سید حسن مثنیٰ ندوی

مہر نیمروز

مارچ سنہ ۱۹۶۰ء

جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۳

حسن مثنیٰ ندوی۔ علی اکبر قاصد۔ ابوالخیر کشفی
سید سلمان ندوی۔ عمر وارث خان۔ خالدہ فہمی ایم اے

قیمت

سالانہ:-	مبلغ چھ روپئے
ششماہی:-	مبلغ تین روپئے آٹھ آنے
فی پرچہ:-	آٹھ آنے (۸)

پتہ

نمبر ۲۴ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی، ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی نمبر ۵

دفتر رسالہ مہر نیمروز ۱۷، کوی روڈ صدر کراچی ۳

اس شمارے میں

حسن مثنیٰ ندوی، اڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے انجمن پریس میں چھپوا کر ۲۴۲ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی سے شائع کیا

پہلی کرن

کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

گذشتہ شمارے میں مولانا محمد حسین آزاد کو یاد کرتے ہوئے یہ جملہ ہمارے قلم سے اتفاقاً نہیں نکلا تھا کہ: آج ہم ایسے شخص
کو یاد کریں تو کس منہ سے یاد کریں جبکہ ہم نے اسکی انشا کو بھی یکسر فراموش کر رکھا ہے جو اس ادیب جلیل کا خاص ہنر تھا؛ ش
یہ ہم نے بالارادہ لکھا تھا۔ واقعی سوچئے کہ آج ہم میں کتنے اہل قلم ہیں جنکو انشا پرداز کہا جاسکتا ہو؛ اپنے ادیبوں کے رشحات
قلم کو سمیٹئے اور سمیٹ کر مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کیجئے پھر دیکھئے کہ گنے چنے چند ہی خانے ایسے نکلیں گے جنکو
کسی نہ کسی طرح پُر کیا جاسکتا ہے ورنہ باقی اور جتنے خانے ہوں گے سب خالی رہیں گے، تنقید شعر و شاعری پر تو وافر ذخیرہ
مل جائے گا، اسی طرح افسانے ڈرامے بھی مل جائیں گے اور نظموں اور غزلوں کے خانے بھی خالی نہیں رہیں گے لیکن انشائیہ
اور بیانیہ اگر تلاش کریں تو وہ سرمہ لگانے کو بھی دستیاب نہ ہوگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو زبان اور علم ادب کی خدمت کے لئے بہت سے معیاری، معلومات افزا اور
دلچسپ رسالے اور اخبارات نکل رہے ہیں، اعلیٰ درجے کی کتابیں بھی لکھی جارہی ہیں اور لوگ ان کو پڑھ بھی رہے ہیں
یہ سب کچھ ہورہا ہے اور زبان ترقی کررہی ہے، پھر بھی اگر آپ غور کریں تو بعض پہلوؤں سے اردو زبان و ادب کی
خدمت ابھی تک ادھوری ہے اور شاید وہی پہلو ایسے ہیں جنکی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت زیادہ ہے،

شعر و شاعری پر تنقیدی مضامین لکھنے اور لوگوں کو شعر فہمی کا سلیقہ سکھانے کا کام بھی ایک خدمت ضرور
ہے۔ اسی طرح نفسیاتی تحلیل کی افسانہ نگاری اور قدیم یا جدید رنگ کی غزل سرائی بھی ادب میں ایک مقام رکھتی
ہے۔ لیکن ساری خدمت اور سارا ادب یہی نہیں ہے اس حقیقت کو نظر سے اوجھل ہرگز نہ ہونے دینا چاہئے، فرض
کیجئے کوئی اجنبی آپ سے سوال کرے کہ اردو زبان کے لئے میں کیا پڑھوں؟ تو اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے کے بزرگوں
نے جو چند تحریریں لکھ چھوڑی ہیں ان کے سوا آپ کے پاس اور کچھ نہ نکلے گا۔ اپنی زبان کے ایک دو نہیں، دس بیس رسالے
دیکھ جائیے ایک مضمون بھی ایسا برآمد نہ ہوگا جس کو آپ بیانیہ اور انشائیہ قرار دے سکیں انگریزی زبان میں جس کو
"ایسے" کہتے ہیں وہ آج تقریباً مفقود ہے اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے کے لوگ بیانیہ اور انشائیہ لکھا کرتے تھے
انہوں نے زبان خود بھی سیکھی تھی اور دوسروں کو سکھانے کی آرزو بھی رکھتے تھے اس لئے ان پہلوؤں کی طرف سے کبھی غافل
نہ رہتے تھے جو زبان کی ترقی و استحکام کے اصل پہلو ہیں ہم سب نے انہیں بیانیوں اور انشائیوں سے ابتدائی اردو

کی تعلیم حاصل کی ہے۔ انشائیوں اور بیانیوں کی مشق، زبان سے وابستگی، زبان کے پھیلاؤ، فکر و خیال کی پرواز، اظہار قوت اور قدرت کا ذریعہ ہے، مگر آج نوجوانوں کو ان منزلوں کے سر کرنے کی راہ بتانے والا نہ کوئی فرد موجود ہے نہ ادا

آج کے نوجوان یا تو افسانہ نگاری کی طرف مائل ہیں یا غزل سرائی کی طرف، اور اگر اس سے بھی آگے بڑھے نقاد بن جاتے ہیں، دنیا میں کچھ سیکھنے کا فطری ذریعہ آنکھ اور کان ہی ہیں، اس لئے جو کچھ ان کی آنکھیں دیکھتی ہیں ا کان سنتے ہیں اسی کو نمونہ بنا کر وہ اگر چل پڑتے ہیں تو ان کا یہ عمل بالکل فطری ہے

دنیائے اردو میں میرؔ اور غالبؔ ہماری رائے میں تو نہ اپنی زندگی میں خوش قسمت تھے نہ آج خوش قسمت جتنی زیادہ ان کی شخصیتیں "کمرل" کی گئی ہیں شاید ہی کسی اور کی ہوئی ہو، پھر نہ جانے وہ کون تھا جس نے پہلے پہل غا پر یہ "اتہام" لگایا کہ وہ فلسفی تھا اور یہ بات بھی اسی تیزی سے چل نکلی جس طرح ہر تہمت چل نکلتی ہے، آج کوئی بھو بھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتا کہ آخر فلسفی ہونے کا مطلب، کیا ہے؟ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ مابعد الطبیعی مسائل کچھ چھینٹے غالبؔ کے دیوان میں کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں تو یہ صفت تو ایسی ہے کہ جس سے (فارسی کو سردست چھوڑیئے اردو کا کوئی شاعر عاری نہیں ...... غالبؔ کی روح رہ رہ کر اپنا یہ مصرعہ دہراتی ہوگی کہ "ہوئے ہم جو مر کے ہوئے کیوں نہ غرق دریا" یہی حال میر کا ہے غرض گوناگوں تنقیدات و تشریحات کا ایک انبار لگا ہوا ہے، اور یہ انبار نوجوانوں کے سامنے ہے اور یہی ان کے لئے نمونہ بن گیا ہے۔ اور اس کیفیت نے صورت حال ایسی کر دی ہے کہ ہوتا ہے جیسے اب دنیا میں اور کوئی عنوان ہی باقی نہ رہا حالانکہ عہد جدید میں بے شمار نئے موضوع پیدا ہوئے ہیں پیدا ہو رہے ہیں، لیکن آج کوئی محمد حسین نہیں ہے، نہ خواجہ حسن نظامی اور نہ عبدالعزیز فلک پیما، اب ان موضو کو ہاتھ کون لگائے۔ انشائیہ اور بیانیہ بھی گویا ان کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔

زبانیں دنیا میں نثر نگاری کے ذریعے ترقی کرتی ہیں، زبانوں کی تعمیر میں بڑا مرتبہ نثر ہی کا ہے، ہم اپنے خیالا کے اظہار میں شعر سے کمتر اور نثر سے زیادہ تر کام لیتے ہیں، نئے نئے موضوعات اور نئے نئے اسالیب بیان نثر ہی کے ذریعے وجود پاتے ہیں، اور نئی نسلوں کے لئے خطابت و محادثات میں کام آنے والے جملے اور فقرے نثر ہی مہیا کرتی ہے، آج اگر کوئی شخص غالب کے اشعار اور دیا شنکر کی مثنوی کے صنائع سے واقف نہ بھی ہو تو اردو میں زبان سے اپنے خیالات کا اظہار خوش اسلوبی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ لیکن اردوئے معلّٰی کے خطوط یا مولوی محمد اسماعیل کی بیانیہ عبارتوں کو اگر کوئی شخص نہ سمجھ سکے تو اردو زبان سے ناواقف سمجھا جائے گا۔ اور اردو زبان تنزل بڑھ رہی ہے ہم ارباب قلم سے قوی امید رکھتے ہیں کہ وہ اس مسئلے کی طرف سنجیدگی سے توجہ کریں گے

پروفیسر فضل الرحمٰن

روایات

(دوسری قسط)

ہر دور میں دو چار شاعر ہوتے ہیں جن کے کلام میں حقیقی جدت اور توجیت اور تخلیقی طرزِ عمل میں جدت اور اختراع
رقی ہے۔ ان کے علاوہ بھیڑ کی ایک بڑی جماعت ہوتی ہے جو بغیر سمجھے بوجھے زمانہ جس طرف چلا جائے اسی طرف چلتے ہیں اور
رکت بجائے اسی پر غیر ارادی طریقے سے ناچتے ہیں۔ ہر فرد سمجھتا ہے کہ میری راہ نئی اور صحیح راہ ہے اور میرا ناچ نرالا۔ لطف تو
ہے کہ وہ دو چار تخلیقی عمل میں انقلاب پیدا کرنے والے ہیں اور جو واقعی نئی راہ نکالتے ہیں وہ روایات سے بہت کچھ سیکھتے
ا نہیں بلکہ اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ بغیر قدماء کی جائز پیروی کئے اس قسم کی جدت ناممکن ہے کیونکہ ہمارے تمام تر
یالات اور ہمارے تمدن کا تعلق ماضی کے ساتھ ہے۔ ہماری زبان لایعنی ہو گی اگر اس تعلق کو منقطع کر دیا جائے اور اس کے
بر ہمارے جذبات رائگاں جائیں گے۔ یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ حال تو ماضی سے صرف تعلق ہی نہیں رکھتا بلکہ ہمارے تمام
ساسات، جذبات، خیالات اور افعال کی انفرادی حالت ماضی کے تجربات اور روایات کے سبب سے ہوتی ہے جو سنگ
س کی طرح ہمارے تجربات کو ایک نئی اور نادر صورت بخش دیتے ہیں۔

تنقید اکثر غیر مفید اور سطحی اس سبب سے ہوتی ہے کہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ شاعر کیوں لکھتا ہے۔ اور کون سی ضرورت
ہے جو مصور کو تصویر کشی پر مجبور کرتی ہے۔ عملِ تخلیق ایک حد تک ارادی ہے اور ایک حد تک غیر ارادی۔ اس میں شعوری اور غیر
عوری عناصر مخلوط رہتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا ذرا مشکل ہوتا ہے کہ اس میں ارادہ یا شعوری افعال کا کہاں تک دخل ہے اور کس
حد تک غیر شعوری عناصر ان میں تغیر پیدا کر دیتے ہیں۔ موسیقی سے یا شاعری میں نظم الفاظ سے جو کیفیت ہمارے جذبات اور
غ پر طاری ہو جاتی ہے اس کی اصلی وجہ بتانا بھی آسان نہیں۔ شاعری اور موسیقی ان کیفیات کا عکس ہیں جنہوں نے شاعر یا ماہر موسیقی کو
یقی عمل پر مجبور کیا۔ نظم پڑھنے یا موسیقی سننے سے وہی کیفیتیں قاری یا سامع میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہو گا کہ شاعری کے ماخذ کا صحیح نقشہ بنانا بہت
دشوار ہے لیکن ایک حد تک اس کا تجزیہ ممکن ہے یہاں صرف دو چار پہلوؤں پر بحث ہو سکتی ہے۔

تمام فنونِ لطیفہ میں ایک جمالیاتی پہلو ہوتا ہے۔ آرٹسٹ کا سب سے پہلا مدعا ایک حسین شئے کی تخلیق ہوتی ہے مگر چہ آرٹ
ہمیشہ جذبات کے اظہار کا ارادہ ہوتا ہے یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جذبات کے اظہار کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں جنہیں آرٹ سے
ئی تعلق نہیں۔ اسی طرح حسن کے بہت سے نمونے اور مناظر ہیں جن پر آرٹ کا اطلاق نہیں ہو سکتا آرٹ میں جذبات اور حسن
ار میں ایک قسم کی آمیزش اور مماثلت ہوتی ہے جس سے دونوں میں ایک نئی معنی خیزی ہو جاتی ہے شاعر یا دوسرے قسم کے آرٹسٹ

کو ہمیشہ اس کی کاوش ہوتی ہے کہ عمل تخلیق سے وہ ایک مناسب اور حسین چیز بنائے جس میں انفرادی خصوصیت ایک بڑی حد تک ہو۔ اس کا بڑا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس کے تعمیر کردہ نمونہ فن میں بے نظیری اور یکتائی ہو۔ لیکن خوبصورتی کے ساتھ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کو تخلیقی عمل کی ضرورت ہی کیوں پڑتی ہے۔ وہ اس بات پر کیوں مجبور ہوتا ہے کہ الفاظ کا تناسب کے ساتھ نظم کرے کیونکہ بالعموم ہم اپنے جذبات کا اظہار ہنس کر یا رو کر یا غصہ ہو کے کیا کرتے ہیں۔ پہلا جواب ہوگا کہ شاعر میں یہ مخصوص قوت ہے کہ وہ الفاظ کے ذریعہ نہ صرف ان جذبات کو بہتر طریقہ سے ادا کر سکتا ہے بلکہ انہیں دوامی زندگی بخش سکتا ہے۔ قریب قریب بے اختیارانہ طریقہ سے اس کا دھیان الفاظ کی طرف جاتا ہے اور اس کے دماغ میں ایک ترنم موجزن ہوتا ہے۔ جن میں وہ الفاظ چسپاں کر کے نظم تیار کرتا ہے۔ اس کے قوائے حاسہ ہمارے قوائے حاسہ سے زیادہ نازک ہوتے ہیں اور ان کے اثرات زیادہ گہرے اور شدید اس لئے اظہار جذبات کے اور طریقے اسے نامناسب اور نامکمل معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن یہ پہلے سوال کا خاطر خواہ جواب نہیں کوئی اور وجہ ہوتی ہے جو شاعر کو ہمیشہ ایک خاص طرح کے عمل پر مجبور کرتی ہے۔ غالباً تمام تخلیقی اعمال کی اصلی وجہ یہ ہے کہ شاعر کی ان تمام مشاہدات سے جو اسے دنیا میں جلوہ گر نظر آتے ہیں پوری تشفی نہیں ہوتی۔ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نظام عالم، اس کے روزمرہ کے تجربات، مروجہ خیالات میں کسی قسم کا تناسب نہیں ہوتا۔ ہر شئے درہم برہم اور نامرتب معلوم ہوتی ہے۔ اور جس طرح ایک سلیقہ مند عورت کو اس بات کی کاوش ہوتی ہے۔ کہ اس کے گھر کی چیزیں قرینہ سے رہیں شاعر بھی اپنے تجرباتی اور دماغی فرنیچر کو سجا کر رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن شاعر صرف نظم نہیں تخلیق بھی ہے۔ اور اس لئے غالباً یہ تشبیہ کافی نہیں۔ شاعر ایک بہتر عالم کی آفرینش کا مدعی ہوتا ہے۔ اپنے دور کے بہت سے خیالات اور اعتقادات کے نقائص کو دوسروں سے بہتر سمجھتا ہے۔ اس کا دل ایک کسوٹی کی طرح ہوتا ہے جس پر رسمی خیالات اور عادات کے کھوٹے سکوں کے عیوب فوراً نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مادی ارتقا اور اس کی تہذیب ہم معنی نہیں اور ہمارے پاس کار اور ریڈیو اور سائنس کے عجیب و نادر ایجادات ہوں، ہمارے دماغ پر اور نئے علوم سے سجے ہوں لیکن جذبات اور تمدنی معاملات میں ہم میں ہزاروں سال قبل کی بربریت موجود رہ سکتی ہے۔

غرض کہ شاعر کو اپنے دور کی بہت سی باتوں سے جس پر کم ظرف اصحاب نازاں رہتے ہیں تشفی نہیں ہوتی اور شکایت رہتی ہے اور وہ اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ بہتر نمونہ پیش کرے یہ ضرور ہوتا ہے کہ بعض صدیوں میں تہذیب بھی اعلیٰ پیمانہ کی ہوتی ہے اور اس لئے شاعر کو زمانہ کے خلاف زیادہ جدوجہد نہیں کرنی ہوتی ہے لیکن اسے اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ بہتر جذبات اور اخلاق کے نمونے پیش کر سکتا ہے۔ بعض عہدوں میں لوگوں کے خیالات اس قدر پست ہو جاتے ہیں، ان کے احساسات اس قدر کند اور تمام رجحان زمانہ اس قدر غیر مہذب ہو جاتا ہے کہ شاعر کو اپنے ماحول سے وہ مدد نہیں ملتی جو زیادہ خاطر خواہ زمانوں میں ملتی ہے اور اس کی شاعری کا لہجہ اکثر طنزیہ، تلخ اور مائل بہ ہجو ہو جاتا ہے اور طرز ادا میں اسے زیادہ کوشش کے ساتھ نئی راہ نکالنی ہوتی ہے۔

عرض ہو چکا ہے کہ معاصر مروجہ خیالات اور ادبی فیشن کو سمجھنے کے لئے خاص ذکاوت اور طباعی کی ضرورت نہیں

ریل گاڑی، موٹرکار یا ریڈیو سے واقفیت بھی کوئی ایسی معرکتہ الآرا بات نہیں اور شاعری میں ان کا تذکرہ قابل ستائش نہیں۔ نہ تو مزدور پر ظلم کا واویلا مچانے اور سرمایہ داروں کو گالیاں دینے میں کوئی جانفشانی، قربانی، تخیل یا تخلیقی قوت کی ضرورت ہے، اور غالباً اس لئے آسان ہے۔ ادب اور شاعری کو ان مزخرفات سے کوئی تعلق نہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی غیر ناقدانہ حامی بھرنا ایک قسم کی ذہنی اور حسی کمزوری کی دلیل ہے جس سے ہمیں شاعری مبرا کرنا چاہتی ہے۔ شاعر کی آنکھیں ایسے فوق البھڑک پردے سے مرعوب اور محظوظ نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس سے گذر کر اصل حقیقت کو دریافت کرسکتی ہیں اور اس کی تخلیقی قوت میں یہ سکت ہے کہ وہ ایک زیادہ کامل نمونہ تعمیر کرسکے

لیکن ہم اپنے تجربات سے باہر نہیں جاسکتے۔ مختلف تجارب اور اثرات سے نئی نئی ترکیبیں ممکن ہیں۔ نادر تمثیلیں بن سکتی ہیں لیکن کوئی انسان اپنے حواس خمسہ اور تجربات کے دائرے سے باہر نہیں جاسکتا۔ شاعری کی نئی عمارت پرانی اینٹوں ہی سے خواہ تراش کر خواہ پوری اینٹیں استعمال کرکے بن سکتی ہے اور اس لئے اسے روایات سے بہت بڑا مدد ملتی ہے۔ چونکہ عہد عتیق میں اکثر ایسے ہی مسائل سے شاعر کو سامنا پڑا جیسے بیسویں صدی میں شاعر کے پیش نظر ہیں اور ایک بصیر شاعر جانتا ہے کہ وہ ہومر سے زیادہ بہتر شاعری نہیں کرسکتا اس لئے اسے ہومر یا شیکسپیر یا حافظ یا فردوسی سے سبق لینے میں کوئی عار نہیں ہوتا۔ عار تو چھوٹے لوگوں کو ہوتا ہے۔

ہمارا دور ایسا نہیں کہ جس پر ہم نازاں ہوں اور جس کے کارناموں پر ہمیں زعم ہو۔ ریڈیو اور سینما ہمیں بہتر اور زیادہ ذکی الحس انسان نہیں بنا دیتے بلکہ مخرب ادراک ہیں اور اکثر مخرب اخلاق بھی۔ اس لئے آج دوسرے دوروں سے زیادہ ضروری ہے کہ اپنے ماحول سے نکل کر روایات کی تفتیش اور چھان بین کریں تاکہ ان کے سبق آموز عناصر سے ہم فائدہ اٹھا سکیں ماحول کا غیر شعوری اثر تو ضرور رہے گا۔ لیکن اس میں خود کو کھو دینا بہت عقلمندی کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے انگریزی ادبا اور شعرا جن کے سامنے آج کی تہذیبی بدنظمی کا منظر زیادہ نمایاں طور پر موجود ہے۔ برابر قدما، اور روایات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جیمس جوائس نے اپنے ناول یولیسیس میں موجودہ زمانے کے نقائص کو قارئین کے ذہن میں زیادہ گہرا نقش کرنے کے لئے نہ صرف آج کی زندگی کا عہد عتیق کی یونانی زندگی سے موازنہ کیا ہے۔ بلکہ پورے ناول کو ہومر کی شہرہ آفاق نظم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یولیسیس کے ہر واقعہ مطالعہ پر اس کے متوازی یونانی نظم کے واقعہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور اس مقابلے سے دونوں میں جو فرق ہے زیادہ خوش اسلوبی سے پیش ہوتا ہے۔ غرض کہ ناول کی شکل اور اس کے نظم میں اوڈیسی کا تتبع کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے اگر کوئی یہ سمجھے کہ جوائس نے لکیر کے فقیر کی طرح غیر تخیلی تقلید کی۔ ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہوگا اس میں طرز تحریر اور طرز تخیل یعنی اس کی امتیازی شان بالکل انقلابی ہے۔ اور ناول میں ہر جگہ اس کی انفرادی خصوصیات کی جھلک موجود ہے

اسی طرح ایلیٹ کی نظموں میں اکثر عہد الیزبیتھ یا قرون وسطیٰ یا کسی دوسرے قدیم عہد کی یاد زیادہ کی گئی ہے ماضی کی نظموں سے یا کسی اور مصنف ادب سے اقتباسات اور حوالوں کی بڑی تعداد ایلیٹ کی نظموں میں ہوتی ہے۔ شیکسپیر کے ایک مصرع یا سینٹ

اوگسٹین کی خود نوشت سوانح عمری کے ایک جملہ کی موجودگی سے قاری کی نگاہ تخیل کے سامنے بہت سی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح کنایتہً عہد حاضر اور دوسرے عہدوں کے نقشے دلکش بدلکش ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہم ان تفرقات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ کبھی کبھی دو چار تغیر و تبدل سے کسی پرانی نظم کے ٹکڑے کی صورت ایک حد تک بدل دی گئی ہے اصل ٹکڑے اور اس "تصرف" کے مقابلے سے ایک طرح کا توازنی تجزیہ ممکن ہوتا ہے۔ جس سے شاعر کے ناقدانہ نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ ایلیٹ کی شاعری ان بصیرت افزا عناصر سے معمور ہے۔ اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ روایات کا کیسا گہرا اثر اس تخیل اور اس کے طرز تحریر پہ ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شاعر کو واقعی کچھ کہنا ہے۔ اگر اسے اخلاقی اور معاشرتی اور ادراکی زندگی میں برے بھلے کی حقیقی تمیز ہے تو اسے شاذ و بالضرور روایات کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ وہ ماحول سے کام لیتا ہے۔ اور اس کی اصلی دلچسپی اپنے عہد کی روش کے ساتھ ہے لیکن اس کا مقصد ہوتا ہے کہ انہیں پرکھا جائے اور سچے اور کھوٹے کو علیحدہ کیا جائے۔ اس عمل کے لئے اس کے پاس دو کسوٹیاں ہیں۔ اپنے ادراک و احساسات کی اور روایات کی حافظ کی شاعری بھی اس حقیقت کی گواہ ہے۔ سلمان ساوجی اور سعدی کے تاثرات حافظ کی شاعری میں بہت ہی واضح ہیں

یہ بہت ممکن ہے کہ گذشتہ زمانہ کے محاسن شاعر کو حقیقت سے کہیں بڑھ چڑھ کر نظر آئیں اور ان کے بیان میں وہ تعلّی سے کام لے۔ یہ انسانی ذہنیت کی خصوصیت ہے کہ ماضی کی چیزیں اسے رومانی رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے جو ادب، شاعری اور فنون لطیفہ کے اعلیٰ نمونوں پر مبنی ہیں ان میں نہ مبالغہ کا جذبہ ہے نہ تعلّی کا کسی زمانہ کی شاعری کیوں نہ ہو اگر واقعی شاعری ہے تو اس میں خلوص اور حقیقت طرازی ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاعر اپنے ہمعصر خیالات، ادب اور فنون کے سحر افزا اسراب سے بچ کر روایات کی حقیقت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ کسی نئی حقیقت یا نئے خیال کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا جب تک اسے نہ صرف اپنے تجربات سے بلکہ صدیوں کے تجربات سے پرکھ نہ لے۔

اگر شاعر صرف ردیف و قافیہ کا بادشاہ ہے تو روایات سے وہ کسی طرح استفادہ نہیں کر سکتا ہے۔ وہ صرف پرانی اور بوسیدہ ہڈیوں کو اکھاڑ کر اپنے دیوان میں دوبارہ دفن کرکے اسے ایک بدنما قبرستان بنادے گا۔ اصل کرامت اس دین کی ہوتی ہے جو شاعر یا فنون لطیفہ کے ماہر کو ملتی ہے۔ اگر وہ ودیعت نہیں ہوتی ہے تو شاعری ایک طرح کی نظر بندی ہوگی جو سست اور کمزور آنکھوں کو مسحور کرے گی مگر جس کا جادو تیز آنکھوں پہ بالکل نہیں چل سکے گا۔ اس کے برخلاف شاعری ایک معجزہ ہے جس کی تخلیق ہر قسم کے امتحان اور تجزیہ کی متحمل ہے۔ شاعری میں ذاتی تجربات اور روایاتی تجربات اس طرح کی خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ پھر دونوں کو علیحدہ کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ اور ایک نیم غیر شعوری طریقہ پر یہی خیالات کی جگہ شاعر کے خیالات لے لیتے ہیں لیکن اعلیٰ فن کا اثر ہمیشہ قائم رہتا ہے اور ہر عہد میں شعرا کی مدد کے لئے موجود۔

ایلیٹ اور پاؤنڈ، اسپنڈر اور ڈلن ٹامس میں یہ صفات موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے اور بھی شاعر ہیں

جن کے مداحوں کی جماعت بہت کافی ہے۔ لیکن جس شخص کو شاعری کا صحیح ذوق ہے اسے اس بات سے بالکل دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی کہ مسٹر آرم اسٹرانگ کن شعبدوں کی تیاری میں معروف ہیں اور جارج بارکر، انٹر میٹر اور نواکس کن کرتبوں میں معروف ہیں کیونکہ انہیں شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہیں

غالباً ایک مثال مباحث کے دفتر سے زیادہ کارآمد اور یقین دلانے والی ہوتی ہے اس لئے زمانۂ حال کے شاعر ڈلن ٹامس کی ایک نظم سے اقتباس پیش ہے۔ اصطلاحات وہی ہیں جو کار کی پچھلی سیٹ اور ریل گاڑی کی راگ میں نظر آتی ہیں لیکن ذہنیت میں بعد المشرقین ہے۔

IN THIS OUR AGE THE GUNMAN AND HIS MOLB,
TWO ONE-DIMENSIONED GHOSTS, LOVE ON A REEL
STRANGE TO OUR SOLID EYE,
AND SPEAK THEIR MIDNIGHT NOTHING AS THEY SWELL
WHEN CAMERAS SHUT THEY HURRY TO THEIR HOLE
DOWN IN THE YARD OF DAY.
THEY DANCE BETWEEN OUR ARCLAMP AND OUR SKULL,
IMPOSE THEIR SHOTS, THROWING THE NIGHTS A WAY;
WE WATCH THE SHOW OF SHADOWSKISS OR KILL,
FLAVOURED OF CELLULOID GIVE LOVE THE LIE

سید عبد القدوس ہاشمی

چند غلط فہمیاں اور ان کی تصحیح

دنیا کی تقریباً ہر تحریک کو دو قسم کی مخالفتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کچھ لوگ مخالفت کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اس تحریک کے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلاتے ہیں، اسے بدنام کرتے ہیں، اس کے عیوب گنواتے ہیں اور لوگوں میں تحریک کی طرف سے بدظنی اور نفرت پیدا کرتے ہیں۔ یہ طبقہ تشدد یا عدم تشدد کے ذریعہ لوگوں کو اس تحریک کی مخالفت کرنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ اور اکثر مواقع پر ایسا معلوم بھی ہوتا ہے کہ اس مخالفت سے تحریک کی رفتار ترقی بالکلیہ رک جائے گی۔ لیکن تاریخ کے کسی دور میں حقیقۃً ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اس تحریک کے چلانے والوں پر کبھی کبھی مخالفتوں کی وجہ سے اوس سی ضرور پڑ جاتی ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان مخالفتوں کی وجہ سے جوش پیدا ہوتا ہے۔ اور تحریک میں قوت اور زیادہ آجاتی ہے۔

مخالفوں کا دوسرا طبقہ جو اس کھلی مخالفت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ وہ تحریک کے مقاصد اور اس کی خوبیوں سے کبھی انکار نہیں کرتا بلکہ بڑی حد تک ہمدردانہ برتاؤ کرتا ہے وہ اپنے قلم اور اپنی زبان سے تحریک اور اس کے ساتھیوں سے محبت اور دلچسپی کا اظہار کرتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہی کہتا جاتا ہے کہ افسوس اتنی مفید تحریک اور اس قدر عمدہ چیز دنیا میں چل نہیں سکی۔ روز بروز روبہ زوال ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تحریک ہر طرح جامع ہوتی تو یقیناً دنیا کے سب لوگ اس میں شریک ہو جاتے اور یہ کبھی روبہ زوال نہ ہوتی کبھی کہا جاتا ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ ترقی نہیں کرتی۔ کبھی نہایت ہمدردانہ لب ولہجہ میں کہا جاتا ہے کہ دیسے تو یہ تحریک مفید ہی نظر آتی ہے۔ مگر اس میں کچھ نہ کچھ خامی ضرور ہے جو اگرچہ ابتدائی جوش و خروش میں نظر نہ آسکی مگر زمانہ جیسے جیسے گزرتا جاتا ہے اور دنیا ترقی کرتی جاتی ہے اس خامی کے قدرتی اثرات ظاہر ہوتے جاتے ہیں اور خامیاں تحریک کی ترقی کا راستہ روکتے ہیں

پہلی قسم کے لوگ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کھلے دشمن ہوتے ہیں اور ان کی دشمنی سے حامیان تحریک چوکنا رہتے ہیں۔ اور بوقت ضرورت ان کا مقابلہ کرتے ہیں چنانچہ تقریباً پانچ ہزار سال کی افسانوی اور واقعی تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ دشمنوں کی دشمنی سے کبھی کوئی تحریک فنا نہ ہوسکی۔

لیکن دوسری قسم کے دشمن بڑے خطرناک ہوتے ہیں یہ بار بار نہایت شدت کے ساتھ اور طرح طرح سے ہمدردی جتا کر ایسی باتیں کہتے ہیں کہ خود تحریک کے علمبرداروں کا یقین تحریک کی صداقت اور افادیت پر باقی نہیں رہتا اور رفتہ رفتہ ایک اندرونی طبقہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس کا دل تحریک کی افادیت کی طرف سے مطمئن نہیں رہتا بلکہ شدید قسم کا احساس کمتری اس میں پیدا

ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ نصب العین جس کو سامنے رکھ کر دشمنان تحریک اس قسم کی دشمنی کرتے ہیں۔

ہمارے موجودہ عہد میں تحریک پاکستان ہی کو بطور مثال کے سامنے رکھ لیجئے اس کی مخالفت جن دشمنوں نے شدت کے ساتھ کی اور ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جتنی ان کی مخالفت بڑھتی گئی اتنا ہی مسلمانوں کا جوش بڑھتا گیا۔ انہوں نے خون ریزیاں کیں اور ایسی شدید کہ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی کھلی جنگوں کے سوا دنیا کے کسی ملک میں دو ہزار سال کے اندر کوئی واقعہ اس طرح اور اتنے وسیع پیمانہ پر خون ریزی اور لوٹ کھسوٹ کا شاید ہی مل سکے۔ یہ مخالفتیں اور دشمنیاں اپنی وسعت میں بودھوں کے خلاف برہمنوں کی سفاکی اور مسلمانوں کے خلاف اندلس کے عیسائیوں کی بربریت سے بھی کسی قدر زیادہ ہی ہیں۔ مگر اس کے باوجود مسلمانوں پر اوس نہیں پڑی، تحریک کامیاب ہوئی اور کامیاب ہو کے رہی۔

اس کے بعد پاکستان کے مخالفوں نے خود پاکستان کے اندر ایک مہم چلائی اور اب بھی بارہ برس سے جاری ہے ہر الجھن اور انتظامی و معاشی مشکلیں ان کی گفتگو کا آخری حصہ یہ ہوتا ہے کہ "جی ہاں! حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان کا بنایا جانا ہی ایک غلط عمل تھا"

اس فقرے کے کہنے والے اس شان سے یہ فقرہ ادا کرتے ہیں جیسے وہ اور صرف وہی ایک "دانائے راز" اس عالم آب و گل میں اب باقی رہ گئے ہیں۔ اور قوموں کے عروج و زوال پر ان کی ایسی نظر ہے کہ دنیائے تاریخ و سیاست میں ان کا کوئی نظیر و مثیل نہیں۔ لیکن جب آپ تھوڑی دیر ان سے اور گفتگو کریں اور کہیں کہ حضور عالی پاکستان نہ بنایا جاتا تو دہلی کی مرکزی حکومت میں ہم آہنگی کیسے آتی اور ایک قومی نظریہ کیسے پیدا ہو جاتا۔ پھر ان سارے مسلمانوں کا کیا بھلا ہو جاتا جو اپنے اپنے صوبوں میں کثرت رکھنے کے باوجود مرکز میں صرف ۲۴ فیصد ہوتے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ "دانائے راز" صاحب کی ساری دانائی کا بھرم کھل جائے گا۔

یہ ایک مثال تھی، تحریک پاکستان ہی نہیں ہر بڑی تحریک اور ہر بڑے مذہب کے ساتھ یہی صورت پیش آتی ہے۔ اور دنیا کی کوئی سیاسی، سماجی اور مذہبی تحریک ایسی نہیں جسے ان دونوں قسموں کے دشمنوں سے واسطہ نہ پڑا ہو۔

جیسے آپ نے موجودہ عہد کی ایک چھوٹی سی مثال تحریک پاکستان کی دیکھی ایک عظیم الشان مذہب اور دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان تحریک یعنی تحریک "اسلام" کی دیکھئے۔ آج آپ کو بظاہر پڑھے لکھے اور مثقف و مہذب لوگوں کی ایک تعداد ایسی ہر جگہ مل سکتی ہے جن کی ہر گفتگو کی تان مسلمانوں کی عام زبوں حالی اور اسلام کے زوال پر ٹوٹتی ہے۔ ان میں سے بعض تو نہایت افلاطونی انداز میں سر ہلا کر فرماتے ہیں کہ اسلام کی ساری تاریخ مار دھاڑ اور باہمی قتل و خون کے سوا کچھ نہیں۔ اور بعض اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اس زبوں حالی اور پس ماندگی کا اصلی سبب ان کو۔ تعلیمات اسلامی کے اندر کسی بنیادی نقص کا وجود" نظر آنے لگتا ہے۔ اور نہایت شاندار طریقہ پر سر ہلا کر فرما دیتے ہیں کہ ضرور کوئی نہ کوئی خرابی تعلیمات اسلامی میں ایسی موجود ہے جو مسلمانوں کی ترقی میں حائل ہے۔

آپ نے بھی ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا جو کسی مشن کالج سے پڑھ کر اپنی خوش قسمتی اور ہماری بدقسمتی سے اگر کسی عہدہ پر فائز ہو گئے تو گویا مقام رفیع انہیں مل گیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ نہ انہیں مطالعہ کا شوق ہے اور نہ سوچنے کے قابل دماغ

باقی رہا ہے پھر بھی باتیں ایسی کرتے ہیں کہ اگر افلاطون وارسطو بھی سامنے آئیں تو انگشت بدندان رہ جائیں۔ حکیم مشرق علامہ اقبال نے ایسے لوگوں کو "طائر گم کردہ نشیمن" کا لقب دیا ہے۔ اور یقیناً غلط نہیں دیا ہے۔

ایک دن میرے پاس ایک عرب سفارتی عہدہ دار تشریف لائے اور بڑی دیر تک اپنی قابلیت و دانائی کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے سوال کیا:

• ——— "کیا آپ کے پاس کوئی بڑی کتاب عرب کی تاریخ پر موجود ہے؟

• ——— "جی ہاں! پچھلے سو سال کے اندر جو متعدد تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں سے بعض موجود ہیں۔ اور قدیم کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے جن میں عرب کی تاریخ مل سکتی ہے۔

• ——— "نہیں، میں کسی قدیم مورخ کی لکھی ہوئی ایسی وسیع تاریخ چاہتا ہوں جو خصوصیت کے ساتھ صرف عرب قوم کی تاریخ ہو،

• ——— قدیم تاریخیں یا تو عام تاریخ عالم ہیں یا تاریخ اسلام۔ قدیم میں عرب قوم کے نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ ان کی کوئی تاریخ خصوصیت کے ساتھ لکھی گئی۔ یہ تو فرانس کے بادشاہوں کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے یورپ کے مستشرقین کو سازش میں شریک کر کے خلافت عثمانی (ترکی) کے خلاف عربوں کے نسلی جذبہ کو برانگیختہ کرنے کے لئے عربوں کی تاریخیں لکھوائیں اور وہیں سے یہ مرض عربوں میں آگیا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں کوئی ایسی کتاب دو سو سال پرانی موجود نہیں جس کو خاص طور پر عرب قوم کی تاریخ کہا جا سکے۔ نہ عرب تمدن کے نام سے کوئی چیز دنیا کے سامنے پیش کی گئی اور نہ عرب علوم کے نام سے۔ تاریخیں اسلام کی لکھی گئیں جس میں عرب و عجم سب ہی شریک تھے اور اب بھی شریک ہیں۔

یہ لکھنا بے سود ہے کہ ان عہدہ دار صاحب کا اس جواب سے کیا حال ہوا۔ اس اللہ کے بندے کو اب تک یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عرب قومیت کا تصور کب سے پیدا ہوا، عرب تمدن، عرب کے کارنامے اور عرب کے علوم پر کتابیں کب سے اور کس جذبہ کے ماتحت لکھی گئیں، اور کون لوگ اس تحریک کے اولین محرک تھے۔ لیکن ہاں بے خبری وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ سارے غیر عرب مسلمانوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو تاریخ عرب سے واقفیت میں اس کے برابر ہو سکے۔

بالکل یہی حال ہمارے ان عزیزوں اور دوستوں کا ہے جو نہ پڑھتے ہیں اور نہ سوچتے ہیں۔ یورپ کے لوگ جو کہہ دیتے ہیں اسے وہ یا تو سن لیتے ہیں یا کہیں اخباروں یا رسالوں میں دیکھ لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد بار بار اسے دہرایا کرتے ہیں۔ کبھی خود تحقیق نہیں کرتے کہ کہنے والے نے جو کچھ کہا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے، اور اس نے کس جذبہ کے ماتحت کیا مقصد و نصب العین قرار دے کر یہ بات کہی ہے۔ وہ تو صرف اس لئے کسی اور کی کہی بات کو اپنی بنا کر دہراتے ہیں کہ شاید لوگ ان کی عظمت فکر کے قائل ہو جائیں۔ اور یہی سب سے بڑا المیہ ہے۔

بعض علماء یورپ نے ادھر ساٹھ ستر سال سے اسلام کے خلاف ویسا واضح مخالفانہ لب ولہجہ ترک کر دیا ہے۔ جیسا کہ ہمیں ولیم میور وغیرہ کی کتابوں میں نظر آتا ہے۔ اب انہوں نے "ہمدردانہ انداز" اور علمی تحقیقات کے تیور اختیار کر لئے ہیں۔ اور اس میں وہ ایسی باتیں لکھتے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر مسلمانوں میں شدید قسم کا احساس کمتری پیدا ہو، اور ان کو اپنے ماضی سے نفرت ہو جائے اور

اس طرح موجودہ نسل کے مسلمان اپنے آپ کو ماضی کی روایات سے منقطع کرلیں گے اور اپنے اسلاف کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔ پھر ان طایران گم کردہ نشیمن کو جال میں پھانسنا کیا مشکل کام رہ جائے گا۔

بیچارے اقبال خدا ان پر رحمت کرے، کہتے تھے کہ

زندہ فرد از ارتباط جان و تن
زندہ قوم از حفظ ناموس کہن

ان مشرق شناسانِ عہد حاضر نے بھی اس نکتہ کو خوب سمجھا ہے۔ اور ان کی ساری مساعی موجودہ مسلمانوں کو ماضی سے قطع کرنے پر مرکوز ہیں۔ اس کے لئے ادارے قائم ہو رہے ہیں، کلوکیم ہوتے ہیں، کتابیں چھپتی ہیں اور یہ کتابیں بطور ہدیہ مسلمانوں پیش کی جاتی ہیں۔ تاریخیں لکھی جاتی ہیں۔ اور انہیں مسلمانوں کی جامعات میں کوشش کر کے شریک نصاب کرایا جاتا ہے۔ دور ول جائیے، اپنی جامعہ کراچی ہی کو دیکھئے مسٹر ہٹی کی تاریخ عرب پڑھنے کے لئے طالب علموں کو دی جاتی ہے۔ ان ہٹی صاحب جو ماشاء اللہ اتنے فاضل ہیں کہ کتاب الاغانی میں لکھی ہوئی کہانیوں کو تاریخی روایات سمجھتے ہیں۔ اور جنہیں الف یلہ ولیلہ میں لکھے ہوئے افسانے عہد ہارون و مامون کے "واقعات" نظر آتے ہیں۔ کیا واقعتہً وہ اتنے نادان ہیں کہ انہیں ریخی روایات اور گھریلو کہانیوں میں فرق نظر نہیں آتا۔ کیا انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ انگریزی زبان میں فیری ٹیلز کے نام سے و قصے کہانیاں موجود ہیں ان سے انگریزوں کی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ اور بیتال پچیسی کی کہانیوں سے ہندوؤں کی تاریخ نہیں ن سکتی؟ ۔ ڈاکٹر ہٹی بڑا وسیع مطالعہ رکھنے والے عالم ہیں وہ یہ سب کچھ سمجھتے ہیں۔ مگر جس مقصد کے ماتحت عیسائی قومیں ن سے اجرت دے کر تاریخیں لکھواتی ہیں، اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ تنقیح و تحقیق روایات پر کم توجہ کریں۔ اب سوال یہ رہ ہاتا ہے کہ ہٹی صاحب کا تو ایک مقصد تھا۔ اور ان کی مالی امداد کرنے والے عیسائیوں کا بھی ایک مقصد ہوگا۔ لیکن ہمارے ارباب لم کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے ہٹی صاحب کی کتاب کو جامعہ کراچی کے طالب علموں کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اس کا جواب تو سارے اکستان میں پھیلے ہوئے مشن اسکول ہی دے سکتے ہیں جنہیں آپ نرم سے نرم الفاظ میں "ذہنیت ساز" کارخانے ہی کہہ سکتے ہیں یا آپ یہ یقین کر سکتے ہیں کہ ان تعلیم گاہوں سے جو سند یافتہ نکلیں گے ان کی ذہنیت ملی یا کم از کم خالص وطنی نقطۂ نظر کی حامل ہوں گی۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض حوادث یا دوسرے خارجی عوامل نے کسی ذہنیت کو بدلنے میں معجز نمائی کی ہو۔

خدا بخشے مولانا محمد علی جوہر مرحوم کہتے تھے کہ وہ ایک مدت تک صرف اس لئے نماز پڑھنے سے محروم رہے کہ دوستوں میں قدامت پسند کہلانے سے ڈرتے تھے۔ لیکن جب دوسرے خارجی عوامل اور اسباب نے کام کیا تو مولانا محمد علی یک سر بدل گئے۔ یہ اور اس طرح کی چند استثنائی مثالیں اٹاوہ اور علی گڑھ کالج کے سند یافتہ محمد علی ہی میں نہیں بلکہ خالص عیسائی مشن کے تعلیم یافتوں میں بھی مل جائیں گی۔ لیکن استثنا قاعدہ کلی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ کہ انگریزوں کی گولیوں اور دتی کے خونیں دروازے پر لٹکائے ہوئے پھانسی کے تختوں نے ہم کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا ان غیر ملکی اداروں کی تعلیم نے۔

اسی قسم کے اداروں اور تعلیم گاہوں کے سند یافتہ ہیں جو آپ کو "افلاطون زمانہ" بنے ہوئے خلاف ملت وخلاف وطن خیالات کے پھیلانے والوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ خود کچھ نہیں سوچتے اور فی الحقیقت یہ لوگ معذور

بھی ہیں ان کو ایسا علمی اور ملی جذبات کا حامل ماحول کہاں میسر آیا اس لئے یہ بیچارے کیا کریں ـــــ یہ بہت آسانی کے
ساتھ دشمنوں کے پروپیگنڈے کا شکار بن جاتے ہیں۔ اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ۔

(۱) ساری اسلامی تاریخ آپس کے جنگ وجدال اور مار دھاڑ کے سوا کچھ نہیں ۔
(۲) مسلمانوں میں بہتر فرقے ہیں اور ان میں متفق علیہ کوئی چیز نہیں
(۳) اسلام روز بروز روبہ زوال ہے
(۴) اسلامی لائحہ حیات جدید عہد میں نہیں چل سکتا، یہ ایک فرسودہ اور از کار رفتہ طریقۂ زندگی ہے۔

آیئے اس مختصر سے مضمون میں ہم ان چاروں دعاوی کی تحلیل کر کے دیکھیں کہ ان کے اندر کتنی صداقت ہے۔ شاید
بعض ایسے گوشے بے نقاب ہو سکیں جن سے ہماری آنکھیں کھل جائیں۔

ان چاروں دعاوی کی تنقیح و تحقیق سے پہلے چند الفاظ میں یہ بھی سن لیجئے کہ اسلام کیا ہے، آپ کو معلوم تو یقیناً ہے
لیکن کیا حرج ہے کہ ایک مرتبہ پھر سے یاد تازہ کر لی جائے،

اسلام سادہ عملی مذہب ہے، اس میں فلسفیانہ موشگافیوں اور سخن تراشیوں کی مطلقاً گنجائش نہیں عہد صحابہ میں
مسلمان روح و جسم کی ثنویت سے بالکلیہ ناآشنا تھے، نہ کہیں روحانیت اور سیر روحانی کی اصطلاحات کا پتہ ملتا ہے۔ اور
کسی غوث، قطب، ابدال، اعماد و اوتاد کا نشان۔ نہ کہیں کوئی مسلمان برزخ کبریٰ، حقیقت محمدی، جبرائیل اللہ، سر ظہور تنزلات
ستہ اور لطائف خمسہ پر گفتگو کرتا ہوا نظر آتا ہے اور نہ کسی محفل میں انائے مطلق اور انائے مقید کی اصطلاح سنائی دیتی ہے۔

اسلامی تعلیمات کی بنیاد وحی محمدی پر ہے، صحابہ وحی کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بے چین نہ ہوتے تھے بلکہ ان احکا
کی پیروی کے لئے سبقت کرتے تھے جو بذریعہ وحی انہیں دیئے جاتے تھے۔ وہ یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جتنے علوم اور فنو
آدمی بذریعہ تجربہ و اختیار حاصل کر سکتا ہے۔ ان کے لئے وحی نبوت کی ضرورت نہیں، اور اسی لئے قرآن حکیم میں لوہے ا
لکڑی میں لچک کا تناسب، آواز کی رفتار، بجلی اور بھاپ کی قوتیں۔ برقیات و سالمات کے خواص پر بحث نہیں کی گئی۔
یہ اور اس قسم کی تجرباتی چیزیں تو انسان اپنے تجربہ اور اپنی تلاش سے معلوم کرتا ہی رہا ہے۔ اور ہمیشہ معلوم کرتا رہے گا۔ وح
نبوت کے ذریعہ انسانوں کو صرف وہ یقین عطا کیا جاتا ہے جو تجربہ و مشاہدہ کے حدود سے ماوراء ہوتا ہے۔ اسی طرح
کیفیات و مشاہدات جو کوئی شخص وہم، خیال، ادراک، تعقل یا وجدان کی مدد سے حاصل کرتا ہے، وحی کا موضوع نہیں
ہے۔ یہ سب انسان کے لئے سعی و محنت سے حاصل شدنی چیزیں ہیں۔ ان کے لئے نہ پیغمبر کی ضرورت ہے اور نہ کسی و
نبوت کی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل سادہ فطری طریقۂ استدلال سے یہ بتایا کہ تم اگر مجھے اب تک کے
کی بنا پر صادق و امین سمجھتے ہو تو حسب ذیل پانچ باتوں کا یقین رکھو،

(۱) خداوند تعالیٰ
(۲) خداوند تعالیٰ کے ملائکہ

(۳) خداوند تعالیٰ کی کتابیں (وحی نبوت کے مجموعے)

(۴) خداوند تعالیٰ کے رسول

(۵) حیات مابعد الممات اور قیامت

یہی پانچ امور ہمارے اجزائے ایمان ہیں۔ ان کے سوا کسی اور بات پر ایمان لانا کسی مسلمان کے لئے ضروری نہیں۔
ل کے لئے اسی طرح پانچ باتیں بتائیں۔

(۱) ایمان مندرجہ بالا کا واضح اقرار

(۲) نماز

(۳) زکوٰۃ

(۴) روزہ

(۵) حج

کتنی سادہ سی بات ہے۔ اگر لوگ اپنی ماؤں کو صادق یقین کرکے باپ کو باپ، بھائی کو بھائی اور بہن کو بہن سمجھتے ڈاکٹر کو صادق سمجھ کر اس کی دی ہوئی زہریلی دوائیں تک کھانے سے دریغ نہیں کرتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک نیکوکار ۔ خصلت آدمی کی بات کا یقین نہ کرلیں جس کی سچائی اور نیکوکاری کو پچاس ساٹھ سال تک لوگوں نے آزما کر اور پرکھ کے دیکھ لیا ہو۔

یہ اتنی سادہ سی بات تھی کہ بادیہ نشین چرواہوں سے لے کر فلسفیانہ مزاج رکھنے والے اسکالر حضرت عبداللہ بن سلام تک سب کی سمجھ میں آگئی، اور آج بھی ہر سادہ دل اور معقولیت پسند آدمی کی سمجھ میں آجاتی ہے [ذرا غور تو کیجئے کہ عرب کے بادیہ نشینوں کو "سرظہور" سمجھایا جاتا، یا کتاب فصوص الحکم پڑھائی جاتی تو کون اسے سمجھتا جب کہ سرظہور کے بانے والے آج تک خود بھی اسے حل نہ کرسکے ہیں کہ علم متشکل ہو کر قلب انسانی کیسے ہوگیا۔ اور لطائف خمسہ پانچ کی بجائے ہی لطیفوں میں کیوں نہ ختم ہوگئے]

غرض یہ کہ اسلام ایک نہایت سادہ سا عملی مذہب ہے۔ فلسفیانہ موشگافیوں کی اس میں مطلقاً کوئی گنجائش ں۔ اس کے عقاید اور اعمال سب کی بنیاد وحی محمدی پر ہے جس کے مجموعہ کو قرآن مجید کا لقب خود وحی نے دیا ہے۔

اور قرآن مجید نے مندرجہ بالا پانچ نکتے یقین کے اور پانچ اصول عمل کے عطا کئے۔ آئندہ کے سطور میں ان ہی پانچوں یدا اور پانچوں اعمال کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔ اور یہ دکھایا جائے گا کہ ان کے اثرات کیا مرتب ہوئے، آیئے پہلے حسب وعدہ ان چاروں دعاوی کا جائزہ لیا جائے جو دشمنوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر ہمارے م کردہ فہمی "طاہروں" کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) کیا ساری اسلامی تاریخ آپس میں مار دھاڑ اور قتل و خون ریزی کے سوا کچھ نہیں ہے؟

اس کرۂ ارضی پر انسانی تاریخ کتنی قدامت رکھتی ہے۔ اب تک اس کا کوئی صحیح فیصلہ اہل علم کی طرف سے پیش

نہیں کیا جا سکا،

لیکن بہر حال جتنی بھی پرانی ہو قرآن کریم جب نازل ہوا ہے اس کا وقت موجودہ شمسی سالوں سے چند برسوں کی حسابی غلطی کے ساتھ ہی سہی، مگر ایک حد تک متعین ضرور ہے۔

موجودہ عیسوی گریگوری کیلنڈر کے بموجب نزول قرآن مجید کا زمانہ سنہ ۶۱۰ء سے سنہ ۶۳۲ء تک ہے، اس طرح تاریخ اسلامی کا ابتدائی سال سنہ ۶۱۰ء کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت سے اب تک یعنی سنہ ۱۹۶۰ء کی جنوری تک ۱۳۵۰ سال کی مدت اسلامی تاریخ کی مدت ہے۔ اس مدت میں مسلمان ساری دنیا میں پھیلے۔ اور ایسے پھیلے کہ آج دنیا کا کوئی ملک بلکہ کسی ملک کا کوئی صوبہ، ضلع یا بڑا شہر ایسا نہیں جہاں کوئی نہ کوئی مسلمان موجود نہ ہو۔

یہ ۱۳۵۰ سال کی مدت اگرچہ ایک بہت ہی طویل مدت ہے۔ لیکن کرۂ ارضی پر انسانی تاریخ کی طویل تر مدت کے مقابلہ میں حقیقتاً ایک بہت ہی مختصر سی مدت معلوم ہوتی ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ چینیوں کی افسانوی تاریخ، ہندوؤں کی کہانیاں فراعنۂ مصر کے قصے، بابل و نینوا کے افسانے کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو یہ مدت کون سی بڑی مدت ہے۔ آدمی ہر شئے کی پیمائش کے لئے خود اپنے آپ ہی کو مقیاس بنانے کا عادی ہے، وہ اونچائی کو اپنے قد کے اعتبار سے اور تعداد اشیا کو اپنی انگلیوں کی تعداد کے مقابل رکھ کر دیکھتا ہے۔ اسلئے وہ اپنی عمر کی مدت سے فاصلۂ زمانی کو بھی ناپنے کا عادی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک انسان کی عمر کے مقابلہ میں ۱۳۵۰ سال کی مدت بڑی طویل مدت ہے

اس سے انکار نہیں ہے کہ اسلامی تاریخ کے اس طویل دور میں مسلمانوں کے مابین قتل و خون ریزی کے واقعات بھی ہوئے اور بہت ہوئے۔ آخر مسلمان بھی آدمی ہی ہوتے ہیں۔ کچھ فرشتے یا ما فوق الانسان مخلوق نہیں ہوتے۔ ان میں انسانوں ہی کی طرح اچھے برے سب ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی تاریخ میں بھی ویسے واقعات اور اعمال کا ملنا ناگزیر ہے جیسے کہ ہمیں دنیا کی عام انسانی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے واقعات اوروں سے کسی طرح کم ہوں۔ یا کسی خاص محدود مدت میں اوروں سے زیادہ ہوں۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کی تاریخ فرشتوں، معصوموں اور ملائکہ کی تاریخ ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کی کسی قوم کی تاریخ ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہے۔ اقتدار و اختیار کی جنگیں، ملک گیری اور ملکداری کے لئے خون ریزیاں کہاں اور کس قوم میں نہیں ہوئی ہیں۔ ذرا اسی سنہ ۶۱۰ء سے سنہ ۱۹۶۰ء کی مدت کو یورپ کی تاریخ میں چین، جاپان اور ہندوستان کی تاریخ میں، افریقی قبائل کی تاریخ میں غور سے پڑھئے۔ وسط چین میں تو مسلمانوں نے کبھی حکومت نہیں کی، فرانس اور برطانیہ پر تو حاکم نہیں رہے۔ سوئیڈن، ناروے، فن لینڈ اور روس پر تو حکمرانی نہیں کی۔ ان ممالک کی تاریخ کو دیکھ لیجئے۔ اگر ان کی خون ریزیوں اور سفاکیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تاریخ کے خونی واقعات عشر عشیر نہ نظر آئیں تو میرا ذمہ۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ انگلستان و فرانس کے مابین جو جنگ صد سالہ ہوئی تھی، کیا تخت و تاج کے لئے فرانس و اٹلی میں جو واقعات ہوتے رہے ہیں وہ آپ کو معلوم نہیں ہیں۔ کیا چین میں سنہ ۶۱۸ء میں تانگ خاندان کی حکومت ختم ہونے کے بعد جو کچھ ہوا ہے وہ آپ کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ کیا ہندوستان کے مختلف علاقوں میں، قنوج اور اجمیر میں دکن، دہلی اور بنگالہ میں جو کچھ ہندو راجاؤں کے عہد میں ہوتا ر

اس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ کیا ناروے اور سویڈن کی آویزیش کی آپ کو اطلاع نہیں ہے، کیا تخت قسطنطنیہ کے لئے دولت روما کی مشرقی شاخ کے لوگوں کی کارستانیاں آپ نہیں جانتے۔ کیا ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کی داستان آپ کو یاد نہیں ہے؟ اور کیا سب سے قریب عہد کا واقعہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی دو عالم گیر جنگیں پوری اسلامی تاریخ کے واقعات خون ریزی کو صفحۂ قلب سے محو کر دینے کے لئے کافی نہیں ہیں جس وسعت کے ساتھ اور جتنے بڑے پیمانے پر خوں ریزیاں خود ہمارے زمانہ میں متذکرہ دونوں عظیم جنگوں میں ہوئی ہیں ان کا اندازہ صرف اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ ۷۱۱ء سے جب کہ غازی محمد بن قاسم نے سرزمین سندھ میں قدم رکھا، ۱۸۵۸ء تک کے جب کہ بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی قیدی بن کر رنگون روانہ ہوئے۔ تمام خون ریز واقعات کا مجموعی نقصان جان و مال ۱۹۱۴ء کی جنگ کے نقصانات جان و مال کا صرف دسواں حصہ قرار پاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو تاریخ ہندوستان اور جنگ عظیم کے نقصانات کو ملا کر دیکھ لیجئے۔

کسی قوم کی تاریخ کو اس طرح دیکھنا دانائی نہیں۔ یہ تو انسانی تاریخ کے واقعات ہیں، اور ہر زمانہ میں مختلف انداز میں ہوتے رہے ہیں۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کسی قوم نے زمام تمدن اپنے ہاتھوں میں لے کر کیا کام کیا، کتنی سابقہ برائیوں کی اصلاح کی اور کتنی اچھائیاں اجتماع نوع انسانی میں پیدا کیں۔ اس اعتبار سے آپ اسلامی تاریخ کو دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ مسلمان اپنی ساری گمراہیوں اور واماندگیوں کے باوجود بھی نوع انسان کے لئے حقیقتہً ایک رحمت خداوندی ثابت ہوئے ہیں ——

ہمارا دل تو یہی چاہتا ہے کہ کاش مسلمان احکام قرآن مجید کے بالکلیہ پابند رہتے اور یک سر مو تجاوز نہ کرتے لیکن یاد رکھئے کہ ایسی معصوم تمنا کبھی پوری نہیں ہوتی، اتنی بڑی قوم جس کے افراد کی تعداد ساٹھ کروڑ نفوس سے بھی متجاوز ہو، ساری کی ساری صرف اچھے ہی لوگوں پر مشتمل نہیں ہو سکتی۔ کچھ دنوں کے لئے کسی جماعت میں تو ایک خاص قسم کا معیار قائم رہ سکتا ہے لیکن کسی بڑی جماعت میں بہت بڑی مدت کے لئے ایک خاص معیار کا قائم رہنا خلاف فطرتِ انسانی ہے۔ قرآن مجید نے بھی اپنے احکام میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ اور خدا نے بھی جہاں یا ایہا الذین آمنوا، یا ایہا الناس کہہ کر مخاطب کیا ہے وہاں قل یاعبادی الذین اسرفوا بھی فرمایا ہے (سورۃ الزمر آیت ۵۳)

تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک عجیب قسم کا مغالطہ اکثر لوگوں کو ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ایک ہی صفحہ میں یا دو چار صفحوں کے اندر جب وہ دو چار واقعات ایک قسم کے پڑھتے ہیں تو ان کو نظر آتا ہے کہ روز ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ ان دونوں واقعات کے مابین اتنا طویل فاصلۂ زمانی ہوتا ہے کہ ایک بچہ پیدا ہو کر جوان، بلکہ بوڑھا ہو کر دنیا سے رخصت ہو چکتا ہے۔ لیکن چونکہ مسلسل واقعہ تاریخ میں آجاتا ہے۔ اس لئے فاصلۂ زمانی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ مثلاً تاریخ ہندوستان کے اندر ہم پڑھتے ہیں کہ عالمگیر نے باپ کو قید کر کے بھائیوں کو قتل کر کے تخت حکومت حاصل کیا۔ اس کے بعد پڑھتے ہیں کہ محمد معظم شاہ بادشاہ ہوا اور بھائیوں سے جھگڑا پڑا۔ اگرچہ یہ واقعات ہمیں ایک ہی صفحہ پر نظر آئیں مگر ان کے مابین پچاس سال سے زیادہ

کا فاصلہ بھی تو ہے جب کہ لوگ اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔
یا مثلاً ہم تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں یہ پڑھتے ہیں کہ مقام صفین پر مسلمانوں کی دو جماعتوں کے مابین جنگ ہوئی اس کے بعد ہم مروان الآخر کا ابو العباس السفاح کے چچا سے شکست کھانے والا واقعہ دیکھتے ہیں تو یہ احساس باقی نہیں رہتا کہ ان دونوں واقعات کے مابین پچانوے سال گذر گئے۔ اور جن لوگوں نے یہ شکست دیکھی انہیں واقعہ صفین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح جب ہم امین و مامون کی آویزش کا حال پڑھتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ چھیاسٹھ سال تک امن و امان رہنے کے بعد یہ واقعہ ہوا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اتنی بڑی مدت میں کچھ نہ کچھ علمی و تمدنی مشاغل سے دلچسپی لیتے ہی رہے ہوں گے۔
حقیقت یہ ہے کہ اختیار و اقتدار کے لئے زور آزمائی اور خون ریزی جیسے سب جگہ دنیا میں ہوتی رہی ہے۔ اس سے زیادہ مسلمانوں میں نہیں ہوتی ہے بلکہ تقابلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اور قوموں سے کم ہی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے طویل زمانے امن و سکون کے آتے رہے ہیں جن میں دوسرے بہت سے کام ہوئے ہیں۔ ان زمانوں میں صرف یہی نہیں ہوا ہے کہ الحمراء اور الزهراء کے عالیشان قصر بن کر تیار ہوتے۔ دہلی کا لال قلعہ اور لاہور کی مسجد بن گئی یا ابن یونس صقلی نے پنڈولم اور زکریا رازی نے تیزاب بنا لیا۔ زرعی پیداوار کی نمائشیں ہوتی رہیں۔ دریاؤں پر بند باندھے جاتے رہے۔ بلکہ تاریخ کا بغائر نظر مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دنیا کی دوسری اقوام میں اسلامی اصول و قوانین اجتماع کی اتباع کا جذبہ بھی پیدا ہوتا رہا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر اگرچہ یہ ساری اقوام مسلمان تو نہیں ہوگئیں لیکن اسلام ان کے ضوابط زندگی میں بڑی دور تک داخل ہوگیا اس طرح ان کے مجموعۂ قوانین میں سے اسلام سے قبل کی بہت سی ظالمانہ و غیر منصفانہ دفعات محو ہوتی رہیں، اور ان کی جگہ اسلام کے محکم اور منصفانہ اصول نے لے لی۔ ہم اس مضمون میں کسی جگہ ان میں سے بعض کا بطور مثال ذکر کریں گے۔

قاضی عبدالودود

عبدالحق بحیثیت محقق

(گذشتہ سے پیوستہ)

(د) چھوٹے بھائی، محمد رضی کا ذکر برائے نام ہے۔
(ہ) شادی کب ہوئی، یہ مذکور نہیں، بیبی کون تھیں، ذکر سے اس پر روشنی نہیں پڑتی؛ بیٹے فیض علی کا ذکر بھی اس طرح ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔
(و) تبدیل مذہب کا ذکر نہیں کیا، باپ کے مذہب کا حال اس طرح لکھا ہے کہ کچھ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔
(ز) تعلیم کا حال عجب طور پر بیان کیا ہے، قرآن کے بعد ترسل اور پھر مطول پڑھنے کا ذکر ہے۔
(ح) شعر گوئی کے آغاز کا حال نہایت مجمل طور پر لکھا ہے؛ اساتذۂ معاصر سے (باستثنائے آرزو) اپنے تعلقات کو بھی قلم انداز کیا ہے
(ط) نکات الشعرا کی تصنیف اور معاصرین پر اس کا کیا اثر ہوا تھا اس کا مطلقاً ذکر نہیں۔
(ی) فیض میر کی تصنیف کی طرف بھی اشارہ نہیں۔
(ک) دہلی لکھنؤ کے مشاعروں، اور شاعروں سے نوک جھونک کا ذکر نہیں؛ کاماں سے دہلی واپسی کے بعد بقا، نثار، حجام برہ سے جھگڑا ہوا تھا، ذکر اس پر بھی کچھ روشنی نہیں ڈالتی
(ل) معاملات عشق میں جس محبت کا حال منظوم ہوا ہے، اس کے ذکر سے یہ کتاب خالی ہے۔

بہت سے لطیفے اور تاریخی واقعات جو ذکر میں مندرج ہیں، آپ بیتی میں شامل نہ ہونے تھے۔

یہ بات کہ ذکر میر کسی اور کے لئے نہ لکھی تھی، صحیح نہیں۔ قطعۂ تاریخ کا یہ مصرع ملاحظہ طلب ہے: "کہ ایں نسخہ بود لعالم سمر"۔

دیباچے کی عبارت ہے: "امید از یاران زماں آنست کہ . . . . در اصلاح بکوشند" لطائف کی تمہید میں ہے دوستوں کی تفریح طبع کے لئے شامل کتاب ہوئے۔ ذکر کی عبارات کا معتدبہ حصہ پر تکلف ہے؛ اگر اس کی امید ہوتی کہ لوگ اسے پڑھیں گے تو میر اتنی زحمت گوارا نہ کرتے۔ کتاب مقبول نہ ہوئی، تو اس میں میر کا قصور نہیں، ان کا بس چلتا تو ہر گھر میں اس کا ایک نسخہ موجود ہوتا۔

میر کی شخصیت کے متعلق مرتب کی رائے کا قبول کرنا ممکن نہیں، اور یہی حال ذکر کا ہے۔ میر ایسے شخص کہ جس کے بارے میں جو کچھ

وہ کہہ دیں بے چون وچرا تسلیم کر لیا جائے۔ ذکر میر اس قسم کی آپ بیتی نہیں جس میں لکھنے والا جو کچھ اس پر گزری ہے بے کم و کاست بیان کر دیتا ہے اور ایسی آپ بیتی آج تک نہیں لکھی گئی۔ وہ لوگ جو بظاہر بہت صاف گو ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور چھپاتے ہیں اپنا نہیں، تو دوسروں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ ذکر میر میں خاص خاص باتیں خاص خاص رنگ میں بیان ہوئی ہیں۔ البتہ یہ خاص مقاصد کے تحت قلمبند ہوئی ہے۔ آپ بیتی کی حیثیت سے یہ قطعاً ناکامیاب ہے، اور بدترین آپ بیتیوں میں سے ہے۔ جو میری نظر سے گزری ہیں۔ میر نے اپنی شاعرانہ زندگی کا اگر ذکر کیا ہے تو اس طرح کہ گویا یہ مسلمات سے ہے۔ جس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مرتب کا یہ خیال کہ میر کا ضبط، اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے کہ ذکر میں شعر و شاعری کا برائے نام ذکر ہے کلیات میر کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والے قبول نہیں کر سکتے۔ میر اور ضبط نفس کو سوں دور ہیں (عیار بحث ہو یا تسلیم اس کا دوسرا سبب مرتب نے یہ بتایا ہے کہ میر نے "یہ چیزیں نکات الشعراء کے لئے اٹھا رکھی تھیں" اس سلسلے میں امور ذیل توجہ طلب ہیں: (الف) نکات کا خاتمہ ۱۱۶۵ھ میں ہوا، ذکر کا آغاز اس کے بعد ہوا، اٹھا رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (ب) نکات میں بہت سی باتیں مجمل ہیں، ذکر میں ان کی تفصیل ہو سکتی تھی (ج) نکات میں ۱۱۶۵ھ تک کی بھی بہت سی باتیں درج نہیں، ذکر میں ان کا ذکر ہو سکتا تھا (د) اتمام نکات کے بعد جو واقعات ظہور میں آئے وہ بیان کئے جا سکتے تھے۔

۳) مرتب کا قول ہے: "مورخ ہزار بے لاگ ہو اور تحقیق و تلاش میں سر مارے، آپ بیتی لکھنے والے کو نہیں پہنچ سکتا، بعض اوقات اس کے ایک بیساختہ جملے سے وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں، جو مدتوں تاریخوں کی ورق گردانی کے بعد بھی میسر نہیں ہوتا" "میر نے ان تمام واقعات اور حالات ("خانہ جنگیوں"، "خود غرضیوں"، "تباہیوں" اور بربادی) کو بڑی صحت اور خوبی سے لکھا ہے اور اس زمانے کی تاریخ کے لئے یہ کتاب بھی ایک حیثیت رکھتی ہے۔۔ ہم اس جگہ تاریخی حالات و واقعات پر کچھ لکھنا نہیں چاہتے جن لوگوں کو مغلیہ سلطنت کے آخری ایام کی تاریخ کا شوق ہے ان کے لئے یہ حصہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا"

ذکر میر تاریخی حیثیت سے چنداں اہم نہیں، بعض دوسرے اور تیسرے درجے کے اشخاص کے متعلق کچھ جزئی باتیں جو دوسری جگہ نہیں ملتیں، البتہ ذکر میں ہیں، میر کی رایوں میں تناقض ہے۔ یہ بعض اہم مواقع پر موجود تھے لیکن ان کے بارے میں ان کا بیان ہمارے معلومات میں اضافہ نہیں کرتا۔ میر سنین مطلقاً نہیں دیتے، اور واقعات کی تاریخی ترتیب لازماً ملحوظ نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں نامناسب اجمال و ابہام ہے جس کی بدولت غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان سب پر طرہ یہ کہ ان کے یہاں غلط بیانیاں بھی ہیں۔ مرتب کا فرض تھا کہ اگر ان کے خیال میں کوئی تاریخی حیثیت ذکر سے ملتی ہے تو اس کا ذکر کرتے جتنی اہم واقعات کے سنین درج کرتے، مجمل و مبہم بیانات کی توضیح اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتے۔ انہوں نے ان امور کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کی اور عہد میر کی تاریخ سے بے خبری کے باعث خود ان سے مقدمے یا عنوانات متن میں فاحش غلطیاں سرزد ہوئی

(۱) نصر نیار خاں سے متعلق میر کی غلط بیانی کا ذکر ہو چکا ہے۔

(۲) یہ بتایا جا چکا ہے کہ ناگرمل کے نائب وزیر ہونے اور عمدۃ الملک و مہاراجہ کے خطاب پانے کا ذکر وفات صمصام

کے تذکرے کے بعد ہے، حالانکہ قبل ہونا تھا۔ چند سانحات کے اجمالی ذکر کی طرف بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

(۳) عالی گوہر کو ص۳۵ و ص۵۸ میں عالی گہر لکھا ہے۔

(۴) عالمگیر ثانی کی مدت سلطنت ۷ سال بتائی ہے ص۸۳۔ اس کی تاریخ جلوس ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ ہے اور یہ بتاریخ ۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ مقتول ہوا ہے۔ مدت سلطنت ۵ برس چند مہینے ہے۔

(۵) "ساوات خاں، ذوالفقار جنگ بہ بخشیگری سرفراز گردید۔ بخشی حال راجہ بخت سنگھ را کہ ... برادر کلاں ابھے سنگھ ریاست جودھپور داشت، نیابت صوبۂ اجمیر داده بمدد وے او رفتا تید۔ راجۂ مذکور خان را سردار فوج نموده با خود برد۔ در ظاہر سامر کہ قصبہ ایست معروف ۔ ۔ ہر دو لشکر طرف شدند و جنگ توپخانہ میاں آمد مردمان طرف ثانی پاس نمک نکردہ چوں غیرت بجر لیاں یک روز ہم تن ندادند تا بجاداون چہ رسد تا چار نیسں آں طرف طہار را ۔ ۔ ۔ درمیاں داده سر لسبر کرد و رفت" ص۹۹

راجہ بخت سنگھ کا تقرر بعہدۂ صوبہ داری گجرات اور ساوات خاں کا تقرر بعہدۂ میر بخشیگری بتاریخ ۲۹ رجون ۱۷۴۸ء (۵ رجب ۱۱۶۱ھ) سرگزشت دہلی ص۱۸۔ راجۂ مذکور کو فوجداری سانبھر وغیرہ ۲۰ جولائی کو ملی (سرگزشت ص۱۹) عنایت اللہ خاں (رعایت خاں) پسر عظیم اللہ خاں راجہ کے ساتھ جانے کے لئے بتاریخ ۱۸ اکتوبر (ذیقعدہ ۱۱۶۱ھ) مقرر ہوئے (سرگزشت ص۲۲) مہاراجہ ابھے سنگھ، زمیندار جودھپور کی وفات ۱۷۴۹ء کی ۲۱ جون کو ہوئی (سرگزشت ص۲۹) سرکار کا بیان ہے: ساوات خاں اکبرآباد و اجمیر کا صوبہ دار تھا۔ اسے اس کا مجاز کیا گیا کہ بخت سنگھ کو اس کے بھتیجے رام سنگھ کے خلاف اس شرط پر مدد دے کہ وہ ان دونوں صوبوں میں شاہی اقتدار قائم کرنے میں مدد دے۔ اس امر کے طے ہونے کے بعد بخت سنگھ اپنے علاقے کو چلا گیا اور ساوات خاں اس کے کچھ بعد عازم اجمیر ہوا۔ رمضان کے پہلے دس دن (۳۰ نومبر ۹ دسمبر ۴۹ء) ہنودی میں گزارے، ۳۰ دسمبر کو جاٹوں کا ایک چھوٹا سا قلعہ فتح کر کے مشیروں کی رائے کے برخلاف، جاٹوں کے استیصال مائل ہوا مگر پہلی ہی لڑائی کے بعد صلح پر مجبور ہوا۔ شرائط صلح میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ساوات خاں نارنول سے آگے بڑھے، لیکن، وہ نارنول پہنچا اور بخت سنگھ سے ملا تو اس پر قائم نہ رہا اور اسی کے ساتھ عازم اجمیر ہوا ۱۴ اپریل ۱۷۵۰ء کو رام سنگھ اور ایشوری کر ایشر سنگھ اس کے مددگار کی فوج اس کے قریب آ گئی ساوات خاں کو بخت سنگھ پر بھروسہ تھا اسے ایشوری سنگھ کو صلح کیلئے خط لکھا گفت و شنید میں دیر ہی تو اس نے اپنے طور پر بخت سنگھ کی رائے کے خلاف حملہ کر دیا اور ایک ہی دن کی لڑائی کے بعد بخت سنگھ کے فاد کو یکتلم نظر انداز کرتے ہوئے صلح کر لی۔ صلح ۱۴ اپریل کو ہوئی تھی اور اس کے بعد ساوات خاں ۵ مہینے شہر اجمیر سے باہر اس غرض سے پڑا رہا کہ شرائط صلح کے مطابق روپے وصول کرے۔ اواخر اکتوبر میں وہ عازم دہلی ہوا (جلد ۲ ص۳۰۰) صاحب سیر المتاخرین جن کے ماموں اور ماموں کے بیٹے اس مہم میں ساوات خاں کے ساتھ تھے، یہ کہتے ہیں کہ بخت سنگھ ۱۱۶۲ھ میں دہلی آیا اور اس غرض سے کہ جودھپور پر قابض ہو، اس نے ساوات خاں کو اجمیر چلنے کی ترغیب دی۔ وہ تو آ گیا مگر یہ اواخر ۱۱۶۲ھ سے قبل دہلی سے روانہ نہ ہو سکا۔ راستے میں جاٹوں سے لڑائی اور "بکمال اہانت" صلح ہوئی اجمیر تک پہنچنے کے بعد، رام سنگھ اور ایسری (کذا) سنگھ سے معمولی سی لڑائی ہوئی اور اس کے بعد علی الرغم بخت سنگھ

صلح ہوگئی۔ رام سنگھ کے مددگار کی حیثیت سے ملہار سپر ہوکر بھی تھا۔ سادات خاں شکست صفدر جنگ کی خبر سن کر عازم دہلی ہوا، اور ایک سال چند ماہ دہلی سے باہر گزارنے کے بعد اوائل ۱۱۶۴ھ میں وارد دہلی ہوا (ص۸۸۳ +)۔

(الف) میر نے رعایت خاں کے راجپوتانہ جانے کا ذکر (بمعیت بخت سنگھ) کیا ہے، لیکن، یہ بالکل نہیں کہا کہ سادات خاں بھی گیا تھا۔ (ب) "طرف ثانی" سے ان کی مراد رام سنگھ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا (ج) "مردماں... چہ رسد" بالکل خلاف واقعہ ہے (د) صلح کی گفتگو کا آغاز سادات خاں کی طرف سے ہوا، اور سرکار و صاحب سیر المتاخرین کے یہاں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ صلح کا ملہار سے کچھ تعلق تھا، بلکہ سرکار نے تو اس کے اس زمانے میں رام سنگھ کی مدد کے لئے آنے کا بھی ذکر نہیں کیا۔ (ہ) بخت سنگھ کا ابھے سنگھ کی موت سے قبل دہلی آنا سرگذشت دہلی سے ثابت ہے۔ اور عنایت اللہ خاں (رعایت خاں) کا تقرر بھی اسی وقت ہوا تھا، مگر صاحب سیر المتاخرین کے قول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ وفات ابھے سنگھ کے بعد دہلی میں موجود تھا۔ اس کا امکان ہے کہ دوبارہ آیا ہو۔ (و) میر رعایت خاں کے ساتھ دہلی واپسی صلح رام سنگھ و سادات خاں کے کتنے دن بعد ہوئی، یہ قطعی طور پر معلوم نہیں، مگر یہ خود ذکر میر سے ثابت ہے کہ میر صفدر جنگ و احمد خاں بنگش کی لڑائی میں موجود تھے؛ یہ جنگ ۱۷۵۰ء کی ۱۳ر ستمبر کو ہوئی۔

(۶) صلح کے ذکر کے بعد جو عبارات ہیں، ان کا عنوان "سادات خاں... اور بخت سنگھ کی نزاع" ہے ص۱۰۱ اور اس کے بعد کا عنوان "میر... کی ناز کمزاجی" ہے عنوان مقدم الذکر کے تحت مرقوم ہے: "اینجا درامرے زبانبازی بمیان آمد.. بخت سنگھ ابرو ترش کرد. صحبت خاں واو فنزونی شد. بستار قلی خاں کشمیری.. بروعدہ سخن خواند، کار نزاع کرا خاں.. مرا فرستاد وعدر دہ مہربانی خواست.. ازجانب او بصحف خوردم کہ آئندہ چنیں نخواہد شد، اما.. صرفہ نداد، زر تنخواہ مردمان رسالہ ہمگی فرستاد و خیر باد کرد.. خاں از آنجا.. لشہر آمد و چندے درخانہ نشست" عنوان موخر الذکر کے تحت میر خاں کی فرمائش کی بادل ناخواستہ تعمیل کرنے اور اس کی نوکری چھوڑنے کا ذکر کرتے ہیں۔ مقالے میں ڈاکٹر عبدالحق نے رعایت خاں سمجھے تھے، لیکن، مقدمۂ ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک "خاں" سے سادات خاں مراد ہے۔ میر کی واقعہ نگاری تو عجیب ہے ہی، ڈاکٹر عبدالحق کی عبارت فہمی عجیب تر ہے۔ میر نے سادات خاں کے ملازم ہونے کا ذکر ہی نہیں کیا، اس کی نوکری چھوڑنے کا کیا سوال ہے۔ ذکر میر کا جہاں تک تعلق ہے، سادات خاں راجپوتانہ گیا ہی نہیں تھا اس صورت میں اس کی اور بخت سنگھ کی نزاع خارج از بحث ہے۔ مرتب نے اس پر غور نہیں کیا کہ بقول میر بخت سنگھ سادات خاں کا نائب ہے، وہ اسے نکال نہیں سکتا۔ وہ میر بخشی ہے، رسالدار نہیں کہ اس کے رسالے کی تنخواہ اس کے حوالے کی جائے۔ رعایت خاں اور بخت سنگھ میں نزاع ہوئی، میر مقدم الذکر کے ساتھ ہی دہلی واپس آئے۔ اور اس کی نوکری ترک کی۔

(۷) ص۸۳ میں ایک مرہٹہ سردار کا نام صاحبا اور ص۸۱ میں دوسرے کا نام جنگو، سرکار نے Sabaji اور جنکو لکھا۔

(۸) ص۱۰۱ میں سورجمل کو مغرور لکھا ہے لیکن ص۹۵ میں اس کے خلاف ہے

(باقی آئندہ)

حسن نور ایم اے۔ ایل ایل بی

پاکستان کے اردو رسائل

لمی اخبارات اور وقائع نویسی

رسائل کی تاریخ چھاپے خانے کی تاریخ سے ملی ہوئی ہے۔ موجودہ چھاپے خانے اس برعظیم میں اہل یورپ لائے۔ قبل ازیں مخطوطات، کتابیں وغیرہ
ام قلمی ہوا کرتی تھیں نشر و اشاعت کے جو ذرائع آج بیسویں صدی میں میسر ہیں۔ دورِ مغلیہ میں نامعلوم تھے۔ مثلاً تار، ٹیلیفون
ی پرنٹر، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم وغیرہ وغیرہ۔ مغلیہ دور میں وقائع نویس ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ حکومت کی جانب سے مقرر
تے تھے اور اپنے مقام اور اسکے قرب و جوار کے حالات و واقعات سے شہنشاہ کو باخبر رکھتے تھے۔ صوبجات کے گورنر
ر دیگر عمائدین سلطنت کے بھی اپنے وقائع نگار ہوتے تھے۔ ان لوگوں کی بھیجی ہوئی خبریں عام مضمون میں مشتہر ہو
اتی تھیں بجز اس کے کہ ان کا تعلق ایسے راز سے ہو جو امور مملکت سے متعلق ہو۔ چونکہ وقائع نگاروں کا تعلق راست بادشاہ
ے ہوتا تھا اسلئے وہ مقامی عہدیداروں کے اثرات سے بے نیاز رہتے تھے۔ حالات کا صحیح علم رکھتے تھے اور ان کو پیش
رنے میں انتہائی صداقت سے کام لیتے تھے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد یہ طریقہ بھی ختم ہو گیا۔ [1]

ظاہر ہے کہ وقائع نویسی، حکومتی ادارہ ہوتا تھا مزید برآں اس زمانے میں لوگ ایسے خبر پسند نہیں ہوا کرتے تھے
، اسوقت رسل و رسائل کی موجودہ سہولتیں مثل ریل، موٹر، ہوائی جہاز، ڈاک اور تار مہیا تھے لہٰذا ایسے بڑے پیمانے
ہلان خبروں کی نشر و اشاعت نہ ہو سکتی تھی۔ مشہور مورخ خافی خاں کے قول کے مطابق قلمی اخبارات شہنشاہ
ورنگ زیب کے فوجیوں کو مہیا کئے جاتے تھے۔

ریخی پس منظر

ن طباعت فرنگی لائے۔ پرتگالی واسکوڈے گاما ۱۴۹۸ء میں برعظیم راس امید کے راستے
پہنچا۔ ان کی تقلید میں ولندیزی، ہسپانوی، فرانسیسی اور انگریز آئے۔ یہ سب پرامن تاجر کے
بیس میں ہندوستان پہنچے تھے برعظیم کا ریشم، لوہا، مصالحے، ہوتی ان کے لئے باعث کشش تھے بہت جلد ان تاجروں
، تجارت کو سیاست میں بدل دیا اور اپنی سازشوں ریشہ دوانیوں سے شہری حکومتیں قائم کر لیں۔ انگریز ان تمام فرنگی
ام میں بہت جلد نمایاں ہو گئے برعظیم کی دولت کے خواب انگریز بہت دنوں سے دیکھ رہے تھے ۱۵۹۹ء میں کچھ انگریز

[1] بدر شکیب اردو صحافت ص ۱۳۸

تاجر متحد ہوئے اور انہوں نے بھی برعظیم سے تجارت کرنیکا تہیہ کیا اس غرض کے لئے ایک جماعت نیام ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔
ملکہ ایلزبتھ نے ۱۶۰۱ء میں برعظیم سے پندرہ سال تجارت کرنیکا اسکو حق عطا کیا۔ کپتان ہاکنس نے ۱۶۰۸ء میں سورت
میں شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں کوٹھی قائم کی ۱۶۹۰ء میں کلکتہ میں ایک کوٹھی کھولی گئی اور ۱۶۹۶ء میں وہاں فورٹ ولیم کا قلع
بنایا گیا۔ ۱۷۰۰ء میں کمپنی نے ستنانی کالی کاتا اور گووندپور نامی گاؤں خرید لئے اور وہاں ایک نیا گاؤں آباد کیا جو آج کلکتہ
کے نام سے مشہور ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کو دیکھکر دولت کے لالچ میں کئی کمپنیاں میدان میں آگئیں ۱۶۹۱ء
میں ایک بڑی کمپنی بنی جس نے اس کمپنی کو بگاڑنے کی ہر ممکن کوشش کی ۱۷۰۲ء میں آپس میں مصالحت ہوگئی اور
۱۷۰۸ء میں دونوں کمپنیاں متحد ہوکر یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی قرار پائی۔ یہی کمپنی ۱۸۵۸ء تک برعظیم میں لوٹ، قتل
وغارت گری، سازش، تجارت کے پردے میں مچاتی رہی ہے۔ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے تمام سلطنت اپنے ہاتھ میں
رابرٹ کلائیو نے سراج الدولہ نواب بنگال کے وزیر میر جعفر کو بنگال کی نوابی کا لالچ دیکر اپنی طرف ملا لیا ان
سازشوں میں جگت سیٹھ، رائے درلبھ اور دیگر افراد شریک تھے۔ ۲۳ر جون ۱۷۵۷ء میں بمقام پلاسی اسی نے نواب
پر حملہ کردیا۔ نواب شکست کھا گیا اور میر جعفر کے لڑکے میرن کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس جنگ سے بنگال کا صوبہ کمپنی
حقوق میں آگیا۔ ۱۷۷۳ء میں برٹش پارلیمنٹ نے ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا جس کی رو سے بنگال میں گورنر جنرل سپریم
کورٹ یا عدالت العالیہ کے جج کے عہدے قائم کئے گئے اس طرح بنگال میں انگریزوں کی حکومت بالکلیہ قائم ہوگئی۔

فارسی اخبارات

سب سے پہلا اخبار ہندو پاکستان میں انگریزی کا بنگال گزٹ تھا جو جنوری ۱۷۸۰ء میں کلکتہ
سے جاری ہوا۔ واضح ہو کہ (Halhed) نے فارسی حروف ۱۷۷۸ء میں ڈھال لئے تھ
علامہ عبداللہ یوسف علی سب سے پہلا دیسی زبان کا اخبار بنگال سماچار تھا جو گنگا دھر بھٹاچاریہ نے ۱۸۱۶ء تا ۱۸۱۸ء
میں کلکتہ سے نکالا۔ حکومت کی سرپرستی میں ۱۷۸۰ء میں کلکتہ گزٹ نکلا۔ اسی کی ۴ر مارچ ۱۷۸۲ء کے شمارے کے
ساتھ ایک کالم پرشین میں چھاپا گیا اور ۱۸۲۲ء میں ایک فارسی ہفتہ وار اخبار جام جہاں نما کے نام سے کلکتہ سے
اس کے بعد مختلف فارسی اخبارات مثلاً مرآۃ الاخبار ۱۸۲۲ء، شمس الاخبار ۱۸۲۳ء، آئینہ سکندر ۱۸۳۱ء، ماہ
عالم فروز ۱۸۳۳ء، سلطان الاخبار ۱۸۳۵ء، لدھیانہ اخبار ۱۸۳۶ء، مہر منیر ۱۸۲۵ء، سراج الاخبار ۱۸۴۱ء
دہلی اور گورنمنٹ گزٹ ۱۸۴۹ء نکلتے رہے۔ ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۷ء تک مختلف شہروں میں مثل دہلی، لکھنؤ
آگرہ، مدراس، بنگلور، حیدرآباد چھاپے خانے قائم ہوگئے۔

اردو اخبارات

ایک جرمن سینی فلوڈ نے لیتھو پریس بمقام گاٹن برگ ایجاد کیا اس برعظیم میں پہ
لیتھو پریس کانپور میں آرچر نے ۱۸۳۰ء میں قائم کیا۔ نواب اودھ نصیر الدین حید
نے آرچر کو لکھنؤ میں ایک مطبع قائم کرنیکا حکم دیا جو بعد میں ۱۸۳۶ء میں مطبع سلطانی کہلایا۔ اردو کا سب سے پ
اخبار ۱۸۳۶ء میں دہلی سے محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر حسین نے اردو اخبار جاری کیا۔ قبل ازیں جام
نما کی ۲۹ر دسمبر ۱۸۲۹ء کی اشاعت سے اردو کا ایک ضمیمہ شائع ہوتا رہا۔ اسکے بعد سید الاخبار دہلی ۱۸۳۷ء

ح الاخبار مدراس ہفتہ وار ۱۸۴۳ء نور مشرقی دہلی ہفتہ وار ۱۸۴۴ء، فوائد الناظرین دہلی ۱۸۴۶ء آعظم الاخبار مدراس
۱۸ ء، اخبار مالوہ اندور ۱۸۴۹ء، کوہ نور لاہور ہفتہ وار ۱۸۵۰ء اخبار الحقائق و تعلیم الخلائق آگرہ ۱۸۵۱ء وغیرہ
رہ نکلتے رہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک مختلف اخبارات نکلتے رہے جسمیں اودھ اخبار لکھنؤ ہفتہ وار ۱۸۵۹ء
ۃ الاخبار مدراس ۱۸۶۰ء، کشف الاخبار بمبئی ۱۸۶۱ء، اکمل الاخبار دہلی ۱۸۶۶ء اخبار سائنٹفک سوسائٹی
لڈھ (ہفتہ وار، پندرہ روزہ) ۱۸۶۸ء، تہذیب الاخلاق ہفتہ وار ۱۸۷۰ء علیگڈھ، ریاض الاخبار خیرآباد
۱۸ ء، اخبار عام لاہور ۱۸۷۱ء، اودھ پنچ لکھنؤ ۱۸۷۷ء [3] رفیق ہند لاہور ۱۸۸۲ء، محشر لکھنؤ ہفتہ وار
۱۸ ء پیسہ اخبار لاہور ۱۸۷۷ء، خورشید دکن حیدرآباد دکن ۱۸۷۷ء، ہزار داستان روزنامہ حیدرآباد ۱۸۸ ء
ر الاخبار، شیر دکن، سفیر دکن وغیرہ وغیرہ

سب سے پہلا ادبی رسالہ خیر خواہ ہند تھا جو ماسٹر رام چندر کی ادارت میں دہلی سے نکلا یہ ڈاکٹر اسپرنگر کے
سورے اور ہمت افزائی سے نکلا تھا۔

بیسویں صدی کے اخبار اور رسائل میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں [4]
ابوالکلام آزاد کا الہلال اور البلاغ کلکتہ، محمد علی جوہر کا ہمدرد، ظفر علی خاں کا اخبار زمیندار [5]، عبدالماجد دریاآبادی
ح اور صدق، سر عبدالقادر کا مخزن لاہور سید سلیمان ندوی کا معارف، پنڈت نگم کا زمانہ، تہذیب نسواں، ادیب
رہ، افادہ، سہیل، نگار، ساقی، ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، نیرنگ خیال، اردو، جامعہ، سب رس، ہندوستانی
ست، معاشیات، سائنس، ترجمان القرآن، نیا ادب، ہندوستانی ادب، نیا دور، سویرا، طلوع اسلام، سیاست
ریں صدی، آجکل، شمع وغیرہ وغیرہ

بیسویں صدی کے اخباروں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں، اتحاد پٹنہ، ندیم گیا، بمبئی کے آفتاب، اجمل، ہلال
ہندوستان، اقبال، خلافت۔ دہلی سے الجمعیت، الامان اور وحدت، حیدرآباد دکن سے رہبر دکن، مشیر دکن
اد، رعیت، میزان، خیابان، پیام، لاہور سے زمیندار، انقلاب، احسان، بندے ماترم، ہند، ملاپ، پرتاپ، نیچ،
نؤ سے ہمدم، ہمت، حقیقت، حق، قومی آواز، تنویر۔ مدینہ بجنور، جدت مرادآباد، روہیلکھنڈ اخبار بریلی، الفاروق

---

[1] اخبار نور الانوار آرہ ۱۸۵۲ء اور اخبار الاخیار مظفرپور ۱۸۶۹ء اور گیا سے ویکلی رپورٹ ۱۸۵۵ء
[2] عظیم آباد سے، پندرہ روزہ چشمۂ علم ۱۸۶۹ء
[3] پٹنہ المنشی نیوٹ گزٹ ۱۸۴۳ء اور الپنچ پٹنہ ۱۸۸۵ء
[4] مولانا شبلی و حبیب الرحمن خاں شروانی کے زیر اہتمام الندوہ لکھنؤ اور مولانا عبداللہ عمادی کا رسالہ
ولانا عبدالحلیم شرر کا رسالہ دلگداز، مولانا ظفر الملک کا رسالہ الناظر لکھنؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے
[5] اخبار الوکیل اور اخبار وطن لاہور (ادارہ)

مہر نیمروز کراچی

آواز آزاد، بنگلور سے روزنامہ پاسبان
گامنی، کلکتہ سے عصر جدید اور ہند۔ بھوپال سے ندیم، افکار، کانپور سے زمانہ،
روزنامہ آزاد و الکلام، سرینگر سے چاند، دلیش اور خدمت [5]
کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ پاکستانی رسائل (۱) وہ رسائل جو منقسم پاکستان بننے سے قبل بھی ہندوستان سے نکلتے تھے اور
۱۹۴۷ء کے بعد ان کے ناشرین پاکستان ہجرت کر آئے اور یہیں سے انہیں نکالنا شروع کیا ان رسائل میں صحت
دہلی، ساقی دہلی، نیا دور بنگلور، افکار بھوپال، ہمدرد صحت دہلی، نظام المشائخ دہلی وغیرہ یہ سب ۱۹۴۷ء کے بعد سے
کراچی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ترجمان القرآن پٹھانکوٹ کی بجائے لاہور سے نکلتا ہے۔

(۲) وہ رسائل جو پہلے مغربی پاکستان کے علاقوں سے نکلتے تھے اور پاکستان بننے کے بعد بھی وہیں سے شائع ہو رہے
ہیں مثلاً ادب لطیف، عالمگیر، نیرنگ خیال، سویرا، اور نیل کالج میگزین، ہمایوں، تہذیب نسواں تعلیم و تربیت
رہنمائے تعلیم وغیرہ۔

(۳) تیسرے گروپ میں وہ ہیں جو ۱۹۴۷ء کے بعد نکلنے لگے۔ ان میں قابل ذکر ماہ نو، انشاء، نقش، پاکستانی
الشجاع، فانوس، مہر نیمروز، نقاد، نمکدان، تذکرہ نیا راہی، سومان۔ لاہور سے چٹان، قندیل، اقدام، لیل و نہار
نقوش، صحیفہ، شمع، داستان گو، نصرت، ہم لوگ، افسانہ وغیرہ اور ثقافت لاہور

پاکستان کے متعلق چند حقائق کا دہرا لینا مناسب ہوگا۔ پاکستان کی مجموعی آبادی (۱۹۵۱ء میں) . . . . .
۷۵۶۳۵۴۹۶ ہے جس میں سے مغربی پاکستان کی آبادی ۳۳۷۳۱۶۷ ہے۔ اور مشرقی پاکستان میں
۴۱۹۳۳۳۲۵ نفوس آباد ہیں۔ پاکستان کی قومی اور عام زبان مغربی پاکستان میں اردو ہے۔ باوجود اسکے
مختلف علاقوں میں علاقوی زبانیں مثل پنجابی، سندھی، پشتو بولی اور لکھی جاتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں تین چار سے
زائد رسائل و اخبار نہیں ہیں۔ برخلاف اسکے مغربی پاکستان میں اردو رسائل ہی چھائے ہوئے ہیں۔ لاہور سے
۲۲۳ اور کراچی سے ۱۴۳ رسائل شائع ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل گوشوارہ سے یہ بات الم نشرح ہو جائے گی۔

ہفتہ وار	پندرہ روزہ	ماہوار	سہ ماہی	دیگر
۲۲۳	۳۹	۲۱۵	۱۲	۳ - ۱۸

---

[5] مولانا حسرت موہانی کا اردوئے معلیٰ، شاہ دیگر اکبرآبادی کا نقاد آگرہ، سید الطاف علی بریلوی کا رسالہ مصنف علیگڑھ
دہلی سے خواجہ حسن نظامی کے جملہ رسائل و اخبارات (جن میں استانی سے لیکر عادل اور منادی تک ایک لمبی فہرست
عزیز حسن بقائی کا پیشوا، اور مشہور رسالہ مولوی دہلی، ان کے علاوہ الفرقان، برہان، اور سردار دیوان سنگھ مفتون
کا مشہور اخبار ریاست، اور مفتی شوکت علی فہمی کا اخبار دین دنیا وغیرہ۔ بھولنے کی چیزیں نہیں ہیں (ادارہ)

مہر نیمروز کراچی

مارچ سنہ ۱۹۶۳ء

صوبہ جاتی کیفیت	ہفتہ وار	پندرہ روزہ	ماہوار	سہ ماہی	دیگر	ٹوٹل
کراچی	٣٢	٩	٣٦	۴		٨١
مغربی پاکستان	١٩٩	٣٠	٢٣٥	٨	٣	۴٧٥
مشرقی پاکستان	٢	—	١	—	—	٣

ضلع وار کیفیت

ضلع	ہفتہ وار	پندرہ روزہ	ماہوار	سہ ماہی	دیگر	ٹوٹل
لاہور	٦١	١٧	١۴٣	٢	—	٢٢٣
راولپنڈی	١٧	-	٢٠	٣	-	۴٠
لائل پور	١۴	٢	١٢	—	-	٢٨
سیالکوٹ	٩	١	١١	١	١	٢٣
گوجرانوالہ	٨	—	١١	—	-	١٩
ملتان	١٠	-	٦	١	-	١٧
بہاولپور	١٠	٣	٣	-	-	١٦
شاہپور	١٠	٢	۴	-	-	١٦
کوئٹہ	٧	۴	٣	-	-	١۴
سکھر	٧	-	۴	-	-	١١
پشاور	٨	—	١	١	-	١٠
گجرات	٣	١	۴	١	-	٩
ہزارہ	٦	١	١	-	-	٨
جھنگ	١	٦	-	-	-	٧
حیدرآباد	٦	-	-	-	-	٦
جہلم	٣	٢	١	-	-	٦
شیخوپورہ	-	۴	-	-	-	۴
مردان	٣	-	-	-	-	٣
منٹگمری	١	١	-	-	-	٢
مظفرگڑھ	٢	-	-	-	-	٢
بنوں	٢	-	-	-	-	٢

	ہفتہ وار	پندرہ روزہ	ماہوار	سہ ماہی	دیگر	ٹوٹل
ڈیرہ غازی خاں	۱	-	۱	-	-	۲
ڈھاکہ	۱	۱	۱	-	-	۳
خیرپور میرس	۱	۱	-	-	-	۲
میانوالی	۱	-	-	-	-	۱
سبی	۱	-	-	-	-	۱
رنگ پور	۱	-	-	-	-	۱

مندرجہ بالا اعداد و شمار میں تعلیمی اداروں مثلاً اسکول اور کالج کے رسائل شامل نہیں ہیں یہ عموماً سالانہ ششماہی اور سہ ماہی ہوتے ہیں اور چونکہ ان کے لئے ڈکلریشن اور رجسٹریشن کی قید نہیں ہے۔ انہیں مجموعہ ہائے مضامین سمجھنا چاہئے۔ فی زمانہ اسکول اور کالج سے کوئی رسالہ نکالنا فیشن بن گیا ہے۔ (باقی آئندہ)

رفعت نواز،

شبنم

(عزیز احمد کا ایک ناول)

عزیز احمد اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے جانے پہچانے جاتے ہیں، انہوں نے ہر صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور ناقدانِ ادب سے دادِ سخن حاصل کی ہے، یہ فیصلہ کرنا کہ آیا وہ اچھے ناول نگار ہیں افسانہ نگار ہیں یا نقاد از حد مشکل ہے چونکہ انہوں نے ہر صنفِ ادب میں قابل قدر سرمایا مہیا کیا ہے، چنانچہ تنقیدی ادب میں ان کی مشہور تصنیف "ترقی پسند ادب" آج بھی اپنے ڈھب کی منفرد اور مستقل تصنیف ہے اسی طرح ان کے افسانوی مجموعے، "رقصِ ناتمام" اور "بیکار دن، بیکار راتیں" اردو کے افسانوں میں گرانقدر اضافہ ہیں، اور ان افسانوں کی اہمیت کا ہر باشعور فرد قائل ہے پھر بھی عزیز احمد کو بحیثیت ناول نگار بہت اہمیت دی جاتی ہے اور انہیں اپنے ہم عصر ناول نگاروں میں ایک امتیاز حاصل ہے

عزیز احمد کے چار ناول تو اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ گریز، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی، اور شبنم،

"شبنم" عزیز احمد کا ایک نئی طرز کا ناول ہے اسمیں ایک اچھوتا ذرا مبہم سا تجسس آمیز خیال پیش کیا گیا ہے، کیا محبت بار بار کی جا سکتی ہے اور اسی شدت سے کیجا سکتی ہے اور کیا محبت کا انجام محض شادی ہو سکتا ہے۔ اس نازک سے اہم مسائلی خیال کو پورے ناول میں واقعاتی تسلسل، خطوط نویسی، بحث مباحث، ذہنی و جنسی کشمکشوں سے واضح کیا گیا ہے — اس ناول میں جو ٹکنک استعمال کی گئی ہے وہ انتہائی مشکل ہے، میں سمجھتا ہوں عزیز احمد کو اس ناول کی تصنیف میں ان ہی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہوگا جن سے سامرسٹ ماہم THE MOON AND THE SIX PENCE لکھتے وقت دوچار ہوئے تھے۔

ناول پڑھتے ہوئے بار بار قاری کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ عزیز احمد نے ناول کو فنی طور پر سنوارنے میں بڑی شائستگی سے حصہ لیا ہے، انہوں نے اپنے موضوع (مختصر موضوع) کو آگے بڑھانے اور پھیلانے میں مختلف چیزوں کا سہارا لیا ہے کہیں ادبی مباحث کا، کہیں شاعری کا، کہیں خطوط کا اور کہیں کردار کے افعال و افکار کا،

"شبنم" میں ہنگامہ (ACTION) نہیں بلکہ ایک قسم کا ٹھہراؤ (SILENCE) ہے۔ ایک نشاط انگیز، سرور انگیز ٹھہراؤ، یہ بات دراصل موضوع کی وجہ سے پیش آئی ہے۔ اس قسم کے موضوع کو فنی طور پر برتنے کے لئے اس قسم کی ٹکنک کا استعمال کرنی لازمی تھی، اور یہی وجہ ہے کہ فنی طور پر اس میں کوئی خامی نہیں۔

ایک کامیاب ناول کے لئے دوسری فنی خوبیوں کے ساتھ ایک اہم فنی خوبی ناول کا مزاج بھی ہے۔ اور شبنم میں ناول کا مزاج TEMPO بھی موجود ہے گو کہ ناول کی رفتار بڑی دھیمی اور نپی تلی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی دلچسپی بدرجہ اتم موجود ہے اس ناول کی کردار نگاری میں عزیز احمد نے ہمیشہ کی طرح اپنی مشکل پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ اس ناول کا بنیادی کردار شبنم خود اسکی بہترین مثال ہے شبنم کا کردار اتنا پیچیدہ اور اتنا تجسس آمیز ہے کہ قاری لمحہ بہ لمحہ اس کردار سے خاص قسم کی دلچسپی لیتے ہوئے اس سے ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنیکی کوشش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ اس کردار میں ایک سکوت اور گہرا قنوطی رنگ بھی ہے، بدنامیوں کے ہالے میں گھرے ہوئے اس کردار میں ساتھ ہی ایک چونکانے والی بات بھی ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کردار سے جو حرکتیں سرزد ہوتی ہیں انہیں خود کو فنا کرنیکا احساس بھی ملتا ہے غالب کا مصرع "پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم" اس کردار کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے، چنانچہ عزیز احمد نے بھی اکثر مشکل مقامات پر اس مصرعہ کا سہارا لیا ہے۔

شبنم کو ہم ایک کرداری ناول بھی کہہ سکتے ہیں پورا ناول شبنم کے گرد گھومتا ہے۔ اور اس کردار کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے ناول تخلیق کیا گیا ہے، اس کردار میں جو تضاد ہے وہ زندگی میں عمل اور پیار کا پتہ دیتا ہے اس کردار میں باوجود فنا ہونیکے جذبہ کے زندہ رہنے کی لگن ملتی ہے،

"شبنم" ایک شوہر چاہتی ہے ایک گھر چاہتی ہے، لیکن یہ سب کچھ بہت ہی مبہم طریقہ سے بغیر "جسمانی وصال" کے کرنا چاہتی ہے چونکہ شبنم نے ہمیشہ محبت کی معراج "جسمانی وصال" کے کچھ نہیں سمجھتی ہے، اس کے پیش نظر ماضی کے چند واقعات ہیں جسمیں محبت کا نتیجہ جسمانی ملاپ، خودکشی، اسقاط اور قنوطیت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، اس لئے وہ محبت کے انجام سے ایک حد تک گھبرانے لگی ہے بدنامیوں نے اسمیں ایک طرح کا خوف بھی پیدا کر دیا ہے، اسے لمحہ بہ لمحہ اپنی مزید بدنامی کا احساس بھی ہوتا ہے، اور غیر شعوری طور پر جب کبھی وہ حقیقت دکھانے کی کوشش کرتی ہے، بدنامیاں بڑھ جاتی ہیں اور آخر میں ایک حد ایسی آجاتی ہے کہ وہ شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ اور ناول میں شروع سے آخر تک اسکی شخصیت مجسم محرومی کے علاوہ کچھ نہیں رہتی، شبنم کا کردار پورے ناول میں زندگی سے دست و گریباں نظر آتا ہے، قنوطیت کے شدید احساس میں بھی زندگی کی کرن اسے آگے بڑھنے کی دعوت ہے

ناول میں براہ راست شبنم کا کردار متعارف ہوتا ہے۔ اور بقیہ کردار شبنم کے توسط سے متعارف ہوتے ہیں ناول کے بقیہ تمام کردار کسی نہ کسی معنی میں شبنم کے عشق میں نظر آتے ہیں یا شبنم کی شخصیت سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں چنانچہ خود مصنف کا کردار (پروفیسر اعجاز حسین) بھی شبنم کی کرداری شخصیت سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا ہے اور مختلف افراد سے پوچھ گچھ کرکے ناول مرتب کرتا ہے اور شبنم کی شخصیت اور کردار کو اجاگر کرتا ہے۔

اس ناول میں دو کردار شبنم سے گہری وابستگی رکھتے ہیں، نوازش علی خاں اور ارشد، نوازش علی خان شبنم کا سب سے پہلا عاشق ہے، اور صدق دل سے شبنم سے محبت کرتا ہے، مگر حالات اس کا ساتھ نہیں دیتے اور وہ بڑی خاموشی سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے، اور اس کے بعد شبنم کی بدنامی شروع ہو جاتی ہے

ارشد جو شبنم سے بہت زمانے بعد متعارف ہوتا ہے اور شبنم کے متعلق پہلی بدنامیوں کا کھوج لگانے کی کوشش بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی خیال ذہن میں رکھتا ہے کہ شبنم کو ایک داشتہ کے طور پر ایک مدت کے لئے رکھ لیا جائے۔

نوازش علی خاں اور ارشد کے کرداروں کا تقابل کیا جائے تو ہمیں نوازش کا کردار ہی اہم نظر آتا ہے، ارشد کا کردار ایک اخبار کے عیاش مدیر کا کردار ہے۔

نوازش علی خاں کے کردار میں ایک قسم کی متانت اور گہرائی ہے، وہ سوچ سمجھ کر شبنم سے علیحدگی اختیار کرتا ہے۔ وہ شبنم کو بدنام نہیں کرتا وہ شبنم سے فلرٹ نہیں کرتا حالانکہ اگر وہ چاہتا تو سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس کے برخلاف ارشد کے کردار میں وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو ایک عیاش کے کردار سے عبارت ہیں۔ ان تینوں کی کردار نگاری میں عزیز احمد نے بڑی فنکاری برتی ہے اور ان کرداروں کے افعال و افکار سے واقعات بیان کئے ہیں جو از حد مشکل ہے ناول کے مطالعہ سے ایک بات اور بھی ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ناول کی تکنیک پر بڑا عبور حاصل ہے وہ پورے ناول کو فنی گرفت میں رکھتے ہیں ان کے یہاں جو فنی رکھ رکھاؤ اور اہتمام ہے وہ دیگر ناول نگاروں کے یہاں کم ہی ملتا ہے۔

ایک اعتراض عام طور پر عزیز احمد کے فن پر کیا جاتا ہے کہ وہ صرف جنسی موضوعات ہی منتخب کرتے ہیں جبکہ ان کی نظر دیگر موضوعات پر بھی پڑتی ہے مجھے بھی یہی اعتراض ہے لیکن یہ اتنا شدید اعتراض نہیں کہ ان کی فنکاری کا سرے سے منکر ہوا جائے یہ تو ایک قسم کی ادبا گزارش ہے کہ وہ دیگر موضوعات کیطرف بھی توجہ کریں تو ممکن ہے اردو ادب کو اور بھی بہت کچھ وہ دے سکیں

ایک اعتراض عزیز احمد کے طرز تحریر کے متعلق بھی کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ وہ دو ٹوک بات بیان کر دیتے ہیں جس سے ذہن کچھ پراگندہ اور بوجھل سا ہو جاتا ہے اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ عزیز احمد دراصل اظہاریت EXPRESSIONISM کے قائل ہیں اور اظہاریت میں واقعات کو زیادہ سے زیادہ اصل روپ میں پیش کرنے کی کوشش کیجاتی ہے چاہے وہ جیسے بھی ہوں یہ ایک قسم کی برہنہ حقیقت نگاری کہی جا سکتی ہے اور جسے فرانسیسی ادیبوں نے زیادہ استعمال کیا ہے اور روسی فنکاروں نے بھی

عزیز احمد کا ناول شبنم نہ صرف ان کا ہی بہترین ناول ہے بلکہ اردو ناول کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔
("عزیز احمد کا فن" کا ایک حصہ)

مہر نیمروز کراچی

ش ن جمی

موجۂ نسیم شب!

(منورا کی ایک رات کے تاثرات)

(۱)

تازہ بتازہ ہر افق!
پھول ادھر، ادھر شفق!
دفتر زندگی کا ہے
زیر نظر ورق ورق!

صفحۂ آب، تہہ بہ تہہ
جیسے سراب تہہ بہ تہہ!
خواب نہیں ہے، پھر بھی ہے
عالم خواب، تہہ بہ تہہ!

دیدہ و دل ہیں مرتعش
اُف ری یہ جاں فزا خلش!
کون کرے گا اعتبار!؟
چاندنی رات اور تپش!!

(۲)

فرش سے لے کے عرش تک
ایک عجیب سی چمک
دیدۂ نم! بتا ذرا
آئی کہاں سے یہ دمک!؟
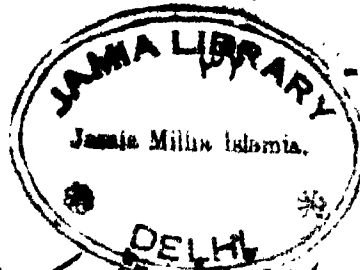
موج سے موج ہمقدم!
رنگ میں روشنی کا رَم
لحظہ بہ لحظہ اک یقیں
ایک فریب دمبدم!

دوش بدوش بحر و بَر
ہے جو صدف وہی گہر
جھاگ میں گھل کے اڑ گئے
شعلہ و شبنم و شرر!

شبنم و شعلہ ہمنفس
تشنہ لبی پہ کس کو بس!!
ڈھال دے پھر مری شراب
آتش و آب کا یہ رس!

آتش و آب، زندہ باد!
حسن و شباب، زندہ باد!
میرے قصور زیست پر
تیرا عتاب، زندہ باد!

(۳)

لوگ ہیں کس قدر ملول
ہوش عبث ، خرد فضول
برق کو بڑھ کے چوم لیں
برق ہے یاسمن کا پھول!

سنگستاں ہے ، لالہ زار
جوئے رواں ہے ، کوہسار
خار ؟ — نہیں ، نہیں کہ ہے
قوسِ قزح کی اک بہار

قوسِ قزح ہے ، آرزو،
پھر کی جس سے ، آبرو!
پھر ہے سوز کا رسول
اور یہ سوز ہی نمو!

(۴)

موجۂ مُتِد نسیم شب!!
میں نے فغاں جو کی تو کب؟
ارض وسما گواہ ہیں
مجھ کو گلہ نہ تب نہ اب!!

رنج و الم کے باوجود!
دیدۂ نم کے باوجود!
آج بھی نغمہ زن ہوں میں
شدتِ غم کے باوجود!

آج بھی ہے رواں دواں
ہاں! وہی جام زرفشاں
میرے غرور زیست کا
بحرِ عرب ہے ترجماں

(۵)

دیکھ! چھلک گیا شرر
جام اٹھا ، سبُو تو بھر!
جام! — بنامِ زخمِ دل!
جام! — بنامِ چارہ گر!

آنے کو ہے پیامِ صبح!
ایک سبُو ، بنامِ صبح!
موجِ نسیم و موجِ آب
دونوں ہیں ہمکلامِ صبح!

قطرۂ ، آخرِ شراب!
میری نوائے کامیاب!
میرے ہی دل کا قرض ہے
نام ہے جس کا آفتاب

سیف حسن پوری

انتظار

(سانیٹ)

یکایک جھلملا کر بجھ گئیں شمعیں ستاروں کی
سحر نے جذب کر لی شب کے نظاروں کی رعنائی
ملال و حزن میں ڈوبیں نگاہیں شاخساروں کی
چمن میں تلملاتی، سسکیاں بھرتی نسیم آئی

ہوئی ظاہر نگارِ صبح کے عارض سے کم تابی
غبارِ یاسیت سے آئینہ شبنم کا سنولایا
گلِ نورستہ کی آنکھوں سے چھلکا کیف بے خوابی
جبینِ غنچۂ رنگیں پہ اضمحلال سا چھایا

شکستہ آبگینے ہو گئے کس کی امیدوں کے
ہجوم یاس کے گھیرے میں کس کے کھو گئے ارماں
غم و اندوہ کے شعلوں سے پہلو کس کے جل اٹھے
جلائیں آنسوؤں کی کس نے قندیلیں سرِ مژگاں

وفورِ درد سے نبضِ عروسِ زندگی ڈوبی —
کلی روئی لپٹ کر گل سے، گلشن کی فضا کانپی!

---o---

سہیل ادریس

افسانہ نگار

آصف سے میری جان پہچان بس اتنی ہی تھی کہ ہم دونوں ادب کے رسیا تھے۔ وہ بھی افسانہ نگار تھا اور میں بھی۔ ہم دونوں کے افسانے رسالوں میں چھپا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس کا افسانہ چھپا تو وہ اتنا اچھا تھا۔ اور مجھے اتنا پسند آیا کہ میں کہہ نہیں سکتا میں نے فوراً اسے خط لکھا، یہ میرا پہلا خط تھا جو اس کے نام گیا۔ میں نے دل کھول کر داد دی تھی اور بڑا لمبا تبصرہ اس کے افسانے پر کیا تھا۔ جواب آیا اور اس کے جواب میں کوئی تصنع نہیں تھا۔ اس نے بڑی سادگی اور خلوص کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ میں بھی تمہارے افسانے برابر پڑھتا رہا ہوں، اور جب بھی پڑھا یقین کرو بے اختیار جی چاہا کہ تمہیں خط لکھوں مگر آج تک اسکی توفیق نہیں ہوئی جب بھی ارادہ کیا، کوئی نہ کوئی نئی الجھن سامنے آگئی، اور میں الجھ کر رہ گیا۔ آج تم نے پہل کی تو میں اتنا شرمندہ سا ہوں کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تاہم آج میرا دل بہت مسرور ہے۔ مدت کی آرزو بر آئی یوں تو میری تمہاری شناسائی بھی ازل کی ہے، لیکن اس دنیا میں بھی ربط ضبط کی کوئی صورت ضروری تھی سو نکل آئی۔ پہل چاہے تم کرو، چاہے میں، بات ایک ہی ہے۔

اور ہم دونوں گہرے دوست ہوگئے اور قاہرہ و بیروت کے درمیان محبت کی ڈاک دوڑنے لگی، یہ حال ہو گیا کہ ایک دوسرے کو خط لکھے بغیر چین نہ آتا تھا۔ دنیا جہان کے قصے، کہانیاں، کہیں آپ بیتی، کہیں جگ بیتی، کوئی دو سال تک ہم دونوں نہ جانے کیا کیا کچھ لکھتے رہے، ایک دوسرے کا حال کھلا ہوا تھا، مگر کوئی صورت ایسی نہ نکلی کہ دونوں کسی ایک جگہ جمع بھی ہو جاتے، ملاقات بھی ہو جاتی۔ میں بڑی بے چینی سے اس کے خطوط کا منتظر رہتا تھا اور وہ بھی ہر ہفتے لکھا کرتا تھا۔ وہ خطوط تو اور بھی دلچسپ ہوتے تھے جن میں وہ اپنی زندگی کے تجربات اور نشیب و فراز کا حال لکھتا تھا۔ اس کے خطوط میں بڑی زندگی ہوتی تھی، وہی زندگی جو اس کی گذر رہی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے لکھا تھا کہ جب میں تمہیں خط لکھنے بیٹھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے آپ سے سرگوشیاں کر رہا ہوں

—— o ——

اب سے پانچ ماہ پہلے جو خط آیا تھا اس میں ایک تازہ بہ تازہ نو بہ نو داستان اس نے چھیڑی تھی، ہلیوپولیس کے ہوٹل میں ایک لڑکی سے ملاقات کا قصہ،

"ایک دوست سے ملنے کا وعدہ تھا، میں ہوٹل کے لاؤنج پر بیٹھا اسکی راہ دیکھ رہا تھا، وقت گذاری کے لئے ایک رسالہ میرے ہاتھ میں تھا، اور میں حسب معمول اس میں ڈوبا ہوا تھا، پڑھتے پڑھتے میری نظر جو اٹھی تو دیکھا کہ سامنے

والی میز پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی ہے، ہاتھ میں ایک کتاب ہے اور بڑے انہماک کا عالم طاری ہے، کیا غضب! میں نے دل ہی دل میں کہا، یہ کہاں سے آ گئی، اور آئی کیسے کہ مجھے پتہ تک نہ چلا، وہ خوبصورت سی تھی، ناممکن تھا کہ نظریں اس کی طرف اٹھتیں اور جم کے نہ رہ جائیں میں نے رسالہ الٹ کے میز پر رکھ دیا رعنائیاں مجسّم ہو گئی تھیں میں اسے دیکھتا رہا اور وہ اپنی کتاب میں ڈوبی رہی کچھ دیر بعد جب اس نے کتاب بند کی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا ایک عکس لہرا رہا تھا۔
نگاہیں ملیں، انہیں فطرۃً ملنا تھا مگر میرے رگ و پے میں جیسے کوئی رَو سی دوڑ گئی، اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں نہ جانے کیا جادو بھرا تھا۔ نیلے آسمان کی سی رنگت یا جیسے سمندر کا عکس، مگر کچھ غبار آلود سا عالم۔ بہت ہی مشکل ہے، میں اس کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔
وہ جب اپنی جگہ سے اٹھ کے چلی تو میں یہ بھول گیا کہ یہاں مجھے اپنے دوست کا انتظار کرنا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی اٹھ پڑا۔ وہ باہر نکلی ٹیکسی کو اشارہ کیا، بیٹھی اور چلی گئی، کہاں گئی یہ مجھے نہیں معلوم لیکن مجھ کو جب اپنے دوست کا وعدہ یاد آیا تو میں اس وقت اپنے گھر پر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔
دوسرا خط جب آصف کا آیا تو اس نے لکھا کہ ہاں بھئی، سنو، بات ختم نہیں ہوئی اس دن کے بعد وہ پھر نظر آئی، اسی ہوٹل میں اسی طرح، بلکہ بار بار سامنا ہوا تفصیل پھر کبھی لکھوں گا، مختصر یہ ہے کہ جان پہچان ہو گئی، باتیں ہوئیں اور خوب ہوئیں اس کی گفتگو کے انداز میں نفاست ہے، آواز میں نرمی ہے حلاوت ہے، کچھ کہو تو ہمہ تن گوش ہو جاتی ہے، اور خود بولتی ہے تو سراپا التفات نظر آتی ہے، میرا نام سن کر اس نے خوشی کا اظہار کیا، کہنے لگی کہ میں نے تو آپ کے افسانے بہت پڑھے ہیں اور بڑے شوق سے پڑھتی ہوں، آپ کے نفسیاتی تجزیوں میں بڑا کیف ہوتا ہے، اور پھر کہانی کا سسپنس، اور پھر اچانک غیر متوقع باتیں، آپ تو باتوں باتوں میں نہ جانے کتنی گتھیاں سلجھا دیتے ہیں۔
مجھے یقین ہے تم یہ باتیں سن کر مجھ سے پوچھو گے کہ کیا یہ لڑکی بھی کہیں ازل میں موجود تھی! شاید ہو۔ مجھے تو کچھ نہیں معلوم لیکن تمہیں کہو اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو گی کہ ایک ایسی خوش تمیز اور مہذب لڑکی سے ملاقات ہو جس کو ادب کا ذوق ہے اور بہت اچھا ذوق ہے، اب عالم یہ ہے کہ میں جو کچھ لکھتا ہوں اس کے سپرد کر دیتا ہوں اور وہ اس کو بڑی توجہ سے پڑھتی ہے، اور جہاں کہیں کوئی نکتہ اسے پسند آ جاتا ہے وہ کچھ دیر کے لئے تھم جاتی ہے اور پھر اپنی بڑی بڑی آنکھیں میری طرف اٹھاتی ہے، جو لطف و سرور سے اور زیادہ چمک اٹھتی ہیں اور اس قدر حسین ہو جاتی ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شیرینی سی ابھرتی ہے، اور وہ کہتی ہے:
"ہائے، لاجواب، آصف، لاجواب! میرے تو احساسات جھوم اٹھے"......
اور میرے سینے میں ادھر دل جیسے کبوتر کی طرح پھڑپھڑانے لگتا ہے، اور الفاظ میرے ہونٹوں سے کچھ اس طرح الجھ سے پڑتے ہیں کہ منہ سے بات نہیں نکلتی اور چہرہ تمتما اٹھتا ہے، میرے دل پر اثر اس کے ان جملوں کا اتنا نہیں جو اس محبت بھرے انداز میں اس کی زبان پر بے ساختہ آ جاتے ہیں، جتنا اس کی آنکھوں کا ہے نیلی نیلی ان قیامتوں کا جو سر سے پاؤں تک میرے سارے وجود کو مرتعش کر کے رکھ دیتی ہیں۔
—— ارے میں ان آنکھوں سے بہت ڈرتا ہوں اور ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر جتنی کوشش کرتا ہوں اتنی

ی شدت سے کوئی قوت جیسے مجھے کھینچ کر ان کی طرف موڑ دیتی ہے، اور میں پھر ان کو گھورنے لگتا ہوں، ان کی گہرائیوں میں ڈوبنے
تا ہوں جنکی کہیں تھاہ نہیں ملتی، دُرّیہ کا سراپا میرے سامنے ہوتا ہے، اور اسکی آنکھیں، بولتی ہوئی آنکھیں۔ ۔ ۔ ۔ یوں سمجھو،
ر یوں کہہ لو، یا شاید زیادہ بہتر ہو اگر یوں سوچو کہ میری رگوں کا سارا خون کھینچ کر میرے گالوں میں کسمسانے لگتا ہے۔
ایک رات میں نے اس سے کہا کہ دُرّیہ! پتہ نہیں تمہاری آنکھوں میں کیا جادو ہے، میں تو ان کو سمجھنے سے بھی قاصر ہوں
ک دنیا بھری پڑی ہے ان میں متضاد قسم کی، اور ایک۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اس نے بڑے انداز سے لہرا کہ قہقہہ لگایا اور میری بات کاٹ کر بولی ــــ تو پھر کوئی افسانہ لکھ ڈالئے ان پر بھی

———o———

آصف نے کچھ عرصہ بعد مجھے ایک رسالہ تو بھیجا جس میں اس کا تازہ افسانہ چھپا تھا "ان آنکھوں کی دنیا" ــــ
ین اس کا خط کوئی نہ آیا، وہ یک لخت خاموش ہو گیا میں اسے بار بار لکھتا رہا، تقاضا کرتا رہا جواب کا۔ خاموشی کا سبب
چھتا رہا کیونکہ خط سے زیادہ اب مجھے اسکی خیریت کی فکر تھی، مگر وہ جیسے دم سادھ کے بیٹھ گیا تھا، آخر چار ہفتے کے بعد
کی خاموشی ٹوٹی، جواب آیا۔
"یہ چار ہفتے بڑے کرب کے عالم میں گذرے ہیں، میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا، دُرّیہ اپنے لوگوں کے ساتھ ملتان
ی گئی ہے، اور پورے پچیس دن سے وہیں ہے، اس اثناء میں یہاں میرا عجیب عالم ہو گیا، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں
ر واقعی میں کچھ نہ کر سکا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک جملہ بھی نہ لکھ سکا، تمہیں خط کیا لکھتا۔ لیکن ٹھہرو، میں کہیں اس لڑکی سے محبت تو نہیں
نے لگا؟ گمان تو نہیں کر لیا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن پیارے، اس کو نہ بھولنا کہ ہم اور تم ــــ اور یہ سارے افسانہ نگار ــ
کچھ لکھا کرتے ہیں وہ باتیں سب عشق و محبت ہی کی ہوتی ہیں ــــ اور یوں ہم اہل محبت کا اچھا خاصہ مذاق اڑاتے
ہے ہیں"

چند ہی دن بعد اس کا دوسرا خط پہونچا۔
کل شام دُرّیہ واپس آگئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور خود بخود ایک لطیف تقاضا سا میرے دل کے اندر ابھر پڑا کہ وہ افسانہ
ہی ڈالوں جو ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اُس وقت سے میرے خیالوں میں
سا ہوا تھا جب سے میری جان پہچان اس لڑکی سے ہوئی ہے، خبر نہیں، یہ دُرّیہ کیا میرے لئے سرچشمۂ الہام بھی بن گئی؟
جی چاہتا ہے کہ اس بات پر خوب قہقہہ لگاؤں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو، میرے قلم کو نہ جانے کون سی قوت پرواز مل گئی
اس نے گھنٹے بھر میں وہ افسانہ لکھ کے رکھ دیا، بلکہ اس سے بھی کم میں، یہ افسانہ ابھی تم کو نہیں سناؤنگا، لیکن مجھے ایسا
س ہو رہا ہے کہ اس میں میری ساری روح محلول ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ افسانہ ایک المیہ ہے، ایک دردناک داستان
ت، المناک حادثوں کا مجموعہ ــــ دُرّیہ نے جب مجھ سے اصرار کیا کہ بتاؤ میری عدم موجودگی میں تم نے کیا کیا لکھا۔ تو
نے وہی افسانہ اس کے سپرد کر دیا جس کو لیکر وہ بے تابی کے ساتھ جلدی جلدی پڑھنے لگی، پڑھتی رہی، پڑھتی
ی، اور جب افسانہ ختم ہوا تو میں نے دیکھا کہ اسکی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں اس کا سارا بدن کپکپا رہا ہے

اور وہ پوری قوت کے ساتھ اپنے آنسوؤں کو روکنے اور اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن اسکی ساری کوشش ناکام ہوئی جاتی تھی

آخر اس نے بڑی سادگی سے، آپ ہی آپ کہا، تم نے یہ کہانی اتنے دردناک انداز میں کیوں ختم کی، آصف، تم آدمی نہیں ہو ۔۔۔۔۔۔۔

اور میں نے بے اختیار اسے کھینچ کر اپنی باہنوں میں جکڑ لیا، نہ جانے یہ کیفیت، اور یہ لپک میرے اندر یک بیک کہاں سے اُمڈ پڑی، اور درّیہ نے بھی کچھ اس طرح اپنے آپ کو چھوڑ دیا کہ اسکی سانس کے تیز تیز جھونکے میرے گال سے ٹکرانے لگے، وہ آپ ہی آپ بولے جارہی تھی " ہائے تم نے کتنا اچھا لکھا ہے تم بڑے افسانہ نگار ہو ۔۔۔۔

اور میرے دل نے بے تکلف اسے سرچشمۂ الہام تسلیم کر لیا، میں اس سے کہہ رہا تھا کہ نہیں درّیہ، یہ سب کچھ تمہارا اثر ہے۔ جب تم میرے پاس ہوتی ہو تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خوبصورت سے خوبصورت افسانے اور اعلیٰ سے اعلیٰ فن پارے میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں ۔

درّیہ نے بڑے فخر کے تیور سے کہا میں بڑی خوش قسمت ہوں آصف اگر ایسی کہانیاں مجھ سے وجود پائیں اور تمہارا قلم ان کو پیش کرے ،

میں نے کہا یوں کہو کہ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم جیسی مہذّب اور حسّاس لڑکی سے میری ملاقات ہوئی ،

درّیہ مسکرا پڑی، اور اسکی مسکراہٹ میں ایک سرمستی تھی درد تھا ،

اچھا تو نئی کہانی کب لکھو گے ؟ اس نے پوچھا

میں ہنس پڑا۔ ابھی، اسی لمحے، تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈالونگا، اپنے موئے قلم کو اس نور میں ڈبوؤنگا جو ان آنکھوں میں امڈ رہا ہے اور لکھ ڈالونگا ۔

---o---

کچھ عرصہ بعد آصف نے جو خط مجھے بھیجا اس میں درج تھا کہ درّیہ واقعی اس کے احساسات پر بڑی طرح چھا گئی ہے۔ بلکہ وہ اتنی شدید محبت میں مبتلا ہو گیا ہے کہ

لکھتا ہے، اسکی ہتھیلی جب میری ہتھیلی سے مس ہوتی ہے تو میرا سارا وجود لرز اٹھتا ہے، اسکی نگاہیں میری نگاہوں سے ملتی ہیں تو جیسے اترتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اندر اندر اور میرے سینے میں شوق بے حد کی ایک آگ سی دہک اٹھتی ہے ۔۔۔۔ میرے دوست! مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اب میری ہر جنبش درّیہ کے اشاروں کی تابع ہو گئی ہے، مجھ سے تو ایک لمحے کے لئے بھی اسکی جدائی گوارا نہیں ہوتی، ۔۔۔۔ اور یہ تو اب معلوم ہوا کہ جن عاشقوں کی حالت ہم لوگ اپنے افسانوں میں بیان کرتے رہتے ہیں، وہ سچ مچ کیا ہوتی ہے، ہم لکھتے تو رہے ہیں کہ فراق اہل محبت کے لئے سوزش عذاب کی گھڑی ہے، لیکن یہ سب کچھ ہم فی الواقع محسوس کر کے کہاں لکھتے ہیں، ہم اس کرب والم کی حقیقت سے سچ مچ آگاہ کہاں ہوتے ہیں ۔۔۔۔ لیکن اب میں سچ مچ آگاہ ہو گیا ہوں اب مجھے اس کیفیت کا پورا پورا اندازہ ہو رہا ہے، آج

میں اپنے افسانوں کے ایک ایک ہیرو کے احساسات میں برابر کا شریک ہوں اور مجھے ان پر بڑا ترس آرہا ہے اور ہمدردی ہو رہی ہے آج میں خود محسوس کر رہا ہوں کہ میرے جسم کا ذرہ ذرہ محبت کی شدت سے کس بری طرح تپ رہا ہے
اور میرے دوست مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ تم مجھ پر ہنسوگے، میرا مذاق اڑاؤگے، برا بھلا کہوگے ....
کہ وہ افسانہ نگار جس کا مشغلہ ہی یہ تھا کہ لوگوں کے عشق و محبت کی ہنسی اڑائے ... لوگ خود اسکی ہنسی اڑائیں کے بلکہ تمہاری ہنسی تو اس وقت اور قہقہے میں بدل جائیگی جب میں یہ بتاؤنگا کہ اب میرے اندر حیاتیاتی تڑپ مضمر ہے میری اور نادرہ کی زندگی ایک دوسرے میں ضم ہو جائے ہاں میں نے ارادہ پختہ کر لیا ہے کہ شادی کر کے اسے اپنالوں اور مجھے ذرا شبہ نہیں کہ خود اسکی آرزو بھی یہی ہے کہ میری شریک حیات بن جائے .... میں اسکی نیلی نیلی آنکھوں میں یہ صاف دیکھ رہا ہوں کہ اس کو جو محبت مجھ سے ہے وہ میری محبت سے بھی زیادہ گہری اور شدید ہے وہ تو بیتاب ہے کہ اپنی اس محبت کو مجھ پہ بے نقاب کر دے ....
میرے دوست میں نے طے کر لیا ہے کہ پہلی ملاقات میں پیام دے دوں .... بلکہ یہ خط پہونچنے سے پہلے ہی ہماری منگنی بھی ہو چکی ہوگی"

دو ماہ پورے ہونے کو آئے جب آصف کا یہ خط مجھے ملا تھا،
اور رشک و رقابت کے جذبات نے میری رگوں میں خون کی رفتار تیز تر کر دی تھی، کہ دیکھو تو سہی کمبخت اپنی منگیتر کی دھن میں اتنا غرق ہے کہ پلٹ کے دیکھتا بھی نہیں .... لیکن خیر، اس کو اس کا حق بھی پہونچتا ہے، اسے مبارک ہو،
میں نے بھی پسند نہ کیا کہ اسکی محبت کی سرمستی و سرور میں ایک لمحے کے لئے بھی خلل انداز ہوں، میں نے ایک خط بھی اس کو نہ لکھا حتیٰ کہ مبارکباد بھی نہ بھیجی کہ یہ بھی کچھ عرصہ بعد ہی بھیجونگا، ابھی نہیں،

تا نہ پڑے خلل کہیں یار کے خواب ناز میں

گذشتہ ہفتے اس کا خط آیا تو لفافہ کھولتے وقت دل نے کہا ضرور شادی کا دعوت نامہ ہے، خط مختصر تھا، اور اس میں یہ سطریں درج تھیں
"اس نے ایک نوجوان کو مجھ سے ملایا اور کہا یہ میرا منگیتر ہے، اور اس نوجوان سے بولی، آصف صاحب بہت بڑے افسانہ نگار ہیں اور میں ان کے افسانوں کی دیوانی ہوں، ....
اور پھر میری طرف مڑکر مسکرائی، وہی جادو وہی کیف ہمیشہ کی طرح، آج بھی اسکی مسکراہٹ میں موجود تھا کہنے لگی۔ آصف صاحب کوئی افسانہ ہماری شادی پر بھی تو لکھئے، لکھیں گے نہ؟ کہئے ہاں"
جی ہاں، بڑی مشکل سے میری زبان نے میرا ساتھ دیا میں نے کہا لکھونگا، فطرۃً لکھونگا ——

ضیاء الرشید

"شیشے کے ہاتھ"

سندھ ایکسپریس کا انجن مسلسل سیٹیاں دیتا ہوا آخر کار بیرونی سگنل کے قریب رک گیا ہے۔ پولیس والے اپنے ڈبے سے اتر کر انجن کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ بہت سے مسافرین بھی انکے پیچھے ہو لئے ہیں اور جو نہیں اترے وہ کھڑکیوں اور دروازوں میں سے انجن کیطرف دیکھ رہے ہیں۔

ریلوے لائین کے ساتھ ساتھ ہتّو کی کا قصبہ آباد ہے۔ بستی کے کچے پکے مکانوں میں سے لوگ نکل نکل کر ریل کیطرف چلے آرہے ہیں۔ لڑکوں اور بچوں کا ایک غول بھی ریل کیطرف بھاگتا چلا آرہا ہے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ "ارے یہ تو اپنا "میلی دا" ہے"

"ہاں۔ ہاں۔ وہی ہے"

"لائین پر لیٹا ہوا تھا شائد"

"کیوں؟" ایک چھوٹا لڑکا ناک کی غلاظت ناک میں سمیٹتے ہوئے پوچھتا ہے۔ "مرنے کے لئے اور کس لئے" ایک بڑا لڑکا اسکے سر پہ چپت مارتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ انجن کے قریب پولیس والوں نے ایک شخص کو پکڑ رکھا ہے جسکی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اسکا شیو بڑھا ہوا ہے اور سر کے گھنگریالے بال ماتم کے جلوس میں سینہ کوبی کرنے والے کے بالوں کی طرح پریشان ہیں۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا ہے، قد مناسب اور اعضا سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر بڑا منہ زور شباب آیا تھا۔ اسکا چہرہ جذبات سے عاری ہے۔ نگاہوں میں مریضانہ افسردگی اور تھکن ہے مگر انمیں کسی قسم کا خوف یا اضطراب نہیں ہے اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے پرواہ بس یونہی خلا میں دیکھ رہا ہے۔

مگر جب بستی کے لڑکے "میلی دا" میلی دا" کہتے ہوئے قریب پہنچتے ہیں تو اس شخص کا چہرہ غصے سے تن جاتا ہے اور وہ چیخ چیخ کر گالیاں دینے لگتا ہے۔

"تم میلی دے"۔۔۔۔۔۔ تم سب "میلی دے"۔۔۔۔ تم ۔۔۔! " وہ جھک کر پتھر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے مگر پولیس والے اسے پکڑے رہتے ہیں۔ وہ بے بس ہو کر پولس والوں سے بھرائی ہوئی آواز میں شکایت کرتا ہے اور اس وقت اسکے چہرے پر یاس و حسرت کے دلوں کو چھو لینے والے نقوش ابھر آتے ہیں۔

"دیکھو جی۔ دیکھو۔۔۔۔ یہ مجھے "میلی دا" کہہ رہے ہیں۔۔۔۔ ایمان سے میں "میلی دا" نہیں ہوں

یہ سب "میلی دے" ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کو پکڑ لو"

ایک شخص بستی کی طرف سے بھاگتا ہوا آکر پولیس والوں سے التجا کرتا ہے:-

"اسے چھوڑ دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بدنصیب میرا چھوٹا بھائی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسکا دماغ خراب ہے ہم ہمیشہ خیال رکھتے ہیں۔ پھر آج غفلت ہو گئی"

انجن ڈرائیور جسکے ماتھے پر غصے سے شکنیں پڑی ہوئی ہیں کہتا ہے۔ "وہ تو انجن کی رفتار کم تھی ورنہ ۔ ۔ ۔" اور وہ پاگل کی طرف دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔

پاگل اب پھر خلا میں دیکھنے لگا ہے۔ اسکے درختوں کی چھال جیسے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے وہ ساری دنیا کے پاگل پن پر اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا ہو! اگارڈ گھڑی دیکھتے ہوئے کہتا ہے "بھئی اسے پاگل خانے میں داخل کیوں نہیں کر لیتے"۔ اتنے میں ایک بڑھیا بھی گرتی پڑتی آجاتی ہے اور ہانپتی ہوئی پاگل سے لپٹ کر رونے لگتی ہے۔

پولیس والے پاگل کے لواحقین کو آئندہ محتاط رہنے کی تاکید کے بعد اسے انکے حوالے کر دیتے ہیں

بستی کے لوگ ایک جلوس کی سی شکل میں پاگل کو لے کر لوٹ رہے ہیں۔ پیچھے سے چند شریر لڑکے "میلی دا" کی آواز لگاتے ہیں۔ پاگل تڑپ کر انکی طرف جھپٹنے کی کوشش کرتا ہے اور مجبور ہو کر گالیاں دینے لگتا ہے۔ بہت سے آدمی لڑکوں کو ڈانٹتے ہیں۔ لڑکے وقتی طور پر خاموش ہو جاتے ہیں۔

تھوڑی دور جا کر پاگل کا بھائی اور ماں اسے لے کر ایک کچی اینٹوں کے بنے ہوئے مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

جب ریل دوسری سیٹی کے بعد رینگنے لگتی ہے تو وہی پاگل مکان کی چھت پر دکھائی دیتا ہے۔ اسکے پاس ہی ماں، بھائی اسکی بیوی اور بچے بھی کھڑے ہیں۔ ذرا سی دیر میں پاگل کسی جوشیلے مقرر کیطرح کے تان تان کر رینگتی ہوئی ریل کو گالیاں دینے لگتا ہے۔

۲

اس پاگل کا نام غلام حسن ہے۔ یہ سرینگر سے قریباً پچیس میل ادھر اسلام آباد کا رہنے والا ہے۔ اسلام آباد میں اسکے بھائی غلام حسین کی پرچون کی دکان تھی اور یہ خود اسلام آباد سے سرینگر تک لاری چلاتا تھا۔ حسن بچپن ہی سے کم گو، تنہائی پسند اور سنجیدہ مزاج تھا۔ باقی ڈرائیوروں کے ساتھ اسکی نشست و برخاست برائے نام ہی تھی۔ ان کی ٹولی میں وہ الگ تھلگ نظر آتا۔ حسن عام ڈرائیوروں کے برعکس زنانی سواری کی موجودگی میں لاری کو کبھی تیز نہ چلاتا اس لئے اسلام آباد اور سرینگر کی اکثر آنے جانے والی زنانی سواریاں حسن کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتیں۔ باقی سب ہی ڈرائیور لاری میں برقع دیکھ کر بابو راؤ پہلوان اور ڈی بلیموریا کی مار دھاڑ سے بھرپور فلموں کے ہیرو بن جاتے جو وہ سرینگر کے سنیماؤں میں آئے دن دیکھا کرتے اور خطرناک ڈھلوانوں اور موڑوں پر بھی لاری کی رفتار کم نہیں کرتے تھے۔

استاد نیاز محمد کے بدن پر کئی دنوں سے خارش ہو رہی تھی۔ ہفتے بھر کی برفباری اور بارش کے بعد سورج نکلا تو استاد نے اسلام آباد کے شاہی چشمے پر جا کر نہانے کا ارادہ کیا۔ استاد کی اکلوتی بیٹی شاداں بھی ساتھ چلنے کے لئے ضد کرنے لگی۔ استاد پہلے تو محبت آمیز غصے سے انکار کرتا رہا لیکن پھر اسنے بیوی کو بھی تیار ہونے کے لئے کہہ دیا کیونکہ

وہ جوان بیٹی کو تنہا لے کر پھرنا معیوب سمجھتا تھا۔

استاد نیاز محمد کی جوانی لاریاں اور ٹرک چلاتے گزر گئی تھی۔ سرینگر سے جموں تک کے اکثر نوجوان ڈرائیور اسی کے شاگرد تھے۔ اور جو نہیں تھے وہ بھی اسے احتراماً استاد ہی کہتے تھے۔ پیلے پیلے ہلتے ہوئے دانتوں، کھچڑی خشخشی ڈاڑھی اور برگد کی جٹاؤں کی طرح جھکی ہوئی مونچھوں والے استاد نیاز محمد کی زندگی کی دو بڑی آرزوؤں میں سے آخر ایک پوری ہو گئی۔ اس نے جوں توں کر کے ایک پرانا "جی۔ ایم۔ سی" ٹرک خرید لیا۔ رہی اولادِ نرینہ کی آرزو سو اب وہ حسرت بن چکی تھی۔ دراصل شاداں کی پیدائش کے وقت کچھ ایسی خرابی ہو گئی تھی کہ ہزاروں تدبیروں اور تعویذوں کے باوجود شاداں کی ماں کی گود دوبارہ نہ بھری۔ شاداں سے میاں بیوی کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اسے ذرا زکام ہو جاتا تو رات رات بھر کانگڑیاں گود میں لئے دونوں سرہانے بیٹھے رہتے۔

استاد نیاز محمد شروع شروع میں تو اپنے ٹرک پر سرینگر سے اسلام آباد سامان لاتا لے جاتا رہا مگر اتنا عرصہ ڈرائیوری کرتے کرتے وہ اب تھک گیا تھا۔ اسکے علاوہ کمر میں پرانے بادی درد کے دورے بھی اب زیادہ ہونے لگے تھے۔ اس لئے استاد کو کسی نیک، ایماندار اور دوسرے کے مال کی قدر کرنے والے ڈرائیور کی تلاش تھی۔ سرینگر کا ایک ڈرائیور استاد نے رکھا مگر وہ تیسرے ہی دن پرانے ٹرک سے تنگ آ کر چھوڑ گیا۔

شاداں اور بیوی اگر ہمراہ نہ ہوتیں تو استاد اپنے ٹرک ہی میں اسلام آباد جاتا۔ عورتوں کے ساتھ اپنے لاری میں سفر کرنا مناسب سمجھا اور اڈے پر آ گیا۔

اتفاق سے تیار لاری پر حسن تھا۔ "آؤ استاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آ جاؤ" حسن نے شاگردانہ انداز میں اپنے برابر والی گدی پر ہاتھ مار کر دعوت دی۔

استاد لاری کا سفر کرتے وقت ہمیشہ ڈرائیور کے برابر ہی بیٹھا کرتا اور راستے بھر محبت آمیز گالیاں دیتے ہوئے ڈرائیور کو آہستہ اور ہوش سے چلانے کی ہدایت کرتا رہتا۔ کوئی لاری والا استاد سے کرایہ نہیں لیتا تھا۔ حسن کو گالی دینے کی ضرورت استاد کو کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ حسن کے منہ پر استاد نے کبھی اُس کی تعریف بھی نہیں کی تھی مگر دوسرے ڈرائیوروں کے سامنے وہ ہمیشہ اسی کی مثال دیا کرتا

اسلام آباد پہنچنے سے پہلے استاد حسن کے گھر چل کر کھانے کی دعوت قبول کر چکا تھا اور حسن استاد کا ٹرک چلانے کی! حسن نے سوچا "چلو ٹھیک ہے۔ تین برس سے لاری چلا رہا ہوں۔ اب ذرا ٹرک سہی" اور پھر استاد کی شرائط بڑی عمدہ تھیں۔ شام کو سرینگر پہنچ کر رات کے ٹھہرنے، کھانے اور صبح کے ناشتے کے انتظام کے علاوہ سو روپے تنخواہ۔

استاد کے سرینگر جانے کے بعد حسن کی بھابی نے جب اسے بتایا کہ وہ شاداں کے سوا کسی دوسری لڑکی کو اپنی دیورانی بنا کر خوش نہیں ہوگی تو حسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھابی یہ ایک ہزار ایک سو گیارویں لڑکی ہے جسے تو نے پسند کیا ہے"

(۳)

حسن کو استاد نیاز کا ٹرک چلاتے ہوئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ اس ٹرک نے اسے ڈرائیور سے مستری بھی بنا دیا تھا کیونکہ

راستے میں خراب ہو جانے پر حسن کو کسی نہ کسی صورت اسے ٹھیک کرنا ہی پڑتا اور ٹرک کی کیا مجال جو ہر پھیرے میں خراب نہ ہو
اسلام آباد سے چلتے ہی حسن کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کئی دنوں کا بھوکا ہو۔ اس کا جی چاہتا کہ ٹرک کو اڑا کر سرینگر پہنچ جائے
اور مال گودام میں خالی کر کے اپنی کوٹھری میں جا پہنچے اور منہ ہاتھ دھو کر کوٹھری کے برابر ٹاٹ کے پردے والے دروازے
پر جا کر استاد کو آواز دے اور پھر پردے میں سے "شیشے کے دو ہاتھ نکل آئیں جنمیں ایک شرمائی ہوئی متبسم خوبصورتی کا عکس
لرزاں ہو!!!

ان ہاتھوں میں چنگیری ہو اور اسپر سالن کا پیالہ رکھا ہو۔

اس معمول کو یاد کر کے اسکے دل میں مسرت و انبساط کی لہریں بیدار ہو جاتیں۔ کسی پہاڑی گیت کی دھن اسکے
ہونٹوں پر رقص کرنے لگتی اور جی۔ ایم۔ سی کے پرانے انجن کا شور سازوں کے خیالی ترنم سے ہم آہنگ ہو جاتا!!

سرینگر سے واپسی پر اسے ٹرک کا بوجھ اپنے اعصاب پر محسوس ہوتا۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ کسی قلی کی طرح پیٹھ پر سامان
لادے دشوار گزار چڑھائی چڑھ رہا ہو!!

حالانکہ اسنے شدید خواہش کے باوجود ان ہاتھوں کو کبھی چھو کر نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی دل کے تقاضوں پر اسنے
کبھی ان شیشوں میں اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

استاد گھر میں ہوتا تو خود اسکا کھانا لے آتا۔ کبھی کبھی جب استاد کی کمر میں بادی کا درد ہونے لگتا تو وہ حسن کو گھر
میں پردہ کرا کے اپنے کمرے میں بلا لیتا۔ حسن اکثر استاد کی پیٹھ پر مالش کرتا اور اس کی دعائیں لیتا اور دروازے کے پیچھے سے
وہی شیشے کے ہاتھ اسے نمکین چائے کے پیالے اور نان خطائیاں پیش کرتے۔

(۴)

قریباً دو برس کے بعد استاد نیاز محمد نے حسن کے مشورے پر پرانا ٹرک بیچ کر نیا فورڈ ٹرک خرید لیا۔

حسن نے ابھی تک "شیشے کے ہاتھوں" کو چھو کر نہیں دیکھا تھا مگر اب اسے انہیں شرمائی ہوئی متبسم خوبصورتی
کے ساتھ ساتھ اپنا عکس بھی دکھائی دینے لگا تھا۔

حسن اور شاداں کا بیاہ ہو گیا۔

شاداں نے حسن کو بتایا کہ تم مجھے اسی دن اچھے لگنے لگے تھے جسدن ہم تمہاری لاری میں پہلی مرتبہ بیٹھ کر اسلام آباد
گئے تھے۔

"کیوں؟" حسن نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ میں سن چکی تھی کہ تم سب ڈرائیوروں سے اچھے ہو..... تم لاری تیز نہیں چلاتے اور ـــــ اور..."

"اور کیا"؟

"اور تم سب ڈرائیوروں سے اچھے ہو"

شاداں نے جیسے گلاب کی شاخ سے آنچل چھڑا لیا۔

"شاداں صبح ناشتے کے ساتھ تم جو پراٹھا پکا کر......"

"لو اور سنو" شاداں نے تعجب سے پلکیں جھپکتے ہوئے نچلے ہونٹ پر انگلی رکھ کر حسن کو ٹوک دیا: "پراٹھے تو صبح بیچاری اماں اٹھ کر پکاتی تھیں...... ہم تو چارپائی پر ناشتہ کرتے تھے،" حسن نے بات بدلی،"شام کا سالن تو لاجواب ہوتا تھا۔"

سُہاگ کے جوڑے میں ملبوس شاداں ہنستے ہنستے دوہری ہوگئی۔ جیسے گل لالہ کی شاخ پر کوئی فاختہ آن بیٹھی ہو: "میں تو گلاس میں پانی تک بھر کے نہیں پیتی تھی۔ ماں ناراض ہوتی کہ پرائے گھر جا کر کیا کرے گی...... پر ابا ہمیشہ میری طرفداری کرتے"

حسن کو شرمندگی کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوا کہ وہ کیسے گذشتہ دو برس سے شاداں کے گھر کے ہر نوالے پر شیشے کے ہاتھوں کے تصور میں کھو جاتا تھا......!!

اس نے بات بنائی: "میرا مطلب ہے شاداں جن ہاتھوں سے تم......!!"

شاداں نے حسن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا!!!

(۵)

چار برس کے بعد حسن پتوکی سے لاہور جانے کے لئے ریل میں سوار ہوا تو اس کی ذہنی کیفیت اس قاتل کی سی تھی جسے معلوم ہوا ہو کہ اس کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی گئی ہے۔

اسکی جیب میں بازیافتہ عورتوں کے کیمپ سے آئی ہوئی سرکاری چٹھی پڑی تھی۔

دوسرے دن رات کو لاہور سے آنے والی ٹرین سے حسن پتوکی اسٹیشن پر اترا تو شاداں میلی کھدڑ کی چادر میں چہرہ چھپائے اسکے ساتھ تھی۔ شاداں کی چال سے کئی سالوں کی جسمانی تھکاوٹ کا پتہ چلتا تھا اور اسکے پاؤں نئے سینڈل میں بے قرار تھے جو حسن نے اسی روز لاہور سے خرید کر دیئے تھے دراصل شاداں کے پاؤں اب جوتی کے عادی نہیں رہے تھے "اخنور کے پل پر جب گہنا سنگھ نے "ست سری آکال" کا نعرہ لگا کر اسے اٹھایا تو اس جدوجہد میں اس کی جوتی پاؤں سے ایسی اتری جیسے کسی کی آبرو اتر جاتی ہے اور تیرہ برس تک اسے جوتی پہننے کا ہوش نہ آیا۔

شاداں لاہور سے پتوکی تک سارا حال حسن کو سنا چکی تھی کہ کیسے تیرہ برس پیشتر وہ قافلہ جو سرینگر سے پاکستان آرہا تھا اور جس پر "اخنور کے پل" پر مسلح ڈوگروں اور سکھوں نے حملہ کیا تھا اور جس حملے میں استاد نیاز محمد اور اسکی بیوی اور حسن کے بھائی غلام حسین کی دس سالہ لڑکی اور ہزاروں دوسرے مارے گئے تھے۔ خود حسن اور غلام حسین بری طرح زخمی ہو گئے تھے...... اس حملے میں جموں کے قریب ہی ایک گاؤں کا سردار گہنا سنگھ شاداں کو اٹھا کر لے گیا تھا

شاداں حسن کو رو رو کر بتا چکی تھی کہ وہ ان تیرہ سالوں میں اسے ایک لمحے کیلئے بھی نہیں بھولی تھی۔ گہنا سنگھ اور اسکے تینوں بھائیوں نے اس عرصے میں اسکی ایسی کڑی نگرانی کی کہ وہ اس قید سے چھٹکارا نہ پاسکی۔ اور جب بھی پاکستان کے فوجی ٹرک آتے تو ان کی عورتیں اسے زبردستی اناج والی کوٹھری میں بند کر دیتیں۔ لیکن ایک رات اسے موقع مل گیا

ور وہ گاؤں سے نکل کر جموں والی سڑک پر آگئی اور پھر وہ دن کو کھیتوں میں چھپ کے اور راتوں کو سفر کرتی ہوئی آخر
یران صاحب پہنچ کر پاکستان کے سرحدی فوجیوں کے پاس آنکلی۔
شاداں نے حسن کو بتایا کہ وہ فوجی کیسی ہمدردی سے اسکے ساتھ پیش آئے اور وہ فوراً لاہور کیمپ پہنچا دی گئی
یمپ والوں کو بیس دن کے بعد پرانے رجسٹروں میں حسن کی لکھوائی ہوئی نشانیاں اور پتہ ملا۔
شاداں نے کہا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ کیمپ والوں نے تمہیں خط لکھ دیا ہے۔ اور اب تم جلد ہی آکر مجھے لے
جاؤگے تو میں خوشی سے خوب روئی میرے جیسی کئی عورتوں نے مجھے ڈرایا کہ لوگ لینے نہیں آتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر حسن
دئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم آؤگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ضرور آؤگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر تم آگئے !!!
حسن بھی اکھنور کے پل پہ بچھڑنے کے بعد سے آج تک کے واقعات سرسری طور پر شاداں کو سنا چکا تھا کہ
یسے وہ اور غلام حسن کئی ماہ تک ہسپتال میں پڑے رہے اور ماں اور بھابھی کیمپ میں۔ آخر بھاگ دوڑ کر کے بتوکی میں تھوڑی
سی زمین اور مکان مل گیا ہے۔ حسن نے بتایا کہ بھائی زمین پر محنت کرتا ہے اور وہ اینٹوں کے بھٹے کی لاری چلاتا ہے
ماں کو اب مسلسل رونے سے رات کو بہت کم دکھائی دیتا ہے اور بھابھی تو ابھی تک سمجھتی ہے کہ اسکی بچی کہیں زندہ ہے
جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچے تو شاداں نے حسن کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"کیا بات ہے" حسن نے بہت دیر کے بعد شاداں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"ایک بات اور کہنی ہے" شاداں کی آواز حسن کو پہلے پہل شیشے کے ہاتھوں میں جھلکنے والے خوبصورتی کے عکس
کیطرح مرتعش محسوس ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!
"کہو" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حسن نے ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے جیسے مجبوراً کہا۔
شاداں حسن کے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔
حسن کچھ دیر یونہی بے حس و حرکت کھڑا رہا اور شاداں بس روتی رہی
آخر حسن نے بمشکل لبوں پر سے غیر مرئی بوجھ سرکایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
"پھر کیا ہوا ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر تو کیا کر سکتی تھی"
حسن کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس نے پوری قوت سے کسی کا منہ بند کر رکھا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!
اور حسن کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔
شاداں حسن کے پاؤں پر گر پڑی !!!

(۶)

شاداں کو گھر میں آئے ہوئے آٹھ روز ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں بستی کی عورتیں اسے آآ کر دیکھ گئیں تھیں
جیسے وہ قبر میں اتاری جارہی تھی کہ اٹھ بیٹھی ہو !!
حسن پہلے ہی گھر میں کم رہا کرتا تھا اور جب سے شاداں آئی تھی اسنے رات کو بھی گھر میں رہنا چھوڑ دیا تھا۔

اینٹوں کے بھٹے پر ہی مالکوں نے اسے ایک کوٹھری دے رکھی تھی۔ حسن صبح سے جو بھی ٹرے نکالنے شروع کرتا تو مغرب کے جا کر ٹرک کھڑا کرتا۔ مالکوں کو ایسا محنتی ڈرائیور آج تک نہ ملا تھا۔ اس لئے وہ حسن کی بڑی آؤ بھگت کرتے۔ حسن کبھی تو دوپہر کھانے کے لئے گھر چلا جاتا اور کبھی اس کوٹھری میں جھولا سی چارپائی پر ہی پڑا رہتا۔ رات ہونے پر آخر غلام حسین اسکا کھانا لے کر شروع شروع میں غلام حسین حسن کو سمجھایا کرتا کہ زیادہ سوچنا اچھا نہیں ہوتا اور اسے رات کو گھر میں سونا چاہئے لیکن پھر حسن کی تلخ باتیں سن سن کر اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اب اگر حسن ہنس کر بولتا تو غلام حسین بھی ہنسنے لگتا اور وہ اگر چپ رہتا تو غلام حسین بھی بات نہ چھیڑتا۔

حسن نے اپنی کوٹھری میں بیٹری کا ایک ریڈیو لگا رکھا تھا۔ رات کو عموماً بھٹے کے مزدور اسکی کوٹھری میں اپنی اپنی چارپائیاں نکال کر آ جاتے۔ اور ریڈیو کی خبریں وہ لوگ یوں دم بخود ہو کر سنتے جیسے جمعہ کی نماز کا خطبہ سن رہے ہوں لیکن حسن کو خبروں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا وہ صرف آنے والوں کی خاطر خبریں لگایا کرتا اور اس دوران میں اسکے ماتھے پر بیزاری سے شکنیں پڑی رہتیں۔ وادی کے لوک گیتوں سے حسن کو عشق تھا اور ملکہ پکھراج کی آواز تو حسن کو رلا دیتی تھی۔ پہاڑی ٹپہ سنتے سنتے وقت یوں محسوس ہوتا جیسے اسکا دل دھوپ میں برف کے ٹکڑے کی طرح پگھل رہا ہو۔ لیکن حسن کبھی کبھی بالکل بہل جاتا اور گھر میں رہنے لگتا۔ دوپہر کا کھانا گھر جا کر کھاتا۔ شام کو سورج ڈھلتے ہی ٹرک چھوڑ کر گھر چلا جاتا۔ ان دنوں بھٹے کے مالک بتا دیتے کہ ابھی آجکل بہت خوش ہو۔ اور حسن یوں جھینپ جاتا جیسے اسے کسی بزرگ نے طوائفوں کی گلی سے نکلتے دیکھ لیا ہو۔

حسن گھر میں ماں بھائی اور بھاوج سے باتیں کرتا۔ ان کے بچوں سے کھیلتا۔ گھر والے دل میں دعائیں مانگتے کہ کاش حسن کی یہ کیفیت کبھی ختم نہ ہو مگر تیسرے چوتھے روز ہی حسن کے چہرے پر ایکا ایکی وہی مردنی چھا جاتی۔ اسکے لہجے میں وہی جھنجھلاہٹ اور رکھائی پیدا ہو جاتی اور وہ دن رات بھٹے پر رہنے لگتا۔

شاداں کو گھر پہنچاتے ہی وہ خود بھٹے پر چلا گیا اور آدھی رات تک بھٹے کے قریب ہی نہر کے کنارے لیٹا بھرے آسمان کو تکتا رہا۔ اور پھر جب اوس نے اسکے کپڑے گیلے کر دیئے اور وہ کئی ٹوٹتے ہوئے تارے دیکھ چکا اور جھینگر اس کے سر پر منڈلانے لگیں اور قریب ہی گھنے جنگلے میں کیکروں پر الو ایک دوسرے کے مقابلے میں چیخنے لگے تو اس نے بنڈل میں سے آخری بیڑی نکال کر سلگائی اور کوٹھری میں جا کر چارپائی کے جھولے میں لیٹے آپ کو گرا دیا۔

اور اسکے بعد اسکی ہر رات یونہی گزرنے لگی۔ وہ بھائی کے بار بار کہنے پر چند لمحوں کے لئے گھر جاتا تو شاداں کو پہلے کی نسبت زیادہ زرد، اداس اور پریشان نظر آتا۔ شاداں کی نظریں مایوس ہو کر حسن کے چہرے سے پھسل جاتیں اور حسن کو گھر کے اندر ان چند لمحوں میں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ شعلوں میں گھرا ہوا ہو!!

شاداں کی طرف وہ کن انکھیوں سے دیکھتا اور اگر کبھی اتفاق سے شاداں سے اس کی نظریں مل جاتیں تو وہ گھبرا جاتا جیسے بھرے بازار میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو!!

نہر کے کنارے کے سوا ہر جگہ ہر وقت اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی گلہری اسکے سینے میں بیٹھی بڑے اطمینان سے ہولے ہولے اسکے دل کو کتر کتر کر کھا رہی ہو!!!

—

شاداں کے کپڑے بدل دیئے گئے، بال ریٹھوں سے دھو دیئے گئے۔ غلام حسین نے اس کی رو بہتے روتے سوجی (آ)نکھوں کے لئے دوا بھی لا دی تھی مگر وہ اب بھی ہر وقت چپکے چپکے آنسو بہاتی رہتی تھی۔

غلام حسین کی بیوی نے ایک روز جب وہ باہر جا رہا تھا تو کہا "شاداں روتے روتے مر جائے گی۔ . . . . . کچھ"

"ہاں۔ ہاں . . . . . سب ٹھیک ہو جائے گا میں نے مولوی صاحب سے بات کی تھی . . . . . . دوبارہ نکاح کرنا ہوگا"

"مگر . . . . ." غلام حسین کی بیوی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ غلام حسین ابھی تک وہ اسی (الجھ)ن میں تھا کہ حسن سے کس طرح اس بارے میں بات کرے۔

دسویں دن غلام حسین دوپہر کو بیٹے پر گیا تو حسن گھر کی طرف آ رہا تھا حسن اسے دیکھ کر خلافِ معمول مسکرایا تو غلام (حسین) کے دل کو دھچکا سا لگا راستے بھر حسن مسکراتا، ہنستا اور باتیں کرتا رہا۔ اس نے شاداں کے سہوا اناج کی قیمت (سے لے) کر ماں کی آنکھوں کے اپریشن تک کی باتیں کر ڈالیں۔ غلام حسین سر جھکائے اسکے ساتھ چل رہا تھا۔

پھر حسن نے وہ اہم بات کہی جو اسکے لب تک آنے کے لئے مچل رہی تھی!

"میں نے آج ایک فیصلہ کر لیا ہے"

حسن نے فاتحانہ نظروں سے اپنے اعلان کے ردعمل کے لئے بھائی کی طرف دیکھا۔ مگر اسکے چہرے پر وہی افسردگی (سنج)یدگی طاری تھی۔

"خیریت تو ہے" حسن نے گھبرا کر پوچھا۔

غلام حسین نے گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "شاداں کہیں چلی گئی ہے"

حسن گھر میں چیخ رہا تھا۔ ایک ایک پر برس رہا تھا۔ "شاداں کہاں گئی"؟ . . . . . "شاداں کیوں چلی گئی"؟ . . . (کسی) نے کچھ کہا تھا"؟

"بھابھی جواب دو شاداں کیوں چلی گئی؟"

"وہ ایک نہ ایک دن ضرور چلی جاتی . . . . . ."

"کیوں . . . . . . آخر کس لئے؟" حسن بھابھی کے شانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے چیخا۔

غلام حسین کی بیوی کے ہونٹ خوف سے لرز گئے۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے حسن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "(وہ) ہر وقت کہتی تھی کہ مجھ سے بڑی بھول ہوئی . . . . . میں سمجھتی تھی کہ تم لوگوں سے ملتے ہی میری بے چینی ختم ہو جائے . . . . . پر مجھے کیا پتہ تھا —"

"کیا نہیں پتہ تھا اسے بھابھی؟"

حسن کی کیفیت اس راہگیر کی سی تھی جس پر ہندو مسلم فسادات کے دنوں میں کسی نے اچانک تیزاب پھینک (دیا ہو)!!

"مسلی دا" —— بھابھی کے بند ہونٹوں سے یہ لفظ یوں نکلا جیسے پکے ہوئے پھوڑے کو ذرا سا دبانے سے

آلائش کی پچکاری اچھل پڑتی ہے ...... !!

اور وہ دوپٹے میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

حسن کے اصرار پر بمشکل آنسو روکتے ہوئے اسنے بتایا کہ ان چاروں سکھ بھائیوں کے ہاں جہاں شاداں رہتی تھی....... شاداں کا ایک ڈیڑھ برس کا بچہ ہے جسے وہاں سب "میلی دا" کہتے ہیں۔ شاداں اپنے بچے کے بغیر نہ رہ سکی اور اسکے پاس لوٹ گئی۔

سب سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے اور غلام حسین کی بیوی اتنی مشکل اور شرمناک بات کہہ کے یوں محسوس کر رہی تھی جیسے کسی جانگسل تکلیف سے نجات حاصل کر چکی ہے اور وہ سوچ رہی تھی کہ اب ان لوگوں کو کیا بتلائے کہ شاداں کیسے رات دن اپنے بچے کی یاد میں تڑپتی تھی۔ وہ کیسے رو رو کر مجھے سناتی تھی کہ "بھابھی اس بدنصیب کا پتہ نہیں کیا حشر ہوگا میرا لال میرے لئے بلکتا ہوگا...... ہائے میں کتنی ظالم ہوں اسے سوتا چھوڑ کر چلی آئی ...... اتنے دن کیمپ میں آنکھ کا پانی نہ ٹھہرا تو سمجھتی رہی کہ حسن سے مل کے سب دکھ دور ہو جائیں گے ...... مجھ ابھاگن کو یہ نہ پتہ چلا کہ یہ آنسو اس بدنصیب کیلئے ہیں مجھے یہ بھی تو نہیں پتہ کہ ان چاروں میں اسکا باپ کون ہے ...... سارے محلے اور گھر کے بچے اس ننھی سی جان کو "میلی دا"، "میلی دا" کہہ کر ہنستے ہیں ...... میں تو اسے ایک منٹ کے لئے اپنی گود سے نہیں اتارتی تھی ...... بڑی سردارنی نے مجھے اس بات پر جمیٹوں تک سے مارا کہ اسے اتار کر کام کیا کروں   بچے اسے مارتے تھے ...... کوئی اسکی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتا تھا ...... تو کوئی اسکی آنکھوں میں انگلیاں گھونپتا ...... پتہ نہیں کس حال میں ہوگا کہیں مر نہ گیا ہو ...... نہیں نہیں بھابھی خدا نے کسی کے دلمیں رحم ڈال دیا ہوگا ...... میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے ...... ہر وقت یوں لگتا ہے جیسے ابھی خون کی قے کردوں گی ...... کاش میں اپنے بچے کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں کیسی ستمگر قدم ہوں بھابھی حسن کو آکے پریشان کر دیا ...... دیکھتی ہو! وہ کتنا غمگین ہے ...... میری وجہ سے وہ گھر میں نہیں رہتا ...... ٹھیک ہے میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے ...... چلتے وقت یہ نہ سوچا کہ اب میں پہلی سی شاداں نہیں رہی "...... غلام حسین کی بیوی کے ذہن میں شاداں کی ایسی بیسیوں باتیں گونج رہی تھیں ...... آخر اس نے حسن سے کہا "حسن یہ شاداں وہ نہیں تھی جسے تو لے کر قافلے کے ساتھ چلا تھا۔ شاداں اب ماں بن چکی ہے اور اسنے کسی سانپ کو جنم نہیں دیا۔ وہ تیری طرف سے مایوس ہو گئی تھی اور ہر آنسو اسے "میلی دا" کی یاد دلانے لگا تھا۔ میرے سمجھانے کا اسپر کوئی اثر نہیں ہوا تیرا خیال اسے سب کچھ بھلا کر جموں سے یہاں تک لے آیا "...... تیری "ہی چپ" نے اس کی مامتا کی آگ کو بھڑکایا اور اسے "میلی دے" کے پاس لے گئی ...... !!!

غلام حسین کی بیوی حسن کو ابھی اور سمجھانا چاہتی تھی پر وہ اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

(۸)

حسن لاہور سے سیالکوٹ اور وہاں سے میراں صاحب کی سرحد تک گیا۔ اس نے راہگیروں، فوجی سپاہیوں اور کسانوں سے شاداں کا پتہ پوچھا۔ وہ گاؤں گاؤں پھرا۔

آخر کئی دنوں کی تلاش کے بعد ایک کھیت کے کنوئیں پہ بیلوں کو ہانکنا چھوڑ کر ایک کسان نے اسے بتایا کہ ہاں
ر دن ہوئے رات کو سرحد پار کرنے کی کوشش کرتی ہوئی اسی حلیئے کی ایک عورت گولی کا نشانہ بن گئی تھی . . . . .
رہم گاؤں والوں کو اسکی شناخت کے لئے بلایا گیا تھا

حسن نے بے اختیار ہو کر کسان کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے

"تم نے لاش دیکھی تھی "؟

کسان نے اثبات میں جواب دیا۔ حسن نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسنے نمناک نظروں سے کسان
طرف دیکھتے ہوئے پوچھا !

"کیا تم نے اسکے ہاتھ بھی دیکھے تھے "

کسان نے مشکوک نظروں سے حسن کی طرف دیکھا۔

"ہاں . . . . ہاں . . . . ہاتھ . . . . . . کیا تمہیں اسکے ہاتھوں میں اپنا عکس نظر آیا تھا . . . . .
اسکے ہاتھ شیشے کے تھے "؟

"واہ مور کھا" کسان نے ترحم آمیز ہنسی کے ساتھ اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بیل ہانکنے لگا !!!

(۹)

ریل کی رفتار تیز ہو رہی ہے۔ حسن اپنے مکان کی چھت پہ کھڑا ہے۔ حسن کو یوں لگ رہا ہے جیسے ریل کے پہیوں
رانجن کے شور نے مل کر "میلی دا" "میلی دا" کی رٹ لگا رکھی ہے۔ وہ چیخ کر، اچھل کر، فضا میں ہاتھ پھیلا کر ریل
مسلسل گالیاں دے رہا ہے - - - !!

آخر غلام حسین اسکی پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر غم آلود لہجے میں کہتا ہے "چل بھئی چل اب نیچے اتریں - - - وہاں
شے کے ہاتھ ہیں "

"کہاں ہیں" شیشے کے ہاتھ". . . . . چلو! کہاں ہیں" شیشے کے ہاتھ "
اور حسن سب کے ساتھ نیچے اترنے لگتا ہے . . . . !!!

نذرِ غالب

(لیث قریشی کے زیرِ ترتیب مجموعۂ کلام "قطرہ و قلزم" سے)

آرامِ جاں ہے سوزِ تمنا کہیں جسے
وہ درد مل گیا کہ مداوا کہیں جسے

کون اس ہما ہمی میں تلاشِ سکوں کرے
نیرنگِ حادثات ہے دنیا کہیں جسے

وہ گردِ انقلاب اڑی ہے زمانہ میں
کجلا گیا ہے شہرِ تمنا کہیں جسے

ہر لحظہ گھٹ رہا ہے بجا خواہشوں کا دم
پھر کون اٹھائے نازشِ بیجا کہیں جسے

سب سے یہ اجتناب ہمیں خود نہیں پسند
لیکن کوئی ملے تو۔ ہم اپنا کہیں جسے

ہے کب نصیب دورِ پُر آشوب میں ہمیں
وہ دورِ دورِ ساغر و صہبا کہیں جسے

ذرہ میں کائنات نظر آ رہی ہے لیث
ہے اک عذاب دیدۂ بینا کہیں جسے

صباؔ اکبرآبادی

جب ہمیں بھولے سے حرفِ مدعا یاد آگیا
اُس نے تیور اسطرح بدلے خدا یاد آگیا

چھا گیا اک نشہ انکی تلخیٔ گفتار سے
آج پھر چھوڑی ہوئی مئے کا مزا یاد آگیا

پھر تمہاری چارہ سازی کے چھڑے ہیں تذکرے
پھر ہمیں اپنا دلِ درد آشنا یاد آگیا

اسطرح بیٹھے ہیں دانتوں میں زباں دابے ہوئے
جیسے انکو اپنا پیمانِ وفا یاد آگیا

غنچے کھلتے، پھول بنتے، خاک ہوتے، دیکھ کر
حالِ دل از ابتدا تا انتہا یاد آگیا

ہائے اُس کم بخت کی موجِ بلا میں کشمکش
ڈوبنے سے پہلے جسکو ناخدا یاد آگیا

دیکھ کر اِن خواہشاتِ دل کو دامنگیر دل
اُن کا دامن اپنا دستِ نارسا یاد آگیا

جانتا ہوں خوب کعبے کی زیارت کا ثواب
کیا کروں گا میں جو تیرا نقشِ پا یاد آگیا

کیا پشیمانی ہوئی تھی اُنکو ان سے مانگ کر
ہر دعا کے بعد انجامِ دعا یاد آگیا

جب قفس میں آئی گلشن سے کبھی ٹھنڈی ہوا
ہم کو اپنا آشیاں جلتا ہوا یاد آگیا

ساتھ میں لائی تھی کتنی راحتیں غربت کی دھوپ
سایۂ دیوارِ جاناں کا مزا یاد آگیا

پتھروں سے سر کو ٹکرانا کوئی آساں نہ تھا
کی بتوں کی بندگی لیکن خدا یاد آگیا

آہ کرتا ہوں تو دنیا پوچھتی ہے اے صباؔ
خود فراموشِ محبت آج کیا یاد آگیا

ابوظفر صہبا

اب درد کی دنیا بھی ہے دل جنتِ غم بھی
اے چشمِ کرم مالکِ کونین ہیں ہم بھی

کم کیف جوانی سے نہیں عالمِ غم بھی
ہیں آپ بھی اک رنگ میں اک حال میں ہم بھی

تم ساتھ ہو منزل پہ پہنچ جائیں گے ہم بھی
رستے میں اجالا ہو تو اٹھتے ہیں قدم بھی

وعدہ وہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ توبہ
آجائے یقیں دل کو نہ کھائیں جو قسم بھی

مدت سے ہے اک ربطِ حسیں آپ میں ہم میں
اب تک مگر انجان سے ہیں آپ بھی ہم بھی

وہ بات ترے سامنے کیا آئے زباں پر
جس بات کو لکھتے ہوئے رکتا ہے قلم بھی

میں نے تو ہر اک گام پہ دنیا کا دیا ساتھ
دنیا نہ چلی ساتھ مرے ایک قدم بھی

سمجھو مجھے موجود بھی معدوم بھی صہبا
اک وہم کے دو نام ہیں ہستی بھی عدم بھی

تسلیم اللہ فہمی

ملوف مے خانہ بار بار کریں کچھ تو صم خاطر بہار کریں

قول و اقرار آپ کا معمول کتنے وعدوں کا اعتبار کریں

عقل اور عشق کی الگ راہیں راہ بر کس کو اختیار کریں

جن کو مرنے کا انتظار نہ ہو زندگی کا وہ اعتبار کریں

کیوں بہائیں فراق میں آنسو کیوں زمانہ کو رازدار کریں

دل بھی اپنا نہیں رہا، افسوس! کہئے اب کس کا اعتبار کریں

اعتماد اپنے آپ پر ہے تسلیم

کیوں نہ قسمت سے کارزار کریں

رعنا اکبر آبادی

فنا کا خوف زمیں سے نہ آسماں سے مجھے وہ اک نگاہ مٹا دیگی دو جہاں سے مجھے

یہی امید تھی گلشن میں آشیاں سے مجھے دھواں بنا کے اڑائیگا آشیاں سے مجھے

یہ اعتبار ہے جیسے مرے رفیق ابھی ستارے توڑ کے لا دینگے آسماں سے مجھے

پڑا ہوں در پہ ترے داغ مستقل بنکر اٹھا سکے تو اٹھا اپنے آستاں سے مجھے

چمن میں کیا کوئی ایسا مقام ہے صیاد نظر نہ آئے مرا آشیاں جہاں سے مجھے

کبھی کا اپنے خیالوں میں کھو چکا تھا میں نہ جانے ڈھونڈ لیا آپ نے کہاں سے مجھے

نسیم صبح کا جھونکا نہیں تھا آندھی تھی وہ اک ہوا جو اڑا لائی آشیاں سے مجھے

کہیں سلام نہ کر لوں میں انکو محفل میں نظر اٹھا کے نہ دیکھا اسی گماں سے مجھے

وہ کیسا چور تھا محفل میں جسکی نظروں نے چرا لیا مری نظروں کے درمیاں سے مجھے

مری لحد کو بھی دو گز جگہ نہیں ملتی زمین بھول گئی لے کے آسماں سے مجھے

مکینِ دل نے پکارا ہے غالباً رعنا
یہ کون دیتا ہے آواز لامکاں سے مجھے

کرار نوری

بس ایک بار محبت میں دل ہنسا کیا ہے یہی لگن ہے کہ ہنسنے کا مدعا کیا ہے

ری نگاہ نے سب کچھ تو کہہ دیا تم سے اب اس کے بعد زمانے سے پوچھنا کیا ہے

ہ وفا میں تو اب میرے ساتھ ساتھ بھی چل فقط نگاہ محبت سے دیکھنا کیا ہے

ب اس تعلقِ خاطر کی لاج رکھنی ہے وہ پوچھتے ہیں کہ مجھسے تمہیں گلہ کیا ہے

بدل رہا ہے زمانہ بدل رہی ہے غزل روایتوں کے دلاسے میں اب رہا کیا ہے

ہیرانہ متانت سے جان دے دیں گے یہی ہے معجزہ اب اور معجزہ کیا ہے

بلند بانگ نوا گر تو گوشہ گیر ہوئے نہ جانے گوشہ نشینوں کا فیصلہ کیا ہے

لعنِ قفس کی یہ کہتی ہے کوئی آہ تو کر سکوت بول رہا ہے کہ سوچتا کیا ہے

بجا کہ عشق میں حق گو ہوا ہے قابل دار دروغ مصلحت آمیز کی جزا کیا ہے

تھی آج ان سے ملاقات آخری نوری

نہ جانے آج کہا کیا ہے اور سنا کیا ہے!

رسالوں میں

(اس ماہ)

فاران کراچی

مدیر فاران نے اپنے نقش اول میں فقہ اور اس کے مقاصد سے بحث کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ فقہ کا مزاج دینی مسائل میں تنگی پیدا کرنا اور شرعی پابندیوں کو بوجھل بنانا ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی دین کے مسائل میں رخصتیں تراشنا اور اباحتیں پیدا کرنا شروع کر دے۔ یا اسلامی ثقافت کو یورپین کلچر کا حاشیہ بردار اور خوشہ چیں بنا لیا جائے۔ مدیر فاران نے اس ضمن میں مسئلہ حجاب پر لمبی بحث کی ہے جبر و قدر کے عنوان سے رسول احمد صاحب نے اپنے مضمون میں یہ بتایا ہے کہ حکمائے یونان دو گروہوں میں منقسم رہے ہیں، ایک گروہ انسان کو مجبور محض سمجھتا رہا ہے۔ اور دوسرا مختار کل، مسلمانوں میں بھی یہ بحث چھڑی اور جبریہ و قدریہ دو گروہ وجود میں آگئے اور پھر اشاعرہ و معتزلہ کی ہنگامہ خیز بحثیں جاری رہیں اور دونوں نے قرآن و احادیث سے اپنے اپنے نظریئے پر دلائل پیش کئے آج یورپ کے فلسفیوں میں اسپینوزا جبری اسکول کا علمبردار ہے اور ہیگل قدری اسکول کا۔ صوفیوں میں رومی نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش ہے جس میں دونوں مبتلا ہیں انہوں نے بتایا ہے کہ تقدیر قوانین الہی کا نام ہے جو اٹل ہیں اور زندگی کو ان قوانین کے مطابق ڈھالنا انسان کی فطرت اور اسکی تقدیر ہے۔ تقدیر کے قلم نے یہ لکھا ہے کہ ہر کام کا انجام اس کی ماہیت اور نوعیت کا نتیجہ ہوگا۔ ظلم کا نتیجہ ادبار، عدل کا نتیجہ اقبال، تقدیر خدائی میزان ہے اس میں بلا سبب کمی بیشی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور جزا و سزا کی بنیاد اسی پر ہے۔ امریکہ فلسفی ولیم جیمس نے بھی اس بحث میں رومی کی حمایت کی ہے۔ ملا واحدی صاحب کا ایک مختصر مضمون اللہ اکبر بھی اس شمارے میں درج ہے، یہ ایک "تاثراتی پارہ" ہے اسے انشائیہ کہیے۔ خلاصہ یہ ہے۔ یہاں مالک کوئی بھی کسی چیز کا نہیں ہے۔ البتہ کام لینے کی صلاحیت ہو تو چند دن ان سے کام لے سکتے ہیں، مولانا مناظر احسن کی کتاب النبی الخاتم سے روح انتخاب بھی شریک اشاعت ہے جس میں مواخات اور اس کا فائدہ۔ اور اذان کی ابتدا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یاد رفتگان کے تحت مولانا احمد سعید کی وفات پر ایڈیٹر نے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ طالوت کے قلم سے ایک تاریخی کہانی "اور صلح ہوگئی" بھی اس شمارے میں درج ہے۔ جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے کی تاریخ جو شکیب ارسلان نے لکھی ہے اس سے یہ کہانی مرتب ہوئی ہے اور واقعہ اسپین کے شہر ماردہ کی جنگ کا ہے۔ جس میں موسی ابن نصیر خود شریک تھا۔

اشارہ پٹنہ

جنوری اور فروری کا مشترکہ شمارہ خاص نمبر کی صورت میں نکلا ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار، اور شری بیر چند پٹیل وزیر زراعت بہار، کے علاوہ قاضی عبدالودود، قاضی محمد سعید اور قیوم خضر مدیر اشارہ کی تصویریں، مضمون نگاروں کی تصاویر کے علاوہ شریک اشاعت ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب کے ادارہ تحقیقات اردو کے کتب خانے نے پٹنہ میں ایک اردو نمائش کی تھی جس میں قلمی کتابیں مشاہیر کے خطوط، ۱۸۸۵ء سے پہلے کے سرکاری محکموں اور عدالتوں کے کاغذات خطاطی اور کتابت کے نمونے اور ادب و زبان و تاریخ اردو سے متعلق فارسی اور ہندی کے نسخے، پرانے رسالے، اخبارات، ادبی گلدستے، ادبی انجمنوں کی روئدادیں، جنتریاں وغیرہ رکھی گئی تھیں، ادارۂ تحقیقات کے پاس اس وقت جو کتب خانہ ہے اس میں قیمتی اور کمیاب کتابیں سات ہزار سے زیادہ ہیں اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس ادارے کے کتب خانے اور نمائش کا افتتاح کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی افتتاحی تقریر بھی رسالے میں موجود ہے، قاضی عبدالودود کا مضمون "دیوان یقین مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم" اس شمارے میں بہت قیمتی ہے، انعام اللہ خاں یقین میر تقی میر کے ہمعصر تھے، اور مرزا مظہر جان جاں کے شاگرد، سنہ ۱۹۳۰ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے یقین کا دیوان مرتب کرکے اپنے طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ یہ مقدمہ بڑا پرزور تھا، مرزا فرحت اللہ بیگ نے سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی" کے بعد لکھا تھا تیس کتابوں کے تو نام بھی درج ہیں۔ قاضی صاحب نے اس مقدمے کا جائزہ لیا ہے اور اس پر تحقیقی بحث کی ہے اور غلطیاں واضح کی ہیں، اس مضمون کی یہ پہلی قسط ہے۔ ڈاکٹر سرمدیشور پرشاد نے "حاشیائی ادب" کے عنوان سے بحث کی ہے اور کہا ہے کہ حاشیائی آدمی اسے کہتے ہیں جو بیک وقت ایک سے زیادہ تہذیبوں میں رہتا ہے، لیکن ان میں سے ایک کی بھی تسلیم شدہ قدروں کو اپنا نہیں پاتا یا دوسرے لفظوں میں ان کے نظام اقدار کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تہذیبوں کے حاشئے پر ہی اپنی زندگی گذارتا ہے، عام طور پر ایسا حاشیائی آدمی اشتباہ، الجھن، نیم پخت عقیدہ اور نفسیاتی رکاوٹوں اور مزاحمتوں INHIBITIONS کے قلعے میں مقید رہتا ہے آج کے ادب کے رجحانات ایسے ہی منفی حاشیائی قدروں کو مثالی منوانے کے درپے ہیں، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جدید شاعری میں ہندوستانی موضوعات پیش کئے ہیں اور آزاد و حالی سے لیکر آج تک کے شعراء پر تبصرہ کیا ہے، اور بتایا ہے کہ مقامی موضوعات اور مقامی لب و لہجہ اردو شاعری میں انفرادی طور پر تو پہلے بھی تھا، لیکن نئی نسل کے شاعروں کے ہاں ایک حاوی رجحان کے سامنے آرہا ہے، مجاز، جذبی اور فیض اس دور کے اچھے شاعروں میں ہیں۔ لیکن ان کی لَے عجمی ہے، ہندوستانی نہیں، سردار جعفری اور کیفی نے زیادہ تر ہندوستان کے قومی اور سیاسی مسائل کے بارے میں لکھا لیکن ان کا مجموعی آہنگ بھی مولانا ظفر علی خاں اور جوش سے ملتا جلتا ہے، جس میں ہندوستانی رس بہت کم ہیں، میرا جی البتہ ہندوستانی مزاج رمز آشنا تھا، نئی نسل کے شاعر ہندوستانی رقص، موسیقی اور دیو مالا سے روز بروز زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں، کالی داس، تلسی، سورداس، کبیر، ودیاپتی، ٹیگور وغیرہ سے متاثر ہو رہے ہیں یا مثلاً میر و نظیر کی اہمیت محسوس کی جارہی ہے، فراق گورکھپوری نے اردو شاعری میں ہندوستانی روح اور کلچر سمونے کی جو کوشش کی ہے اس کے

غالب شعری رجحان بننے کا وقت اب آیا ہے اس رجحان کے نمائندہ، ڈاکٹر مسعود حسین، مختار صدیقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، ابن انشا اور ناصر کاظمی ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے پرویز شاہدی کی فنکاری کے عنوان سے ایک نامکمل تنقید لکھی ہے یہ معروضی اور موضوعی مطالعہ ہے، ارتقائی نہیں، انہوں نے لکھاہے کہ کامیاب شاعری کیلئے ضروری ہے کہ موضوع یا تجربہ شعریت اختیار کرلے شعریت روح فن ہے، اور موزوں ہیئت اس کا بدن، انہوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ بعض انقلابی نظمیں یا نظموں کے بعض بند پرویز نے بہت اچھے کہے ہیں لیکن وہ اگر خالص رومانی شاعری کرتے یا مناظر فطرت کی آئینہ سامانی کی طرف متوجہ ہوتے تو اردو اور اردو ادب کا سرمایہ گرانقدر بنتا۔ فصیح الدین بلخی کے قلم نے اجاگر چند الفت عظیم آبادی، پر روشنی ڈالی ہے ان کی فارسی اور اردو غزلوں کے نمونے دیئے ہیں، وہ شیخ علی حزیں اور ملا محمد علیم تحقیق کے ہم عصر تھے، شیخ حزیں سے اپنی غزل پر اصلاح بھی لی ہے، الفت نے محمد شاہ کے جلوس سال ہشتم پر سکہ بھی لکھا تھا اس جلوس کا سال ۱۱۳۸ھ ہے (یہ زمانہ میر تقی و خواجہ درد کی پیدائش کا ہے) محمد ایوب شمیم ندوی نے علامہ سید سلیمان ندوی پر ایک چھوٹا سا اچھا مضمون لکھا ہے جس سے ان کی زندگی پر ایک سرسری مگر واضح روشنی پڑتی ہے، (معارف سید سلیمان نمبر اس مضمون کا ماخذ ہے) ناظر کاکوروی نے افسانوی شعور کے عنوان سے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ آج جدید افسانہ نگاروں میں ہمہ جہتی تنوع اور رنگین پس منظر کے آثار صحیح پائے جاتے ہیں۔

خیال کامٹی

حفیظ الکبیر قریشی نے "پریم اور اسکی شاعری پر ایک اجمالی نظر" میں نوجوان شاعر پریم وار برٹنی پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں اور اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے، کہا ہے کہ پریم بنیادی طور پر رومان اور محبت کا شاعر ہے لیکن ابھی اس کے غم جاناں اور غم دوراں پر غم ذات ہی کا پرتو ملتا ہے اور یاس کا غلبہ۔ افسانوں اور غزلوں کے علاوہ اخبر میں، کلچر کے تحت "انڈونیشیا کے رسم و رواج" پر دیش بانو نے آرسوئے ہارڈ حنو کے مضمون کا ترجمہ پیش کیا ہے جس میں پیدائش موت اور شادی سے متعلق کچھ رسم و رواج کا تذکرہ ہے۔

نوائے ادب بمبئی

اس شمارے میں پہلا مضمون قاضی عبدالودود کے قلم سے "بیاض عنایت حسین خاں مہجور بنارسی" ہے، یہ علی ابراہیم خاں خلیل مصنف گلزار ابراہیم کے پوتے تھے ان کا خطاب اقبال الدولہ تھا۔ دوسرا مضمون سید محمود حسن قیصر امروہوی نے لکھا ہے "کلام مصحفی پر اسیر کی اصلاح" مصحفی کا دیوان ۱۲۹۶ھ میں تاج المطابع رام پور سے شائع ہوا تھا، اور سب اسی سے واقف ہیں لیکن مضمون نگار نے لکھا ہے کہ رضا لائبریری رام پور میں مصحفی کے کئی دیوان قلمی شکل میں محفوظ ہیں، ان نسخوں سے اس مطبوعہ دیوان کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جگہ جگہ تصحیح کے نام سے اشعار میں اس قدر ترمیم اور الفاظ میں اس حد تک تصرف کیا گیا ہے کہ مصحفی کے کلام کے اصلی خد و خال پوشیدہ ہو گئے ہیں، اسیر مصحفی کے شاگرد تھے، اور امیر مینائی کے استاد، مضمون نگار نے لکھا ہے کہ بعض اصلاحوں نے شعر کو پست کر دیا ہے، بعض نے بلند کر دیا ہے۔ اور بعض نے نفس مضمون ہی بدل دیا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اچھے اشعار اسیر نے انتخاب میں شامل ہی نہیں کئے۔ نصیر الدین ہاشمی کا مضمون حیدرآباد میں جنگ آزادی کا اردو ادب بھی شریک اشاعت ہے، اس مضمون میں انہوں نے ۱۸۵۷ء سے

۱۹۴۷ء تک کی اردو نظم و نثر کے چند نمونے دکھائے ہیں، ڈاکٹر اے لے ناجی کا مضمون اردو تھیٹر کا معمار، جگناتھ شنکر سیٹھ بھی معلوماتی ہے، جگناتھ شنکر ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے بمبئی میں اسکول اور کالج قائم کئے، اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کی، اردو کا پہلا ڈرامہ راجہ گوپی چند اور جلندھر، ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ء کو ہوا تھا۔

منادی دہلی

فروری کے شمارے میں "اور جو کچھ ہوا وہ سب نے دیکھ لیا" کی سرخی سے خواجہ حسن ثانی نے رسالہ ساقی کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی کے ایک مضمون پر کڑی تنقید کی ہے، شاہد صاحب نے ایک مضمون میں دلی کے ۱۹۴۷ء کے انقلاب کی داستان بیان کی تھی جس میں لکھا تھا کہ "دلی کے تقریباً سارے مزارات کی بے حرمتی کی جا چکی تھی۔۔۔۔ شاہ ابوالعلاء (شاہ ابوالعلاء) کا جہاں مزار تھا وہاں پیاؤ لگ گئی۔۔۔۔۔ ایک بدعقیدہ شخص نے کہا یہ انہیں بزرگوں کے مزار ہیں جن سے منتیں مرادیں مانگی جاتی ہیں، حیف ان سے اپنی ہی قبریں نہیں بچائی گئیں تو یہ اور کسی کی کیا مدد کر سکتے ہیں، خوش عقیدہ شخص نے کہا، یہ بزرگ یہاں تھے کہاں؟ سب حج کو گئے ہوئے تھے، اب جو یہ واپس آئیں گے تو دیکھنا کیا ہوتا ہے! اور جو کچھ ہوا وہ سب نے ہی دیکھ لیا"۔۔۔۔ خواجہ حسن ثانی لکھتے ہیں کہ شاہد احمد صاحب کا یہ آخری جملہ پڑھ کر مجھے ایک پادری کی بات یاد آ گئی جس نے مناظرہ میں مسلمانوں سے پوچھا تھا کہ تمہارے رسولؐ کے نواسے پر کربلا میں ایسا ظلم ہو گیا مگر خدا نے کچھ مدد نہ کی! اور اس کے جواب میں مسلمان مناظر نے کہا تھا جی ہاں یہ خدا تو ایسا ہی ہے اس نے تو اپنے بیٹے کو سولی پر چڑھوا دیا، اپنے رسول کے نواسے کی کیا مدد کرتا۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ اس سوال جواب کو ناسمجھی اور بے عقلی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اصل میں انسانوں کی اکثریت نے خداپرستی کی حقیقت کو سمجھا ہی نہیں، ایمان بہت سے لوگوں کے حلق سے نیچے نہیں اتر سکا، یہ سب کے سب خدا کو بھی اپنی اس دنیا کا کاروبار سمجھتے ہیں اور مذہبیت کو رائج الوقت سکہ قرار دے کر اس سے خرید و فروخت کرنی چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات بھی اللہ کی ایک نشانی تھے جن کو اللہ نے توفیق دی ان کا ایمان فسادات کو دیکھ کر اور بھی پختہ ہو گیا اور جو ناسمجھ تھے وہ یا تو اپنی کھوٹی عبادتوں کا عوض ڈھونڈنے لگے اور دیکھنے لگے کہ مذہب کے بازار میں کیا منافع ملا۔ یا لنگڑے لولے اور بے دقوفوں کی حیثیت میں رہنے والے اپاہجوں کی طرح انتظار کرنے لگے کہ اولیاء اللہ حج سے واپس آ کر انہیں بچا لیں، لیکن ان دونوں سے زیادہ بے عقلی کی بات اس نے کی جس نے ان ناسمجھوں کو سمجھدار خیال کیا اور یہ طعن کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ اور جو کچھ ہوا وہ سب نے دیکھ لیا۔

اسی شمارے میں مولانا شاہ غلام حسنین صاحب چشتی کے قلم سے "بنگالہ میں دو سو برس پہلے کی اردو کا ایک نمونہ" بھی شریک ہے، ضلع بیربھوم مغربی بنگال کی ایک بستی حضرت پور ہے جہاں مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال بخاری کی خانقاہ ہے اور اس خانقاہ کے پیرزادے سید جلال کی اولاد، ان کے ایک بزرگ حضرت سید احمد عہد شاہ جہانی میں اوچھ (نزد ملتان) سے یہاں آ کر مقیم ہوئے تھے، موجودہ پیرزادے سید شاہ محمد رضا بخاری ہیں، ان کے قدیم مخطوطات اور سفینوں میں نعتیں غزلیں اور سلام اس عہد کی یادگار آج بھی موجود ہیں۔ ملا واحدی صاحب دہلوی کے قلم سے "میرے زمانے کی دلی" بھی اس شمارے میں شریک ہے، یہ سلسلہ ایک عرصہ سے چل رہا ہے اور خوب ہے، اب کے لقمان الملک حکیم نابینا

کا تذکرہ ہوا ہے۔ نئی گلستان کی سرخی سے حضرت خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے سے دلچسپ اقتباسات بھی درج ہیں اور آج سے تیس سال پہلے کی تاریخ کا روزنامچہ بھی، جو آج بھی تازہ معلوم ہوتا ہے، اخیر میں مولانا عبدالقادر بنگالی حق وار شاہ نیلم نظامی کا وہ مقالہ بھی درج ہے جو انہوں نے اپنی لڑکیوں کی شادی کی سالگرہ پر پڑھا تھا سالگرہ تفریحی اجتماعات اور ہنسی مذاق کی محفلوں کا دوسرا نام ہے لیکن نیلم صاحب نے اپنے مقالے سے سنجیدہ غور و فکر کی نہایت ہی خوبصورت اصلاح پیش کی ہے، مقالہ بہت جامع اور دلچسپ اور مفید ہے، "چار مہینے مسلمانوں کے دیس میں" خواجہ حسن ثانی نظامی کے سفرنامۂ پاکستان کا ایک حصہ ہے جس کی قسطیں پچھلے شماروں میں آچکی ہیں۔

المجلس کراچی۔

ادارۂ المجلس علوم قدیمہ و جدیدہ کی روشنی میں اسلام کے نظریۂ حیات عام فہم انداز سے پیش کرنے کے لئے قائم ہوا ہے، اس کے صدر جناب اسمٰعیل عبدالکریم مرچنٹ ایم اے ایل ایل بی ہیں، ماہنامہ المجلس جس کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۶۰ء میں نکلا ہے اسی ادارہ کا ترجمان ہے، صدر المجلس کے قلم سے اغراض و مقاصد اور عزائم کی وضاحت اس شمارے میں درج کر مولانا محمد ایوب دہلوی کا مضمون معراج، صوفی غلام مصطفےٰ کا مضمون، اسلامی توحید اور خدا کی وحدانیت، مولانا محمد تقی نجفی کا مضمون اسلام میں عدل کا مقام، مولانا وحید احمد بدایونی کا مضمون تصوف اور شاہ حیدر القادری کا مضمون رویا (خواب) علمی مباحث ہیں مضامین کے علاوہ غریب سالکی، ماہر القادری اور صوفی محمد عمر اظہر کی اسلامی نظمیں بھی شریک اشاعت ہیں، اس شمارے میں ادارہ المجلس کے قیام اور اس کے آغاز کار پر اہل علم حضرات کے پیامات خیر مقدم بھی درج ہیں جن میں وزیر خارجہ پاکستان مسٹر منظور قادر کا نام بھی شامل ہے۔

ادیب علیگڑھ

تازہ شمارہ جامعہ اردو کے امتحانات کے نتائج پر مشتمل ہے تاہم اس شمارے میں دو مفید مضامین درج ہیں، ایک محمد فرحت اللہ کے قلم سے مرزا غالب کی شاعری، دوسرا شبنم سبحانی کے قلم سے ہندوستان کی تہذیبی ترقی میں اردو کا حصہ موخر الذکر مضمون گذشتہ سے پیوستہ ہے اور اس شمارے میں بھی تمام نہیں ہوا ہے۔ میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا سے لیکر غالب و مومن بلکہ امیر و داغ تک کے تذکرے زیر بحث آئے ہیں اور ان کے کلام سے اخلاقی و تہذیبی قدریں پیش کی گئی ہیں، مقدم الذکر مضمون میں فرحت اللہ صاحب نے میرزا کے اشعار کی وہ تشریح پیش کی ہے جو انہوں نے خود سمجھی ہے وہ ایسی شرح لکھنا چاہتے ہیں جو مرزا غالب کے مفہوم سے قریب تر ہو۔

سوشل ریویو کراچی

یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے پاکستان سوشل ویلفیر لیگ کے زیر اہتمام نکلا ہے، خوبصورت ٹائیٹل اور تصویروں کے ساتھ، پچاس صفحات ہیں، سید وکیل احمد اس کے نگراں، اور ایس منانی اس کے مدیر ہیں، اس رسالے میں تمام مضامین سوشل ویلفیئر سے متعلق ہیں، جام جہاں نما، سماجی سرگرمیوں کی مختصر خبروں کا حصہ ہے، اور سید وکیل احمد کا مضمون "بچے جو قوم کی امانت ہیں" افتخار حسین کا مضمون، "بہبود دیؔ نابینا" عبدالغنی صدیقی کے قلم سے سماج کاری، مسعود احمد ہاشمی

کے قلم سے اسلام میں سماج کی اہمیت' اور ایس ایم اعجاز حسین کے قلم سے پاکستان کا مسئلہ آبادی اور اس کا حل یہ سارے مضامین سماجی سرگرمیوں پر لکھے گئے ہیں۔ مذہب اور تفریح علی حسنین شیفتہ کا مضمون ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کا اصول ممانعت معاشرے کو جراحت و نقصان سے بچاتا ہے۔ اخیر میں ایس متانی کا افسانہ قوس قزح کے پیچھے بھی شریک اشاعت ہے اور حضرت ثاقب کانپوری نشور واحدی اور نوشاد نوری کی غزلیں بھی۔

ثقافت لاہور۔

اس ماہ کے شمارے میں مرحوم خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم کا مضمون فنون لطیفہ شائع ہوا ہے' اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ فنون لطیفہ حسن و عشق کے بہترین مظاہر اور اخلاق عالیہ کے موثر عوامل بھی اپنے اندر رکھتے ہیں' اور ہر زمانے کا عالم یہ دیکھتا ہے کہ فن جذبات لطیف کی پرورش کر رہا ہے یا قلب و نظر کے لئے سامان ہوتا ہے' علماء نے فنون لطیفہ سے بے تعلق ایک تو اس لئے ظاہر کی کہ موسیقی جذبات انگیز ہے اور دنیا میں اکثر عشرت پسندوں نے اس کو ادنیٰ جذبات کی انگیخت کے لئے ہی استعمال کیا ہے' دوسرے اس لئے کہ علماء کی نظر طلوع اسلام کے دور پر تھی' ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں سقراط و افلاطون کے علاوہ حالی اور اقبال کی تنقید بھی پیش کی ہے۔ سائنس اور اسلام ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا مضمون ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ جدید سائنس کے تمام اساسی نظریات کی دراصل' اسلام ہی نے بنیاد ڈالی ہے اور اسے سیدھی راہ دکھائی ہے سائنس کی ضروری خصوصیات علم کا حصول' دوسرے سائنس کی بنیاد تجربات و مشاہدات نظریات اور انضباط اشیاء ہے' تیسرے تسلیم شدہ ہے کہ سائنس کا حیات انسانی میں بہت بڑا اور اہم حصہ ہے اور ان تینوں اہم خصائص کی بابت اسلام کا تصور واضح ہے۔ پروفیسر رشید احمد نے اس مرتبہ ابن تیمیہ کے سیاسی افکار پیش کئے ہیں' ابن تیمیہ ۶۶۱ھ مطابق ۱۲۶۳ء کو حران میں پیدا ہوتے تھے' ان کا نام احمد تھا' لقب تقی الدین اور کنیت ابوالعباس۔ تیمیہ ان کی والدہ کا نام تھا' ۱۳۲۸ء میں ۶۶ سال کی عمر میں وفات پائی' ساری عمر جہاد بالقلم میں معروف رہے' جہاد بالسیف میں بھی کسی سے کم نہ تھے' بے شمار کتابیں لکھی ہیں وہ مسلک کے لحاظ سے حنبلی ہیں۔ ابن تیمیہ ماوردی کے برخلاف امام میں اجتہادی صلاحیت کا ہونا ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ غزالی کے ہمنوا ہیں کہ امام اہل حل و عقد کی تقلید کرے البتہ اصابت رائے اس میں ضرور ہونی چاہئے۔ ابن تیمیہ کے نزدیک دین اور سیاست لازم و ملزوم ہیں' بشیر احمد ڈار نے عیسائی تصوف کے عنوان سے آگسٹائن کے حالات پیش کئے ہیں' آگسٹائن ۳۵۴ء عیسوی میں افریقہ کے ایک شہر تاگاسٹ میں پیدا ہوا تھا' وہ بڑا خطیب تھا' کارتھیج' روم اور میلان کے تعلیمی اداروں میں معلم بھی رہا تھا' "اعترافات" (کنفشنز) اس کی مشہور خود نوشت سوانح ہے۔ وہ مانوی حلقے میں شامل ہوا پھر وہاں سے روم گیا اور پھر میلان' اور مانویت چھوڑ کر فلسفہ تشکیک کا حامی ہو گیا' پھر فلاطینوس کے فلسفے کا مطالعہ کیا اور پھر ایک دن عیسائی ہو گیا' آگسٹائن کا خیال تھا کہ انسان فطری طور پر گناہگار پیدا ہوا ہے' عیسائی تصوف میں آگسٹائن کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ مضمون عیسائی تصوف کی تیسری قسط ہے۔ معشوق حسین خاں نے مصری دیومالا پر قلم اٹھایا ہے' اور مصری دیویوں اور دیوتاؤں کے حالات بیان کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ مصریات کے ماہر ڈاکٹر بج کہتے ہیں کہ قدیم اہل مصر دیویوں دیوتاؤں کے تصورات رکھنے کے باوجود خدائے واحد پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ اور اس خدا کا انہوں نے کوئی بت نہیں بنایا' ان کا عقیدہ تھا کہ کوئی

مہر نیمروز
کراچی

مئی ۱۹۶۰ء

جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۵

حسن مثنیٰ ندوی - علی اکبر قاصد - ابوالخیر کشفی

سید سلمان ندوی - عمر وارث خان - خالدہ فہمی ایم اے

قیمت

سالانہ:-	چھ روپے
ششماہی:-	تین روپے بارہ آنہ
فی پرچہ:-	آٹھ آنے (۸/)

پتہ

نمبر ۲۰۴ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی، ہاؤسنگ یونین ایریا۔ کراچی ۵

دفتر رسالہ مہر نیمروز، ۷۔ کوی روڈ کراچی

اس شمارے میں

حسن مثنیٰ ندوی، اڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے انجمن پریس میں چھپوا کر ۲۰۲ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی ۵ سے شائع کیا

پہلی کرن

امان اللہ خان

مئی سنہ ۱۹۶۰ء کا پرچہ مطبع کو جانے والا ہی تھا کہ اخباروں میں ایک چھوٹی سی خبر نظر آئی
افغانستان کے سابق بادشاہ امان اللہ خان کا بہ عمر ۶۸ سال سوئٹزرلینڈ میں انتقال ہوگیا۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ وہی امان اللہ خان ہیں جن کے نام سے کبھی اخبارات کے کالم بھرے ہوتے تھے۔ وہی امان اللہ خان جو کبھی سوا کروڑ انسانوں کے ملجاء و ماویٰ تھے۔ افغانستان ہی نہیں بلکہ ہندوستانی و پاکستانی مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا تھے کبھی ان کو ایک نظر دیکھ لینے کی تمنا لے کر لوگ کلکتہ سے بمبئی اور پٹنہ سے پشاور تک سفر کیا کرتے تھے۔ ہاں ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ان کے شاہانہ استقبال کے لئے شہنشاہ جارج پنجم بڑی دیر تک کھڑے رہے تھے۔ ایک وہ بھی وقت تھا کہ یہ جوان تھے، جواں سال، جواں بخت، جواں ہمت، اور مرحوم مولانا ظفر علی خاں ان پر نظمیں لکھا کرتے تھے۔

قندھار کا بانکا جواں — غازی امان اللہ خاں

انگریزی سیاست کاری نے لوگوں کی جہالت کو اکسا دیا۔ اور بادشاہ غازی امان اللہ خان۔ پناہ گیر امان اللہ خاں ہو کر اٹلی میں جا بسے

یوں تو بوڑھاپا اور موت کسے چھوڑتے ہیں۔ لیکن بیچارے امان اللہ خان کے ساتھ تو ان کے اپنوں نے بھی وفا نہ کی۔ جس ملک کو سنہ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے آزاد ملک بنایا تھا اس ملک والوں نے سنہ ۱۹۲۸ء میں اسے ایسا نکالا کہ پھر قدم رکھنے کی اجازت نہ دی،

بات کوئی عجیب نہیں، موت کسے نہیں آئے گی اور زمین کا وہ کون سا حصہ ہے جو موت کی فرماں روائی سے باہر ہے۔
اس عالم پر موت کا فرمان ہمیشہ ہی سے نافذ رہا ہے، اور ہمیشہ ہی نافذ رہے گا۔

یہ عالم یہ ہنگامۂ لون و صوت
یہ عالم کہ ہے زیر فرمان موت

لیکن تنبیہ نفس اور عبرت کا کیسا عجیب وقت ہوتا ہے جب انسانی عزائم کے سربفلک پہاڑ قضائے ربانی کی معمولی سی ضرب سے روئی کے گالوں کی طرح اڑ جاتے ہیں۔ اور ناموری و اقتدار پسندی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موت کی ایک آتشیں پھونک سے بھاپ بن کر گم ہو جاتا ہے۔

امان اللہ خان بھی اسی طرح مر گئے جیسے سب مر جاتے ہیں۔ اور امان اللہ خاں ہی پر کیا منحصر ہے۔ ان سے بڑے بڑے نامی و گرامی بادشاہ دارا و سکندر کیخسرو و جمشید اور قیصر و کسریٰ بھی تو مر ہی گئے۔ بادشاہ ہی نہیں انبیاء و اولیاء بھی مر ہی جاتے ہیں۔ امان اللہ خان نے تو خاصی بڑی عمر پائی آخر کب تک نہ مرتے، قمری سال سے ستر سال اور شمسی سے ۶۸ سال عمر ہو چکی تھی، مرنا برحق ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا،

امان اللہ خان کی موت وہاں واقع ہوئی جہاں دواؤں کی کمی نہ تھی ماہرانہ طبی امداد کے لئے زیوریخ (سوئزرلینڈ) مشہور و معروف ہے افغانستان کے کسی دیہات میں ان کا انتقال نہیں ہوا، جہاں بروقت دوائیں نہ مل سکتی تھیں، ڈاکٹر میسر نہ آسکتے تھے، بلکہ وہاں انتقال ہوا جہاں ڈاکٹروں کی پوری فوج اس غنیم سے بچانے کے لئے دواؤں اور آلات جدیدہ سے مسلح موجود تھی۔ لیکن چارہ گروں سے کچھ نہ ہو سکا۔ دواؤں نے کوئی کام نہیں کیا۔ اور اس کا حکم جس کے ہاتھ میں فنا و بقاء ہے جاری ہو کر رہا۔ اس کے حکم کو کون روک سکتا ہے۔ موت ہی نہیں، اس کا کوئی حکم ساری دنیا کی متفقہ کوشش سے بھی نہیں رک سکتا۔

امان اللہ خان کی موت سے ہماری موجودہ صدی کی ایک بڑی شخصیت پیوند خاک ہوگئی جس کی حوصلہ مندیوں کی داستانیں کبھی صحافت کی زینت تھیں، اور جس کے قصے کہانیاں کبھی ہر محفل میں بیان کی جاتی تھیں۔

امیر حبیب اللہ خان امیر کابل کے دو فرزند تھے عنایت اللہ خان اور امان اللہ خان، امان اللہ خان چھوٹے تھے یہ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے تھے اس وقت افغانستان ایک نیم آزاد ریاست تھی، جو انگریزوں کے ماتحت ہوا کرتی تھی۔ امیر حبیب اللہ خان کو کسی نے سوتے میں قتل کر دیا۔ چند دنوں کے لئے عنایت اللہ خان فرمان روا ہوئے، مگر پھر علحدہ ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء کی فروری میں امان اللہ خان افغانستان کے امیر کی حیثیت سے مسند نشین ہوئے۔ اور انہوں نے انگریزوں سے جنگ چھیڑ دی، اس زمانہ میں اس صدی کی پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کو ختم ہوئی بہت دن نہیں ہوئے تھے۔ انگریز لڑائی کے قابل نہ تھے اس لئے انہوں نے صلح کر لی اور امان اللہ خان، شاہ امان اللہ خان ہو گئے۔ انہوں نے بہت سی ضروری اصلاحات اپنے ملک میں نافذ کیں اور ہندوستان و انگلستان کا سفر کیا۔ ان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر انگریزی سیاست نے بڑی تیزی سے کام کرنا شروع کیا، ایک زبردست بغاوت ان کے خلاف ہوئی۔ اور بچہ سقہ کی باغیانہ یلغار سے زچ ہو کر انہیں افغانستان کو ۱۹۲۸ء میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا پڑا۔ اس کے بعد سے وہ اٹلی میں رہا کرتے تھے۔ وہ ایک پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان تھے انہوں نے حج بھی کیا تھا۔ بڑے جری، اور سنجیدہ مزاج آدمی تھے۔ ۲۵ اپریل ۱۹۶۰ء کو ستر سال میں ان کا انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی غلطیوں کو معاف کرے اور نیکیوں کا اچھا صلہ عطا فرمائے

یہ صحیح ہے کہ امان اللہ خان مرحوم کے مزاج میں شتاب کاری و جلد بازی تھی، لیکن بے عیب کون ہے، وہ اپنے دل و دماغ کے اعتبار سے کافی بلند آدمی تھے اگرچہ انگریزوں نے ان کی تجدد پسندی اور مذہب سے بیگانگی کے بہت سے افسانے مشہور کرائے اور یہی پروپیگنڈا ان کے خلاف بغاوت کے لئے کامیاب تدبیر ثابت ہوا۔ لیکن واقعتہً وہ مذہبی پابندیوں سے متنفر نہ تھے بلکہ ایک اچھے مسلمان آدمی کی طرح عقائد و اعمال دونوں میں مذہب کے پابند تھے۔

وہ ایک روشن دماغ فرمان روا تھے، اور چاہتے تھے کہ افغانستان بھی معاشیات کے میدان میں ترقی کرے، اور یہ صورت حال کہ

" افغانستان زمینے است کہ بروآفتاب تمدن ہنوز طلوع نہ گشتہ "

باقی نہ رہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بعض غیر ضروری بلکہ محض تقلیدی قسم کے احکام بھی جاری کر دیئے۔ اور یہی احکام جوانی کی شتاب کاری کی وجہ سے قبل از وقت جاری ہو گئے تھے ان کے خلاف طوفان بغاوت برپا کرنے میں انگریزوں کے ممد و معاون ثابت ہوئے

امان اللہ خان کے بعد افغانستان پر دو دور آئے، ایک تو بچہ سقہ کا دور، اور دوسرا مرحوم نادر شاہ کے ہاتھوں بچہ سقہ کے استیصال کے بعد موجودہ درّانی بادشاہوں کا دور۔ جیسے امان اللہ خان کو وقت نہ مل سکا کہ افغانستان کو ترقی دیتے۔ نادر شاہ کو بھی چار سال کے بعد ہی ایک شخص عبدالخالق خان نے قتل کر دیا۔ اور ان کی وہ سب تمنائیں دھری رہ گئیں جو ملک کی معاشی و تعلیمی ترقی کے سلسلہ میں ان کے سینہ میں موجزن تھیں۔ اور جن کے لئے انہوں نے علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر اقبال اور سر راس مسعود کو بلایا تھا۔

اس کے بعد اگرچہ بغیر قتل و خوں ریزی کے موجودہ بادشاہ افغانستان اورنگ نشین ہو گئے مگر دھڑہ بندیوں نے پچھلے ۳۰ سال میں افغانستان کو نہیں چھوڑا، اور اب بھی افغانستان کوئی ترقی یافتہ ملک نہیں کہا جا سکتا۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمام اختیار ہے وہ ہمسایوں کے خلاف تو بیانات دے سکتے ہیں مگر خود اپنے ملک کی ترقی کی طرف اتنی توجہ دینے کی شاید انہیں فرصت نہیں ملتی ــــ

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے

پچھلے چند ماہ کے عرصے میں ہندوستان و پاکستان کی تاریخ کی بہت سی زندہ علمی و ادبی شمعیں گل ہو گئیں۔ والئی بھوپال نواب حمید اللہ خان رخصت ہوئے جنکی ذہانت نے آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگرس کا جھگڑا ختم کرایا۔ اور کاندھی جی سے یہ تحریر لکھوائی کہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی اکثریت کی ترجمان ہے"

مولانا احمد سعید دہلوی نے رخت سفر باندھا مقرر شیریں بیان تھے۔ وہ مسلم لیگ میں نہ تھے لیکن جمیعتہ علماء کی صدارت و نظامت سے اگر مولانا کفایت اور مولانا احمد سعید بے دخل نہ کر دیئے جاتے تو جمیعتہ کا قدم مسلم لیگ کی طرف بڑھ چکا تھا انہوں نے متعدد تصانیف چھوڑی ہیں

حضرت امیر مینائی کے شاگرد و جانشین اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری نے بھی کوچ کیا۔ جنکی ساری عمر زبان و ادب کی خدمت میں گذری۔ اور آدمی تو ساری عمر صرف کرنے کے بعد ہی کسی مرتبے پر پہونچتا ہے۔

حضرت نازش ٹونکی بھی چل بسے جو اس گھرانے کے فرد تھے جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں عملی حصہ لیا تھا وہ علم و فضل اور روایات کے حامل تھے

مولانا مبارک کریم عظیم آبادی نے بھی وفات پائی، خان بہادر بھی تھے۔ اور عرصہ دراز تک محکمہ تعلیم کی خدمت انجام دیتے رہے۔

ڈھاکہ میں مشہور شاعر سید شرف الحسینی بھی چل بسے، وہ نواب ڈھاکہ کے گھرانے کے ممتاز فرد تھے مشہور ادیب نواب سید محمد آزاد مرحوم ان کے ماموں ہے۔ اور خود سید صاحب ڈھاکے میں شعر و ادب کی شمع انجمن تھے۔ انہوں نے شعر و ادب کا اچھا خاصہ ذخیرہ چھوڑا ہے۔

لاہور میں مولانا شاہ جعفر میاں پھلواروی کی بیگم نے انتقال کیا۔ وہ نواب صدیق حسن خاں کی نواسی اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کی بہو تھیں اور ان گھرانوں کی روایات کی حامل وہ اردو لغت و بیان اور محاورات کے معاملے میں استناد کا درجہ رکھتی تھیں، وہ زبان لکھنو کی وارث تھیں، مولانا شاہ جعفر میاں نے اردو زبان و محاورات پر جتنے مضامین لکھے ہیں ان میں جا بجا ان کے حوالے دیئے ہیں۔

یاران نکتہ داں

فضل الرحمٰن :-

آپ نے اپنے اداریئے میں انشائیہ اور بیانیہ کی طرف توجہ دلائی ہے، میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں کہ اردو زبان کی ترقی کے لئے انشائیہ اور بیانیہ کی طرف توجہ ضروری ہے۔ اردو ان مضامین سے نہیں آسکتی جو تنقید، تشریح اور سوانح کی صورت میں آج کل لکھے جاتے ہیں لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ انشائیہ کیا چیز ہے، اور بیانیہ کس کو کہتے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ نئے لکھنے والے انشائیہ کے نام سے کہیں کچھ اور نہ لکھنا شروع کر دیں مگر یہی سمجھتے رہیں کہ وہ انشائیہ ہی لکھ رہے ہیں، انشائیہ کا مطلب اور اس کی شکل صورت ذہن نشین کرانے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ انتظام ہونا چاہیئے۔ میں خدانخواستہ کسی قسم کی بدگمانی کا اظہار نہیں کر رہا ہوں آپ خود بھی محسوس فرماتے ہوں گے کہ بعض لوگ غزل کے نام سے جو چیز پیش کرتے ہیں۔ وہ غزل نہیں ہوتی، بلکہ غزل کے بجائے قصیدے یا رجز کے اشعار ہوتے ہیں، وہی زبان، وہی انداز، وہی بندش۔ اس کا سبب میرے خیال میں یہی ہے کہ غزل اور قصیدے اور رجز کی شکل و صورت اور انداز بیان کا فرق ان کے سامنے واضح نہیں ہے اس لئے لوگ لکھتے غزل ہیں اور وہ قصیدہ ہو جاتی ہے، یا رجز بن جاتی ہے یا کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی معاملہ انشائیہ کے ساتھ بھی پیش آئے۔ انشائیہ کے ساتھ۔ آپ نے بیانیہ کا تذکرہ بھی کیا ہے میرے خیال میں دونوں ایک نہیں ہیں۔ بیانیہ میں NARRATION کا مفہوم ہے۔ جو اس نام سے بھی ظاہر ہے

سیّد احمد :-

رسالہ پہنچا، شکریہ، آپ نے سچ کہا میر و غالب زندہ تھے اُس وقت بھی مظلوم تھے مر گئے تب بھی مظلوم ہیں مظلوم ہی نہیں مظلوم تر۔ ان کی مظلومی کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے آپ نے "کھرل کرنے" کی اصطلاح اچھی چنی۔ بیچارے سرمہ ہو گئے ایک دن آئیگا کہ یہ سرمہ بھی ناپید ہو جائے گا کسی زمانے میں گوالن دودھ میں پانی ملا دیتی تھی، پھر وہ زمانہ آیا کہ پانی میں دودھ ملانے لگی آپ کو یہ شکایت کیوں ہے کہ ایک آدھ پاؤ غالب اور میر ہیں باقی آدھ آدھ سیر یا سیر سیر بھر خود مضمون نگار اور نقاد کے مٹکے کا سامان۔ آج نہ خالص گھی کا زمانہ ہے نہ خالص دودھ کا تو خالص غالب اور خالص میر آپ کیوں تلاش کرتے ہیں۔

پروفیسر فضل الرحمٰن کا مضمون روایات پڑھنے کی چیز ہے پتے کی باتیں لکھی ہیں پہلی قسط مجھے نہیں ملی بھیجیے۔ لکھنؤ میں آپ کا رسالہ کیا بالکل نہیں آتا؟ —

نسیم احمد خاں

جناب ایڈیٹر صاحب! اسلام علیکم! آج ہی مہر نیمروز کراچی میں حسن نور صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی کا مضمون پاکستان کے اردو

باقی صہ ۳۲ پر

سید عبد القدوس ہاشمی

چند غلط فہمیاں اور ان کی تصحیح

(۳)

تیسرا پروپیگنڈا جو سب سے زیادہ قوت کے ساتھ اور سب سے زیادہ وسعت کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان قوم اب رو بہ زوال ہے۔ اور روز بروز اس کی حالت میں تنزل پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ پروپیگنڈا آپ کے دشمنوں کی طرف سے اس مقصد کے ماتحت ہوتا رہتا ہے کہ آپ میں احساس پستی پیدا ہو کر آپ کے قوائے عملیہ میں اضمحلال پیدا ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے دشمنوں کی طرف سے بڑا ہمہ دانہ پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ اور نہایت دل سوزی کے انداز میں یہ جھوٹ ثابت کیا جاتا ہے تاکہ آپ کسی نہ کسی طرح یقین کر لیں کہ اس قوم کی ترقی کی اب کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی قوم کے افراد میں مایوسی کی ایسی لہر پیدا کر دی جائے کہ انہیں قومی ترقی کی طرف سے مایوسی ہو جائے تو واقعتہً وہ قوم ترقی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اور یہی مقصود ہے اس پروپیگنڈے کا۔ یورپ کا ایک مستشرق اٹھتا ہے اور مسلمانوں کے پچھلے کارناموں پر ایک شاندار تحقیقی کتاب لکھتا ہے۔ عیسائیوں کی طرف سے ہزاروں روپے خرچ کر کے اس کتاب کی اشاعت کی جاتی ہے۔ اور خاص طور پر مسلمانوں میں اسے پھیلایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ معصوم سا علمی کارنامہ دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ بڑی حد تک مسلمانوں کی خدمت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ذرا آپ غور سے اس کتاب کو پڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کسی عاد و ثمود قسم کی تاریخی قوم کا حال لکھ رہا ہے جو اب دنیا سے مٹ کر ختم ہو چکی ہے یا کسی فونیشین یا کلدانی و اشوری تمدن کا تذکرہ کر رہا ہے جس کے مٹے مٹے سے آثار ہزاروں من مٹی کے ڈھیروں میں کہیں کہیں دبے ہوئے مل جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اپنی کتاب کا نام بھی ایسا رکھتا ہے جو مسلمانوں کے نیست و نابود ہو چکنے کی طرف ایک خفیف سے اشارے کا کام دے سکے۔ مثلاً تراثِ اسلامی (Legacy) یا دور اسلامی کے کچھ نشانات باقیہ (REMAINS) اب ہوتا یہ ہے کہ پڑھنے والے کے شعور پر یہ اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ یہ قوم اب مر چکی ہے، اس کی وراثت یا اس کے کچھ کچھ نشانات ملتے ہیں۔ حالانکہ امر واقعہ اس کے برخلاف ہے۔ مسلمان قوم زندہ ہے اور زندہ قوم کے کارناموں کا ذکر (LEGACY) اور (REMAINS) کے لفظ سے نہیں کیا جا سکتا۔

آپ غور کریں تو آپ کو نظر آئے گا کہ عموماً عیسائی عالموں کی تحریروں میں یہ مقصد ہر جگہ ضرور ہوتا ہے کہ آپ کے دل و دماغ پر مسلمان قوم کے مر چکنے یا ختم ہو چکنے کا خیال طاری ہو جائے۔ ان کتابوں کو پڑھ کر مسلمانوں کا ایک طبقہ بہت بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اور وہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ خدانخواستہ مسلمان اب ختم ہو چکے یا ختم ہو رہے ہیں۔ ہم آئندہ سطور میں اس پروپیگنڈے کی صداقت کا ہلکا سا اجمالی جائزہ لے کر آپ کو دکھاتے ہیں کہ یہ کس قدر جھوٹے ہیں۔ نہ مسلمان ختم ہو چکے ہیں اور نہ ختم ہو رہے ہیں

بلکہ حقیقت واقعہ بالکل اس کے برخلاف ہے۔ مسلمان زندہ ہیں ان میں زندگی کے تمام آثار موجود ہیں۔ وہ ترقی کررہے ہیں اور نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کررہے ہیں۔ یہ جو آوازیں سنائی دیتی ہیں کہ مسلمان ختم ہوگئے یا ختم ہورہے ہیں یہ محض شرارت وعداوت کی وجہ سے اٹھائی جارہی ہیں۔ اور بہت دنوں سے اٹھائی جارہی ہیں، ان کی طرف دھیان دینا اپنے قوائے عملیہ کو ضعیف کردینے کی سعی کے برابر ہے۔ ہم یہ آوازیں بڑی مدت سے سن رہے ہیں۔ اور سنتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن نہ ہم ختم ہوگئے اور نہ قیامت سے پہلے ختم ہوں گے۔

آج تو ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ۱۳۷۹ سال ہونے آئے۔ دشمنان اسلام تو یہ آوازیں عہد رسالت میں اٹھایا کرتے تھے، جب کبھی مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچا، انہوں نے نعرہ لگایا کہ اب مسلمان ختم ہوئے، تاکہ اس نعرے سے متاثر ہوکر مسلمانوں پر اوس پڑ جائے۔ سورۂ آل عمران کے آخر میں ایسے نعرہ لگانے والوں کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے بندے اور آدمی ہی تھے ایک دن موت آنی ہی تھی۔ وہ وقت آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ پھر کیا تھا سارے عرب میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آوازیں اٹھیں کہ مسلمان اب ختم ہوئے۔ اور اسلام مٹ گیا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان نہ صرف باقی رہے بلکہ ساری دنیا پر چھا گئے۔ اسی طرح "مسلمان ختم" کا نعرہ عہد صحابہ میں یہودی اور نصرانی اقوام ہر موقع پر لگاتی رہیں اور ہم ترقی کرتے رہے۔ یہ نعرہ معمر بن مثنیٰ کی شکست کے وقت لگایا گیا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین کے بعد لگایا گیا۔ اور عہد صحابہ کے بعد تو نہ جانیں کتنی ہی بار یہ آوازیں سنائی دیں۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ ان آوازوں میں صداقت بالکل نہ تھی۔ صدیوں تک عیسائی اقوام نے اتفاق و تحالف کے ساتھ جنگ صلیبی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور ہر بار یہی کہا گیا کہ اب مسلمان ختم۔ تاتاری فتنہ اٹھا اور بغداد میں خون کی ندیاں بہ گئیں ایک دو دن کے لئے نہیں بلکہ تقریباً ساٹھ سال تک مسلمان کے لئے سانس لینا محال نظر آتا رہا۔ لیکن کیا ہوا مسلمان مٹ گئے؟ ہماری موجودہ صدی ہی میں دیکھئے ۱۹۱۷ء میں جب انگریزوں کا قبضہ فلسطین پر ہوا تو وزیر اعظم برطانیہ لائڈ جارج نے پارلیمان میں اعلان کیا کہ آج ہم نے جنگ صلیبی جیت لی، اب مسلمان ختم۔ لیکن خاک بر سر دشمن ہم اب بھی موجود ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فلسطین کے ایک حصہ پر آج دس بارہ سال سے یہودیوں کا قبضہ ہے لیکن یہ قبضہ تو صرف دس بارہ ہی سال سے ہے۔ مرحوم سلطان صلاح الدین نے جب بیت المقدس فتح کیا تھا تو بڑی مدت سے اس پر عیسائیوں کا قبضہ تھا، یہ کوئی بہت عجیب بات نہیں کہ یہودیوں کا فلسطین کے ایک حصہ پر قبضہ ہے۔ یہ قبضہ بھی اسی طرح عارضی ثابت ہوگا جیسے اس سے پہلے عیسائیوں کا قبضہ عارضی ثابت ہوچکا ہے۔

اقبال وادبار

قرآن کریم میں قوموں کے اقبال وادبار کا ایک جامع اصول بتایا گیا ہے۔ اور واضح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ تلک الایام نداولہا بین الناس۔ اس دنیا میں یہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا کہ کبھی یہ پلہ جھکا اور کبھی وہ پلہ۔ اس سے نہ قومیں تباہ وبرباد ہوتی ہیں اور نہ مٹ کر فنا ہوجاتی ہیں اور اسلام تو دنیا میں خدا کا آخری پیغام ہے یہ مٹ گیا تو دنیا کیا باغیوں اور سرکشوں کا اڈا بنا کر قائم رکھی جائے گی۔ یاد رکھئے کہ جس دن ہم نہ ہوں گے اس دن یہ زمین وآسمان بھی نہ ہوں گے۔ زمین پھٹ کر تباہ ہوجائے گی اور آسمان روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گے۔

قوم تو بہت بڑی چیز ہے۔ اور قوموں کی عمروں میں سو پچاس سال کا زمانہ بہت ہی قلیل مدت کہا جاتا ہے آپ کسی

ایک فرد کی محدود پچاس سال کی زندگی ایسی نہیں پیش کر سکتے جس میں اس فرد پر اچھے اور برے دن نہ آئے ہوں، اقبال و ادبار کا زمانہ نہ گزرا ہو مسلمان قوم پر بھی اچھے اور برے دن آتے رہتے ہیں۔ اور یہ قانون فطرت ہے۔

نہیں قدرت کے آئین مسلم سے کوئی چارا

مسلمانوں کی تاریخ بھی تو دنیا کی عام انسانی تاریخ کا ایک حصہ ہی ہے اور مسلمان بھی آدمی ہی ہوتے ہیں اس لئے اسلامی تاریخ میں خلاف آئین قدرت واقعات و حوادث کی تلاش کسی طرح دانائی نہیں کہی جاسکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جیسے دنیا کی تمام قوموں پر اچھے اور برے دن آتے رہے ہیں مسلمانوں پر بھی اچھے برے زمانے آئے ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے۔ البتہ ایک [illegible] ہے جو دنیا کی ساری قوموں کو حاصل نہیں ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسے سادہ عملی اور عالمگیر مذہب کے [illegible] ہر نسل اور ہر ملک کے لئے یکساں مفید اور دلکش ہے، اس کی وجہ سے جہاں ایک مسلمان کی انفرادی زندگی [illegible] مختلف بعض خصوصیات پائی جاتی ہیں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور قومی حرکات میں بھی کچھ امتیازی اثرات [illegible] ہمیں ہر زمانہ کی تاریخ میں اور ہر اس ملک کی تاریخ میں دکھائی دیتے ہیں جہاں مسلمان معتد بہ تعداد میں موجود ہیں۔ اور جہاں انکی [illegible] لحاظ تعداد نہیں بھی موجود ہے، ان ممالک میں اسلامی تصورات سے تاثر واضح طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ موضوع ہے اور آپ سے توجہ کے ساتھ مطالعہ کا متقاضی ہے، اس مضمون کے آخر میں ایک علیحدہ عنوان کے ذریعہ انشاءاللہ ہم اس کا ذکر کریں گے۔ مذہب اسلام کی یہی سادگی اور دلکشی اس کے لازوال ہونے کی ضمانت ہے۔ ایک علاقے کے لوگ اس سے برگشتہ ہوتے ہیں تو دوسرا علاقہ متاثر ہوتا ہے۔ اور یہ اصول بہر حال زندہ رہتے ہیں۔

جائزہ

اس جگہ تو ہمیں اس کا جائزہ لینا ہے کہ آج کل یعنی ۱۹۶۰ء میں مسلمان بحیثیت مجموعی مائل بہ ترقی ہیں یا مائل بہ تنزل تاکہ ہم صحیح طور پر اپنے حالات کو سمجھ لیں۔ دشمنوں کے اس نعرہ کی تو حقیقۃً کوئی قیمت نہیں ہے کہ مسلمان روبہ زوال ہیں، کیونکہ یہ ہمیشہ سے یہی کہتے رہے ہیں اور کہتے رہیں گے۔

شور بختاں بہ آرزو خواہند
مقبلاں را زوال نعمت و جاہ

لیکن ہمیں خود اپنی معلومات کے لئے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

کسی فرد انسانی کی زندگی میں پچیس تیس سال کی مدت شاید کسی جوانا مرگ کی ساری ہی زندگی قرار پا جائے لیکن قوموں کی حیات میں یہ مدت بہت ہی قلیل مدت ہے جسے شاید کوئی اہمیت ہی حاصل نہ ہو۔ ہمیں تاریخ کے صفحات بتلاتے ہیں کہ اتنی مدت تو قوموں میں احساس پیدا ہونے کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی قوموں کی تاریخ میں اتنی مدت چشم زدن میں گزر جاتی ہے اگرچہ تاریخ اسلام کے ابتدائی تیس سال پوری انسانی تاریخ میں البتہ ایک بے مثال استثناء کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اس مدت کے اندر مسلمانوں نے اس وقت کی دونوں بڑی حکومتوں کو ملیامیٹ کر کے ایک نئی لگن لگا دی تھی ورنہ ساری انسانی تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ خیال پیدا ہونے اور ابتدائی جماعت بنتے بنتے اور داخلی تنظیم کے وجود میں آتے ہی لگتے تیس سال بلکہ اس سے بڑی بڑی مدتیں ختم ہو گئیں یہودی چالیس سال تک جزیرہ نمائے سینائی میں بھٹکتے رہے اور

موعود کی راہ بھی نہ پا سکے۔ ہنخامنشی دور کے ایران میں ساٹھ سال سے زیادہ مدت پریشان فدائے قوم کو یکجا کرنے میں بس ہو گئے۔ گوتم بدھ کو نروان ملنے میں بھی ۳۳ سال کی مدت لگی۔ امریکہ نے ۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو ۴۶ سال کی جدو جہد کے بعد آزادی کا اعلان کیا، اور ۱۷۸۳ء میں ۵۴ سال کے بعد اس کی خود مختاری پیرس کے معاہدہ میں تسلیم کی گئی۔ اسی طرح روس کو ۱۹۱۷ء کے انقلاب تک پہنچنے کے لئے خفیہ اور علانیہ جدو جہد کے ۸۴ سال گزارنے پڑے۔ چین کو پہلی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۳۸ سال کی خون ریزی کا زمانہ مسلسل دیکھنا پڑا تب عوامی جمہوریہ وجود میں آئی

غرض یہ کہ پچیس سال کی مدت قوموں کی تاریخ میں کوئی بڑی مدت نہیں۔ آیئے پچھلے پچیس سال کی مدت میں اپنی قوم یعنی مسلمانوں کا جائزہ لیجئے۔ اور دیکھئے کہ اس مدت میں مسلمان کیا کرتے رہے۔ انہوں نے کیا حاصل کیا اور کیا گنوایا اس سے ہم صحیح طور پر یہ سمجھ سکیں گے کہ مسلمان قوم مائل بہ زوال ہے یا رو بہ ترقی۔

اس طرح ہمارے جائزہ کی مدت یکم جنوری ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتی ہے۔ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء پر ختم ہو جاتی اس پچیس سال کی مدت میں مسلمانوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جو نمایاں ترقی کی ہے۔ وہ بہت پرانی کہانی نہیں بلکہ آنکھوں کے سامنے ہی سب کچھ ہوتا رہا ہے۔ اگر ہم اپنی یادداشتوں ہی کو مرتب کر لیں تو اس پچیس سال کے واقعات سارے کے مربوط و مرتب شکل میں یاد سے ابھر کر آنکھوں کے سامنے آجائیں گے

چونکہ ترقی یا تنزل کے مفہوم میں ایک ہمہ گیر ہمہ جہتی پائی جاتی ہے۔ اور اس کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں مثلاً کسی قوم کی عددی قوت میں ترقی، مالی حیثیت میں ترقی سیاسی آزادی اور حریت میں ترقی، وغیرہ اس لئے ہمارے مطالعے کے بھی مختلف رخ ہوں گے ہم سب سے پہلے سیاسی آزادی اور حریت کو لیتے ہیں کیونکہ اس میں ترقی کئے بغیر کوئی قوم دوسرے میدانوں میں ترقی نہیں کر سکتی ہے۔

پس منظر

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اس عالم آب و گل میں قوم تو قوم کوئی فرد بھی ایسا نہیں پایا جاتا ہے جس کی چھوٹی سی محدود زندگی میں اقبال و ادبار، عروج و زوال اور سرفرازی و نگونساری کے متضاد ادوار نہ آتے رہے ہوں اس لئے مسلمانوں پر بھی ایسے ادوار آتے رہے کبھی کشور کشائی اور تمدن آفرینی کا دور رہا ہے۔ اور کبھی مظلومیت و مجبوریت کی کیفیت محیط ہو گئی ہے۔ اس طرح مسلمان گرتے اور سنبھلتے ہوئے کبھی تیزی سے اور کبھی سستی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کہ ۱۸۸۲ء میں برطانوی بحری بیڑا اسکندریہ میں اتر گیا۔ یہ گویا عثمانی ترکوں کی شکست کا اعلان تھا۔ اب اس کے بعد مسلسل یہ ہوتا رہا کہ مسلم کی ریاستیں انگریزوں، فرانسیسیوں اور دیگر مغربی اقوام کے ماتحت ہوتی گئیں شمالی افریقہ کے علاقے گئے۔ برصغیر پاک و ہند کی برائے نام حکومتیں بھی گئیں، ملایا وغیرہ کی ریاستیں جو کمزور ہی سہی مگر موجود تھیں ختم ہوئیں۔

یہ دور ادبار اپنی انتہا کو ۱۹۱۸ء میں پہنچا۔ جب کہ جنگ عظیم کے ختم پر فرانس و برطانیہ کی فاتح فوجیں قسطنطنیہ میں جا کر مقیم ہو گئیں۔ جزیرہ نمائے عرب پر شریف کے پردہ میں انگریز قابض ہو گئے۔ مصر پر انگریزوں کا قبضہ تھا ہی، طرابلس وغیرہ اطالیہ کے تصرف میں تھا، مراکش، الجزائر، تونس پہلے سے فرانس کے قبضہ میں تھے اب شام بھی مل گیا، عراق عرب اور فلسطین انگریزوں کے حصہ میں آئے۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کی تقریباً ساری ہی آبادیاں مستعمرین کے بالواسطہ یا بلاواسطہ قبضہ میں آگئیں۔

یہ صورت حال دور ادبار کا انتہائی نقطہ تھا۔ اگرچہ پچھلے سوا سو سال میں مسلمان سیاسی طور پر روز بروز کمزور ہی ہوتے جا

مگر یہ احساس وہ اب بھی نہ تھے۔ ۱۹۱۸ء کے بعد پیش آنے والے واقعات اور خصوصیت کے ساتھ وہ تحریکیں جو مسلمانوں
پیدا ہوئیں وہ اس کی شاہد ہیں کہ اس وقت سے لے کر ۱۹۳۵ء کی ابتداء تک مسلمانوں نے آزادی کے لئے تقریباً ہر حصہ
جدوجہد کی، اور ہزاروں قسم کی تکالیف اور مظالم کے باوجود ان کا جذبۂ آزادی کبھی کمزور نہ ہوا بلکہ روز بروز تیز سے تیز تر
گیا۔ اپنی حالت کا انہیں بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوا، اور وہ ہر جگہ ہاتھ پیر مارنے لگے۔ پاک و ہند کی تحریک
ت ہو یا لیبیا و طرابلس کی تحریک سنوسی، مصر کی تنظیم وفد ہو یا انڈونیشیا کی تنظیم شرکۃ الاسلام۔ سب کی سب اسی ایک
اس کی شدت کے مظاہرے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا عمر چکرو منتو، سعد زاغلول، شیخ سنوسی، محمد بن عبدالکریم خطابی،
اسی طرح کے مسلمان رہنما ہر جگہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پندرہ سولہ سال تک یہ تحریکیں روز بروز تیز تر ہوتی گئیں۔ یہاں
کہ کامیابی کا وقت آگیا۔

۱۹۱۸ء کے اختتام پر جو سیاسی صورت حال مسلمان ممالک کی تھی اور جس کی وجہ سے مختلف تحریکیں پیدا ہوئیں، وہ
رت حال باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ جب کسی قوم پر ادبار کے دن آتے ہیں تو وہ قوم یا تو قعر مذلت میں
کے مطمئن اور بے حس ہو جاتی ہے، یا اس میں شدید ردعمل اضطراب و بے چینی کی شکل اختیار کر کے اس دور ادبار کے اختتام
جدید دور اقبال کے شروع ہو جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ مسلمانان عالم کے لئے ایسا ہی
نہ تھا۔ ۱۹۳۶ء کی ابتداء سے ۱۹۶۰ء کی ابتداء تک پچیس سال کی مدت میں حسب ذیل علاقہ کے مسلمانوں نے سیاسی آزادی و خود
ری حاصل کر لی ہے۔ یہ تمام علاقے وہ ہیں جہاں مسلمانوں کی تعداد جملہ آبادی میں پچاس فیصد سے زائد ہے۔

نام ملک	رقبہ مربع میل	جملہ آبادی	مسلمان
مصر	۳۸۶۰۰۰	۲۱۹۳۵۰۰۰	۲۰۱۳۵۰۰۰
شام	۷۲۹۰۰	۳۷۵۰۰۰۰	۳۱۲۸۰۰۰
پاکستان	۳۶۵۰۰۰	۸۰۱۰۰۰۰۰	۷۲۲۰۰۰۰۰
انڈونیشیا	۷۳۳۶۸۱	۸۲۱۰۰۰۰۰	۷۵۶۰۰۰۰۰
تونس	۶۰۱۶۵	۳۶۹۲۰۰۰	۳۶۵۵۰۰۰
مراکش	۱۵۵۰۰۰	۱۰۹۰۰۰۰۰	۱۰۲۰۰۰۰۰
لیبیا	۶۷۹۳۵۰	۱۶۵۰۰۰۰	۱۶۴۶۰۰۰
سوڈان	۹۶۷۵۰۰	۱۰۹۰۷۶۳۸	۹۵۸۰۰۰۰
ملایا	۵۰۶۹۸	۶۲۰۰۰۰۰	۳۲۰۰۰۰۰
نائجیریا	۳۳۸۵۸۰	۳۰۷۰۰۰۰۰	۱۷۱۹۲۰۰۰
	۳۸۰۵۸۶۶		۲۴۶۵۶۶۰۰۰

یہ ۳۸ لاکھ مربع میل سے بھی زائد رقبہ ہے جہاں سے ان ظالموں کو نکالنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے جو صدیوں سے ان پر قابض تھے۔ اور مقامی آبادی کا خون چوس رہے تھے اس طرح تقریباً پچیس کروڑ مسلمانوں کو حق خود اختیاری حاصل ہو چکا ہے۔

ابھی اور متعدد ممالک ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر وہ ابھی تک ظالم مستعمرین اور خون خوار قابو چیوں سے آزادی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں، لیکن وہاں شدید قسم کی بے چینی موجود ہے۔ اور آزادی کی جدوجہد جاری ہے جیسے بہادران الجزائر کی بے مثال جدوجہد جس کی نظیر پوری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ مظلومین کشمیر کی بے چینی جو بھارت کے فوجی قبضہ کی وجہ سے وہاں پائی جاتی ہے۔ عدن اور اس کے گرد و نواح کی تحریک آزادی جو انگریزوں کی بے پناہ بمباری کے بعد بھی زندہ ہے اور ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن کامیاب ہو کے رہے گی۔

کیا ان اعداد و شمار کو دیکھنے سے آپ پر یہ حقیقت روشن نہیں ہو جاتی کہ مسلمان سیاسی اعتبار سے روبہ زوال نہیں بلکہ روبہ ترقی ہیں۔ اور ترقی کی یہ رفتار نہ صرف اطمینان بخش ہے بلکہ بہت ہی امید افزا۔ کون شپرہ چشم ان اعداد کو دیکھنے کے بعد بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ مسلمان سیاسی اعتبار سے دور زوال سے گزر رہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے یہ ممالک ویسی سیاسی و حربی قوت نہیں رکھتے جیسی کہ ہونی چاہئے۔ اور اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان میں اتحاد و اتفاق بھی نہیں ہے۔ ان کی کوئی سیاسی تنظیم نہیں جو ان سب کو مربوط رکھے، ان میں معاشی رابطہ بھی ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ ان میں سے اکثر بہت ہی غیر ترقی یافتہ اور بدحال علاقے ہیں۔ بعض جو بڑے ہیں مثلاً پاکستان، انڈونیشیا، مصر، سوڈان اور نائجیریا۔ ان کی معاشی قوت بھی ابھی قابل تعریف نہیں ہے۔ لیکن دنیا کی تاریخ کا بہ غائر مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے، اتنی چھوٹی سی مدت میں یہ سب کچھ کبھی کسی جگہ اور کسی دور میں ممکن نہیں ہوا ہے۔ کیا آپ حکومت برطانیہ سے یہ امید رکھتے تھے کہ سوڈان کو یا نائجیریا کو انگلستان کی طرح ترقی یافتہ بنا دے گا۔ کیا آپ فرانس سے یہ گلہ کر سکتے ہیں کہ اتنے دنوں تک قبضہ رکھنے کے باوجود تونس کو ترقی کیوں نہ دی۔ اور کیا ہالینڈ سے یہ شکوہ ہے کہ انڈونیشیا کو رشک سویڈن و ناروے کیوں نہ بنا دیا۔

تقریباً ان تمام علاقوں میں جانے کا مجھے پچھلے سات آٹھ سال کے اندر اتفاق ہوا ہے، اور میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہر جگہ ترقی سیاسی استحکام اور عالمی مسلم تنظیم کی ضرورت کا احساس شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ہر جگہ کہیں سست رفتار سے اور کہیں تیزی کے ساتھ کام ہو بھی رہا ہے۔ البتہ دور غلامی کے پروردہ یافتہ لیڈر اور گھٹیا درجہ کے مفاد پرست چرب زبان مقرر چونکہ اپنی خیر سیاسی استحکام اور معاشی ترقی میں نہیں دیکھتے اس لئے ہر جگہ حالات کو خراب رکھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ لیکن اس سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں نہ تو ایسے لوگ طبعی موت سے محفوظ و مامون ہیں اور نہ سیاسی موت کے خطرات سے آزاد و مصئون۔ انکا دور بھی ختم ہو جائے گا۔ اور اس وقت تک کی رفتار ترقی کو دیکھتے ہوئے یہ امید کسی طرح بیجا نہیں کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اس سیاسی مقام کو مستقبل قریب میں حاصل کر کے رہیں گے جو ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ اگر دنیا کی عمر ختم نہیں ہو گئی تو چند ہی سال کے اندر مسلمانوں کی سیاسی تنظیم وجود میں آ جائے گی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ معاشی راوبط میں استواری پیدا ہو کر ان میں خوشحالی و خوش اقبالی بھی آ جائے گی۔ ان کی خارجہ پالیسی ایک خاص نظام میں آ جائے گی۔ ان کا اپنا بین الاقوامی بلاک ہوگا اور مشرق سے ناجائز استفادہ کی راہ اقوام مغرب کے لئے روز بروز تنگ ہو کر مسدود ہو چکے گی۔

باقی صفحہ ۲۳ پر

قاضی عبدالودود

عبدالحق بحیثیت محقق

(گذشتہ سے پیوستہ)

میر کی فارسی میں ہندوستانیت موجود ہے ؛ واقعہ نگاری میں نہایت ضروری جزئیات ان سے نظر انداز ہو جاتے ہیں، اور جا بجا ابہام رہ جاتا ہے۔ چراغ کے محاورات کے استعمال کا سوال نہ ہو، جب بھی بے محل الفاظ ان کے قلم سے نکلتے ہیں۔ ان کی عبارت اتنی مضبوط نہیں، جتنی ہونی چاہیئے۔

"از زبان خواجۂ مذکور (محمد باسط) برآمد کہ وقت قلمدان نیست، چوں ایں سخن شنیدم، بقاہ قاہ خندیدم، نواب۔ سبب خندہ پرسید۔ عرض نمودم کہ ایں عبارت را فہمیدم۔ ۔ وقت قلمدان نیست انشائے تازہ است" ص۶۲ ایک کمسن لڑکا امیرالامرا کے سامنے اس طرح بات نہیں کر سکتا، اس سے قطع نظر، "انشائے تازہ" کا محل نہیں، گفتگو ہو رہی تھی، تحریر نہ تھی۔

امان اللہ کی نوجوانی کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا، لیکن ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں : "در جوانی چشم نگشودم، اکنوں پیر افشانی نمودم" ص۲۱

امان اللہ کے مرض الموت کا بیان ہے، مگر میر فضول عبارت آرائی سے نہیں چوکتے : "دمیکہ بضبط بر دلختے خود را غنچہ ساختے گہ از درد نالاں شدے چوں گل پریشاں شدے۔ ۔ ۔ دود جگر۔ کباب گذشتہ بود۔۔ کار از بیطاقتی بر وتنگ شد، با پیر گفت کہ۔ ۔ ۔ دیدۂ من کباب سنگ شد" ص۵۲

میر اعظم خاں سے ملنے جاتے ہیں وہ ان کے لئے قہوہ و قلیان منگواتا ہے۔ اس کے بعد میر شعر خوانی اور اشک فشانی کرتے ہیں۔ اعظم خاں متفکر نظر آتا ہے، میر اس کا سبب پوچھتے ہیں تو وہ یہ کہتا ہے کہ آپ دہلی میں ملنے آتے تھے تو "اقسام شیرینی و انواع حلویات پیش کیا کرتا تھا، آج شکر خام بھی نہیں کہ شربت کا ایک پیالہ آپ کے لئے تیار ہو سکے۔ میر نے کہا : "موقع ایں ہمہ نیستم" "آں ہم بہ سبیل تفنن بود، صاحب ما خوب میداند کہ گاہے شکم را نان سماط (کذا) نکردہ ام" یہی بات ہو رہی تھی کہ ایک عورت ایک خوان میں حلوا لائی۔ وہ سب اس نے میر کے حوالہ کیا اور کہا : "ایں روسیاہ قدر خود خوب میداند، عمریست کہ تفاذکشی میگذراند۔ ۔ ایں اقامت شمارت حصۂ مرا امید و بخانۂ خود فرستید" ص۹۱ و ص۹۲۔ افلاس کی وجہ سے "شکر خام میسر نہیں، مگر قہوہ موجود ہے، یہ بات خلاف قیاس ہے۔ لفظ یعنی جس طرح میر نے یہاں آیا ہے عربی فارسی میں استعمال نہیں ہوتا، "عمریست کہ تفاذکشی میگذراند" اگر یہ صحیح ہے تو انہیں باتیں کرنے کی صلاحیت نہ ہوئی، "صاحب" جس طرح ذکر میں اس جگہ اور کئی دوسرے مقامات میں استعمال ہوا ہے، ایران میں نہیں ہوتا۔

امان اللہ گھر سے حلی متقی کی تلاش میں نکلے ہیں، مگر پتا نہیں کہ کہاں جائیں، اس موقع پر، خضر سے جو کچھ غائبانہ کہا ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں : "رخسارم کہ برگل ترتیہ خندہ میزدے (ذکر کردی)" "از تاب آفتاب تفیدہ، چشم کہ برغزال سیاہی زدے ("زدی" ذکر)

قریب بہ سفیدی رسیدہ" ص۱۵ اپنے حسن کی تعریف بالکل بے محل ہے۔

علی متقی ایک فقیر کو قتل کی دھمکی دیتے ہیں ص۱۰، حالانکہ ان کا مسلک یہ بتایا گیا ہے کہ کسی کی دل آزاری نہیں چاہتے۔ یہ دھمکی اس وجہ سے تھی کہ فقیر نے اپنے کو مؤید اسلام کہا تھا جس شخص کی طرف یہ الفاظ منسوب ہوں کہ "کافر شدن چہ عیب است" اسے اختلاف عقیدہ کی بنا پر اتنا بگڑنا نہ چاہیئے کہ آمادۂ قتل ہو جائے یہی بزرگ انکسار کی تعلیم دیتے ہیں ص۱۷، لیکن ص۱۶ میں امان اللہ سے اپنی نسبت یہ فرماتے ہیں: "طرفہ دریائے بجوئے خویش بستہ"۔

ہنود کی جمع الجمع ہنوداں ص۹۰ و ص۱۱۶ کسی ایرانی یا محتاط ہندوستانی کی فارسی میں میری نظر سے نہیں گزری۔ مال و اموال ص۱۳۳ میں ۱۱۵ در خیر و خیرات میں خیر فاضل ہے "اور کسی ایرانی کی نظم و نثر میں یہ ترکیبیں میں نے نہیں دیکھیں "تمام تمام شب" ص۱۳۱ اور کنگہ کنگہ ص۱۲۳ میں میری رائے میں ہندوستانیت ہے۔ روزگار سے نوکری ص۴۷ و ص۶۲ کی مثال بطور شاذ ایرانیوں کے یہاں ملتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہندوستانی فارسی ہے۔ جاگیر کا بھی یہی حال ہے جس کی جمع میر نے بقاعدۂ عربی جاگیرات بنائی ہے ص۱۲۲۔ احسان مندص۹۱ کے ہندوستانی ہونے میں مطلقاً شبہ نہیں "نیز۔ بر در ش خوابیدہ" کے متعلق لکھا جا چکا ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ بات نہیں کھلتی کہ آنزو کا گھر ایک خاص موقع پر چھوڑا تھا یا نہیں، اور اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میر کی ماں امان اللہ کے درود آگرہ سے قبل مر چکی تھیں، مگر دوسری عبارت اس کے خلاف ہے "زن، جگل کشور کے ساتھ کاماں گئے یا برسا نہی میں عشرہ گزارا" اس کے متعلق وہ وضاحت نہیں جو ہونی چاہئے تھی۔

ذکر میر میں غیر معتدل شعریت کی مثالیں ملتی ہیں، مگر کہیں کہیں ایسی شعریت بھی ہے جو حسن سے عاری نہیں۔

میر کی فارسی کتابوں میں جو مفردات و مرکبات ملتے ہیں ان میں سے بہتیرے کلیات اردو میں بھی مستعمل ہوئے ہیں۔ ان کا اردو کلام اچھی طرح سمجھنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ ان کی نظم و نثر فارسی کا مطالعہ غائر نظر سے کیا جائے۔ فہرست ذیل میں جو افسوس ہے کہ بترتیب حروف تہجی تیار نہیں ہو سکی (۵) محاورات و مصطلحات جن کا ذکر چراغ کی بحث میں ہو چکا ہے، شامل نہیں، لیکن، چراغ کے بعض الفاظ جو پہلے قلم انداز ہوئے ہیں، اس میں موجود ہیں۔ انتخاب الفاظ مختلف نقطہائے نظر سے کیا گیا ہے اور بعض جگہ جملے کے جملے دے دیئے گئے ہیں کچھ ایسی عبارتیں بھی جن کی صحت مشتبہ ہے، اس میں ملیں گی۔ حواشی میں خاص خاص امور کی طرف ناظرین کی توجہ منعطف کرائی گئی ہے، لیکن اس کی فکر نہیں کی گئی کہ ہر وہ بات جو شایستۂ التفات ہے، حواشی میں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا جائے۔ حواشی کی کئی بحثیں ناکافی بھی ہیں، ـــــ ان کی طرف کبھی اور توجہ کی جائے گی:۔

مرا، یکہ (یکہ) بیت او بعالم دویدہ، لاتعد، قادر سخن، تعلیمگر، عاجز سخن، مرکب و بسیط، دامن کوہ بازو، ۲، تازہ کاری، فردانیت، وحدانیت، تحیات نامعدود، بے رہنمائی او در اہے نمیتماید[1]، دنبال او گیر ہیچے[2]۔ ملیجے، سایہ رو، یار یگہ، محشریاں، مقام محمود ۴۳، اگر بر غلطے (خطائے) اطلاع یابند چشم عنایت بپوشند؟ نامساعدت ایام، بازوے تلاش کشایند، جد کلاں[۳]، مستقر الخلافت اکبرآباد افتاد ۴۴

---

(۱) = دکھائی نہیں دیتی؛ (۲) ایک ہی شخص کو سیع و ملیح دونوں کہنا ٹھیک نہیں۔

(۳) = پر دادا

جہان آب و گل، کمر ہمت بر بستہ، فوجداری گرد اکبر آباد، حرکت عنیفہ (عنیفی)، بجا[1] افتاد، حکایت اد پس[2] سر شد، خرد (خورد)، ترک لباس[3] کردہ و پا بدامن کشید، مکلّل، تصدیع۔ کشید پے بباطن برد، بندہ۔ کردہ ام ۵، خواجہ سرائے، بخدمت عالی واضح است، کاکل جمع پریشاں نشدہ، دماغش میرسید، عبودیت ۶، خلوتیت[4]، خلیلیت (خلیت)، حبیبیت، ہرگاہ بخود آمدے، در بند قسمت اہل بودن، مہتاب بگنبہ پیمودن است ۷، وسیع المشرب، رنگ کاہی مردے بود بحال توقّفے[5] (ی) ۸، نماز اشراق، سرگرم بازی، آن ستیال، دیدہ دیدہ برق، بلا گرداں، متخلق باخلاق سنجیدہ ۹، داہ، بیطاقتی۔ کرد، بیدماغ، رومال، پا براہ گذاشت (گزاشت)، بمزہ شد، رودخانہ، فقدان زبان دری۔ ۱۰ خط بہ بینی کشید، بے حقیقت معنوی، تکیۂ فقیر، سیہ گلیم، اندر معذرت در آمد، پردہ از روے کار برخاست، در عرصۂ[6] دہ دوازدہ روز، بیلطف، سر خود گیر، بار سفر بکہ نداشت۔ برلبست، دیوان صوبہ (صوبۂ)، قرابت قریبہ، رحل اقامت انداخت ۱۱ حرف سر کردے، دم جانسوزش آتش شوق بر کردے، در گلو گرہ گشتے، نالہ کہ از دلش سر بر زدے دل شب، نماز تہجد، نفس سوختند، بگرد او نرسید، غسالہ، بیانہ کہ سہ منزلے[7] اکبر آباد شہر لیست قدیم ۱۲ چشمے چرا نہد، پر بداد، سوادب ۱۳ تناول، متعرض، قساوت، تشریف شریف ارزانی فرمانید، الکاٹیاں، کد خدائی[8]۔ داماد، لا اہالی (لاؤ بالی) ۱۴ تدرو (تدرو) درویش دل آگاہ شد[9]، نابلد ۱۵ آسودگی از من رو بتافت، آوارگی مراد دریافت، وحشت آمادہ، از طاق دست افتادہ، کمیابی (کم پائے) سایۂ افتادہ، بگفتن راست نمیآید، عاریتی ۱۷، العبث، بیمار خانہ ۱۸، ماتمیاں، عجائبات ۱۹، ہمسر[10] تمنا بر تمنا شکستی، دست[11] بدل بر گردید ۲۰، عنانداری، دل تفتہ، سرا پرداستاں۔ یکشا، نام بر آوردہ ۲۲، سقف منقش طاق، شہر پناہ، عیدگاہ، کم بغل ۲۳، بحضرت پدرم آورد، اشارت مع البشارت، کلبۂ اعتزال، سر حرف وایکے درویش[12] در حلقے نشستہ بود ۲۴، نظرے در کارش کرد، چار دیواری خندق میآمد، اراک بے تاک ۲۵، احوال ہمدیگر گرفتند، آنظرف آسمان، خیمۂ شب بازے (ی) ۲۶، ہم بستر، زلال بحفاظ اشیخان ریائی تا چشم بہم میزنی، مربع نشستہ ۲۷، باخدا دریک پیرہن اند، نفس امارہ، احرام، سر کوچہ، نمدمو، دل دادہ، انگاں، تاتہ تیغ ناز معشوق نہ نشیند، از پا نمینشیند[13]، جنگ آوراں، سجادہ برآب افگندن، شام خندید، خضوع وخشوع، دستک زدہ ۲۹، نقش محبت در دلم نشستہ، صد پردہ نازکتر، از نگاہ کرم رنگ میبازد، تماشائی (ئے)، محشر خرام، استحالہ ۳۰، تجدد امثال، لوث دنیا، دفعتہً (دفعتاً)، دل اگر گداز[14] شود، مقام منزلہ (منزلتِ) الاقدام ہدایت وضلالت ہر دو مظہر اویند، مناجاتیاں، خراباتیاں، ہستی واجب محتاج برہان نیست عاجی ۳۲، جلوہ دار، خوش آمدی وصفا آوردی، اشرفی بہر دے کا آوردہ، ز نہار کہ از یکساں رو متابی میادا کہ در عرصات[15] رونیابی ۳۳ این در پاسداری این مرد لا علاج، صوبہ دار چوں غریبان خاکسار پارہ[16] رو بہ زمین مالیدہ، خواندہ، سیر آہنگ، ددو دگاہ کہ پردہ را ایست مشہور

---

[1] حاشیۂ ذکر: بجا افتادن وجا مہ گذاشتن یعنی مکث (قیام کرنا) کردن ومردن ہے [2] ؟ [3] ترک لباس دنیا داراں [4] یہ لفظ میں نے کہیں نہیں دیکھا [5] حاشیۂ ذکر: موحال [6] عرصہ: جہاں تک میرا علم ہے، ایرانی فارسی میں نظر نہیں آتا [7] اس طرح ذکر میں اور جگہ بھی، ص ۱۱۳ میں منزلی [8] اور جگہ بھی آیا ہے اور کلیات اردو میں اکا بروں ہے [9] بیاہ ہو گر ص ۱۳ میں کدخدایان شہر بھی ہے [10] داماد کی جو اصل میں نے ص ۱۳ میں بتائی ہے غلط ہے [11] ایران میں ذال کے ساتھ لکھا جاتا ہے [12] ؟ رفت [13] ص ۱۰ میں ہے: پر ستش نکویاں مینمودم ہا گردے بے الیشان مینشتم تمنا بر تمنا میشکستم [14] دست بر دل بیقرار، حاشیہ [15] ۔ تیکے [16] یکبارہ [17] ؟ [18] گداختہ [19] قیامت [20] پارہ رو، کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔

دیگاہ میخوانند، نواجید، نماز خفتن ۳۴، بمبالغہ (بمبالغہ) بیش از بیش (ہر دو جا پ) بخور د فقیر داد، مختصر، چوں شب بسر دست آمد انگیز

فقیر، نیاز نگاہ، تا سخت نخورند از جاے (رے) خود نرو ند ۳۵، ہیہاے ہلاک، کشادہ رو، فتیلہ مو، باریک بین، این جا ئیم، دمے چند

خوش بہ آرم، سر کرد ۳۶، رنج۔۔ گوارا کن کہ شایان راحت شوی، اگر تشنۂ دریاے (دریائی) تہدار حقیقت نمیتواند شد،

صنعتگر بیکار، مژگاں بہم زدنش (روش)، از حیز بیاں بیروں، ہمگی، نماز پیشیں ۳۸، متنغص، از ما چہ میکشاید شکستہ پائی (رے)، قلندر

مضبوط الاحوال، از یں راحت ۳۹، مراقب انقباض و انبساط، راہ و روش، تسلی نمیشوند، خشک سال شد ۴۰، در جناب احدیت

عرض داد، پریشاں گو، بانگپ (کپ) زدن، او خوش داشتم، بالکش (پلاش) شوق، فرد اول جریدۂ تعزیہ، مجرد دوچار شدن، امساک

باراں حیرتی ۴۱، بارش خواہد شد، نماز گزاردیم (بالذال) ۴۲، مبالغہ راحیے و تکلف[۲۲] را نہایتے است، از دہن خود زیادہ مگو، ہنگ

زیر سر گذاشتم، بمعنی شیر شرزہ و بظاہر۔ گربہ لادہ (لادہ)، شستہ تر کردم، خجالت کشید ۴۳، ہر زہ جانگی (کاف عربی)، فتوح ۴۴

عماں، آدمی روشے ایں چنیں دیرپیدا میشود ۴۵، داغ جدائی او۔ تا زندہ ام سیاہی نخواہد افگند، آدمے سہلے (ہر دو یائے معروف)

۴۶، ضامنی[۲۳] نجات او نوشتہ، فجاءۃً، متعہد، پرچہ، گل ہمیشہ بہار ۴۷، شست رشصت بھی ۱۵۲)، ذوق بیذوق، نامید، ورمعاش

پاس مشہور کن و در معاد مراعات معقول، مژگاں برہم زدی، دقیقہ فہم، مغتر ۴۹، خرتیت[۲۴]، دماغ آخر میرود، دور میکردند، شما ند،

کساد بازاری ۵۰، تبرک کردد، رخصت ہم۔ اتفاق میشود ۵۱، در مسئلہ رویت تردد دارم، خدا نخواستہ، رنگ رویش شکست

۵۲، غالباً جان ناتواں طاقت ندارد، عبا (عباے) راز تن من یکشید، تہ شیشہ، درد نوشی بایں درد کشیدن ۵۳، سفینہ (سفید) صبح

و مید، برسمیات مردہ[۲۵] او پرداختند، لعل پروردہ ۵۴، حوائج قسمت میکردہ ۵۵، مقامر خانۂ آفاق، بخدمت سامی، از ینجاست کہ

گفتہ رفتہ است، مطلب عمدہ، ریاضت شاقہ، متصوف ۵۷، عشائین، تپ (تپ) اغواہم کرد، تبریکرد، مبردات، فوق الحد، شث

منقلب ۵۸، برادر اندر، کفایت است، کار ناتوانی بالا رفت، ناقباحت فہمی، ابرو ترش کرد، مزاج ناساز[۲۶]، بازی دہی، نقش عزت

تو پیش ایں بابا نخواہد نشست، ذلت و خواری، قرضدار ۱ پہلو تہی کرد، کمر را محکم بستم ۶۱، در شریک، قرضخواہ، فارغخطی، دستنگر،

کار را بلطف خدا دیند انداختم ۶۲، طرفے نبستم، لقا ہتفاہ خندیدیم قلمدان بردار، وقت دستخط نواب نیست، روز ینہ ۶۳، تان و نمک میخورم

کحل البصر، منتہائے بے منتہا۔ کشیدم، نوشتۂ اخواں پناہ رسید، دنیادار واقعی، حتا طب صحیح، سلوک مدعیانہ ۶۴، خوش صورت،

سیرگاہ او منزل دل ۶۵، داغ سودا سیاہ گردید، کنارہ گیری، زندانی و زنجیری پریخواں، پائیز ترطیب دماغ، بزبان اردوے معلی

(معلی) پادشاہ ہندوستان ۶۷، شعر من در تمام شہر دوید، خالیۂ کنائی حویلی، یرند، نکتہ انگیز، مجراے (ی) من، زمیندار ۶۸ گولا

خان مسطور (منظور)، شکست فاحش، کروفر، بخشیگری ۶۹، بہ روے او دوانید، در ظاہر سامر، جنگ توپ خانہ، پاس نمک نکردہ

---

۲۱ اسی جگہ کا ہوں ۲۲ تکلف بے محل معلوم ہوتا ہے ۲۳ ہندوستانی ۲۴ خرریت ایرانی فارسی میں ہے، مگر اس طرح فارسی الفاظ پر عربی "یت" کے اضافے کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

۲۵ حاشیہ "پیراہن کہ زیر جامہ باشد" یہ صحیح نہیں ۲۶ میر نعش کے لئے "مردہ" کثرت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ۲۷ باطینتی ۲۸ ہر دو مرادف۔

چوں غیرت ہمراہاں یک روز ہم تن ندادند تا بجا دادن چہ رسد، خاں صرفہ خود ندیدہ، مصحف خوردم، تنخواہ، رسالہ، دولتخواہ شعر ریختہ خود ایں آموزید کہ ایں طفل در لبتر بکار درست کردہ بخواند.. چوں پائے تبعیت درمیاں بود. پنج شعر ریختہ باد آموختم، گذشتہ را صلوٰۃ ۷۱، بخشی فوج، امیر الامرائی، نظم ونسق ۷۲، ہیضہ کردہ، سرپائے زدہ، بالقوہ (بدون ہمزہ) خصمانہ او ۷۳، دستوری، خوش سلیقگی، طلاقت لسان، مہم، دیوان خاص، لطائف الحیل، نوشت وخواندے با وزیر داشت، دائرہ لشکر ۷۴، کارپرداز، بند وبست، قلمدان وزارت عزولی، مردمان بے نہ ود عرصہ در آمدند، میل در چشمش کشیدہ، دیوانی خالصہ وتن ۷۵، مہاراجگی، حزم تمام وکمال طمطراق، یاران بد پرداز میر بخشی، وضیع وشریف ۷۶، جنگ از کلہ دکلہ) یاراں پر یدہ مصادرہ، معاملت، کوچید، بجبالہ نکاح در آوردہ، بالا بالا رفتا شہر بند گشت ۷۷، داروغگی توپخانہ، ضیافت شیراز ۷۸، کار دیا ستخواں رسیدہ، چوبدار، علو مرتبت، ارادہ حق تعالیٰ متعلق است ۷۹، زور مند، ز ریکسالہ مرا تنخواہ نمودہ، خانہ باغ، خامہ زباں دراز، یلغار، مقدمات ۸۰، زبوں گشتن، بے ادائی، خسر، تہمتی بادشاہت برہم پذیرہ رفتن، قلم زباں آور، موجبز گنجائی، اطناب، حقہ باز ۸۱، سواد شہر، رئیساں رنگ روہا ختند، جگردار، انجمن شدند، فوج سنگیں، مکلف، تمارض، زمانہ سازی ۸۲، سادہ لوح، نا سرانجام، قلچی، وعدہ دار، جگر از سنگ کردہ، لاشہ، ماتم نگرفتند، کوچ بکوچ (باکوچ) ۸۳، طے مراحل تیغ کشیدن آفتاب، چشم لشکریاں.. ترسیدہ منجم ۸۴، دکھنیاں، ملچار تردد نمودند، سرکردہ فوج تیر (برائے تفنگ)، دست و پا گم کردہ، علطے راتجاک وخوں کشیدند، زشت سیرت، شیخان شہر گوشہ نشیناں بیجا شدند، نسقچی باشی ۸۶، نیمتی، از ہولے سرد خانہ روشن کردند ۸۷، دست بلشتی، دیدہ (ۂ) دریاں، چوبکاری زمین شہر کہنہ کہ جہاں تا نہ آتش بیگفتند، دیوار صورت کاری افتادہ را ماناشد؛ نہیب وغارت ۸۸، قلعجات (قلعہ جات)، جنگ گریز، معسکر ۸۹، در عرضہ بیاس ۸۹، حصاریاں اہتمال ۹۰، عبیر العبور عہد وپیماں، لواحقاں، کردہ، سلخ ۹۱، لالہ، تحفہ، ایلچیگری، امیر شش ہزاری، یک دو دم توقف بہ آوردہ شود، طلب راانجبر (بجبر) پرسش من کشادہ، انواع حلویات ۹۲، مولع، بہمان تبریزی ۹۳، احوال گیری، خرم (خورم)، مایحتاج، تصدیعت ممالک محروسہ، مشایعت ۹۴، کار بندہ ہنر بازی، بہیر و بنہ (نیز ۹۴ نمبر ۱۰۱)، بجوب پیچیدہ، قلعہ سر سواری گرفتہ، پنڈت، سردارے.. بیخبر رسیدہ، قدوم فرحت لزوم، علوفہ من بدستور سابق موشخط کردہ دادند، بند بر بند قبا با فتہ ۹۶، پیادہ شدہ در آویختند، جنگ آواراں عرصہ تنگ آوراں از دو طرف ریختند، دستہائے فوج، تفنگ اندازان سہل، اول وہلہ، مہلکہ ۹۷، دیہات دست اندازی، کردرہا، دہ باشی ۹۸، رفقہا.. نوشت، پیشوا آمدہ صحبت بکار شدہ نزد لے (دلی)، او را منحول کیند، ہیبت کوک شدہ ۹۹، سلسلہ (سلسلہ) مویاں... الحمد و بلیائے کشیدم، اردو نوکش نخوت گرفتہ، شہر نشینی، عوام کالانعام، الو (اولو) العزم، راہداری، محالات، قلعہ دار،

---

۷۱ دوسرا لازما دو تین صفحے کے لئے نہیں آتا۔ ۷۲ = صلاحیت، یہ کئی جگہ آیا ہے ۷۳ اجازت ۷۴ اردو میں یلغار جوڑ کر ص ۱۲۷ میں بھی ہے؛ ترکی میں تلفظ ممکن ہے کہ بدون الف ہو لیکن، فارسی میں عموماً الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے

۷۵ ص ۱۳۷ میں برائے پذیرا شدن ۔

۷۶ ملچار میں نے ذکر کے سوا کہیں نہیں دیکھا، مورچال تو نہیں ؟؛

۷۷ تفنگ بندوق ہے، تو تیر تفنگ سے کیا مراد ہے ؟-

حصن حصین، سرآمد ۱۰۳، ملا قشری، نفس درست نکردہ، پہ دپوچ .. بافت (یافت)، باغات، چشم آب میدادم، موذن طبیقتان (طبقتان)، اقمشہ واقعہ، شہر بند، لشکر پشت داد، لازمان حضور، ناگاہ از تہ (نہ) کار، خام دستان، ناماّل اندیش، بدعہد حلقہ بردر وزیر زدہ ۱۰۶، یومیہ، زخم وامندار، صاحب الوس بعظم (عظیم) شان ۱۰۷، وعدہ قریب میشود، وبے (رلے) طاقتی نمودند، آدمی گر (گیر) ی، سان فوج خود میشمایم، واقعہ (واقع) ۱۰۸، تفنگچیاں (تفنگ چیان)، گرم انداختن تفنگ، رئیس آں طرف۔ خودکشی مینمودند دست از شوخی برنمیداشت، جاسوسان .. دوسہ کردہ این طرف آن طرف کافتند ۱۰۹، فوج التمش[1]، ورانیدیم ۱۱۱، نامعاملہ (معاملہ) فہمان حضور، بد دلی، چپلہ، دارالقرار ۱۱۲، مجوزآزار (انار)، دو لک روپیہ ماہیانہ، جنگ وجدال، معہ[2] ۱۱۲، ۱۲۰، مسعدہا (دہ ہا) ہمہ باطل شدند، تبیٔن ۱۱۳، مقابلہ فیتین، برائے نمود جبات، توپ انداز، ترکی تمام گردیدہ، شہر۔ حاکم نشین، حال شکستہ، صوبجات ۱۱۴، خلیع العذار، ضلع (ضلعہ ۱۴۳) ۱۱۴، مدبران، باسر دہیب پرداختند، عرض سپاہگری (گیری) آنہا بردند، سردار مقرری ۱۱۵، دائرہ گرد محاذ یکدلی، آب میتاختند، جگر در باختہ، اوطان، اساری، نمک، گوشمال بواجبی دادہ، خرابیہا کشیدہ ۱۱۶، نقض عہد، بالسلسلئے، صحب ۱۱۷، استظہار، مستظہر، قوم دغل، بدباخت، ہوس ۱۱۸، درعرصہ نبود، سفہا، صلح وصفا شدہ، مدار المہام، کلہ (کلاہ) گوشہ با آسمان میسایند، ناآزمودہ کار ۱۱۹، پریشان جنگیدند، قلقچی، بالا بالا نخواہد رفت، باش و بود ۱۲۰، بالکلیہ، دادار بیہمال، یمن نیت، آبخور بامن خوب نبود ۱۲۱، علی الرغم (الزعم)، بجال سگ وگربہ ۱۲۲، قدرے قلیلے، دل خوشے نداشت، مفلوک ۱۲۳، بیرو نجات، طرف کلاہ برشکست، دوآبہ، سرچنگے (جنگی) زدہ، انبوہ کزانی، برین منوال، زود حردے (ی) مانند بے محابا (بہ) ۱۲۴، ریتی، مورچال، قلعہ .. را میپرانیدند[3]، رہکلہ وچبوترہ .. ویرب وبابدت وباں، میر آتش، سیلت، ادبار زدگان ۱۲۵، شوریدہ پشت، جم غفیر، زدہ طلب خود را میخواہند خواست، ہنگامہ پرداز، نمک بحرام، قدغن ۱۲۶، روکشی، صاحب سلک، ہیئت مجموعی، محرر، حاجب کوکہ دور باش نماید بمکانہاے منتشرقہ، مختار الملک، برسائر شہر گذمان معلوم بخش، حرکت مذبوحی ۱۲۹، پرخاش بیراق کوتاہ، انجامید، آنجامید، تباہی ترزبانی ۱۳۰، سازشے کردہ، یورش، تاش (تاس) بادلۂ مالدار ۱۳۱، وعدہ ووعید را جہا، بیک سیلی زدن ناز، کارہا و بالاگرفت، ملک تنخواہ سوماں کردہ ۱۳۲، میر بخشیگری، ملکدار، گورنر بہادر کہ صاحب[4] است ۱۳۳، نواب وزیر، مقدمۃ الجیش، دو تنخواہ ۱۳۴ نامتناہی، صاحبزادہ، ہرطرف کہ رومیآورد، گرد میانگیخت، زنجیرہ توپخانہ، غرق آہن، صفوفہا، بیگیر آمدہ ۱۳۵، سیر حاصل، چپلے پہرے فرستاد، فارۂ۔ مترتب نشد، ہشیار سری، مدار و مدوار فیض ۱۳۶، الطاف عمیم، تزک تمام، دوبدو منافق، دانستہ بزبان داشتہ بلاتحاشا، دل بہمے (بہم) دارد، عرضی فرستاد، انتظار میکشیدہ ۱۳۷، لیت ولعل، امورات ملکی ومالی، مرجعیت، دربار میشد، ظلم خانہ

---

[1] حاشیۂ تذکرہ چنداول، (ساقہ) فوج از لغات ترکی وفوجے راگویند کہ برائے حفاظت لشکر میآید بخلاف ہراول، غیاث اللغات اسی کتاب میں التمش کے بارے میں ہے بمعنی فوج پیشیں۔ . ودر لغات ترکی نوشتہ کہ التمش بمعنی فوجیکہ میان ہراول وسردار باشد

[2] مع چاہئے۔ [3] غیاث اللغات میں صرف خلیع العذار، کلیات میر میں بھی خلیع العذار آیا ہے۔

[3] قلعے کو اڑا دیتے۔ یہ میرے خیال میں ہندوستانیت ہے۔

[4] یہ لفظ صاحب کا استعمال قابل توجہ۔

(ر ۵)، منہیات، متعذر، بجا آیدن، خروس ۱۳۹، جاے (رجاے)، براے ایشاں نمایند؟ ۱۴۰، خطر مند، فی الجملہ ۱۴۱، درد از سرتا قدم، آتش او پختند، بجاے (دے) داد و روانہ ساخت ۱۴۲، میوہ (ے) جات لا تحصیٰ، کمانہاے چاچی، دو لتخانہ، بستر خواب مالیدہ، طلائی (ے) نخود سوز، نقل فرنگی ۱۴۴، تنقل، ستارہ و ہوائی، آتشبازی، وارلبست (لیست)، ظل ممدود، مار مسکوب، جلوہ پرداز، باغ بتطراز گلہاے فالودہ، الوان شربت، آں خیرۃ جاں، نان بادام، شیرمال، باقرخانی، نان ورقی، قلیہ دو پیازہ، اقسام کباب بہ دستار خواں کشیدہ، خوش نمک ۱۴۵، اعرجہ، کوفتہ، نسخہ سرشتہ، متعارف، تتاب، پلاو، آتش، عجب آتش درکاسہ (کاسۂ)، خوش معاشی، لطف شامل، امرایان، متصرف رانائی ۱۴۶، بے احصا، شکارنامہ ۱۴۷، دامن کوہ، سفر دور و دراز (دور و دراز)، انتخاب زدہ، خود بدولت خمس کردند، از زمین غزل ۱۴۸، استعلاج، کوس لمن الملک زد، مالک الملک، دستار بدل ۱۵۰، صاحب عالم، پادشاہزادہا ۱۵۱، پلے (پلے) ہیچ، قلعہ بند، قریب یک ماہ کشید، حادثہ گاہ، مزاج ناساز ۱۵۲، عینک، وجع اسناں، آزردہ خاطری ۱۵۳۔

کم سن و نادیدہ (ہ) روزگار ۱۲۳، از خود کردہ ۸۱، وعدہ داد ۸۲، اہل و عیال ۹۱، شہریاں ۸۷، نگار بہشت رو ۸۵، خسارت ۵۰، آدم ۶۱، زبون گفتن ۸۰، زبونگیر چند ۸۳، لاش ۸۴، سواد شہر ۸۸، ہہلکہ ۹۷، خجالت کشیدہ ۱۰۰، خمیازہ کشیدہ ۱۱۶، کوکری ۱۲۰، ورتمہ دکار رنار، سرگرم کار ۱۳۴، گمرہی؟ (بمیدان کہی - قریب درگاہ ۱۲۸، سانحات ۱۴۷، نظم کل ۵، اشتیاقیت ۶، کم فرصتہ لکۂ ابر، تابع مزاج ۱۳، مستسعد ۱۶، اقران ۱۹، ماہ دو ہفتہ ۲۲، چشم لطف از من برنداری ۲۳، راہ دریا۔ کہ قفل است ۲۸، راہ بست است ۳۰، در رابر بستہ ۳۴، تجرید ۳۴، متکفل ۴۶، تانہ وارد ۵۰، مزاجگوئی ۵۱، این قرار داوۂ (کذا) مجلس روانست ۵۵، تازہ از ولایت، کاغذ زر ۶۰، چشم پوشید، پنبہ دہانی ۶۴، سر صفحہا ۶۶، دماغ خود میسوخت، کام و ناکام، جنگ ۔۔ روداد ۶۷، دیوانخانہ ۷۲، بچشم کم خواہد دید ۷۳، دیوان خاص، نوشت و خواندے باوزیر داشت، وکیل ۷۵، براکثر تصنیفات او خط کشیدم، بحقیقت محض، مختار سلطنت ۷۶، اصلح ۷۷، انگوشتہ زدہ ۷۷، دہ گمرد وقت دل ۱۰۰، از جا شد ۸۱، فوج سنگیں ۸۴، پریشان دل ۸۵، استغراق ۸۶، کوچیدہ ۸۸، ہمراہیان، امداد ۔۔ یا [illegible] خود ندیدہ ۸۹، خوشدل، سرسران دکن، دست دو دے واشت ۹۱، بیابان مرگ ۹۵، مرد آرمیدہ، بازاریان ۱۰۱، خیرباد کردہ ۶۷، سررشتۂ (سررشتۂ) کار ۲۶، این جگہ از کجا ۶۴، حیز کتاب ۶۶، کمپایاں ۹۰، خلایہ بود از یں دست تا آں دست ۹۹، پیلا موساں بید دولت ۱۰۱، مقادمت بواقعی ۱۰۲، نظامت، دہ کرور روپیہ حاصل، مفت خود شمردہ، الحمد للہ (للہ) کہ صاحب سنی برآمدند ۱۰۳، خوش ترکیب ۱۰۴، جامہ زیب، پاکیزہ طینت، بازمیندار۔ آویزشے نمودہ ۱۰۶، معہذا، قلعہ داپہ چیرہ دست ۱۰۸، رودداران ۱۰۹، ناتجربہ کاران ۱۱۰، اوداز دیم ۱۱۱، سازو برگ، تلاقی فریقین، شکست فاحش ۱۱۲، دارالجزا، دہ خلال ہمیں حال، بخاطر خوش نمیآوردند ۱۱۳، دو دلہ ۱۱۵، نمک بحرام، تا دو پہر ۱۱۶، شام افتاد ۱۱۷، زبانہ کش، بے اسلوب ۱۱۸، حرکت بیجا، نتیجہ الکبیرہ [illegible]، پانصد، استداو، توکل کردہ پیش سرداران آمد ۱۲۰، تعلل، سر پیچ کردند ۱۲۲، محالات ۱۲۳، قلکزدہ ۱۲۴، عرض بحضور اقدس کردند، زبانزد ۱۲۵، پیادہ پا ۱۲۶، اہل حرفہ ۱۲۷، قیل و قال، جنگ زدند ۱۲۹، شب بزراعت خام معاش کردند، قطعی ۱۳۱، جم غفیر ۱۳۲، حور (نہ) دلش، فوج نگہ بیدار ۱۳۳، خانہ نشین ۱۳۵، خلف الصدق، صفتہاے حمیدہ ۱۳۶، بندوبست کردہ ۱۳۷،

۱ے　یہاں بیمار کے لئے

باقی ص ۳۴ پر

سلطان جمیل نسیم

اِلتماس" پر ایک تحقیقی نظر

اردو میں الفاظ کی تذکیر و تانیث کا مسئلہ بھی عجیب ہے۔ ایک ہی لفظ کہیں مذکر بولا جاتا ہے اور کہیں مونث ——— اردو زبان کے آغاز سے لیکر آج تک اس مسئلے کا کوئی ایسا حل دریافت نہیں ہو سکا ہے جس پر تمام اردو بولنے اور لکھنے والے متفق ہو سکے ہوں مزید برآں اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اردو میں عربی، فارسی اور ترکی کے بہت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اصل زبان سے صورت بدل کر یہاں تک پہنچے ہیں، یہ تبدیلی مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ کہیں تو الفاظ کی حرکات بدل گئی ہیں۔ کہیں اصل معنی کے علاوہ دوسرے معنی اختیار کر لئے گئے ہیں اور کہیں تذکیر و تانیث میں تصرف کر لیا گیا ہے۔

جنوری ۱۹۶۰ء کے نیرنگ خیال میں ارتضیٰ عزمی صاحب کی غزل شائع ہوئی ہے جس کا ایک شعر ہے۔

ہماری سمت بھی کبھی نظر اٹھا کے دیکھئے ہم اہلِ دل کی آپ سے بس اتنی التماس ہے

اس شعر میں "التماس" کو نشان زد کر کے مدیر نیرنگ خیال نے نوٹ دیا ہے کہ "التماس" عربی میں مونث ہے جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اردو میں یہ لفظ مونث نہیں بلکہ مذکر مستعمل ہے۔ فاضل مدیر نیرنگ خیال نے یہ اعتراض اتنے حسین اور بلیغ انداز میں کیا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ مذکورہ لفظ کو بغیر کسی چون و چرا کے مذکر ہی تسلیم کر لیا جائے لیکن تحقیق و کاوش کا تقاضا کچھ اور ہے ——— عزمی صاحب بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں اور زبان و بیان کے معاملہ میں تو خاص طور سے احتیاط برتتے ہیں اسلئے میری طبیعت کو اور زیادہ کرید ہوئی کہ اس لفظ کی تذکیر و تانیث کے بارے میں تحقیق کیجائے

جب خود عزمی صاحب سے میں نے اس لفظ کی تذکیر و تانیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا "آپ اس لفظ کو اردو میں مذکر مان لیجئے اور میرے مصرعہ کو یوں پڑھئے" ———

ہم اہلِ دل کا آپ سے بس اتنا التماس ہے

پھر خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ یہ لفظ مذکر ہونا چاہئے یا مونث ——— اسکے بعد وہ مسکراتے ہوئے بولے "شاید آپ کی تسلی نہیں ہوئی ہے۔ بھئی اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں دہلی اور لکھنؤ کا اختلاف ہے۔ دہلی والے مذکر اور اہل لکھنؤ مونث استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں اسی قبیل کے اور بہت سے الفاظ ہیں مثلاً فکر، بلبل، طرز اور آغوش وغیرہ آپ کس کس کے بارے میں تحقیق کرتے پھرینگے"!

میں عزمی صاحب کی اس گفتگو سے مطمئن نہیں ہو سکا اس کی وجہ یہ تھی کہ مدیر نیرنگ خیال حکیم یوسف حسن صاحب ایک

پرانے ادیب و صحافی ہیں اور اردو میں ان کی بڑی خدمات ہیں اس لئے میں نے موصوف کے اعتراض پر اس انداز سے فیصلہ کر لینا گوارا نہیں کیا جیسا کہ عزمی صاحب نے اشارا کیا تھا اسکے علاوہ میری طبیعت بھی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ جب تک کسی اختلافی مسئلہ کے بارے میں اہل علم کی رائیں اور اساتذہ کی اسناد حاصل نہ ہو جائیں، مجھے چین نہیں آتا لہٰذا میں نے اس سلسلہ میں خود بھی تحقیق شروع کر دی اور مختلف اہل علم سے بھی رجوع کیا جن میں نقوی صاحب ابوظفر صہبا صاحب منشی عطا اللہ صاحب، مولانا احترام الدین صاحب شاغل اور مولانا سیفی صاحب کے نام قابل ذکر ہیں ان تمام حضرات کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی آراء سے مطلع کیا اور اسناد کی فراہمی میں میری معاونت فرمائی ـــــ اب التماس پر مختصر سا تحقیقی جائزہ حاضر ہے ملاحظہ فرمایئے۔

التماس :- اسم مذکر۔ لغوی معنی :- درخواست کرنا۔ عرض۔ گذارش۔ بنتی۔ التجا) ـــــ

عربی میں مؤنث۔ اہل زبان مذکر و مؤنث دونوں طرح بولتے ہیں۔

مذکر :- 　جھگڑے سنتے ہو روز اوروں کے 　　آج میرا بھی التماس سنو 　　(لا اعلم)

مؤنث :- 　ادا ہر طرح رسم آبرو کی 　　ادب سے التماس گفتگو کی 　　(امیر اللہ تسلیم) (فرہنگ آصفیہ)

　صنم پرست ملیں یا خدا شناس مجھے 　　دعائے وصل کی رہتی ہے التماس مجھے 　　(رشک) (معین الشعراء)

پلاٹس (PLATTS) میں مذکر دیا ہوا ہے۔

تذکیر و تانیث، (حافظ جلیل حسن جلیل) مختلف فیہ ہے۔

میں نے منت سے التماس کیا 　　کہ محبت نے بدحواس کیا 　　(مومن)

نسیم اللغات از نسیم امروہوی ناظم انجمن ترقی اردو (صفحہ ۹۲) مذکر بھی اور مؤنث بھی،

محاورات ہند از استاد منیر لکھنوی (صفحہ ۲۱) لکھنؤ میں مؤنث اور دہلی میں مذکر بولتے ہیں۔

خواجہ میر درد کا شعر ہے ـــ

نہ پھر تک شمع سر کو دھنتی رہی 　　کیا پتنگے نے التماس کیا

نگار لکھنؤ کے سالنامہ ۵۲ء حسرت نمبر، میں مولانا جمال میاں فرنگی محلی کا مضمون "رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس مضمون میں مولانائے موصوف نے "التماس" کو مؤنث استعمال کیا ہے فرماتے ہیں :-

" ملک و ملت کے ایسے مجاہد قائد اور اردو کے اتنے بڑے شاعر کی ان یادگاروں کے لئے حکومت یا ملت سے کوئی امید رکھنا بے کار ہے اور اس قسم کی استدعا بھی کرنا مولانائے مرحوم کی شان استغنا کو صدمہ پہونچانا ہے۔ لیکن ناشرین کتب سے اور مضمون نگاروں سے اتنی التماس ضروری ہے کہ وہ کم از کم مولانا کی تصانیف بلا ان کی اہلیہ محترمہ کی اجازت کے شائع نہ کریں اور ان کی داخل نصاب کتابوں کا سرقہ تو نہ کریں "

"آں عزیز کے استفسار نے خلجان میں ڈال دیا۔ التماس کو میں خود مونث بولتا ہوں اور میرے نزدیک سب کو مؤنث ہی بولنا چاہیئے۔ میرے مطالعہ سے کہیں اسکے خلاف نہیں گذرا کہیں کہیں لوگ بچا بچا کر ضرور استعمال کر گئے ہیں یعنی لفظ

کی تذکیر و تانیث کا پتہ ہی نہیں چلتا ہے میں نے اپنی طبیعت کی خلش مٹانے کے لئے حضرت شاغل سے رجوع کیا ان کا
بھی وسیع ہے اور لائبریری بھی بڑی ہے۔ موصوف نے جو کچھ لکھا ہے لفظ بہ لفظ لکھ دیتا ہوں :-

" التماس - ع - عرض کرنا - (مذکر - مومن - مرحوم) ۔

فلک رس ہو غوغا مناجات کا — کروں التماس اپنی حاجات کا (دستور الشعراء) مز

اساس ، التماس ، کھٹاس اور مٹھاس مؤنث بولے جاتے ہیں (رسالہ تذکیر و تانیث) صفحہ ۲۶

مدیر نیرنگ خیال کا نوٹ خود سند ہے - بہت کم الفاظ ایسے ہونگے جو عربی میں مؤنث اور اردو میں مذکر کی حیثیت سے مستعمل ہوں ورنہ اکثر تو جو لفظ عربی یا فارسی میں مؤنث یا مذکر استعمال کیا جاتا ہے ۔ بالکل اسی طرح اردو میں بھی ہوتا ہے۔ آپ نے مدیر رسالہ کے نوٹ کے جو معنی لئے ہیں وہ غلط ہیں ۔ التماس اردو میں بھی مؤنث ہی ہے ۔ آپ سے التماس ہے کہ آج شام غریب خانہ پر تشریف لائیں ۔ آپ نے میری التماس منظور فرمائی ، شکریہ ۔ ان جملوں سے اندازہ لگا لیجئے کہ التماس کا صحیح استعمال کیا ہے "

مندرجہ بالا اسناد و اقتباسات سے کم از کم میرے نزدیک " التماس " کے مذکر یا مؤنث ہونے کا فیصلہ نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ بحث یہاں ختم ہوتی ہے ۔ بلکہ حقیقت میں یہاں سے تو اس بحث کا صحیح معنوں میں آغاز ہوتا ہے ۔ کیونکہ بقول رشید حسن خاں صاحب کے ــــــــ " زبان جب درمیانی دور سے نکل کر آگے بڑھتی ہے تو بہت سے غلطیے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں ۔ موجودہ دور میں یہی ہوا اور یہی ہو رہا ہے اس بنا پر ہم کو مان لینا چاہئے کہ دوسری زبانوں کے جو الفاظ آج عام طور پر پڑھے لکھے لوگ جس طرح استعمال کرتے ہیں وہ اسی طرح صحیح ہیں لیکن اگر اس بات کو کسی تعین کے بغیر کہہ دیا جائے تو صحیح نہیں اسلئے کہ پھر ہر شخص اپنے گھر یا اپنے علاقے کی زبان مستند مانے گا جو ستم مستند بات نہیں - زبان بڑی اہم چیز ہے ۔ جس طرح اس میں جمود مناسب نہیں اسی طرح یہ بھی مناسب نہیں کہ اس کی کوئی حد ہی مقرر نہ کی جائے ۔ یہ بات بہت آسانی کیساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جو الفاظ جس طرح مستعمل ہیں وہ اسی طرح صحیح ہیں لیکن واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ اگر ایسے الفاظ کا تعین نہ کیا جائے تو یہ ایک انتہائی غلط اقدام ہوگا ۔ ایک زندہ زبان کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر چیز منضبط ہو " اس لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ اردو زبان کے دیگر مسائل کیساتھ ساتھ ایسے الفاظ جنکی تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے ان کی تذکیر و تانیث کا تعین کر لیا جائے اسکے لئے اہل علم اور اہل زبان کے ماہر حضرات آج کے مطالبات نئے محرکات نئے میلانات اور نئے سماجی و سیاسی حالات کو پیش نظر رکھکر اصول وضع کریں تاکہ زبان میں یکسانیت اور ملک کے مختلف علاقوں میں اردو بولنے اور لکھنے والوں کی تقریر و تحریر میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے اس سلسلہ میں اہل زبان و زبان دان اور دہلی و لکھنؤ کے اختلافات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہئے بلکہ الفاظ کی تذکیر و تانیث کا معیار علمی انداز کا ہونا چاہئے لیکن ایسے اصول بناتے وقت ذوق اور وجدان کی رہنمائی بھی بیحد ضروری ہے -

آنجہانی پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے اردو میں الفاظ کی تذکیر و تانیث کے لئے کچھ اصول وضع کئے ہیں موصوف نے اپنی کتاب منشورات یا کیفیہ میں لفظ شمس کی تذکیر و تانیث پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لفظ عربی ہے اور عربی زبان میں مؤنث مستعمل ہے ۔ لیکن جب یہ لفظ اردو میں آیا تو اسکی جنس تبدیل ہو گئی اور مذکر بنا لیا گیا کیونکہ اسکے ہم معنی ایک لفظ

(باقی ص ۲۹ پر)

صبا اکبر آبادی کا ایک شعر

(۴)

سلطان جمیل نسیم کے استصواب پر اس شعر کی تشریح میں اب تک مولانا عبدالماجد دریابادی، علامہ تمنا عمادی، پنڈت تلوک چند محروم، سید محمد حسین، سید حسن امام وارثی، رعنا اکبر آبادی، غلام ربانی تاباں، عطاء اللہ نظر انصاری، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، خواجہ غلام السیدین، نیاز فتحپوری، پروفیسر ضیا احمد بدایو[نی]، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر مسعود حسین، علامہ جمیل مظہری، [...]ندی، سید آل رضا، ڈاکٹر وزیر آغا، شکیل بدایونی، شان الحق حقی، سید ہاشم رضا، صالحہ عابد حسین، [...] اکبر آبادی، رضیہ صفت جعفری، پروفیسر [...] احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد عزیز، سید ذوالفقار علی بخاری، جیسے اہل علم وادب نے حصہ لیا ہے، ان کے علاوہ نیروز میں اس بحث کو دیکھ کر جناب [...] عباد اللہ اختر اور فرمان فتحپوری نے بھی اظہار خیال کیا ہے اور یہ سارے خطوط آپ کے سامنے آچکے ہیں اب ذیل میں چند اور ممتاز ادیبوں کے [...]ادات ملاحظہ فرمایئے یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ (ادارہ)

[...]مد طاہر فاروقی

عزیزم السلام علیکم

آپ کا خط آئے بہت دن ہوگئے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ پھر جواب گول کر گیا۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ میں برابر جواب [...]کا ارادہ کرتا رہا، مگر ایسا جواب فرصت چاہتا ہے اور وہ میری قسمت ہی میں نہیں ہے۔ اس لئے آپ چاہیں تو اس تاخیر کو معاف کر دیجئے۔
پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ اس طرح کے گنجلک اور مبہم اشعار میں نہ الجھا کیجئے۔ سب سے پہلے یہ انداز ہمیں غالب نے سکھایا۔ پھر کم زیادہ ہوتے [...] کے بعد اس دور میں پھر چمک گیا ہے۔ بعض حضرات تو اس سے زیادہ مغلق اور پیچیدہ باتیں کر جاتے ہیں۔ اور جی چاہتا ہے کہ انکے [...]ر کو مہمل سمجھ لیا جائے۔ لیکن یہ نہیں تو کم سے کم اتنا تو کرنا چاہیئے کہ ہم اپنے ذہن کو ایسے الجھاووں سے بچائیں۔ اتنا وقت کسی ادبی شاہکار [...]عری شہپارہ میں صرف کیا جائے تو کیا فائدہ ہوگا؛ صبا صاحب کے یہاں خود بڑے نوادر اور شاہکار جمع ہیں۔

اس تمہید کے بعد یہ عرض ہے کہ یہ شعر بہر حال نہ مہمل ہے اور نہ مغلق۔ البتہ اس میں تھوڑا ابہام ہے اور کچھ نازک خیالی [...]لئے شاید آپ یا کوئی اور دوست اس میں الجھ گئے ہونگے۔ لیکن یہ عرض کر دوں کہ یہ شعر جسقدر اچھا لگتا ہے اتنا اچھا نہیں۔ اسمیں [...]ھا اور چونکاتا ہے وہ اسکے ظاہری حسن کی وجہ سے ہے۔ ایسی عمدہ بندش ایسے شائستہ الفاظ اور ایسا حسین انداز بیان سادہ [...]شعر سنتے ہی ہم چونک پڑتے ہیں اور مرعوب ہو جاتے ہیں۔

مجھے بھی یہ شعر اچھا لگا اور اچھا لگتا ہے۔ لیکن جب معنی پر غور کیجئے تو یہ طلسماتی تار و پود بکھر جاتا ہے۔ گھما دو کیجئے کتنے اچھے اشعار [...]میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ شعر کوئی انفرادی اور استثنائی حیثیت اس بارے میں نہیں رکھتا۔

کیا معنی ہیں اس شعر کے؟ آئینہ ساز آئینہ دیکھتا تھا۔ آئینہ دیکھکر اپنی صنعت پر حیران اور مسرور ہو رہا ہوگا (یا نوک پلک کی فکر میں ہوگا) مگر اسکی حیرت کی کوئی حد نہ رہی یہ دیکھکر کہ (ارے یہ تو کوئی طلسماتی آئینہ ہے کہ) عکس بدل پڑا ہے۔ اس پر ظاہر ہے کہ اسکو چونک پڑنا تھا۔

تماشا یہ ہے کہ اس سارے شعر میں سب سے زیادہ چونکا دینے والا لفظ یہی "چونکنا" ہے۔ اور مجھے اس شعر میں یہی لفظ کمزوری کا باعث نظر آتا ہے چونکنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود اپنی صنعت کے کمال کے آئینہ ساز کے لئے یہ تجربہ غیر متوقع تھا۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ یہاں کوئی غیر متوقع بات جو خود آئینہ ساز کی توقعات سے ماورا ہو بیان نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اس سے اس کے کامل اور اکمل ہونے پر چوٹ پڑتی ہے درانحالیکہ باقی مضمون اسکی اکملیت کی طرف ذہن کو منتقل کر رہا ہے۔

اب اسی مضمون کو آپ صوفیانہ بنا لیجئے۔ (میں یہ جانتا ہوں کہ صبا صاحب صوفی نہیں ہیں) ہم کو اعتراف ہے کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است — اور اس لئے ہماری روایت کے لحاظ سے غیر صوفی شعراء نے عام طور پر مضامین تصوف بیان کئے ہیں، تو چلئے اسکا صوفیانہ مطلب نکال لیں۔

مگر خیال رکھئے کہ صوفیانہ مطلب سے مضمون اور معنی میں آپ گہرائی تو پیدا کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ مبتدا و خبر اور فاعل ومفعول بدل جائیں۔

اس طرف آیئے تو مضمون اور بھی گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں آئینہ ساز کی کاملیت واکملیت میں شمہ برابر کمی نہیں تصور کی جا سکتی۔ تو پھر اسکی صنعت میں کوئی ایسی بات پیدا ہو جانی جس پر وہ خود چونک اٹھے کیونکر قابل قبول ہوگا۔

ایک اور پہلو لیجئے۔ یہ ساری کائنات ۰ اس ،، کا ظل اور عکس ہے۔ یا انسان ظل خدا ہے (اور ظل ہی کو ہم عکس بھی کہیں گے) ایسی صورت میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ عکس کو جس مقام پر اور جن اوصاف کا حامل آئینہ ساز نے تصور کیا تھا۔ وہ اس سے زیادہ کا حامل نظر آیا۔ اس لئے خود آئینہ ساز اپنی صنعت کے اس عمل پہ حیران رہ گیا اور چونک پڑا۔

بس یہی "چونک پڑنے" والی بات تو کسی طرح نہیں جمتی۔ مجازی معنی میں مجھے اچھی نہ لگی تو یہاں کیسے چپکا دوں —!!

اچھا دیکھئے —— یہ خط صرف آپ کے لئے ہے۔ میں مقدمہ بازی سے بہت دور کا آدمی ہوں۔ خود بیانی صبا صاحب سے پوچھ لیجئے گا۔ مجھے اخباروں اور رسالوں میں آپ نہ گھسیٹیں تو بڑا کرم ہوگا۔ البتہ صبا صاحب اس مضمون سے اختلاف کریں تو میرے لئے موجب مسرت ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ ان کے اختلاف سے میرے علم میں کچھ اضافہ ہو جائے۔

فضل کریم فضلی

مکرمی۔ سلام مسنون۔

آپ نے جس شعر کے معنی دریافت فرمائے ہیں وہ میری دانست میں ایسا نہیں جس پر زیادہ اختلاف رائے کی گنجائش ہو۔ ویسے تو شاید ہی کوئی شعر بے معنی یا مہمل ہو جبتک کہ خود مصنف اسے دیدہ ودانستہ مہمل نہ بنائے۔ ہر شاعر شعر کہتے وقت کوئی نہ کوئی مفہوم ضرور پیش نظر رکھتا ہے جسے وہ نظم کرتا ہے۔ سوال صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ کہاں تک اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کامیاب ہوا ہے اس شعر میں ←

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

شاعر کا مافی الضمیر ادا ہو جاتا ہے اور اچھی خاصی طرح ـــ آئینہ ساز خالق کائنات ہے عکس سے مراد انسان ہے جو احسنِ تقویم کا مصداق ہے۔ اب معنی صاف ہو جانے چاہئیں۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔

شاد عارفی ۔

نسیم صاحب سلام علیکم

صبا اکبر آبادی صاحب کے مطلع سے متعلق استفسار ملا۔ اس مطلع پر میری آخری رائے تو یہ ہے کہ قطعاً "مہمل" غلطی دراصل یہاں ہو رہی ہے کہ غالب نے اپنے مہمل اشعار کے جواز میں "گنجینۂ معنی کا طلسم باندھ کر" اپنے بے شمار متبعین کو تباہ کر دیا چنانچہ ان مقلدین نے امیر خسرو کے لیے ڈھکوسلوں میں الفاظ کمپوز کر کے ان کو بامعنی کہنے پر اصرار میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اور کچھ ان کے یار لوگوں (گروپ) نے انہیں بانس پر چڑھانے میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ جن پر یگانہ چنگیزی حملا کر برس پڑا - - - -

میں نے کہا ہے کہ میری آخری رائے میں یہ مطلع قطعاً مہمل ہے۔ اب ایسا کہنے کے دلائل بھی سنئے پہلے تو اس مطلع میں فنی خرابی یہ ہے کہ مصرعہ مقدم موخر ہے پہلے مصرعہ کو دوسرا اور دوسرے کو پہلا مصرعہ ہونا چاہئے تھا۔ دوسری غلطی یہ کہ "دیکھتا تھا" کی جگہ "دیکھتے ہی" کا پہلو ہے، دیکھتا تھا کی "استمرار" توقف اور تامل محل نظر ہے۔ اسلئے کہ چونکنے کے لئے کسی کام کے ناگہاں اور یک لخت ہونے کی ضرورت ہے۔ سوچ سمجھ کر چونکنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خیر یہ بحث آگے آئے گی۔

اب مطلع کی ہیئت دیکھئے اور اس ترتیب سے مقابلہ کیجئے جو صبا اکبر آبادی صاحب کے یہاں ہے۔

آئینہ ~~دیکھتا تھا~~ دیکھتے ہی آئینہ ساز چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز

دیکھتے ہی کے ساتھ چونکنے کا جو تعلق ہے وہ ظاہر ہے نہ کہ دیکھتا تھا کے تسلسل و تواتر سے۔

نسیم صاحب ـــ اب معنویت کی طرف آیئے۔

حقیقتاً اس مطلع کی بنیاد غالب کے مصرعہ

طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

پر قائم ہے بدرجہ مجبوری حیات امروہوی کے اس فلمی غزل کے مصرعہ پر بھی کہ

بج رہا ہے اور بے آواز ہے ۔

ان دونوں مصرعوں کو گڈمڈ کر کے شعبدہ بازنے اپنی ٹوکری سے خرگوش نکالا ہے۔ شعر نہیں کہا ہے۔ اوہ میں بھولا ـــ مطلع سرزد کیا ہے۔ غالب کی اسی غزل سے جس کے مقطع میں گنجینۂ معنی کے طلسم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صبا اکبر آبادی صاحب نے کافی استفادہ کیا ہے۔ غالب کہتا ہے۔

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آئے
جاں کالبد صورت دیوار میں آئے

صبا صاحب نے سوچا ہوگا کہ جب کہ بند صورت دیوار میں جان پڑ سکتی ہے تو عکس بہر حال لطیف تر ہوتا ہے وہ کیوں گفتار میں نہیں آسکیگا چنانچہ انہوں نے عکس کو قوت گفتار عطا کر کے ندرت کا ایک مرحلہ طے کرلیا اور نہ سمجھا کہ اسطرح آئینہ ساز پر بڑی زد پڑے گی چنانچہ غور فرمائیے یہ تو طے شدہ نسخہ ہے کہ جس شعر میں معنی نہ ہوں انہیں تصوف اور فلسفہ کے لبادے میں لپیٹ کر معنی دار بنایا جاسکتا ہے جب ہی تو غالب اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کے غلط شعروں پر تصوف اور فلسفہ کا "لکل" چڑھا یا گیا ہے۔ جبکہ نہ تو غالب اور نہ کوئی دوسرا شاعر اپنے ہاں تصوف اور فلسفے کے حقائق کلیۃً بیان کرسکا ہے مبادی فلسفہ و تصوف سے کم سے کم پڑھا لکھا آدمی بھی واقف ہوتا ہے چنانچہ جن شعروں کو ناقص اور تصوف کا شاہکار کہا گیا ہے وہ بچارے خود اپنے اس علمی مرحلے سے بے خبر تھے۔ بات پھر تفصیل کی طرف جا نکلی لیکن ہوگی مفید ——— اب آپ یہ دیکھیں کہ اس مطلع میں آئینہ ساز خدا ہے اور انسان آئینہ اور انسان کا دل بھی ہی۔ تو آئینہ ساز یعنی صانع کو اپنے مصنوع سے یہ لاعلمی بے خبری کہ وہ بول بھی سکتا ہے۔ اپنے صانع پر کفر کی حد تک طنز ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ جب خدا انسان یا اسکے دل کو بنا چکا تو اسکے تکملے پر غور کرنے کے لئے ۔ "دیکھتا تھا" گویا بڑی ناقدانہ نظر ڈال رہا تھا کہ کہیں کچھ جھول یا خامی تو نہیں رہ گئی کہ صفات آئینہ کی بدولت یا آئینہ ساز کے عکس خصوصیت کی بنا پر عکس نے "آواز دیدی" ۔ یہاں یہ پہلو محلِ نظر ہے کہ وہ آواز تحسین و داد کے انداز میں تھی یا طنز آکوئی فقرہ مثلاً۔

نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا ——— یا پھر مولانا روم کی "نے" والی پوری حکایت آواز سنتے ہی آئینہ ساز اسطرح چونک پڑا جس طرح ——— فرض کیجئے کوئی کاریگر (کاریگر یوں کہہ رہا ہوں کہ میں خدا کی ذات سے یہ گستاخی نہیں کرسکتا) بچھو بنائے اور صرف حکمت کے اظہار کے لئے بنائے کہ دیکھو میں نے ایک ایسا جانور بنایا ہے جسکی آنکھیں نہیں ہیں۔ اس معدوم البصری کے بعد بھی وہ اپنا انسکار احساسات کی بنا پر کرسکتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کاریگر نے بچھو کو بہت پیار سے ہاتھ میں اٹھانا چاہا تو اس نے ڈنک مار دیا۔ اب تو کاریگر چونک پڑا کہ یہ خوبی اسمیں خود بخود کہاں سے آگئی جبکہ میں نے اسکی ساخت میں کوئی کھٹکتی ہوئی چیز نہیں رکھی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کاریگر کے ڈوب مرنے کی بات ہے کہ وہ اپنے مصنوع کی خصوصیات سے لاعلم ہے اسلئے آسانی سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ صبا اکبرآبادی کا آئینہ ساز خدا نہیں ہے۔ ورنہ اسمیں یہ ناتمامی کفر ہوگی۔ اب ایک اور طرح سوچیے چونکہ خدا یعنی آئینہ ساز انسان یعنی آئینہ کو بناتے وقت اسمیں قوت نطق کے ساتھ کم ظرفی کی صفت بھی ودیعت کی تھی اسلئے جب بھی کسی منصور قسم کے بزرگ نے فنافی اللہ کے مرتبہ پر پہنچ کر انا الحق کہا تو خداوند قدوس کو اسپر قطعاً تعجب نہیں ہوا اسلئے کہ وہ جانتا تھا کہ اسمیں اس نے کیا کیا کمزوریاں ودیعت کی ہیں۔ مگر یہ صبا اکبرآبادی کا آئینہ ساز اپنا آئینہ گر ہے جسکے متعلق صائب نے کہا تھا۔

صائب ز ملائک مطلب رتبۂ انساں
آئینۂ بے پشت چہ دیدار نماید۔

اسلئے میرا آخری فیصلہ یہ ہے کوئی بھی اسکو با معنی ———
ہر چند کہے کہ ہے ۔ نہیں ہے ۔ ——— نظیری نیشاری پوری نے کیا خوب کہا ہے

غلط سنجانِ عامی دشمنان اند
مگر در صحبتِ اغیار مگسل

نوٹ :- اس قسم کے گھٹیا اور بے معنی اشعار پر اسقدر الجھنا فضول وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے حیرت ہے کہ آپ نے ذراسی بات کو اسقدر طول دیا۔ یا اسکے مقابلے میں اگر کوئی مفید کام پر اپنی توجہ صرف کرتے تو بہتر تھا۔

براہ کرم اس خط کو ضرور شائع کرائیگا۔ ش۔ ع

امتیاز علی عرشی رامپوری۔

مکرمی۔ تسلیم

صبا صاحب کا شعر مجھے تو بامعنی نظر آتا ہے۔ ہاں ذرا صوفیانہ قسم کا ہے اس میں آئینہ ساز سے ذاتِ خالقِ کائنات مراد ہے۔ آئینہ خود کائنات ہے، جو اسکے صفات کا پرتو ہے، اس میں سب سے افضل و اشرف عکس انسان ہے جسے خود خالق نے "احسنِ تقویم" پر پیدا کرنے کی بشارت دی اور اسی بنا پر زمین پر اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر کیا ہے۔ باقی عکس کو دیکھنا اور پھر اس کی آواز سن کر چونک پڑنا وغیرہ سب مجازاتِ شاعرانہ ہیں

سلیم جعفر :-

آپ کی فرمائش کا جواب تو وہی ہے جو میں دے چکا ہوں لیکن آپ نے اسکا اعادہ کیا میں کیا اور میرا فہم کیا کسی نے کہا ہے

ہم سخن سنج نہیں اور سخن فہم نہیں
صاحبِ علم و ہنر ہیں یہ ہمیں وہم نہیں

یہ مجھ پر صادق آتا ہے حضرت صبا بقیدِ حیات ہیں ممدوح سے ہی استفسار کیا جاتا تو بہتر تھا۔ ع تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں — میری سمجھ میں جو کچھ آتا ہے عرض کرتا ہوں آئینہ ساز نے اس مقصد سے آئینہ بنانا شروع کیا کہ جو چیز اسکے سامنے آئے اسکا عکس اس میں منعکس ہو بنا چکا تو امتحاناً اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس کا عکس اس میں پڑا اور وہ بول اٹھا۔ حبذا مرحبا چونکہ یہ امر غیر متوقع تھا۔ آئینہ ساز غرق لجۂ حیرت ہوگیا۔

بہ ظاہر الفاظ شعر سے تو یہی معنی نکلتے ہیں۔ مجاز و استعارہ اگر کچھ اور معنی پیدا کرتے ہوں تو وہ میرے فہم سے بالاتر ہیں

سرفراز تسکین :-

سلطان جمیل نسیم صاحب :-

خط ملا —— صبا صاحب کے شعر پر میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔ بہر حال پہلے آپ صبا صاحب کے چند شعر سن لیجئے

ظاہر جہان پہ مرتبۂ آدمی کریں
جتنے نبے ہوتے ہیں خدا بندگی کریں

✦

یہ ہمیں ہیں کہ ترا درد چھپا کر دل میں
کام دنیا کے بدستور کئے جاتے ہیں

✦

ان کی نظریں جب مرے اشعار میں حل ہو گئیں
نامکمل تھیں جو غزلیں وہ مکمل ہو گئیں

+ + +

زندگی آج کا فریب نہیں زندگی عمر بھر کا دھوکہ ہے

+ + +

آؤ ذرا سہیں تپشِ روزگار کو الفت میں پختہ کار نہ تم ہو نہ ہم ابھی

+ + +

شگفتِ گل میں بھی زخمِ جگر کی صورت ہے کسی سے ایک تبسم کا آسرا بھی نہیں
اگر شعورِ محبت نہ درمیاں ہوتا کوئی کسی کو زمانے میں پوچھتا بھی نہیں

+ + +

بڑا غضب ہے کہ آنسو بھی بے اثر نکلے بڑی امید تھی ہر اشکِ رائگاں سے مجھے
اگر یقینِ رسائی ہو ان کی منزل تک تو پھر گزار دو شعلوں کے درمیاں سے مجھے

+ + +

ہم اپنے غمکدے سے جاتے ہوئے کسی کو دیکھا کئے مسلسل دیکھا گیا جہاں تک

+ + +

میرے الجھے ہوئے حالات سمجھنے والے تیرے آراستہ گیسو تو پریشاں بھی نہیں

+ + +

ہر ایک کو خوش رکھنے میں کوئی نہ ہوا خوش میرے دلِ مخلص سے نہ بندے نہ خدا خوش
حاصل ہے مکافاتِ عمل حسبِ توقع دوزخ میں نہیں آج کوئی میرے سوا خوش

+ + +

ان اشعار کے لکھنے کا مطلب یہ تھا کہ صبا صاحب بڑی مشکل زمینوں میں بڑی آسانی سے بڑے مضمون کو ادا کر دیتے

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

شعر کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے آئینہ ساز اور عکس کا تعین کرنا ضروری ہے لہذا جگت موہن لال رواں کا شعر ملاحظہ ہو۔

اہلِ جہاں کے کفر و توہم کا کیا علاج آئینہ کہہ رہا ہے کہ آئینہ ساز تھا

اس سے آئینہ ساز کا تعین ہو گیا۔ کہ (عکسِ حقیقی یعنی انسان یا کائنات) اور آئینہ ساز (صانعِ مطلق) یعنی خالقِ کل اس تعین کے بعد شعرِ زیرِ بحث میں آئینہ ساز کا چونک اٹھنا اور آئینہ کا آواز دینا وضاحت طلب ہیں جب مجاز

آئینہ ساز (کاریگر) آئینہ بنانے کے بعد آئینہ کو تنقیدی نظر سے دیکھتا ہے اور آئینہ کا ایک ادنیٰ سقم بھی اسے غیر مطمئن بنا دیتا ہے۔ یعنی وہ خامی دیکھ کر چونک اٹھتا ہے۔ تو حقیقی آئینہ ساز (صانع مطلق) اپنے آئینہ یعنی انسان کی کسی خلاف توقع حرکت سے کیوں نہیں چونک سکتا اب سوال آئینہ کے آواز دینے کا اس کا جواب یہ ہے کہ آئینہ بے جان نہیں بلکہ جاندار شئے ہے یعنی حیوان ناطق ہے لہٰذا وہ بول سکتا ہے۔

اعتراضات کے جوابات تو ہو چکے لیکن حاصل شعر کیا ہے اس کے متعلق بھی سن لیجئے آئینہ ساز (خدا) اپنے عکس (انسان) کو دیکھ رہا تھا کہ اس کی آواز سنکر چونک اٹھا اس کی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا تھا۔ اور اس سے بندگی ہی کا متوقع تھا۔ لیکن انسان اپنے فطری تمرد کے سبب کبھی اس کی خدائی سے انکار کرنے اور کبھی خود خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔

خدا انسان کی زبان سے ایسی خلاف توقع باتیں سنکر چونک اٹھا اور اس کا یہ چونکنا حق بجانب بھی ہے۔

شعر کا ایک مفہوم اور بھی ہے جہاں تک معترضین کی نظر نہیں پہنچی۔ اردو کا روزمرہ ہے کہ اس نے ایسی چیز بنائی کہ منہ سے بول اٹھی۔ جیسے صبا صاحب کا یہ بولتا ہوا مطلع حالانکہ کوئی چیز یا یہ مطلع ذی روح نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے آواز کا صادر ہونا معلوم ——— لیکن یہاں منہ سے بول اٹھنے کے معنی انتہائے صنعت یعنی انتہائی قابل تعریف ہونے کے ہیں، منہ سے بولنے کے اس اصطلاحی معنی کو ذہن میں رکھ کر پہلا مصرعہ گنگنائیے!

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز

اور دیکھئے کہ عکس کی آواز کے معنی اب عکس کی آواز نہیں رہ جاتے بلکہ انتہائے خوبصورتی کے ہو جاتے ہیں آئینہ ساز کے چونک اٹھنے کی توجیہہ یوں ہو سکتی ہے مثلاً ایک شاعر سے کوئی عظیم شعر ہو جاتا ہے تو اسے خود حیرت ہوتی ہے کہ ایسا عظیم شعر کیونکر تخلیق پا گیا۔ اب سوچئے آئینہ ساز نے اپنے ذہن میں آئینہ کا ایک خیالی خاکہ بنایا اور جب آئینہ مکمل ہو گیا اور اسے دیکھا تو خود چونک اٹھا کہ ایسا حسین آئینہ کیونکر بن گیا جو منہ سے بول رہا ہے۔ میرے خیال میں شعر نہ صرف بامعنی ہے بلکہ بہت عظیم ہے

بقیہ:۔ "التماس" پر تحقیقی نظر

سورج، اردو میں پہلے سے ہی موجود تھا جو مذکر بولا جاتا تھا۔ اگر اس اصول پر التماس کی تذکیر و تانیث کے بارے میں غور کیا جائے تو اس لفظ کا اردو میں مونث ماننا پڑیگا جسکی وجہ یہ ہے کہ اردو میں التماس کے ہم معنی جتنے الفاظ مستعمل ہیں سب کے سب مؤنث ہی بولے جاتے ہیں مثلاً عرض، گذارش، درخواست، التجا اور بنتی ——— بنتی خالص ہندی لفظ ہے اور ہندی میں بھی مؤنث بولا جاتا ہے ——— اسلئے مدیر نیرنگ خیال محترم حکیم یوسف حسن صاحب سے میری التماس ہے کہ وہ بھی عرشی صاحب کے شعر کو اس طرح پڑھیں —

ہماری سمت بھی کبھی نظر اٹھا کے دیکھئے
ہم اہل دل کی آپ سے بس اتنی التماس ہے۔

وحید قیصر ندوی

مسلم بنگالی ادب کا پس منظر

اور

جدید رجحانات

پس منظر

بارہویں صدی عیسوی تک بنگلہ زبان کا شمار کسی مستقل زبان میں نہیں ہوتا تھا مقامی بولی یا سنسکرت تھی موجودہ بنگلہ زبان سنسکرت اور پراکرت کی بگڑی ہوئی شکل کا نام ہے جس نے خود اپنا مقام حاصل کر لیا ہے اور اب ایک مستقل زبان کہلانے لگی ہے۔ اگر مسلمان بادشاہوں نے اس نومولود زبان کی سرپرستی نہ کی ہوتی تو یہ اس قدر ترقی یافتہ نہ ہوتی۔ مسلمان بادشاہوں میں سب سے زیادہ حسین شاہ نے اسے ایک زندہ زبان بنانے میں حصہ لیا۔ چنانچہ میں آج تک کسی ہندو شاعر کا یہ مصرع مشہور ہے "شری حشی جگت بھوشن" یعنی حسین شاہ سارے جہاں کے محسن ہیں۔

بنگلہ کے ابتدائی دور میں صرف شعرا کا کلام ملتا ہے نثر نگاری کا باضابطہ آغاز چھ سو برس بعد اٹھارہویں صدی عیسوی ہوا اس وقت تک بہت تھوڑے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مصنف خود ہی اپنی کتابیں اپنے ہاتھوں سے لکھا کرتے تھے اس کی کئی کئی نقلیں تیار کرتے تھے۔ بعض مصنف دوسروں سے نقلیں تیار کراتے تھے۔ لیکن اس کی رفتار اس قدر سست تھی سوائے ایک خاص حلقے کے تعلیم آگے نہیں بڑھ سکی۔

اسی زمانہ میں یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار بڑھنا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ یہی حکومت کی مالک بن بیٹھی سلطنت پر قابض ہوتے ہی انگریزوں نے ہاتھ پیر نکالنے شروع کئے اور امور سلطنت کے ساتھ ساتھ یہاں کے مذہب کلچر اور سے بھی ٹکر لینا چاہی۔ غیر مسلموں نے ان کا ساتھ دیا اور وہ بہت آگے بڑھ گئے۔ مسلمانوں نے ٹکر لی اور پاش پاش ہو گئے۔ چونکہ نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو بے دست و پا کر دینا چاہا۔ غیر مسلموں نے بھی مسلمانوں کو کچلنے کی کی۔ مسلمانوں نے دونوں میں سے کسی کے آگے ہتیار نہ ڈالے۔ انہوں نے انگریزوں کا طرز معاشرت، تمدن اور زبان کا سیکھنا اوپر حرام کر لیا اور بنگلہ میں پڑھنا لکھنا جو ان کی بول چال کی زبان تھی اس لئے گناہ سمجھا کہ وہ اسے غیر مسلموں کی زبان سمجھتے تھے۔ یہ اور فارسی کو اپنی زبان خیال کرتے تھے جنکو مٹانے کے لئے انگریزوں نے ہر قسم کی تدبیریں کر رکھی تھیں۔ انگریز عربی اور فارسی کو ملک بدر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حکومت کی زبان انگریزی قرار پائی۔

انیسویں صدی کے شروع میں حاجی محمد محسن، نواب عبداللطیف اور سید امیر علی مرحوم وغیرہ نے مسلمانوں کو انگریزی کی طرف متوجہ کیا۔ علما کی بھویں تن گئیں اور انہوں نے ان کی سخت مخالفت اور مذمت کی۔ مگر یہ ہمدردان قوم اپنے کام میں

ڑے ہی عرصہ میں ان کی سعی و کوشش سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں. انہوں نے سمجھ لیا کہ انہوں نے بنگلہ اور انگریزی دونوں سے
ہ کر اچھا نہیں کیا چنانچہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد انگریزی اور بنگلہ کی تعلیم حاصل کرنے لگی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں عیسائی پادری گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پھر کر عیسائیت کی تبلیغ کرتے تھے بشروع شروع میں
ریوں کو زبان کی وجہ سے بہت دقت محسوس ہوئی مگر تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے مقامی زبان یعنی بنگلہ سیکھ لی اور یہاں کے
ے اس میں بات چیت کرنے لگے۔ اٹھارہویں صدی تک چھاپہ خانہ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اور لکھنے کا رواج بہت کم،
ہونے کے برابر تھا۔ پادریوں نے سوچا کہ اگر بنگلہ زبان کا ٹائپ بنا لیا جائے اور کتابیں چھاپ چھاپ کر اپنے خیالات اور مذہب
اعت کی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس طرح ان کا حلقہ اثر زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ اسلئے بہت سے انگریز اہل علم اور
اس کام میں لگ گئے۔ دو پادریوں کیری اور مارشمین نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ دونوں فارسی زبان کے بڑے عالم تھے اور
نے ایسے آدمیوں کو ملازم رکھا جنہیں بنگلہ اور فارسی دونوں پر عبور تھا۔ ایسے لوگوں میں رام۔ رام بوس اور شری مرتنجائے خاص
قابل ذکر ہیں۔ ان سے کیری اور مارشمین نے تھوڑے ہی دنوں میں بنگلہ زبان اچھی طرح سیکھ لی۔

ادھر فورٹ ولیم کالج اور سری رام پورشن کا قیام عمل میں آچکا تھا پادریوں کی تجویز پر انہی کی مدد سے فورٹ ولیم کالج
سری رام پورشن والوں نے بنگلہ زبان کا ٹائپ بنایا۔ چنانچہ سری رام پورشن نے بنگلہ کی سب سے پہلی کتاب جسے رام، رام بوس
لکھا تھا بنگلہ ٹائپ میں چھاپ کر شائع کی۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج اور سری رام پورشن نے ہزارہا کتابیں چھاپیں۔ پادریوں کی
دیکھی غیر مسلموں نے بھی اپنے پریس جاری کئے اور ہر قسم کی کتابیں چھاپنا شروع کیں. مسلمانوں نے غیر مسلموں اور فرنگیوں سے علٰحدگی
کر رکھی تھی اسلئے انہوں نے پریس کی ایجاد سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔

انیسویں صدی میں سر سید علیہ الرحمتہ کی طرح جب بنگال میں سید امیر علی اور محمد محسن وغیرہ نے انگریزی تعلیم کا پرچار شروع
مسلمانوں نے محسوس کیا کہ وہ دوسروں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور ان کو خطرناک حد تک بے وقوف بنایا گیا ہے۔ عربی
جنہیں وہ اپنی زبانیں سمجھ رہے تھے بلائے نام رہ گئی تھیں اور جس زبان سے وہ نفرت کر رہے تھے اسکا ہر طرف رواج تھا چنانچہ انہوں نے اپنی ساری توجہ اسی طرف مبذول کر دی کہ نئی
نسل انگریزی اور بنگلہ کی تعلیم حاصل کرے اسی لئے انیسویں صدی میں ہمیں مسلمان مصنفوں، نقادوں، شاعروں، نثر نگاروں
ورخوں کا ایک اچھا خاصا گروہ تصنیف و تالیف میں مشغول نظر آتا ہے۔

چونکہ بنگلہ کو زندہ زبان بنانے میں غیر مسلموں نے بہت حصہ لیا ہے اس لئے اس زبان پر ہندو فلسفۂ حیات کا بہت گہرا
اہے اور ایک طرح سے یہ زبان غیر مسلموں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔ بنگلہ کے سارے ادبی، تاریخی، سیاسی، سماجی، اقتصادی
معاشی سرمائے پر ہندو اثر غالب نظر آتا ہے۔ اس لئے جن مسلمانوں نے ابتدا میں تصنیفوں کا سلسلہ شروع کیا وہ بھی غیر
ں کے ادبی اور علمی سرمائے سے بالواسطہ یا بلا واسطہ متاثر نظر آتے ہیں۔

جدید رجحانات

بنگلہ شاعری کے موجودہ دور کا آغاز انیسویں صدی کے اخیر میں ہوا۔ جب یہ کوشش شروع
ہوئی کہ بنگلہ زبان کو دنیا کی دوسری زندہ زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا جائے۔ چنانچہ اسی کوشش
سبب آج بنگلہ زبان میں ہر علم و فن کی کتابیں کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں۔ مسلمان بہت بعد میں بنگلہ زبان اور جدید بنگلہ شاعری

کی طرف متوجہ ہوئے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جب پاکستان کا نعرہ ایک حقیقی مطالبے کی شکل میں سامنے آیا تو مشرقی پاکستان کے حساس اور دردمند مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ ملی مقاصد کے پیش نظر بنگلہ زبان میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ چنانچہ لاہور رزولیوشن کے ساتھ ساتھ مشرقی بنگال میں ایک لسانی انقلاب کی بنیاد پڑی۔ کلکتہ مسلمانوں کی تمام سرگرمیوں اور سیاسی تحریکوں کا مرکز تھا اس لئے اس لسانی انقلاب کا مرکز بھی کلکتہ ہی قرار پایا۔

سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک یہ کام بہت سست رفتاری سے ہوتا رہا مگر اس دو سال کے عرصہ میں اس لسانی انقلاب کی ضرورت اور اہمیت تمام مسلم رہنماؤں اور قائدین کی سمجھ میں آگئی چنانچہ سنہ ۱۹۴۲ء کے شروع میں مولانا محمد اکرم خاں کی سرپرستی میں ایسٹ پاکستان رینائینس سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں یہ بات دل چسپی سے سنی جائیگی کہ مسلمان نوجوان جس لسانی انقلاب کے داعی تھے اس سے کئی غیر متعصب ہندو بنگالی بھی کلی اتفاق رکھتے تھے۔ ان غیر مسلموں میں پریذیڈنسی کالج کے ایک پروفیسر شوشو بھوشن سرکار اور بنگالی فلموں کے مشہور ایکٹر منورنجن بھٹاچاریا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

لسانی انقلاب کا مرکز گو مغربی بنگال تھا مگر اس کا داعی زیادہ تر مشرقی بنگال کا نوجوان طبقہ تھا۔ مغربی بنگال کے ساتھ ساتھ خاص مشرقی بنگال میں بھی یہ تحریک آہستہ آہستہ زور پکڑتی جارہی تھی اسی زمانے میں خاص ڈھاکے میں ایک ادبی انجمن "پوربا پاکستان شاہتیہ سنگد" قائم کی گئی جسکے مقاصد بھی وہی تھے جو ایسٹ پاکستان رینائینس سوسائٹی کے تھے ڈھاکے میں اس انجمن کی زیر سرکردگی لسانی انقلاب کی تحریک بڑے زور شور سے شروع ہوئی اس کے پہلے صدر ایک نوجوان پروفیسر سید علی احسن تھے اس کی مجلس عاملہ میں نذیر احمد شہید، کوی جسیم الدین اور پروفیسر مظہر الحق وغیرہ شریک تھے۔ نذیر احمد اس کے سب سے زیادہ سرگرم کارکن تھے۔ جن کو اپنی مسلم دوستی کی وجہ سے جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ لیکن ان کا خون رنگ لائے بغیر نہیں رہا۔ انہوں نے جس نیک مقصد کی خاطر جان دی تھی وہ آخر پورا ہو کر رہا۔ آج مشرقی پاکستان میں جو بنگلا زبان جنم لے رہی ہے وہ اس زبان سے بالکل الگ ہوتی جارہی ہے۔ جو مغربی بنگال، آسام اور تری پورہ وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔

"پوربا پاکستان شاہتیہ سنگد"، نے ڈھاکہ سے ایک پندرہ روزہ رسالہ "پاکستان" کے نام سے نکالا، اس میں ایسے مضامین ہوتے تھے۔ جن میں عربی، فارسی اور اردو کے الفاظ کثرت سے استعمال کئے جاتے تھے۔

اس جماعت کا افتتاحی جلسہ سلیم اللہ ہال میں ہوا جس کی صدارت "ایسٹ پاکستان رینائیسنس سوسائٹی" کے صدر اور روزنامہ "آزاد"، کلکتہ کے ایڈیٹر جناب ابوالکلام شمس الدین نے کی۔ اس جلسہ میں صاف صاف اعلان کیا گیا کہ مسلمانوں کی بنگلا غیر مسلموں کی بنگلہ سے الگ ہے۔ اس میں تین چیزوں پر بہت زور دیا گیا۔

(۱) بنگلہ لٹریچر میں اسلامی تصورات اور تخیلات کا داخل کرنا۔

(۲) دیہاتی قصے کہانیوں کے مجموعے "پوتھی"، کو اسلامی رنگ میں نئے سرے سے ڈھالنا۔

(۳) دیہاتی شاعری کے ذخیرے کی فراہمی اور اس میں اسلامی رنگ پیدا کرنا۔

جلسے کے ختم ہوتے ہی چند حساس نوجوان آگے بڑھے اور انہوں نے پوری تندہی اور جانفشانی سے "پوتھی" اور لوک گیتوں یعنی عوامی نغموں کی اصلاح کی کوششیں شروع کر دیں۔ چونکہ لوک گیت زیادہ تر مسلمانوں میں رائج تھے اور ان کے مصنف بھی زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ اس لئے ان نوجوانوں کو اس سلسلہ میں زیادہ دقتیں نہیں اٹھانی پڑیں۔ اسی طرح پوتھیوں میں چونکہ عام طور سے کربلا کے واقعات حضرت علیؓ کی جنگوں کے حالات، حضرت خالدؓ اور حضرت طارقؒ کی بہادری کی داستانیں تھیں اس لئے ان کی اصلاح میں بھی زیادہ دقتیں پیش نہیں آئیں

پوتھی اور لوک گیتوں کا دائرہ صرف دیہاتوں ہی تک محدود تھا۔ اس لئے ان پر شہری لٹریچر یعنی ہندو فلسفۂ حیات کا اثر نہیں پڑا تھا۔ یہ صنفیں عربی فارسی سے پہلے ہی بہت متاثر تھیں اسلئے ان کو اسلامی رنگ دینے کا مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہو گیا۔

"پوتھی" کی اصلاح کے سلسلے میں سیّد علی احسن کا نام سرِ فہرست ہے۔ انہوں نے "پوتھی" کی اصلاح کے ساتھ ساتھ "پوتھی" کے انداز پر ایک طویل بنگلہ نظم "قصۂ چہار درویش" مرتب کی ان کے بعد مفخر الاسلام نے ایک نظم اسی رنگ میں "یوسف زلیخا" کے نام سے لکھی۔۔۔ کوی فرخ احمد نے بھی الف لیلہ کے بعض مشہور قصوں کو سامنے رکھکر اسی رنگ میں کئی اچھی اور کامیاب نظمیں لکھیں جن میں "سندباد" یا "درد دریا سے" اور "بہری" وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

ان نوجوانوں کی کامیابی پر ملک کا تخریب پسند طبقہ بہت چیں بہ جبیں ہوا مگر اس کی ایک نہ چلی اور یہ تحریک آہستہ آہستہ مشرقی پاکستان کے تمام شاعروں اور ادیبوں کو متاثر کر گئی۔ چنانچہ کوی شہادت حسین، کوی غلام مصطفےٰ، کوی جسیم الدین، کوی فرخ احمد مفخر الاسلام سیّد علی اشرف مشرقی پاکستان کی واحد مسلمان شاعرہ بیگم صوفیہ کمال، اشرف صدیقی اور دوسرے تمام نئے اور پرانے مسلمان شاعروں اور ادیبوں کی شاعری اور ادب نے ایک نیا راستہ اختیار کر لیا۔ اب ہمارے بنگالی شاعر اور ادیب جو تخلیقات پیش کر رہے ہیں ان کی ایک ایک سطر سے اسلام دوستی اور اسلامیت ٹپکتی ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ سارے ادیب اور شاعر جو اس انقلابی تحریک کے موافق تھے یا مخالف مشرقی پاکستان آ گئے ہیں اور آپس میں مل کر ایک نئی زبان کو جنم دے رہے ہیں۔ نام نہاد ترقی پسند طبقہ بھی برابر اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ لیکن زبان کے معاملے میں وہ بھی مسلمان ادیبوں اور شاعروں کا ہمنوا ہے چنانچہ اب خیالات چاہے جس قسم کے ادا ہوں ان کی ادائیگی اس زبان اور طرز تحریر میں ہوتی ہے جس کے مسلمان ادیب و شاعر داعی ہیں اس وقت مشرقی اور مغربی بنگال پڑوس میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دور ہو جائیں گے۔ آج مشرقی پاکستان میں "پردھان منتری" کو وزیر اعلیٰ "سبھاپتی" کو "صدر" اور "سماچار" کو "خبر" کہا جا رہا ہے "نمسکار" کی جگہ "السلام علیکم" "باڑی" کی جگہ "دولت خانہ" کا استعمال عام ہے۔ اسی طرح مسلمان ادیب اور شاعر اقبال کے کلام کا ترجمہ کثرت سے کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کوی فرخ احمد کا نام نمایاں نظر آتا ہے کیونکہ انہوں نے ایک طرح سے علامہ اقبال کے کلام کو بنگلہ میں منتقل کرنے کے لئے خود کو وقف کر دیا ہے۔

کوی غلام مصطفےٰ "مسدس حالی" کا منظوم بنگلہ ترجمہ بہت پہلے شائع کر چکے ہیں شہادت حسین کی نظم "زندہ پاکستان" کے ایک ایک لفظ سے اسلامیت ٹپکتی ہے۔ یہ شہادت حسین وہی ہیں جو "گرودیو" رابندر ناتھ ٹیگور کے سب سے بڑے "پیرو" سمجھے جاتے تھے ان کی زندگی کے آخری دور کی نظمیں اور مضامین دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس کثرت سے عربی فارسی کے الفاظ اپنے مضامین میں اور اشعار میں استعمال کرتے تھے۔

سید علی احسن کی نظم "مکہ معظما رپاتھے"، یعنی مکہ معظمہ کے راستے پر" کا مطالعہ کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت بنگلہ زبان کے ادیبوں اور شاعروں کے جدید ادبی رجحانات کا دھارا کس رخ پہ بہہ رہا ہے۔

بقیہ:۔ یاران نکتہ داں

رسائل ملا جس میں مجھے افسوس ہے کہ وہ ہفتہ وار لاہور کا نام نظر انداز کر گئے ہیں جب کہ میں اس کا ایک ایسا خریدار ہوں جو اسے ۵۲ء سے پڑھ رہا ہوں۔ مزہ تو یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں انھوں نے بعض ایسے ہفتہ واروں کا ذکر کر دیا ہے جو لاہور کے بعد نکلے اور اب دم توڑ رہے ہیں۔ کیا اسے مقالہ نگار کی آئینی لغزش قرار دیا جائے۔ والسلام۔

ارشد کاکوی

میرے محترم!

آپ کا اداریہ حسب معمول اب کے بھی خاصہ خیال انگیز ہے۔ شاید یہ اداریہ علی اکبر قاصد صاحب کو بھی متاثر کر سکے۔ اس بار ش ضحی کی نظم اور صبا اکبر آبادی کی غزل جانِ مطالعہ ہیں۔ اگر آپ خط کا جواب دیا کرتے تو میں آپ سے ش ضحی صاحب کا پتہ دریافت کرتا۔ پہلے وہ کوئٹہ میں تھے۔ سنا ہے کہ کراچی میں ہیں لیکن یہ شنیدن کس کام کا۔

بقیہ:۔ چند غلط فہمیاں

روس اور امریکہ کی بے پناہ علمی، حربی اور معاشی قوتیں کوئی دو چار ہفتے یا دو چار سال کے اندر پیدا نہیں ہو گئی ہیں امریکہ نے تو یہ سب کچھ صدیوں میں حاصل کیا ہے، لیکن اگر زار کے روس کو عدم محض بھی فرض کر لیجئے تو روس کو اس مقام تک پہنچنے میں کم از کم ۴۳ سال تو بہر حال صرف کرنے پڑے ہیں۔

بقیہ:۔ عبدالحق بحیثیت محقق

پذیرا شدن، دست اندازہ ۱۳۸، در بار میشد، بے اسبابی، بندگان عالی ۱۴۰، دولت ایں بابا مستعجل ۱۴۱، السلطنۃ تمام ۱۴۲، میدہ ہائے رسیدہ ۱۴۴، سیاسیاں، جلوہ پرداز، آتش ماخواہد بخت ۱۴۵، وزیر الممالک ۱۴۶، کمان دکھنیاں نمیتوانند کشید ۱۴۸، جگرہ صید اندازی انیان نخواہند رسید، تسلط کلی ۱۵۱، بے (رپے) ایچ ماتن تنہا ۱۱۴، ہمنیہا ۱۱۸، نرگسداں ۱۴۴، نمد مویان بیابان وحشت ۲۷، شکل وصورت ۲۷، دور گردان نزدیک بدل ۷، ۲، سلاطین ۸۰، رسد ۹۶، فوز عظیم ۸۲، جستہ جستہ ۱۲۴، مور چال اسطورہ ۱۲۸، چشم سیاہ کردند ۱۰۵، سررشتہ (سرشتہ) کار بدست دیگرے ۲۶، انگار بہشت رو ۵۴، دل بگداز ۱۷، واکشید ۱۴۔

سید محبوب جمالی

سیاہ نقوش

بے سود ہے دیوانگیٔ شوق کا اظہار
مجھ کو نہ سمجھ دولتِ عشرت کا طلبگار
ایوانِ مسرت کے مکیں حسنِ فسوں کار
بہلالے شبستانِ امارت میں دلِ زار

ہاں! بھول جا ماضی کو کوئی خوابِ حسیں تھا!

مجھ بیکس و مجبور کی آفات ذرا دیکھ
سوزِ غمِ پنہاں کی عنایات ذرا دیکھ
تخئیل کے ڈھتے یہ محلّات ذرا دیکھ
آشفتگیٔ گردشِ لمحات ذرا دیکھ

ہاں! بھول جا ماضی کو کوئی خواب حسیں تھا!

ہے زیست میری خوگرِ غم یاس زدہ دل
منجدھار کا آغوش ہے میرے لئے ساحل
ہاں! دیکھ لگا ہوں میں سری جذبۂ بسمل
اک شورشِ حسرت ہے مری سانس میں شامل

ہاں! بھول جا ماضی کو کوئی خواب حسیں تھا!

اقوارؔ ظہوری

"حرفِ مطلب"

میری امید کی دوشیزگی و نغمہ گری
آج بھی شوق ملاقات لئے بیٹھی ہے
دل رسیدہ غم حالات لئے بیٹھی ہے
صبح جسکی نہیں وہ رات لئے بیٹھی ہے
آج بھی ہے وہی اندازِ فسردہ نظری

میرے سینے میں امنگیں تو جواں ہیں لیکن
تیری بے مہری و بیگانہ روی کا عالم
ہے مرے صفحۂ تقدیر پہ عنوانِ الم
اور پھر بارِ سماعت مرا افسانۂ غم
تجھ سے ملنا نظر آتا ہے ابھی ناممکن

تجھ کو ماحول نے دیوانہ بنا رکھا ہے
ایسے ماحول کی بندش سے نکلنا ہوگا
ساتھ چلنا ہے تو بے خوف ہی چلنا ہوگا
تلخ حالات کے دھارے کو بدلنا ہوگا
ورنہ دنیا نے تو افسانہ بنا رکھا ہے

نیمروز کراچی
اپریل ۱۹۴۰ء

ذوالفقار رضوی

زہر بھرا ہے مدھ کا پیالہ

ابو جان کی باتیں ختم ہونے ہی نہ آتی تھیں۔ حامد نے بیٹھے بیٹھے شاید دس جماہیاں لے ڈالی تھیں پانچ مرتبہ انگلیوں کے جوڑوں کو چٹخا چکا تھا۔ اور پھر ہاتھوں کو ایک دوسرے میں الجھاتے ہوئے اسے ناخنوں میں میل دکھائی دیا تو ایک ہاتھ کے ناخنوں سے دوسرے کے ناخنوں کا میل نکالنے لگا۔ دس ناخن بھی صاف ہو گئے مگر ابو جان کی باتیں۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا انہیں۔ حامد دل ہی دل میں اس گھڑی پر لعنت بھیج رہا تھا جس گھڑی نے ابو جان سے لڑکیوں کو تعلیم دینے کے متعلق بات شروع کی تھی۔ اگر اسے خبر ہوتی کہ ابو جان لڑکیوں کی تعلیم کے اس قدر خلاف ہیں تو پہلے ہی حزب مخالف بن کر تعلیم نسواں پر دو چار باتیں کہہ ڈالتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ناخنوں کے کنارے دودھیا ہو چکے تھے۔ اب اس کی توجہ چہرے کے دوسرے حصّوں کی جانب مبذول ہوئی۔ آنکھوں کے کونوں میں انگلیوں کے سرے ڈال کر انہیں صاف کیا پھر اس کی انگلیاں کانوں کے سوراخوں کی خبر لینے لگیں۔ وہاں سے پھسل کر ناک کے نتھنوں کی صفائی ہوئی۔ اور اس کے بعد

اب کیا کیا جائے۔

حامد نے کمرے کی تینوں دیواروں پر لٹکتی تصویروں کیلنڈروں اور ٹنگے ہوئے کپڑوں کو غور سے دیکھنا شروع کیا حالانکہ یہ تمام چیزیں وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ مگر اب اسے ان چیزوں کے دیکھنے میں لطف آ رہا تھا۔ سامنے کی دیوار پر ایک کیلنڈر لٹکا تھا جس کا مہینہ تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ بات اس نے ابھی دیکھی اس کے اوپر جو تصویر تھی اس کے فریم کا شیشہ ایک کونے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ پھر دائیں طرف جو کپڑے ٹنگے ہوئے تھے ان میں پیلے اور لال رنگ کے دو ڈوپٹے ساتھ ساتھ کتنے برے لگ رہے تھے۔ لال۔ یہ دونوں رنگ اکٹھے برے کیوں لگتے ہیں۔ وہ چیزوں کو دیکھتے دیکھتے سوچنے لگا۔

ابو جان ابھی تک نئے نئے نکتے تلاش کر کے اسے یہ سمجھا رہے تھے کہ لڑکیوں کو تعلیم دینا بہت برا ہے۔ مذہب[1] کی رو سے گناہ اور دنیا کے لحاظ سے تباہ کن۔ مگر یہ باتیں کرتے ہوئے انہیں وہ دن اور وہ باتیں بری طرح یاد آ رہی تھیں جب انہوں نے اپنی پہلی لڑکی کی پیدائش پر بیوی سے کہا تھا۔ کہ میں اپنی لڑکیوں کو میٹرک تک ضرور پڑھواؤں گا۔ مگر یکے بعد دیگرے تین لڑکیاں اور تین لڑکے۔ چھ بچے گویا اس کی زندگی کو تکلیفوں اور مصیبتوں کے چھ گہرے اندھے کنوؤں میں دھکیل دیا گیا ہو۔ بیوی زندہ نہ رہی ورنہ نہ جانے کتنے بچے اور اسے باپ کہنے کو تیار ہوتے۔

ابو جان کی زبان تیزی سے چل رہی تھی۔ اوسان بگا۔ دماغ ان کے دل کو چوڑے چکلے سینے میں پرانی باتیں یاد

[1] کس مذہب کی رو سے؟ ۔ (مدیر)

دلا دلا کر تیزی سے دھڑکا رہا تھا۔

حامد کی نظروں نے دوسری دیوار سے تیسری دیوار تک پھسلنا چاہا۔ مگر راستے ہی میں اٹک گئیں۔ کھڑکی کے شیشوں کے پیچھے دونوں جانب دو دو آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحہ ان چاروں آنکھوں کو دیکھا۔ اور پھر ان کی تاب نہ لا کر ابو جان کے چہرے پر گاڑ دیں مگر ابو جان تو چپ ہو چکے تھے اور اپنے نقلی دانت نکال کر صاف کر رہے تھے۔

ابو جان کے ہاں حامد کا یہ دوسرا دن تھا۔ لائلپور سے چلتے ہوئے اس نے ابو جان اور ان کے گھر کے دوسروں کے متعلق جو باتیں سوچ رکھی تھیں وہ سب غلط نکلیں دس برس پہلے جب وہ سترہ برس کا تھا تب ابو جان اپنی تینوں بیٹیوں بیٹوں اور بیوی کے ساتھ لائلپور گئے تھے۔ ابو جان اس کے والد کے چچیرے بھائی تھے یعنی ابو جان اسکے چچا لگتے تھے۔ خاندان کے سبھی چھوٹے بڑے انہیں ابو جان کہتے تھے نہ جانے کیوں۔ اسے خود بھی پتہ نہ تھا اور نہ ہی کبھی کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس کی بس سب انہیں ابو جان کہتے تھے

ابو جان نے دانت صاف کرنے کے بعد انہیں میز پر رکھے ہوئے پانی سے بھرے پیالے میں ڈال دیا۔ اور خود باہر چلے گئے۔ حامد کو سوچنے کا پورا موقعہ مل گیا۔ اس نے سامنے رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر کھول لی۔ آنکھیں کتاب کے صفحوں پر دوڑنے لگیں مگر دماغ نے اپنا کام شروع کر دیا۔

"کھڑکی میں کون کون تھا۔۔۔؟

"سلمہ، ازیرہ، عاصمہ"

سلمہ اور ازیرہ ہونگی۔ نہیں سلمہ اور عاصمہ عاصمہ اور ازیرہ ہونگی۔ وہ جوڑا مرتب کرنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر اس کا دماغ پھر کر والدہ کی باتوں تک جا پہنچا۔

"تمیز سے رہنا۔ کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے ان کی نظروں سے گرنے کا احتمال ہو۔ ہر کام میں ہر بات میں آداب کا لحاظ رکھنا۔"

وہ سوچنے لگا اب تک اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی جس سے والدہ کی ہدایات کو ٹھیس پہونچی ہو۔

اسے دراصل ابو جان نے ہی بلایا تھا۔ تاکہ اسے اچھی طرح دیکھ لیں۔ اور پھر اس کے ہاتھ میں سلمہ کا ہاتھ دے دیں۔ ابو جان نے بھی سوچا ہوگا کہ چلو لڑکا بھی دیکھ لیں گے اور لڑکے والوں پر احسان بھی ہو جائے گا۔ کہ ایک مہینہ اپنے گھر میں رکھا۔ ایک طرف ایک دن ابو جان حامد سے کہنے لگے۔

"حامد بیٹا بچوں کی باتوں یا شرارتوں سے اگر کوئی تکلیف ہو تو برا نہ ماننا۔ سلمہ وغیرہ کی والدہ زندہ ہوتیں تو کتنے آرام میں رہتے تم۔ خیر پھر بھی۔"

"کوئی بات نہیں ابو جان ۔۔۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔"

مگر ایک روز اسے واقعی بڑی تکلیف ہوئی جب ۔۔۔ سے پتہ چلا کہ سلمہ، ازیرہ، عاصمہ میں سے کوئی ایک۔ ابو جان کے جانے کے بعد گلی کے کسی آوارہ چھوکرے سے ملتی ہے۔ اس نے گھر لوٹتے ہوئے تینوں میں سے کسی ایک کو گلی میں ایک لڑکے جیل

تے دیکھا تھا۔ حامد کو دیکھتے ہی جمیل آگے نکل گیا اور وہ لڑکی سلمٰی، ازیرہ، یا عاصمہ گھر میں گھس گئی۔
اس نے چاہا کہ ابو جان سے کہہ دے مگر کہتا کیا۔ سلمٰی ازیرہ یا عاصمہ میں سے کس کی بات کہے۔ ابو جان کے تینوں لڑکے ایسے ہی تھے۔

وہ لڑکی کون تھی

وہ یہ نہ جان سکا۔

سلمٰی ازیرہ، یا عاصمہ؟

دن رات اس کے دل و دماغ کرید تے رہے لیکن وہ نہ کچھ سوچ سکا اور نہ کچھ سمجھ ہی پایا۔ دس دن گذر گئے اور وہ طے نہ کر پایا کہ چپ چپ رہنے والی اس سے پردہ کرنے والی سلمٰی یہ غلطی کر رہی ہے یا تیز تیز باتیں کرنے والی ہر بات مذاق کا پہلو نکال لینے والی ازیرہ کی یہ حرکت ہے یا بھولی بھالی عاصمہ کی جسے یہ بھی نہیں پتا کہ ریڈیو میں آواز کہاں سے آتی ہے۔ اور ریڈیو سن کر عجیب عجیب سوال کرتی ہے۔

آہستہ آہستہ اس کے غصہ اور نفرت کا جذبہ نرم پڑتا گیا۔ آخر ان بچاریوں کا قصور بھی کیا ہے۔ اٹھائیس[۲۸] پچیس[۲۵] اور تیس[۳۰] سال کی عمریں ——

جوانی دروازہ پیٹ رہی ہو —— اور کوئی کواڑ نہ کھولے۔ آخر کب تک کلیاں اپنے [illegible] شبو بند رکھ سکتی جوانی زندگی کی دہلیز پہ سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے آنکھیں پھوڑ لے، کیا کرے،

اس نے دن رات اس مسئلہ پر سوچا۔ ہر وقت ابو جان کی تینوں لڑکیوں کے بارے میں کھویا رہا ہر پہلو سے ہر امکانی تلاش کرنے کی کوشش کی مگر کچھ نہ ہو سکا۔ آخر کچھ ہوتا بھی کیسے۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ آخر ان تینوں میں سے کون ہے۔ بڑی یا چھوٹی؟ ایک دن وہ یونہی بیٹھے بیٹھے گنگنا رہا تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ کوئی اسکی آواز سن رہا ہے یا گنگنا نے لگا تب اس نے باقاعدہ شروع کر دیا مگر اس نے گانا ختم کیا تو ازیرہ دھم سے آ ٹپکی۔

"بھائی جان ایک گانا اور ——"

حامد اچھل پڑا۔

"نہیں بھئی مجھے گانا کب آتا ہے ——"

"میں نے ابھی سنا۔ ہائے اللہ اتنا اچھا تو گاتے ہیں آپ"

"ازیرہ ان سے کہو کہ گائیں ——" پردے کے پیچھے سے سلمٰی کی آواز آئی۔

"کون سا ——" ڈکار کی طرح حامد کے منہ سے نکلا۔

"آپ تو کہتے تھے۔ آپ کو گانا نہیں آتا" ازیرہ چہکی

"نین ملے نین ہوئے باورے"، سلمٰی کی آواز آئی۔

حامد نے میز بجا کر گانا شروع کر دیا۔ اس دوران اس کی نظریں جلتے ہوئے پردے کے پیچھے کچھ تلاش کرتی رہیں

اس نے جان بوجھ کر گانے کو طویل کیا ہر بول کو بار بار دہرایا گانا ختم ہوا تو ساتھ ہی اسے کچھ خیال آیا۔

یہ سلمہ تو اس قدر خاموش رہتی تھی۔ آج تک اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ یہ گانے کی فرمائش اس کا دماغ چکرانے لگا

"سلمہ" ـــــــ

"نہیں سلمہ نہیں ہو سکتی "

اسے معلوم تھا کہ ابو جان اسے فرزندی میں لینا چاہتے ہیں اور یقیناً سلمہ ہی سے وہ بندھا

"اور اگر سلمہ ہی ہوئی تو "

اس کا دماغ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ اندھیروں کے ہجوم نے اس کے دماغ کو پھر بھٹکا دیا۔

ایک روز حامد نے چھوٹے شاہد کو جمیل سے باتیں کرتے دیکھا تو جیسے اس کے ہاتھ سنہری موقع آ گیا۔ وہ اسی روز شاہد کو بازار لے گیا۔ اسے مٹھائی خرید دی پھر اسے سینما لے گیا اور رات کو گھر لوٹتے ہوئے پہلے تو شاہد کی بہت ساری تعریف کر ڈالی جب زخم پک گیا تو نشتر چلایا۔

شاہد پھٹ سے بول اٹھا۔

"بھائی جان اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ابو جان نے کئی بار سلمہ باجی کو ڈانٹا بھی مگر وہ پھر بھی نہیں مانتیں جمیل بھائی صاحب کا لڑکا ہے مجھے پیغام پہنچانے کا ایک روپیہ ملتا ہے۔"

لاتعداد سوئیاں جیسے اس کے خون میں آگے پیچھے دوڑنے لگیں۔ جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس نے شاہد کے ہاتھ پر رکھ دیا کہ وہ صبح اپنے لئے مٹھائی خرید لے۔ شاہد کی آنکھوں کی شرارت اور ہونٹوں کی مسکراہٹ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

"نیا شکار پھنسا ہے"

اس رات وہ کسی ایک فیصلہ پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس کے بیس روز گذر چکے تھے باقی دن کیسے گذریں گے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ ابو جان سے صاف صاف انکار کر دے مگر پھر سوچا اندھیرے میں کسی کو روشنی دکھانے کی بجائے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دینا شرافت نہیں۔ پھر سوچا والدہ کو سب حال لکھ ڈالوں مگر یہ باتیں لکھی کیسے جائیں ـــــــ

ـــــــ اس نے یہ بھی سوچا کہ خود ہی جمیل سے ملے۔ مگر اس کے متعلق کونے والے دکاندار کی باتیں جس نے کہا تھا کہ جمیل شادی شدہ ہے اس کا کام ہی یہی ہے۔ نہیں وہ سلمہ کے قابل بھی نہیں۔ خود سلمہ سے سب کچھ کہہ ڈالے مگر اس سے بھی کیا ہوگا اس کی ہونے والی بیوی اس کے سامنے کسی غیر سے ملے اور وہ بول چپ رہے اسے اپنی بے غیرتی پر غصہ آ گیا۔

کروٹ بدل کر اس نے کھڑکی میں سے چاند کو دیکھا تو جیسے چاند کی ساری روشنی اس کے دماغ میں بھر گئی۔

"مجھے سلمہ سے شادی کرنی ہوگی " اس نے بے اختیار سوچا اور پھر بڑبڑایا۔

"مجھے سلمہ سے شادی کرنی ہوگی "

یکایک اسے خیال آیا کہ والدہ نے اسے تنہا کیوں بھیجا ۔ وہ ساتھ ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا مگر ٹھیک ہی تو ہے ابو جان نے مجھے اکیلا ہی آنے کو لکھا ہوگا۔ والدہ آتیں تو خرچ زیادہ ہوتا۔ اور پھر والدہ کو سلمہ کی اس حرکت کا پتہ چل جاتا۔

تو وہ قطعی اس گھر میں شادی نہ ہونے دیتیں۔

حامد نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ سلمیٰ ہی سے شادی کرے گا ابو جان کے بوجھ کو کم کرے گا کہ وہ اس کے احسان مند رہیں، ازیرہ اور عاصمہ کے لئے راستہ صاف کرے گا کہ ان کی شادیاں بھی جلد ہو سکیں۔ اور سلمیٰ کی زندگی بچائے گا کہ وہ جس راستہ پر پڑ چکی ہے اس راہ کی دلدل بڑی خطرناک ہے

حامد نے مہینہ پورا کیا اور ابو جان کی دعاؤں سلمیٰ کو اپنانے کی خواہشوں، ازیرہ کی شوخی بھری باتوں اور عاصمہ کے تیار کردہ انڈوں اور پراٹھوں کو ساتھ لئے وہ حیدر آباد سے لائلپور چلا آیا۔

ابو جان سے کچھ خط و کتابت کے بعد والدہ ابو جان کے پاس نہ جانے کیا الا بلا مٹھائی لڈو کپڑے چوڑیاں انگوٹھی وغیرہ لے کر حیدر آباد چلی گئیں۔

شادی ہو گئی اور سلمیٰ کو پا کر حامد یوں محسوس کرنے لگا جیسے اس نے کوئی ملکوتی نیکی کی ہو۔ آسمانوں کے باسیوں کی بات کی ہو۔ ایسا ثواب کمایا ہو جو دنیا کے دوسرے لوگوں کے لئے ناممکن ہو۔

سات آٹھ مہینے اس نے یوں گذار دیئے جیسے سلمیٰ ایک حور کے روپ میں اس کے لئے آسمان سے اتری ہو اور وہ جس قدر ثواب کما سکے کما لے، والدہ نے ایک دن اسے دفتر جانے سے پہلے کہا۔

"بڑی بھابھی کو ساتھ لے کر سلمیٰ بیٹی کو حیدر آباد لے جاؤ"

اس نے بڑی بھابھی سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بولیں۔

"پگلے — اتنا بھی نہیں سمجھتا پہلا بچہ اپنے والدین کے گھر پیدا ہو تو اچھا ہوتا ہے۔ میں اس لئے ساتھ جاؤں گی کہ وہاں کوئی عورت نہیں ہے"

"ازیرہ اور عاصمہ جو ہیں —" حامد نے بھولے پن سے کہا۔

"ارے میرا مطلب ہے بڑی عورت۔ کوئی بڑی بوڑھی جو سلمیٰ کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکے —"

حامد نے بڑی بھابی کو غور سے دیکھا۔ ماں کا تقدس اسے پہلی دفعہ اس چہرے پہ نظر آیا۔ اب تک بھابی وہ ایک عام عورت سمجھتا آیا تھا آج اسے اس چہرے میں ان آنکھوں میں ان ہونٹوں پہ اس جسم میں ایک نئی معصومیت بڑی بھلی لگی شفیق جذبے کی لہر دوڑتی نظر آئی۔

ابو جان کا گھر ویسا ہی تھا۔ حامد سے زیادہ بے تکلف ہو جانے کی وجہ سے ازیرہ اور عاصمہ اسے زیادہ تنگ کرنے لگی تھیں اور اس کے تینوں سالے شاہد، عابد اور ساجد جو پہلے اس کے قریب نہ آتے تھے اب ہر وقت اسے گھیرے رہتے ایک دن جب شاہد نے اس سے کہا۔ "بھائی جان آج سینما دکھایئے نا —"

تو اسے یوں لگا جیسے اس نے کہا ہو۔ "بھائی جان ایک روپیہ دیجئے نا —"

اس نے بڑے گہرے لہجہ میں پوچھا۔ "کیوں شاہد — اب تو روپیہ نہیں ملتا ہو گا —

"اب دو روپئے ملتے ہیں —"

باقی صہ ۴۶ پر

نجم فضلی

اصول کی بات

"میں اپنے ساتھی شیدا کو یہ بات کبھی نہ سمجھا سکا کہ کسی کو ٹھگتے وقت بھی کچھ اصول سامنے رکھنے پڑتے ہیں"، مجید نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

سب اسکے قریب کھسک آئے ان میں سے ایک نے ایک لکڑی سے آگ کو کریدا اور آس پاس ذرا سی روشنی پھیل گئی سب نے اپنے موٹے موٹے غلیظ کھدر کے کمبل اپنے جسم پر ذرا ڈھیلے کرلئے اور آگ کی ہلکی روشنی میں مجید کے تابناک چہرے کیطرف دیکھنے لگے۔

مجید کا اس جیل میں آج آخری دن تھا۔ جب سے وہ آیا تھا اس نے اپنا رویہ کچھ ایسا رکھا تھا کہ سب اسکی عزت کرتے تھے۔ اور کسی حد تک ڈرتے بھی تھے جتنے قیدی تھے وہ سب اپنے یہاں آنے کی وجہ اور اسکے علاوہ دیگر کارنامے کئی بار سنا چکے تھے، لیکن مجید ہی ایک ایسا شخص تھا جو چھ ماہ کی قید کے دوران بالکل خاموش رہا اور کسی قیدی کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ آخر اسکے یہاں آنے کی وجہ کیا ہوئی لیکن آج جبکہ اسکا اس جیل میں آخری دن تھا اور وہ اپنی سزا کی معیاد پوری کرچکا ہے ایک ساتھی کے کہنے پر صرف اپنا ایک کارنامہ سنانے پر آمادہ ہوا ہے۔

"بہت خوش معلوم ہوتا ہے مجید آج تو۔ مل لے مل لے۔ کل تو سب چھوٹ جائیں گے"

اندھیرے میں حولدار کی گرجدار آواز گونجی اسکا سایہ اندھیرے میں تحلیل ہوگیا۔

اور پھر اس وقت تک موت کی سی خاموشی رہی جب تک کہ حوالدار کے جوتے کی کھٹ کھٹ دور ہوتے ہوتے بالکل غائب نہ ہوگئی۔

اسکے بعد پھر سب کی نظریں ایک ساتھ مجید کے چہرے پر جم گئیں۔

"شیدا ایسی ایسی اسکیمیں تیار کرتا تھا جن سے بڑی بڑی رقمیں وصول ہوں اور دھوکا کھانے والے ہاتھ ملنے کے علاوہ کچھ نہ کرسکیں" اس نے ایک لمبی سانس لی۔

لیکن یہی ایک بات تھی جس سے میں اختلاف کرتا تھا کہ ٹھگے جانے والے شخص کو اسکی رقم کے عوض کچھ نہ کچھ ضرور ملنا چاہئے خواہ وہ نقلی ہی کیوں نہ ہو یا نہیں کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔ میں نقلی دوائیں نقلی سونے کے زیورات جھوٹی پالشیں یا ایسی ہی کسی چیز کے دیئے بغیر کسی کو ٹھگنا پسند نہ کرتا تھا میرا خیال تھا کہ کسی کو کوئی چیز دیئے بغیر اس سے رقم اینٹھنا مناسب نہیں ٹھگے جانے

پر بھی اس شخص کو اپنی رقم کے بدلے کوئی نہ کوئی چیز تو اسے ملنی چاہئے جسے پاکر اسکی اشک شوئی ہوجائے خواہ وہ چیز کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے خیالات کا یہ اختلاف پرکھوں کے خون کے اختلاف کے سبب ہو جو ہماری رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے

ایک بار سردیوں میں ہم لوگ راج پوتانہ کا دورہ کررہے تھے اور "لیور کیور" اور "تپ دق مار" نامی دوائیں یہاں وہاں فروخت کررہے تھے تو شیدا بولا "مجید میرے خیال میں تو ہمیں یہ ٹٹپونجیا روزگار چھوڑکر کوئی ایسا کام کرنا چاہئے کہ لمبی رقم ہاتھ لگے۔ راجستھان اور دہلی میں تو بڑے بڑے سیٹھوں کی کمی نہیں پھر ہم اس مثل کو کیوں سچ ثابت کریں کہ سمندر میں رہ کر گھونگا پیاسا۔ کیا خیال ہے تمہارا ؟"

"بھائی دیکھو" میں نے کہا "تم میرے خیال سے واقف ہو۔ میں دھوکا بھی دینا چاہتا ہوں تو ایمانداری سے، مثال کے طور پر لیور کیور ہی لے لو۔ میں لوگوں سے پیسے لیتا ہوں تو انہیں کم از کم عمدہ شاندار شیشیاں تو دیتا ہوں۔ جگر چاہے ٹھیک ہو یا نہ ہو پر میری دوا میں پینے کا دودھ اور شہد تو ہے ہی اور پھر اسے تیار کرنے میں محنت بھی کرتا ہی ہوں اس طرح اسمیں تھوڑا دھوکا تو ضرور ہے لیکن پیسے میں اپنی محنت اور لاگت کے ہی لیتا ہوں اسلئے یہ ایمانداری کا دھوکا ہے۔ لیکن خیر اگر تمہیں کوئی نئی بات سوجھی ہو تو بتاؤ شائد پسند آجائے"

"میں سوچ رہا ہوں کہ کوئی سیٹھ پھانسا جائے" شیدا نے کہا۔

"لیکن کہاں"؟ میں نے پوچھا۔

"جے پور میں" وہ بولا "میں نے سنا ہے کہ وہاں کے کچھ سیٹھ شوقین ہیں انہیں سے رقم اینٹھنی چاہئے۔ لاکھوں کروڑوں کمانے والوں کو ٹھگنے میں لطف بھی آئے گا۔

خیر تو اسکے بعد ہم لوگ یعنی میں اور شیدا دوائیں اپنے ایک دوست کے پاس رکھ کر جے پور پہنچ گئے شیدا نے ابھی کوئی اسکیم تیار نہ کی تھی۔ لیکن وہ موقع کے لحاظ سے اسکیم تیار کرنے میں استاد تھا اسلئے میں مطمئن تھا

جے پور آتے وقت اسنے یہ بات مان لی تھی کہ ٹھگے جانے والے شخص کو میری مرضی کے مطابق بدلے میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور دیجائے تب اسے ٹھگا جائے اور اسلئے ساتھ دینے میں مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔

جے پور کے چوڑے راستہ پر ٹہلتے ہوئے ایک دن میں نے شیدا سے پوچھا "شیدا تم نے ان سیٹھوں سے تعلقات پیدا کرنے اور بڑھانے کا کوئی طریقہ بھی سوچا ہے؛ یا بس یونہی گانٹھ کی رقم خرچ کررہے ہو۔ یہ مارواڑی ایک نمبر کے کنجوس ہوتے ہیں اور لوگوں سے زیادہ ملتے جلتے نہیں ان سے میل جول کرنا بھی بہت مشکل ہے۔

"دیکھو مجید" شیدا نے کہا "ان لوگوں سے تعلقات بڑھانے میں اگر کوئی مشکل ہے تو وہ ہے ہماری شان و شوکت، مارواڑی سیٹھ سیدھے سادے ہوتے ہیں اسمیں شک نہیں کہ وہ لوگوں سے میل جول نہیں بڑھاتے لیکن اسکا ایک خاص سبب ہے یہ مارواڑی یا انکے بڑے بہت ہی سادہ طریقے سے آکر جگہ جگہ بس گئے اور کاروبار میں ترقی کرکے کچھ دنوں میں سیٹھ بن گئے لیکن وہ اپنی پرانی حالت کو بھولتے نہیں اسلئے اگر ہم یہ شان و شوکت چھوڑ کر ان سے ملنا چاہیں تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا"

پھر تین چار دن تک میں اور شیدا جے پور میں چکر لگاتے رہے پہلے ہم نے جے پور کے چنے ہوئے دولت مند اور معزز

لوگوں کی صورت پہچانی اور پھر انکے طور طریقہ اور شوق وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔

ایک دن، شام کو شیلا کھانے کے وقت تک ہوٹل سے غائب رہا۔ اس رات وہ ہوٹل میں رات گیارہ بجے واپس آیا۔

"آج میں نے ایک موٹے اسامی کا پتہ لگایا ہے" وہ آتے ہی بولا "کروڑوں کی جائیداد کا مالک ہے۔ بمبئی، کلکتہ اور مشرقی پاکستان میں اسکے کئی کارخانے ہیں بڑے بڑے شہروں میں عالیشان قیمتی کوٹھیاں ہیں اور اتنا بڑا آدمی ہونے پر بھی غرور کا نام تک نہیں ہے کافی پڑھا لکھا ہونے کے سبب تعلیمی کاموں سے کافی دلچسپی ہے۔"

"آج ہی اس نے ایک دوسرے سیٹھ سے گھنٹے بھروں سونے کے دام چڑھنے کی شرط لگا کر بیس ہزار روپے جیتے ہیں اسی خوشی میں اس وقت بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا میں نے اس سے جان پہچان کر لی ہے وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا وہاں اس نے میری خوب خاطر تواضع کی پھر اس نے مجھے اپنا عجائب خانہ دکھایا اور اسکا گھر کیا ہے محل ہے محل اسی کے ایک حصے میں اس نے ایک عجائب خانہ قائم کر رکھا ہے کم سے کم تین لاکھ کی تو تصویریں ہی ہوں گی دنیا کے مشہور فنکاروں کی تصویریں اسکے علاوہ قریب قریب چار لاکھ روپئے کی دوسری عجیب و غریب چیزیں ہیں اسکے عجائب خانہ میں جن میں قدیم فنون کے نادر نمونے اور قیمتی چیزیں ہیں۔ قریب قریب پینتالیس سال کا ہے سیٹھ امیر چند لیکن اس جیسا دولت مند آدمی جے پور میں تو کیا سارے راجستھان میں نہ ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ اسکی بیشمار دولت میں سے تھوڑی سی بھی اگر ہمارے ہاتھ لگ جائے تو کچھ دنوں کا ٹھکانا ہو جائے اس سے اسکا کوئی نقصان بھی نہیں ،،

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "ابتدا تو بڑی زبردست کی ہے دوست لیکن یہ بتاؤ کہ اس سے ہم کو کیونکر فائدہ ہوگا ؟"

اتنا کہہ کر مجید خاموش ہو گیا جیسے تھک گیا ہو اس نے ایک لکڑی اٹھا کر پھر آگ کو کھودا آگ قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ راکھ کے ڈھیر میں کہیں کہیں چنگاریاں رہ گئیں تھیں۔

ایک نے ایک نظر سے سب کی طرف دیکھا سب کی نظریں اسکے چہرے کی جانب تھیں۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا ـــــ

"ارے یار" شیلا بستر پہ اٹھ کر بیٹھ گیا "اتنی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ـــ اپنا عجائب خانہ دکھاتے وقت سیٹھ کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ اس نے کہا بھی تھا کہ وہ اپنے عجائب خانہ کو ہندوستان کا سب سے بڑا عجائب خانہ بنانا چاہتا ہے پھر اس نے مجھے اور چیزوں کے ساتھ قریب قریب ڈیڑھ ہزار سال پرانی ایک مورتی بھی دکھائی جس پر عجیب و غریب قسم کی نقاشی ہے۔ ہاتھی دانت کے ایک ٹکڑے پر ایک کمل کا پھول بنا ہوا ہے اور اس کے اوپر ایک عورت کی خوبصورت مورتی بنی ہوئی ہے بڑی غضب کی کاریگری ہے سیٹھ امیر چند نے اپنے عجائب خانہ کی فہرست دیکھ کر بتایا تھا کہ گپت خاندان کے کسی راجہ کے لئے اجین کے کسی بت تراش نے ایسی دو مورتیاں بنائی تھیں دوسری مورتی ابھی ملی نہیں، یہ پہلی مورتی پاٹلی پتر کے قریب ملی تھی، آثار قدیمہ کے کسی افسر سے ناجائز طریقہ پر سیٹھ نے چار ہزار روپئے دیکر مورتی کو خرید لیا تھا۔

"لیکن شیلا" میں نے جھنجلا کر کہا "ہم لوگ یہاں سیٹھ سے رقم اینٹھنے آئے ہیں یا ان سے تاریخ اور فن پڑھنے ؟ آج تمہارا دماغ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"یار سنو تو سہی" شیرا نے بیچ میں بات کاٹ کر سمجھانے کے انداز سے کہا" ذرا غور سے سنو سب سمجھ جاؤ گے:
اسکے آگے شیرا نے کچھ نہ بتایا۔ دوسرے دن شیرا پھر غائب رہا۔ دوپہر سے پہلے اسکی ایک جھلک بھی دکھائی نہ دی ہوٹل میں آتے ہی وہ مجھے اوپر کیلئے میں لے گیا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا بنڈل نکالنے لگا اس بنڈل میں ہاتھی دانت کی ٹھیک ویسی ہی مورتی جیسی اسنے سیٹھ کے پاس دیکھی تھی۔
"کچھ دیر پہلے میں یہاں کباڑی بازار گیا تھا" اس نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کیا" وہاں پرانے سامان کے ساتھ یہ چیز بھی مجھے مل گئی۔ کباڑی نے بتایا کہ برسوں سے یہ چیز اس کے پاس پڑی ہے کسی انگریز کے نیلام کے سامان کے ساتھ یہ اسے ملی تھی میں نے اسکے لئے اسے پانچ روپئے دینے چاہے لیکن اس نے اس کے پورے پچاس مانگے خیر کسی طرح کر کے اسے پچیس روپئے میں خرید لایا ہوں۔
"اب سنو مجید" وہ کہتا گیا" یہ ہاتھی دانت کی مورتی بالکل سیٹھ امیر چند والی مورتی کی طرح ہے وہ اسے آسانی سے پانچ ہزار روپئے میں خرید لے گا اور اگر یہ مورتی پہلی والی کی طرح اصل نہیں ہے تو ہرج ہی کیا ہے؟"
"بالکل ٹھیک" میں نے خوش ہو کر کہا۔ قسمت بھی ساتھ دے رہی ہے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اسے فروخت کیسے کریں گے؟"
"یہ سب کچھ ہو جائے گا فکر نہ کرو" شیرا نے اسکیم پہلے ہی بنا رکھی تھی ــــ
میں نے ایک کالا چشمہ خریدا عمدہ اور قیمتی سوٹ پہنا اور نہایت نفاست سے بال پیچھے کی طرف سنوارے اور اس طرح میں مدراس یونیورسٹی کا پروفیسر گپتا بن گیا اور پھر جے پور کے سب سے شاندار انگریزی ہوٹل میں جا ٹھہرا پھر میں نے ایک خط ہوٹل کے نوکر کے ہاتھ سیٹھ جی کو بھیجا کہ قدیم فن کے بارے میں گفتگو کے لئے مجھے ان سے ملنا ہے۔
خط موصول ہوتے ہی سیٹھ امیر چند خود ہوٹل میں حاضر ہو گئے وہ دوہرے جسم کے سیدھے سادے آدمی معلوم ہوتے تھے آتے ہی انہوں نے ادب سے نمستے کیا اور کہا، کہئے پروفیسر صاحب کیسے یاد فرمایا؟"
میں کالے چشمہ کے اندر سے ہی گھورتا ہوا بولا۔
"سیٹھ امیر چند جی آپ ہی ہیں؟"
"جی ہاں" وہ بولے" میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں"
"میں قدیم تاریخی چیزوں کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنے آیا ہوں" میں نے اپنے لہجے کی بناوٹ کو چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ آثار قدیمہ کے ایک افسر سے مجھے پتہ چلا ہے کہ چند سال پیشتر ایک کھدائی میں گپت خاندان کی ہاتھی دانت کی ایک چھوٹی سی مورتی نکلی تھی۔ اسے آپنے خرید لیا تھا۔ ایسی دو مورتیاں گپت خاندان کے چندر گپت دوئم نے اجین کے کسی بت تراش سے بنوائی تھی دوسری مورتی جو ابھی تک لاپتہ تھی پاٹلی پتر سے سات میل دور نکلی ہے اسے میں نے خرید لیا ہے اور میں آپکی مورتی خرید کر مورتیوں کا یہ جوڑا اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں"
"کیا؟ دوسری مورتی مل گئی ہے؟" امیر چند نے تعجب سے پوچھا" میں اپنی مورتی بیچوں؟ نہیں پروفیسر صاحب میں

ایسا نہیں کر سکتا بلکہ میں تو آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنی ہی مورتی میرے ہاتھ فروخت کر دیں جس سے یہ جوڑا ایک ہی عجائب خانے میں رہ جائے۔ کیا وہ مورتی آپ یہاں لائے ہیں؟"

میں نے مورتی سیٹھ امیر چند کو دکھا دی۔ انہوں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا، "بالکل وہی چیز ہے ہوبہو ویسی ہی کاریگری دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ اس کے لئے میں آپ کو پندرہ ہزار روپئے دے سکتا ہوں پروفیسر گپتا"

کافی دیر تک ٹال مٹول کرنے کے بعد میں نے کہا "اچھا اگر آپ کا ایسا ہی اصرار ہے تو لے لیجئے" میں نے فروخت نہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"خیر آپ ہی لے لیجئے لیکن آج رات کو ہی مجھے مدراس چلا جانا ہے پرسوں وہاں ایک جلسے کی صدارت کرنی ہے"

سیٹھ امیر چند نے فوراً فون پر پندرہ ہزار روپئے نقد گھر سے منگوا دیئے اور مورتی لے کر چلے گئے۔

جب میں لوٹ کر اپنے ہوٹل میں پہونچا تو شیر اگھڑی دیکھتا ہوا بولا "کہو کیا ہوا"

"نقد پندرہ ہزار روپئے وصول کر لایا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"واہ میرے یار، واہ بس آدھ گھنٹہ باقی ہے ٹرین جانے میں بوریا بستر گول کرو۔ اور اسی ٹرین سے دہلی چلدو" وہ جلدی سے بولا "ابھی جلدی کیا ہے" میں نے پوچھا یہ تو ایمانداری کا سودا ہے اور میرے اصول کے موافق بھی۔ مان لیا کہ وہ مورتی نقلی ہے تو پھر اس بات کا پتہ لگانے میں سیٹھ کو کافی دیر لگے گی۔ اسے تو یقین ہو گیا ہوگا کہ دوسری مورتی بھی اصل ہے اور مجھے اطمینان ہے کہ میں نے پندرہ ہزار کے عوض اسے کچھ دیا ضرور ہے خواہ نقلی ہی کیوں نہ ہو"

"وہ مورتی نقلی کب ہے؟ وہ تو اصلی تھی ہی" شیرا نے ڈرامائی انداز سے کہا "وہ تو وہی مورتی تھی جو اس نے عجائب خانے میں دکھائی تھی۔ جب دیکھ کر لوٹنے لگا تو سیٹھ کے پیچھے ہونے کے سبب مجھے موقع مل گیا اور میں نے اٹھا کر جیب میں رکھ لی اب باتوں میں وقت ضائع نہ کرو جھٹ پٹ سامان تیار کر کے چلدو"

"لیکن" میں نے غصے کے انداز سے کہا "تم نے وہ کیا اڑی کے یہاں کا قصہ کیوں گڑھا؟"

"اس لئے کہ تمہارے اصول میں فرق نہ آئے اور تمہارے جذبات کو ٹھیس نہ لگے اور تم اطمینان سے کام کر سکو اب چلدو جھٹ پٹ۔

بقیہ: زہر بھرا ہے مدھ کا پیالہ

"دو روپئے ——" حامد کا دماغ چکرا کر پیچھے چلا گیا۔ —— ایک روپیہ —— سلمہ

—— دو روپئے —— کون ——؟ اس کا دماغ آگے آیا۔

"دو روپئے نہیں بلکہ دو روپئے چار آنے ——"

شاہد شیخی سے بولا اور حامد کو جیسے نیند میں کہیں دور کی سی آواز سنائی دی:——

"چار آنے باجی انہیں بھی تو دیتی ہیں ——"

حضرت اقبال سہیل

تابشِ سہیلؔ

ہماری پستیٔ فطرت نہ تھی یوں آشکار اب تک
کہ تھی دیوارِ زنداں رازِ دل کی پردہ دار اب تک

گیا ساقی تو کیا ہم خود ہیں اس کے جرعہ خوار اب تک
سروں میں ہے اسی صہبائے دوشیں کا خمار اب تک

مشقِ وحشت پھر شہیدِ ناتمامی ہو گئی
مصلحت پھر سنگِ راہِ تیز گامی ہو گئی

کیوں بڑھایا آپ نے جامِ تہی میری طرف
اور اس سے تیز میری تشنہ کامی ہو گئی

اڑ گئی توڑ کے غنچے کا قفس موجِ نسیم
خوگرِ قید ابھی ماتمِ پر کرتے ہیں

شبِ غم کی چاندنی کیا، رگِ برق کا تموج
مری دل شگفتگی کیا، لبِ زخم کا تبسم

خزاں کے دم سے ہے رنگینیٔ جمالِ بہار
شباب کیا کوئی غم تھا کہ جاوداں ہوتا

ماحصلِ سعی ہے سرگشتۂ حرماں ہونا
یعنی ہر گام پہ منزل کا گریزاں ہونا

اس فصل میں بھی جا نہ سکے شاخسار تک
زنداں نصیب کاش نہ جیتے بہار تک

گرہ کھلی نقاب کی وہ ضد گئی حجاب کی
بلائیں لے رہا ہے دل نگاہِ کامیاب کی

اف کیا مزا ملا ستمِ روزگار میں
کیا تم چھپے تھے پردۂ لیل و نہار میں

جو دردِ عشق نہ ہوتا تو دل کہاں ہوتا
بہارِ زیست کا ہر لمحہ رائیگاں ہوتا

کچھ ایسا ہے فریبِ نرگسِ مستانہ برسوں سے
کہ سب بھولے ہوئے ہیں کعبہ و بت خانہ برسوں سے

دیتے ہیں اسی کو جامِ طرب جو جرعہ کشِ غم ہوتا ہے
کب باغِ جہاں میں خندۂ گل بے گریۂ شبنم ہوتا ہے

تا چند سہیل افسردۂ غم کیا یاد نہیں تاریخِ حرم
ایماں کے جہاں پڑتے ہیں قدم پیدا وہیں زمزم ہوتا ہے

حضرت وحشی

پھولوں سے بھرنے والے ہر دامن تہی کے
ارمان ہیں مجھے بھی دل کی شگفتگی کے

بار الم اٹھایا، رنگ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

اے حسن روح پرور! زیر نقاب رہ کر۔
سیکھے ہیں تو نے کس سے انداز دلبری کے

مہر و وفا ہماری ضرب المثل رہے گی
جب تک رہیں گے چرچے دنیا میں عاشقی کے

اس لطف اس کرم پر کیونکر گمان ہوتا
وہ دشمنی کریں گے پردے میں دوستی کے

صبا اکبر آبادی

حسن خود عشق پہ نازاں ہے یہ معلوم نہ تھا
پھول کانٹوں کا نگہباں ہے یہ معلوم نہ تھا

ایک اک سانس گریزاں ہے یہ معلوم نہ تھا
زندگی موت کا عنواں ہے یہ معلوم نہ تھا

خاک شہروں میں اڑاتے رہے صحرا کے لئے
انہیں ذروں میں بیاباں ہے یہ معلوم نہ تھا

بے نیازانہ کرم حسن نے کیا کیا نہ کئے
عشق شرمندۂ احساں ہے یہ معلوم نہ تھا

چاک کرتا تھا جنوں پردۂ اسرارِ ازل
یہ بھی اپنا ہی گریباں ہے یہ معلوم نہ تھا

کسی نمرود سے جبتک نہیں ٹکرائے تھے
آگ کا نام گلستاں ہے یہ معلوم نہ تھا

مستقل نقشِ تمنا کو سمجھ رکھا تھا
پئے یک جنبشِ مژگاں ہے یہ معلوم نہ تھا

کتنے سامان کئے زیست کی آسانی کے
موت جینے سے بھی آساں ہے یہ معلوم نہ تھا

زندگی ختم ہے ٹوٹا ہے جو سازِ امید
ایک اک تارِ رگ جاں ہے یہ معلوم نہ تھا

شعلۂ عشق بجھا ہے تو جہاں ہے تاریک
عشق ہی شمع فروزاں ہے یہ معلوم نہ تھا

ہائے اک شخص، جسے جانِ تمنا سمجھا   وہ مری جان کا خواہاں ہے یہ معلوم نہ تھا

مرکزِ کفر کو چھوڑ آئے حرم کی خاطر   کفر ہی مرکزِ ایماں ہے یہ معلوم نہ تھا

مجھکو رُلوا کے انہیں کتنی پشیمانی ہے   اشک منجملۂ طوفاں ہے یہ معلوم نہ تھا

وہم فانوس نے دھوکہ دیا پروانوں کو   شمع اک شعلۂ عریاں ہے یہ معلوم نہ تھا

دل نے خود انجمنِ ناز میں جانے نہ دیا   دل درِ دوست کا درباں ہے یہ معلوم نہ تھا

ہم نے الزام دیئے ہجر کی تاریکی کو   سایۂ گیسوئے جاناں ہے یہ معلوم نہ تھا

وسعتِ دہر میں ترسا کئے آزادی کو   ایک پھیلا ہوا زنداں ہے یہ معلوم نہ تھا

لوگ کرتے رہے آشوبِ جہاں کی تاویل   وجہ آشوب خود انساں ہے یہ معلوم نہ تھا

عشق میں ہو نہ سکا دل کے دھڑکنے کا علاج   وہ نظر سلسلہ جنباں ہے یہ معلوم نہ تھا

دوستوں کیلئے کیا نہ ادا کی قیمت   دوستی کسقدر ارزاں ہے یہ معلوم نہ تھا

ہم نے خود اپنی جوانی سے تغافل برتا   فقط اک رات کی مہماں ہے یہ معلوم نہ تھا

اے صبا دل میں ہمیں خون کی گردش پہ تھا ناز

تاک میں گردشِ دوراں ہے یہ معلوم نہ تھا

روشن نگینوی

نظر فریب نظاروں کا تذکرہ نہ کرو
خزاں بدوش بہاروں کا تذکرہ نہ کرو

مری نگاہ میں اہلِ زمین کی عظمت ہے
فلک کے چاند ستاروں کا تذکرہ نہ کرو

جبینِ کاہکشاں ماند پڑتی جاتی ہے
جمیل راہ گذاروں کا تذکرہ نہ کرو

نظر کے ساتھ تمنا بدلتی رہتی ہے
حسین شعبدہ کاروں کا تذکرہ نہ کرو

جہاں سے رسمِ محبت کہیں نہ اٹھ جائے
جہاں سے تم مرے یاروں کا تذکرہ نہ کرو

غمِ حیات کا درماں اگر نہیں ممکن!
غمِ حیات کے ماروں کا تذکرہ نہ کرو

وطن کو چھوڑ کے آئے تھے جن امیدوں پر
اب ان ضعیف سہاروں کا تذکرہ نہ کرو

حضورِ ماہ وشاں ذکرِ غم سے کیا حاصل
گلوں کے سامنے خاروں کا تذکرہ نہ کرو

یہ مصلحت بھی عجب مصلحت ہے اے روشن
چمن میں رہ کے بہاروں کا تذکرہ نہ کرو

رخشاں ابدالی عظیم آبادی

جہاں میں یہ پھیلی ہے تنویر کس کی — زمین و زماں پر ہے تسخیر کس کی
بنائی ہوئی ہے یہ تصویر کس کی — یہ نقش زمانہ ہے تحریر کس کی
فرشتہ خصایل، پری کا مماثل — ہے انساں! تو شوخ تحریر کس کی
ہوا ہے دل زار شیدا یہ کس کا — ہے جانِ حزیں آہ! نخچیر کس کی
ہے پیشِ نظر کس کا نقشہ یہ دائم — یہ کانوں میں گونجی ہے تقریر کس کی
ہے کس رخ کا پرتو سری صبح روشن — شب تار ہے زلفِ شبگیر کس کی
ہوا محو سرشار دل کیفیت میں — ہوئی دلنشیں ایسی تقریر کس کی
تمہیں کیا، کوئی ہوگا بندہ خدا کا — کہوں کیا کہ ہے دل میں تصویر کس کی
زمانہ ہوا ہے مسخر یہ کس کا — یہ جادو کی پھیلی ہے تاثیر کس کی
یہ قاصد کو بھی دل لگی خوب سوجھی — خدا جانے لایا ہے تحریر کس کی
بناؤ گے اے شیخ اب کس کو کافر — رہا کون، اب ہو گی تکفیر کس کی
بہت خواب دیکھے ہیں تیرے کرم کے — مگر آج تک نکلی تعبیر کس کی
دعاؤں کا قایل، نہ نالوں کا سامع — ہوا اے سنگدل! تجھ پہ تاثیر کس کی
رہا نام دنیا میں کس کا ہمیشہ — رہی ہے زمانہ میں تعمیر کس کی
نہ پائے حقارت سے خاروں کو ٹھکرا — یہ دیکھ اس میں ہوتی ہے تحقیر کس کی

تصور پہ رخشاں! یہ ہے کون چھایا
بسی ہے یہ آنکھوں میں تصویر کس کی

افسر ماہ پوری

جب تک ہمیں ہے یاد تری چشمِ تر کی بات
بھولی ہوئی ہے گردشِ شام و سحر کی بات

بدلی ہوئی ہے اور بھی صیاد کی نظر
ہونے لگی ہے جب سے مرے بال و پر کی بات

تم کو پسند پھول ہیں، کانٹے ہمیں پسند
ہے اپنی اپنی وسعتِ ذوقِ نظر کی بات

پھر کارواں بھٹکنے لگا راہِ شوق میں
شاید کہیں چھڑی ہے تری رہگذر کی بات

رسوا ہوئی ہے جب بھی ہماری جبینِ شوق
آئی ہے درمیاں ترے سنگِ در کی بات

اس تیرگی میں پہلے جلاؤ چراغِ دل
پھر انجمن میں چھیڑنا شمس و قمر کی بات

صحرا میں ہے کبھی تو گلستاں میں ہے کبھی
گیا پوچھتے ہو افسرِ آشفتہ سر کی بات

ظفر عالمگیر

عشوۂ و ناز ہو کہ عجز و نیاز ... زندگی ہے فقط نشیب و فراز

ق

جلوۂ ناز و دلنشیں آواز ... آپ کے جسم کا حسین گداز
غمِ دوراں سے کھا گئے ہیں شکست ... مسکرانے کے دلفریب انداز
ہم نے چھیڑا تھا ایک بار اسے ... سازِ دل سے نہ آئی پھر آواز
عشق کی آبرو کا پاس نہیں ... وحشتِ دل ہے کتنی دست دراز
اصل میں دل کے کھیل ہیں سارے ... جلوۂ ناز اور فسونِ نیاز
اب خدارا نہ چھیڑئیے اس کو ... سازِ دل میں کہاں ہے اب آواز!
داستاں بن گئی ذرا سی بات ... ہے مزاجِ جہاں فسانہ طراز
اک شکن تک جبیں پہ سہہ نہ سکا ... کتنی نازک سی شئے ہے دل کا ساز
عشق آگے نکل چکا ہے بہت ... رنج ہوگا نہ دیجئے آواز!
چوم کر سنگِ آستانِ حبیب ... نہ جھکی پھر کہیں جبینِ نیاز
خود نمائی سے فرصت ان کو نہیں ... وہ جو کہلائے ہیں غریب نواز

ہم نے دیکھا نہیں کچھ ان میں ظفر
ہوں گے ممکن ہے صاحبِ اعجاز

نکہت وارث خاں

چھیڑ نظروں کی تھی لیکن آنکھیں حیراں ہوگئیں
دل میں پیوست انکی نظریں مثلِ پیکاں ہوگئیں

بکھریں جب زلفیں تری جانِ گلستاں ہوگئیں
نکہتیں اقصائے عالم میں پریشاں ہوگئیں

شوق میں نظریں جدھر اٹھیں بہاراں ہوگئیں
لغزشیں کون و مکاں پہ کیا نمایاں ہوگئیں

دل پریشاں آنکھ خوں افشاں نگاہیں مضطرب
بے سروسامانیاں آپ اپنا ساماں ہوگئیں

چاند میں دلکی ضیا تاروں میں آنکھوں کی ضیا
تابشیں میری رخِ گردوں پہ رخشاں ہوگئیں

چھیڑتا ہے نقشِ ماضی پھر تصور کو مرے
کیف ساماں جلوتیں پھر دلمیں رقصاں ہوگئیں

ڈوبتے دل کو ہے نکہتؔ میرے غم کا آسرا
زندگی کی تلخیاں سرمایۂ جاں ہوگئیں

رسالوں میں

افکار کراچی :۔

یوم پاکستان کی مناسبت سے یہ اس کا خاص ایڈیشن ہے ادبی مسائل کے تحت، ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اقبال کی ایک نظم خضر راہ پر تبصرہ کیا ہے۔ اور اس کے مفہوم و معنے کی تشریح کے بعد یہ کہا ہے کہ اقبال کی چند بہت ہی اہم نظموں میں اس کا شمار ہوتا ہے جس میں موضوع کی بصیرت اور فنی سلیقہ شعاری ساتھ ساتھ ہیں اور اس میں وہ سحر بھی ہے جو شاعری کی جان کہلاتی ہے۔ اسی شمارے میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا وہ خطبۂ صدارت بھی شریک ہے جو حلقۂ ارباب ذوق کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ "عصر حاضر میں ادب کا مقام" اسکی سرخی ہے وہ لکھتے ہیں آج ادب اور آرٹ کی حیثیت سماج کے جسم کی نہیں بلکہ لباس کی رہ گئی ہے۔ انسان کے علم و عمل کا دائرہ سائنس اور مشین تک سمٹ آیا ہے وہ اپنے مسائل کو ان ہی کے ذریعے حل کرنا چاہتا ہے اور تفریحات کے لئے نئے نئے باب کھل گئے ہیں جو براہ راست ادب کے حریف بھی ہیں، اعلیٰ ادب کے شائق ادب کے جدید نمونوں کا مقابلہ متاخرین کے کارناموں سے کرتے ہیں تو عموماً ان کی تشفی نہیں ہوتی وہ تسکین خاطر کے لئے کلاسیکل ادب کی طرف چلتے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ کہ اردو کے ادیبوں کے مسائل کیا ہیں ؟ ۔۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ زبان کی طرح ادب کو بھی دو نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے ایک تو تحت السطور سرگوشی اور تحت الشعور کی زبان ہے جو ادبی ورثے کا ایک خاص حصہ ہوتی ہے اور جس سے وہ لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں جو مخصوص تہذیبی قدروں اور مقامی اصطلاحوں میں سموئے ہوئے ہوں مگر ادب کا دوسرا حصہ زیادہ عالمگیر ہے جو دوسری زبانوں کے قالب میں ڈھل کر بھی اپنے کو باقی رکھتا ہے اور یہی اعلیٰ ادب ہے جس کے سہارے زبانیں زمان و مکان کے انقلابات پر حاوی آجاتی ہیں اردو میں ایسا اعلیٰ ادب جو دوسری زبانوں میں اعتماد کے ساتھ منتقل کیا جائے تقریباً ناپید ہے۔ ادب کی عظمت صرف شعر سے نہیں بلکہ نثر سے وابستہ ہے۔

ندیم ڈھاکہ :۔

عندلیب شادانی نے اپنے مضمون ریختی کا موجد میں بحث کے بعد بتایا ہے کہ دکھنی شعراء نے بھی ایسی شاعری کی ہے جس میں اظہار عشق عورت کی طرف سے ہے اور محبوب مرد قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس کو ریختی نہیں کہہ سکتے، ریختی وہی ہے جو انشا رنگین اور جان صاحب نے پیش کی ہے، ریختی کا مفہوم خاص ہے جس میں عورت عورت کی عاشق ہوتی ہے اور کلام فحش آمیز و ہوس انگیز ہوتا ہے۔ دکھنی شاعروں کی پیش کردہ چیز، ہندی شاعری سے متاثر ہے، اور نہ اس ریختی سے الگ ہے۔ ورنہ ساری ہندی شاعری ریختی قرار پا جائے گی جو غلط ہے۔ حمید عظیم آبادی نے سوانح شاد عظیم آبادی (سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۷ء)

گئے ہیں، یہ شاد کے آخری زمانے کے حالات اور معمولات ہیں جنکا زیادہ تر ادب اور شاعری سے تعلق ہے۔ اعجاز کاکوی نے حسرت اور طرز لکھنؤ کے عنوان سے یہ بتایا ہے۔ کہ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ حسرت کی زبان لکھنؤ کی اور طرز دہلی کا ہے۔ خود حسرت بھی یہی کہتے ہیں لیکن کلام حسرت سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی ان پہ دونوں کا اثر ہے بلکہ لکھنوی طرز میں دل کھول کر داد سخن دی ہے معشوق کے لباس کا، اعضا کا، آرائش کا، اور معشوق کے نغمہ و سرود کا تذکرہ ان کے ہاں خوب ہے، اور لفظ "پری" کا استعمال بھی، ارشد کاکوی کا مضمون "شرت کال" یعنی مشرقی پاکستان میں خزاں کا موسم بھی اس شمارے میں ہے، اور ان مضامین میں سے جن کی اردو زبان کو ضرورت ہے۔ مگر اہل قلم اس کی طرف سے غافل ہیں۔

خاتون پاکستان کراچی :-

یوم پاکستان پر نکلا ہے اور مارچ اپریل کا مشترک شمارہ ہے، اداریہ ۲۳ مارچ کی اہمیت پر ہے، لاہور ریزولیوشن کی سرخی سے حسن مثنیٰ ندوی نے اپنے ایک مختصر مضمون میں کہا ہے کہ فکر موجود نہ ہو تو قوم کی حیثیت بے روح مادے کی سی ہوتی ہے لاہور ریزولیوشن اپنی پشت پر ایک فکر رکھتا ہے اس فکر کا سامنے آنا تھا کہ روح الاجتماع ابھر پڑی جو ایک ناقابل تسخیر قوت ہے قومی سربلندی کے لئے روح الاجتماع ضروری چیز ہے مگر روح الاجتماع کسی فکر کے بغیر کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ رفیق خاور نے "وہ سہانی صبح" کے عنوان سے ۲۳ مارچ کا نظارہ دکھایا ہے اور حقیقی پاکستان کے تعمیر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ عبد الحفیظ خان نے "ہمارا آنے والا پاکستان" پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ اس پاکستان کا بنانا ماؤں کے ہاتھ میں ہے۔ کفایت شعاری اور بچت پر فرحت سلطانہ نے، خواب اور اسکی تعبیر انور عنایت اللہ نے، عورت کے فطری فرائض پر فریدہ وجدی کا مضمون اور ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کے قلم سے "نسبتی رشتے" بھی اس شمارے میں درج ہیں جن میں گھریلو مسائل کی الجھنوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور کثرت اولاد کی روک تھام کے تحت ڈاکٹر عبد الحی نے اظہار خیال کیا۔

المجلس کراچی :-

صوفی غلام مصطفےٰ نے حدیث کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے لیکن لب ولہجہ مناظرانہ ہے نجفی صاحب نے اتحاد و اتفاق کی سرخی سے یہ واضح کیا ہے کہ اسلام نے باہمی اتحاد کے کتنے ذرائع فراہم کر دیتے ہیں پھر بھی اگر ہم میں اتحاد نہ ہو تو یہ ہمارا قصور ہے۔ مولانا ایوب دہلوی نے معجزہ کی بحث پیش کی ہے اور منطقی بحث کی ہے، ایک مضمون ابو ظفر صاحب کے قلم سے اذان بھی شامل ہے، یہ مضمون اپنی نوعیت کے لحاظ سے مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی، اقبال کے اس مصرع سے شروع ہوا ہے کہ "مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ" مضمون عالمانہ ہے۔ مولانا وحید بدایونی کے مضمون تصوف کی دوسری قسط بھی اس شمارے میں موجود ہے۔ علمی اور تاریخی بحث ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ وحدۃ الوجود اور ویدانتی تصور میں بعد المشرقین ہے، مگر اکثر لوگوں کو مغالطہ ہوا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔

المجیب پھلواری (پٹنہ)

نیا پرچہ نکلا ہے۔ مدیر مسئول سید احمد حسین ہیں اور ادارہ سید یوسف رضوی، شاہ عین احمد قادری اور عبد الواسع جالوی پر مشتمل ہے علمی مذہبی رسالہ ہے۔ دوسرا شمارہ سامنے ہے۔ اس میں مولانا شاہ عون احمد کے قلم سے انبساط عید حضرت مولانا شاہ غلام الدین قادری کے قلم سے کف اللسان (یعنی زبان پر قابو رکھنا) عالمانہ مضامین ہیں جو انسانی کردار کی تعمیر کے لئے مفید ہیں، شاہ عون احمد نے حج پر بھی ایک مضمون لکھا ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ حضور اکرمؐ نے کس طرح حج ادا کیا اخبار و سیر کے تحت مولانا

شاہ عثمان غنی کا تاریخی مضمون حضرت عبداللہ ابن زبیر بھی شریک اشاعت ہے، اخیر میں مکاتیب علمیہ اور مسائل و فتاوے کے بھی چند صفحات ہیں، یہ مکاتیب حضرت مولانا شاہ محی الدین صاحب قادریؒ کے ہیں مگر پورے خط کی صورت میں نہیں بلکہ سوال وجواب کی صورت میں درج ہوئے ہیں اور زیارت موئے مبارک سے تعلق رکھتے ہیں۔ نعت اور غزلیں بھی رسالے میں موجود ہیں۔

اشارہ پٹنہ :۔

طلعت کمال نے حاشیائیت کے عنوان سے ایک نظری بحث کی ہے، ایک وقت دو یا کئی تہذیبوں کے حاشئے پر زندگی گذارنے کو "حاشیائیت" کا نام دیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ حاشیائیت ایک حرکی نظریہ ہے جو تہذیبی عمل کی پیداوار ہے جس کا فطری رجحان عالمی ہوتا ہے۔ زینت ساجدہ نے "محمد قلی اور اسکی شاعری" میں اس قدیم اردو شاعر کا تعارف پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ بڑا قادر الکلام اور کامیاب شاعر تھا اسکی دکھنی شاعری نے فارسی اور تلنگی دونوں سے فیض پایا ہے اور مجاز کے سارے پہلو اس کے یہاں بانکپن سے پیش ہوئے ہیں،

تحریک دہلی :۔

اپریل کے شمارے میں عابد رضا بیدار نے سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی پر تاریخی روشنی ڈالی ہے۔ اس سوسائٹی کا اخبار ۲۲ مئی سنہ ۱۸۶۶ء میں نکلا تھا اور پھر یہی اخبار بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ بن گیا تھا۔ اس سوسائٹی کا مقصد دیسی زبان میں اشاعت کی ترقی، علمی کتابوں کے ترجمے، اردو علم کی تاریخ اور اردو لغت کی تیاری وغیرہ تھا، محمد یٰسین نے حسرت کی ہندی شاعری پیش کی ہے ہندی شاعری سے مراد اردو میں کرشن کنہیا کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ ہندی گیت اور دوہے مراد ہیں رشید حسن خاں نے "در شہر شما نیز کنند" کی سرخی سے ایران کے اہل قلم آقائے پور داؤد وغیرہ پر تنقید کی ہے جنہوں نے ہندوستان کے فارسی شعراء اور مصنفین پر طنز کئے تھے کہ زبان کو خراب کیا ادب میں مہملات کا اضافہ کیا وغیرہ وغیرہ رشید خاں نے جواباً "لغت نامہ دہخدا" اور "مقدمہ ہائے برہان قاطع" وغیرہ (مطبوعات ایران) سے ایرانی اہل قلم کی مضحکہ خیز غلطیاں نکال کر دکھائی ہیں جن میں لفظی اور عروضی بوالعجبیاں بھری پڑی ہیں مضمون طویل ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ فن عروض میں آج بھی یہاں کہ اہل فن ایران کے مقابلے میں زیادہ گہری نظر رکھتے ہیں، اس شمارے میں ریٹا ہینڈن کا ایک مضمون قومی ملکیت کا مسئلہ بھی شریک ہے۔

نوائے ادب بمبئی :۔

تازہ شمارے میں ضمیر احمد خاں نے اپنے مضمون "دیوان نظیر اکبرآبادی" میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے مرتب کردہ دیوان نظیر اور مقدمے پر تنقید کی ہے، اور آگرہ ایڈیشن سے مقابلہ کرکے بتایا ہے کہ آگرہ ایڈیشن فرحت ایڈیشن سے صحیح تر معلوم ہوتا ہے۔ شاہ غلام حسنین ندوی کے قلم سے بہار کے ایک گمنام شاعر مفتی غلام مخدوم ثروت کے احوال درج ہوئے ہیں مفتی ثروت بیٹے تھے قاضی جمال الدین بہجت کے اور بہجت بیٹے تھے قاضی سید علاء الدین کے جو عہد شاہجہانی کے آخری دور میں شہر پٹنہ کے قاضی تھے۔ ثروت، سنہ ۱۱۴۰ھ میں پھلواری میں پیدا ہوئے پٹنہ میں مفتی عدالت رہے شاعری میں شاہ آیت اللہ جوہرؔ کے شاگرد تھے۔ اور فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔

سخاوت مرزا نے سلطان محی الدین سالک (کڑپوی ثم حیدرآبادی) کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ سید مخدوم جلال الدین بخاری کی اولاد سے تھے، ان کی تاریخ ولادت نامعلوم ہے۔ لیکن ان کے والد نے سنہ ۱۲۳۱ھ میں وفات پائی تھی اس لحاظ سے ان کی پیدائش تقریباً

۱۲۲۱ھ میں ہوئی ہوگی۔ ان کا صحیح سنہ وفات بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ تصوف کے متعدد رسالے مثنویات کا مجموعہ اور دیوان اردو ان کی یادگار ہیں۔ کلام عارفانہ تھا۔ ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی نے ایک غیر معروف دکنی شاعر (تسلیم گلشن آبادی) کا تعارف کرایا ہے۔ تسلیم ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے تھے اردو کا ضخیم دیوان، فارسی کا مجموعہ اور تصوف کی کئی فارسی اردو تصانیف چھوڑی ہیں

ادیب علیگڑھ:۔

مارچ میں ادیب نے جامعہ اردو کا بیس سالہ نمبر پیش کیا ہے جو بڑی حد تک جامعہ اردو کی خدمات اور کارناموں کی تاریخ اور اردو زبان اور علم و فن کی نشر و اشاعت کی روئداد ہے، پیغامات، معائنوں اور اخبارات کی رایوں کے علاوہ مختلف جلسوں کے خطبات بھی درج ہیں جن کی صدارت خواجہ غلام السیدین، گوپی ناتھ امن ڈاکٹر طاہر فاروقی، پنڈت راج ناتھ کنزرو، ڈاکٹر سید محمود اور مولانا حفظ الرحمٰن نے کی تھی۔ بیس سالہ امتحانات و انعامات کی فہرست بھی شامل ہے، اخیر میں اردو مضمون نویسی پر بہت مفید مضمون درج ہے جو نئے لکھنے والوں کی اچھی رہنمائی کرتا ہے۔ ممتاز شخصیتوں اور جامعہ کے کارکنوں کی تصاویر بھی شریک ہیں۔

اپریل کا شمارہ ۴۷ صفحے کے ایک ہی مضمون پر مشتمل ہے، ہندوستان کی تہذیبی ترقی میں اردو کا حصہ اس مضمون کا عنوان ہے اور شبنم سبحانی کے قلم سے ہے انہوں نے اردو کی داستان ماضی کا بڑی محنت سے جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ آج ہندوستان پھر اسی پوزیشن میں ہے جہاں ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد تھا۔ اور مختلف تہذیبی تصورات کی آماجگاہ ہے، ایک طرف متحدہ قومیت کا نعرہ ہے دوسری طرف مغربی تہذیب کی وارفتگی، تیسری طرف اشتراکیت کی مادیت، چوتھی طرف وہ گروہ جو مذہب کو انفرادی زندگی میں ذاتی اخلاقیات تک محدود رکھنا چاہتا ہے، پانچویں طرف وہ گروہ جو پوری زندگی کو ایک اکائی تصور کرتا ہے اور مذہب کو بنیاد بناتا ہے اور اس کشمکش میں ایسی شخصیتیں ناپید ہیں جن کا شخصی خلوص اور بلند کردار عہد ساز ثابت ہو، ایسی شخصیتوں کی تعمیر میں نظریہ کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ سرسید، حالی، شبلی، اقبال کی شخصیتیں عہد ساز اپنے نظریئے کی وجہ سے تھیں، اسی لئے ان کا ادب بھی اعلیٰ ادب ہے۔

مجلس حیدرآباد دکن ـــ

اردو مجلس حیدرآباد کا سہ ماہی ترجمان ہے نیا نیا نکلا ہے۔ صاف ستھرا پرچہ ہے، ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی نے "اردو سفرنامے" (ایک سرسری جائزہ) ڈاکٹر سیدہ جعفر نے "سجاد انصاری کے انشائیے" اور روسی زبان کے پروفیسر کراشنین نیکوف نے "پشکن اور اس کی شاعری" پر روشنی ڈالی ہے، پشکن ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۳۷ء میں اس کا انتقال ہوا یہ نئے روسی ادب کا بانی ہے وہ کہتے ہیں کہ پشکن نے عوام کی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا جیسے نظیر اکبر آبادی نے دیکھا تھا ایک مختصر مضمون قاضی عبدالودود کے قلم سے بھی مثنویات میرزا رکن الدین عشق دہلوی پر اس شمارے میں درج ہے۔ قاضی صاحب نے ان کی مثنوی گوئی پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز کی مثنوی گلشن شعراء کا تعارف پیش کیا ہے۔ امتیاز کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں مرتب ہوا تھا ان کی پیدائش ۱۱۷۶ھ کی ہے۔ جدت اسلوب زور بیان شگفتگی اور روانی کلام میں پائی جاتی ہے۔ مثنوی گلشن شعراء ایک فرضی افسانہ ہے جیسے عام مثنویوں میں ہوتا ہے مگر امتیاز کا مقصد عشق حقیقی کی تفصیل بیان کرنا ہے۔ محی الدین احمد نے شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا کی زندگی اور شاعری پر روشنی ڈالی ہے نواب صاحب نیلور مدراس میں ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ انہوں نے آصف اللغات لکھنی شروع کی تھی قانون، فلاحت، زراعت، باغبانی اور پرورش حیوانات پر بھی ان کی کتابیں موجود ہیں، انہوں نے تاریخ النوائط بھی

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

کتابوں میں

تشبیہاتِ رومی :-

مرحوم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی آخری تصنیف ہے، چھ سو پانچ صفحات ہیں، ٹائپ پر چھپی ہے، مجلّد ہے اور آٹھ روپئے اسکی قیمت ہے، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور نے شائع کی ہے -

مولانائے روم کی مثنوی دنیا کی ان مقبول نظموں میں شمار ہوتی ہے جو ہر دور میں زندہ بھی رہی ہیں، اور زندگی بخش بھی، مولانا بہت بڑے عالم صوفی اور متکلم تھے، اور ان کی مثنوی میں حقیقت کائنات، فلسفۂ حیات، اس کی کائنات میں انسان کا مرتبہ، روح اور مادہ، دنیا اور آخرت، انبیاء اور ملائکہ، عقل اور عشق، فلسفہ اور مذہب جیسے نازک مسائل زیر بحث آئے ہیں، یہ مسائل جتنے اہم ہیں اتنے ہی خشک بھی ہیں، لیکن مولانا کی فطرت کی تازگی، مزاج کی شگفتگی، انداز کے بانکپن اور سرمستی نے ان مسائل کو شاداب تر بنا دیا ہے، ان کا علم گہرا ہے، نظر وسیع ہے، مشاہدات ہمہ گیر ہیں، قوت فکر، قوت اظہار، نکتہ رسی اور ذہانت و فطانت ان کی خصوصی صفات ہیں، وہ ماہر نفسیات بھی ہیں ان کے زبان و بیان میں شوخی و شگفتگی ہی نہیں، دلنشینی اور تاثیر بھی ہے، دلائل و براہین اور تشبیہات و تمثیلات کی برجستگی کا یہ عالم ہے جیسے ابلتا چشمہ، امڈتا دریا - مخاطب کی ذہنی سطح ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، اسکی تعلیم معمولی ہو کہ غیر معمولی، وہ کوئی عامی ہو یا فلسفی، ان کی مثنوی کا جادو سب کے دل کو یکساں لبھاتا ہے، یکساں متاثر کرتا ہے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام لاہور، اور مجلس ندوۃ العلماء کے اجلاسوں نے ماضی میں جو تنظیمی تعلیمی اور اصلاحی کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کے توسط سے مثنوی کا بڑا دخل رہا ہے، ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد جو نشاۃ ثانیہ ہوئی اس میں پشاور سے رنگون تک کے طول و عرض میں تربیت پانے والے دل و دماغ کسی ایک چیز سے اتنے متاثر نہیں ہوئے جتنے مولانا کی مثنوی سے ہوئے - برعظیم کی فضا تو آج بھی مثنوی کے سوز و گداز اور کیف انگیز ترنم سے بسی ہوئی سی ہے - اور اگرچہ فارسی زبان کا ذوق کم سے کمتر ہو گیا ہے تاہم مثنوی آج بھی اسی شوق و سرور کے ساتھ پڑھی اور سنی جاتی ہے، اور اس کے مضامین تسکین دل مہیا کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیف اس لحاظ سے بھی ایک بڑی خدمت ہے کہ انہوں نے تشبیہات رومی کے نام سے قریب قریب وہ تمام مضامین اردو میں منتقل کر دیئے جو مثنوی کے چھ ضخیم دفتروں میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ چھ دفتر چھ سمندر ہیں اور ان سمندروں میں ڈوب کر تشبیہات و تمثیلات کے موتی چننا آسان کام نہ تھا، یہ بڑی عرق ریزی کی مہم تھی اور ڈاکٹر صاحب نے غواصی کا پورا حق ادا کیا ہے، انہوں نے بے شمار عنوانات قائم کئے ہیں، بختیہ درج کی ہیں مثنوی کے اشعار پیش کئے ہیں اور ایک ایک دو دو

منغیہ میں تمثیلات و تشبیہات کی اچھی شرح کی ہے، ارواح و ابدان، قانون ارتقا، فتنۂ زبان، یقین و ایمان، خدا، ذات و صفات، نبی، ایمان بالغیب، اخلاقیات و نفسیات، حُبّ مال، رہزن ایمان، حرص و ہوس، اکبر مکر، خدا اور بندے کا فرق، خدا اور انبیاء کی پہچان، مدارج عقل، دانش و بینش، خیر و شر، جبر و اختیار، ذوق اقتدار، وحدت وجود اور وحدت شہود، ارتعاشات نفس تعیش، نفس بہانہ جو، عالم صغیر و عالم کبیر، علم و وحی، عقل اکتسابی اور عقل وہبی، ــــــ زماں و مکاں اضافی ہیں، رحمت الٰہی اساس ہستی ہے، روح کی مسلسل ترقی، خدا نتیجۂ استدلال نہیں بلکہ ایک محسوس حقیقت ہے، خودی اور خدا، قلب سلیم صدق و کذب کی کسوٹی ہے وغیرہ وغیرہ انسانی زندگی کے یہ سارے اہم اور نازک مباحث چند تشبیہات و تمثیلات کے ذریعے مولانا نے حل کر دیئے ہیں، اور یہ مباحث وہ ہیں جنکو ہر شخص ہر زمانے میں جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے اور اسے جاننا چاہئے لطف یہ ہے کہ تمثیلات سب سامنے کی ہیں، جنکی طرف عموماً آدمی کا دھیان نہیں جاتا۔

شبلی نے بھی اپنی مختصر کتاب سوانح مولانا روم میں صرف چند مباحث ایک جگہ جمع کر دیئے تھے، مثلاً، ذات باری، صفات باری، توحید، نبوت، معجزات، روح، آخرت پھر تجدد امثال، تجاذب اجسام اور ارتقا، اور ضمناً بعض مفکرین یورپ نیوٹن اور ڈارون کا بھی تذکرہ کیا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب دوسرے انداز کی ہے اور یہ مولانا کی تمام تشبیہات و تمثیلات کا مجموعہ ہے جو ان کی رنگا رنگ بحثوں میں آتی رہی ہیں ڈاکٹر صاحب نے بھی جدید مفکرین کے نظریات کی طرف موقع موقع سے مفید اشارات کئے ہیں، پھر یہ کتاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے ایک عقل مجسم نے ایک عشق مجسم کی ترجمانی کی کوشش کی ہے۔ ایک فلسفی نے ایک صوفی کی تقریر سمجھائی ہے، ایک استدلالی نے وجدان کی گفتگو نقل کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ خود فلسفی تھے اور اپنی ایک رائے بھی رکھتے تھے اس لئے کہیں کہیں اسکی جھلک بھی تحریر میں فطرۃً موجود ہے، مگر وہ جھلک مولانا کی تجلیوں سے الگ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ توضیح لکھی ہے کہ "تمام توحیدی ادیان کی اساس حق ہے" اسلام یہی کہتا ہے کہ تمام انبیاء ایک ہی پیغام لائے تھے لیکن وہ "اساس" باقی کہاں تھی ؟ اسی لئے قرآن میں واضح اعلان ہے کہ ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ (جس کسی نے بھی اسلام کے سوا کوئی "دین" پسند کیا وہ قطعی نامقبول ہوگا) اس لئے نجات و فلاح کو ایک محدود گروہ کا اجارہ "سمجھنے والی بات بالکل منطقی ہے" اور یہ انکشاف بھی قرآن ہی نے کیا کہ پچھلے تمام ادیان میں تحریف کر ڈالی گئی ہے اور یہ محرف چیز تمہارے سامنے ہے وہ خدا کا پیغام نہیں ہے، اس لئے ڈاکٹر صاحب کا یہ جملہ شاید برمحل نہیں کہ "ہر دین میں مرور ایام سے "بعض امور" میں، "غلو پیدا ہوگیا اور "کہیں کہیں" صحائف سماویہ میں لفظی یا معنوی تحریف ہوگئی" ــــــ "بعض امور میں"، اور کہیں کہیں، کے فقرے سخت مغالطہ پیدا کرتے ہیں، دنیا میں آج کون کون سے ادیان ہیں جنکی تعلیمات محفوظ موجود ہیں ؟ اور وہ کون کون سی صحف سماویہ ہیں جن میں "کہیں کہیں" تحریف ہوئی ہو ؟ ــــــ اصلی صورت میں محفوظ و مامون تو صرف ایک ہی کتاب ہے، اور وہ ہے قرآن، اس بات پر آج مشرق سے لیکر مغرب تک ساری دنیا متفق ہے۔

وحدت ادیان کے بارے میں ایک دھوکا مولانا ابو الکلام آزاد کو بھی ترجمان القرآن کی تصنیف کے وقت ہوا تھا لیکن جب اسکی منطقی کمزوری واضح ہوئی تو انہوں نے وضاحت کی کہ نجات و فلاح کے لئے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے ساتھ ایمان بالرسالت بھی لازمی ہے، اور ایمان بالرسالۃ مقتضی ہے کہ پیغام محرّف کو نہیں بلکہ پیغام غیر محرف کو رہنما بنایا جائے۔ اور صرف وہی

مقبول ہے۔ مولانا روم بحث کی اس نزاکت کو سمجھتے تھے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ ۔ ؎

نہ خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل ۔۔۔ دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

از خدا می خواہ تا زیں نکتہ ہا ۔۔۔ ورنہ لغزی و رسی در منتہا

زانکہ از قرآں بسے گمرہ شدند ۔۔۔ زاں رسن قومے دروں چہ شدند

مر رسن را نیست جرمے اے عنود ۔۔۔ چوں ترا سودائے سر بالا نہ بود

مولانا روم نے عقل استدلالی کی حقیقت جا بجا بے نقاب کی ہے اور عقل وعشق کے فرق و امتیاز پر بار بار ڈالی ہے۔ اور فیصلہ یہ سنایا ہے کہ

گر بہ استدلال کار دیں بدے ۔۔۔ فخر رازی راز دار دیں بدے

یعنی دلیل بازیوں سے اگر دین کا کام چل سکتا تو فخر رازی فلسفے کے امام نہ ہوتے بلکہ راز دار دیں ہوتے۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی اچانک رحلت کے بعد شائع ہوئی، ورنہ یقین ہے کہ وہ بھی اس میں حک واضافہ کرتے، اور ایک جامع مقدمہ بھی اس پر لکھتے۔

ایک آدھ جگہ شعر بھی غلط درج ہو گیا ہے مثلاً شاد عظیم آبادی کی مشہور غزل کا یہ مشہور شعر ؎

پچھلے پہر اٹھ کے نمازیں سجدوں پہ سجدے ناک رگڑتی

جو نہیں جائز اس کی دعائیں اف رے جوانی ہائے زمانے

اپنی نوعیت کا ایک ہی لاجواب شعر ہے مگر کتاب میں اسکی صورت مثلث کی سی ہو گئی ہے۔

سجدوں پہ سجدے ناک رگڑتی ۔۔۔ جو نہیں جائز اسکی دعائیں

اف رے جوانی ہائے زمانے

ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیف، عوام وخواص دونوں کو یکساں فائدہ پہونچائے گی کہ

ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمہ روحی

بقیہ ۱۔ رسالوں میں

لکھی ہے اور محبوب السیر (محبوب علی خاں نظام دکن کے عہد کی تاریخ) بھی لکھی ہے اور اپنی سوانح عمری بھی (جو غیر مطبوعہ ہے) رسالہ معیار فصاحت اور توسیع زبان بھی ان کی قیمتی تصنیفات ہیں مصطلحات دکن اور غرائب الجمل بھی ان کی یادگار ہیں، شاعری میں شاگرد تھے اور ذکا حضرت غالب کے، ان کے دو دیوان ہیں دوسرا دیوان خواجہ حافظ کے جواب میں مرتب ہوا ہے، حافظ پر دو دو غزلیں انہوں نے لکھی ہیں، اس کے علاوہ نظمیں اور قصائد بھی ہیں اردو میں داغ سے اصلاح لی تھی، مگر زبان ان کو رہی، نواب صاحب غیر معمولی ذہانت وعلم کے حامل اور عملی آدمی تھے۔

چمکدار اور نہایت مضبوط

چاہے پاکستان میں کھڈی (کرگہ) کا جھونپڑا ہو یا کسی بیرونی ملک کے کاٹن ملز کا شیڈ ہر جگہ مضبوط اور چمکدار سوت کی قدر ہوتی ہے

گل احمد ٹیکسٹائل ملز بہترین مضبوط اور چمکدار سوت تیار کرتا ہے جس کی پاکستان میں اور بیرونی ممالک میں ہر جگہ قدر ہے۔

گل احمد ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

مومن منزل۔ جوڑیا بازار۔ کراچی ۲

کیبل ABAD MILLS ٹیلیفون نمبر 35236 و 33243

ملز

بمقام ـــــ لانڈھی

ٹیلیفون نمبر 49531/23

مہر نیم روز

جون سنہ ۱۹۶۰ء

جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۶

حسن مثنیٰ ندوی ۔ علی اکبر قاصد ۔ ابوالخیر کشفی

سید سلمان ندوی، عمر وارث خان ۔ خالدہ فہمی ایم اے

قیمت

سالانہ :-	چھ روپے
ششماہی :-	تین روپئے ۴ آنہ
فی پرچہ :-	آٹھ آنے (۸)

پتہ

نمبر ۲۰۴ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی، ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی ۵

دفتر رسالہ "مہر نیم روز" ۔ کوی روڈ کراچی

اس شمارے میں

حسن مثنیٰ ندوی، اڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے انجمن پریس میں چھپوا کر ۲۰۲ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵ سے شائع کیا

پہلی کرن

رستم زماں

فردوسی نے اپنے شاہنامے میں رستم کے کارنامے بڑی شان وشکوہ کے ساتھ بیان کئے ہیں اور پھر یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ رستم
تم میرے زور قلم نے بنایا ہے "وگرنہ یلے بود در سیستاں" یہ شخص تو ایک سیستانی پہلوان تھا جیسے دنیا میں اور دوسرے پہلوان
تے ہیں، لیکن فردوسی کا یہی دعوے اپنے اندر ایک دلیل خود اپنے خلاف بھی رکھتا ہے، یعنی کیا عجیب کہ رستم کو رستم بنانے کا دعویٰ خود
قلم کا نتیجہ ہو۔ ! ــــ سیستان جس علاقے کا نام تھا وہ آج بھی مغربی پاکستان کا ایک حصہ ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس علاقے میں جس
نے بھی کسی فن کو اپنایا ہے اس میں کمال ہی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرخی سیستانی اسی علاقے کا باشندہ تھا جس کا نام آج بھی فارسی
ری کے اساطین میں امتیازی درجہ رکھتا ہے، حالانکہ بقول نظامی عروضی سمرقندی، اسکی ظاہری وضع قطع اور سادگی کو دیکھ کر لوگوں
نے ایک دہقانی سمجھا تھا، پھر امام ابوداؤد السجستانی بھی اسی سیستان کے رہنے والے تھے، اور صحاح ستہ میں ان کی مشہور کتاب
سنن ابی داؤد کا جو مرتبہ دنیائے علم میں ہے اس کا حال سب کو معلوم ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ رستم بھی اگر واقعی کوئی پہلوان اس
میں موجود تھا تو وہ اپنے فن میں غیر معمولی درجہ نہ رکھتا ہو، فردوسی کے دل و دماغ پر اسکی قوت و توانائی کا جو اثر، شاہنامے کے
ار کی عینک سے ہمیں دکھائی دیتا ہے، وہ خود غماز ہے کہ رستم یا اس جیسی کسی اور شخصیت کا وجود محض فرضی اور صرف کرشمۂ تخیل
ز نہیں۔

بہرحال کوئی رستم رہا ہو یا نہ رہا ہو اور فردوسی نے کسی ایسی شخصیت کو خارجی دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو
ہزار سال کے بعد، ہم نے اپنی آنکھوں سے تو ایک جیتے جاگتے رستم زماں کو ضرور دیکھا، سچ مچ کے رستم کو، ــــ گاما کو، گاما
معنوں میں رستم زماں تھا جس کا دنیا میں کوئی حریف نہ تھا، جس نے ہر مقابل و مبارز کو شکست فاش دی، اور اپنی غیر معمولی قوت و
ی کا لوہا سارے عالم سے منوایا۔ یہ فردوسی کے رستم سے بھی بڑا رستم تھا جس کا مدمقابل ڈھائی ارب سے زیادہ کی اس ارضی آبادی
ئی بھی نہ تھا۔

رستم زماں گاما کشمیری پہلوانوں کے اس مشہور خاندان کا فرد تھا جن کی کشتی گیری اور پہلوانی کا سکہ صدیوں سے اس برعظیم
ں ہے۔ اس خاندان میں بڑے بڑے نامی گرامی پہلوان پیدا ہوتے رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں گاما ۱۸۸۰ء میں وسطی
مشہور ریاست دتیا میں پیدا ہوا تھا اس نے اپنی ابتدائی زندگی راجہ دتیا کے ساتھ کھیل کر گزاری تھی، اٹھارہ سال کی
لاہور پہنچا۔ بائیس ۲۲ تئیس سال کی عمر میں اس نے مشہور پہلوان بیدو جی کو پچھاڑا، اور تیس ۳۰ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے

تو اس نے وہ مقام حاصل کر لیا کہ بڑے بڑے پہلوان اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے گھبراتے تھے، لیکن آج سے ٹھیک پچاس سال پہلے سنہ ۱۹۱۰ء میں دنیا کے سب سے بڑے پہلوان زبسکو سے اسکی معرکہ آرا کشتی لندن میں ہوئی۔ یورپ جو ہر معاملے میں اپنے آپ کو برتر مشہور کرنے اور سمجھنے کا عادی ہے، گاما کو منہ لگانے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ لیکن گاما کا ذہن یورپ سے مرعوب نہ تھا وہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ اپنی دھن میں لگا رہا آخر زمین ہموار کر لی اور چند اچھے پہلوانوں کو پچھاڑ کر ایک ہلچل برپا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے سب سے بڑے پہلوان زبسکو سے اسکی بازی بد گئی اس بازی میں گامانے زبسکو کو شکست فاش دی اور دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ سنہ ۱۹۱۰ء سے زبسکو نے پورے اٹھارہ برس تک مسلسل مشق و ریاضت کی اور پوری تیاری کے بعد سنہ ۱۹۲۸ء میں پھر گاما کو دعوت مبارزت دی، یہ دنگل پٹیالے میں ہوا لیکن سنہ ۱۹۱۰ء میں یہ دونوں پہلوان جہاں ڈھائی گھنٹے تک ایک دوسرے سے گتھے رہے تھے وہاں سنہ ۲۸ء میں فیصلہ چشم زدن میں ہوا۔ پہلی کشتی میں گامانے قوت کا مقابلہ قوت سے کیا تھا، دوسری کشتی میں کمال فن کا مظاہرہ کیا کہ دنیا میں قوت ہی سب کچھ نہیں، کچھ چیزیں اس کے علاوہ بھی ہیں جس کے بعد گاما دنیا کا سب سے بڑا پہلوان تسلیم کر لیا گیا اور بطور نشان طلائی پیٹی اور نقرئی گرز اس کے حوالے کر دیا گیا۔

گامانے رستم زماں کی حیثیت حاصل کرنے کے بعد آخیر وقت تک اسے نبھایا، کسی پہلوان نے اسکی پیٹھ زمین سے نہیں لگائی۔ لیکن جس پہلوان کو دنیا کی کوئی قوت شکست نہ دے سکی تھی اس کو بڑھاپے نے زیر کر لیا پچھلے کئی سال سے اسکی صحت روز بروز گرتی چلی جاتی تھی اور آخر ۲۳ مئی کو تقریباً اسی سال کی عمر میں وہ اس دنیا سے اٹھ گیا۔ موت، یعنی پیدا کرنے والے کا حکم ہر قوت جسمانی اور ہر قوت روحانی پر بھاری ہے۔

انسان ـــ افلاطون کا "عالم اصغر" اور صاحب نظر کا "عالم کُل" ـــ خدا جانے کتنی متضاد قوتوں کا مجموعہ اور کیسی کیسی صلاحیتوں کا مالک ہے، اگر وہ اپنے بدن کی طبیعیاتی قوت کو مشق و ممارست سے بڑھائے تو گاما پہلوان ہو سکتا ہے، وہ گاما پہلوان جس کے لئے تانبے کی چادر کو بھی کاغذ کی طرح چیر کے پھینک دینا۔ کوئی بڑی بات نہ تھی، اور اگر وہ اپنی روحانی واخلاقی قوتوں کو بڑھائے تو پھر بقول اقبال ؎

کبھی اس کے قبضے میں جبریل و حور

یا بقول حکیم شیراز ؎

یکے دیدم از عرصۂ رودبار   کہ پیش آمدم بر پلنگے سوار

آدمی چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے، اور کیوں نہ ہو آخر اس دنیا میں خدا کا نائب ہی تو ہے۔ بشرطیکہ وہ چاہے بھی۔ خدائے قوی و عزیز اپنی رحمتیں نازل فرمائے بوڑھے پہلوان گاما پر جو اپنی زندگی میں اپنے خالق جسم و روح کی یاد سے غافل نہ رہا اور نہ غیر معمولی جسمانی قوت کا غرور ہی اسے بہکا سکا۔ نفس سرکش کا زیر کرنا تو کسی زبسکو پر غالب آنے سے بھی زیادہ کٹھن مرحلہ ہے۔ اور یہ بات گاما کی بہادری کے ساتھ اسکے عالی ظرف ہونے کی بھی دلیل ہے کیونکہ اصل مردانگی و شجاعت تو یہی ہے کہ آدمی جب قوت و اختیار کی بلندی پر فائز ہو تو اس کے توازن دماغی میں کوئی فرق نہ آئے۔ گاما ہماری ملکی تاریخ کا ایک روشن باب تھا جسے دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

یارانِ نکتہ داں

شرقی عباسی امروہوی:۔

میرے عزیز دوست سلطان جمیل نسیم صاحب نے مجھے ارشاد کیا ہے کہ میں حضرت صبا اکبرآبادی مدظلہ کے ایک مطلع پر جو مکالمہ اپنے دوست جناب خالد علیگ سے کر چکا ہوں اسے معرضِ تحریر میں لاکر انہیں پیش کروں بناء بریں سرِ تسلیم خم ہے۔

خالد صاحب نے صبا صاحب موصوف کا یہ مطلع سنایا ؎

آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز
چونک اٹھا سنکے عکس کی آواز

اس کے بعد پریس میں اس شعر پر جو لے دے ہوئی جسمیں "عکس کی آواز" خاص طور سے محلِ نظر تھی اسکا ذکر کیا اور سب سے بعد میں مشفقی نسیم صاحب نے متعدد ادیبوں کو خط لکھکر اس شعر پہ تبصرہ خواہ ہونے کا خیال اور جوابی خطوط کے ذریعہ جو توضیحات موصول ہوئی تھیں ان کو فرداً فرداً دھرانے کی زحمت اٹھائی۔

مینے یہ سب کچھ سنکر عرض کیا کہ مجھے ان توضیحات سے اتفاق نہیں اور اپنی تردیدی دلائل پیش کرنیکے بعد اپنی تفسیرات شعر کو استدلال کے ساتھ پیش کیا۔ خالد صاحب نے اسے بہت پسند کیا کسی ملاقات پہ سلطان جمیل نسیم صاحب سے بھی اس کا ذکر چھڑ گیا اور موصوف نے بھی اسے اتنا ہی پسند کیا۔ اب جو انہوں نے تحریری صورت میں اس توضیح کا تقاضہ کیا تو مینے پوچھا کہ صاحبِ شعر کو بھی اس سے اتفاق ہے یا نہیں اور یہ معلوم ہونے پہ کہ مدعائے شاعر وہی تھا جو مینے بیان کیا۔ میں تعمیل ارشاد نسیم صاحب میں (غلطی کے خطرہ سے محفوظ ہوکر) شاعر کا نقطۂ نظر پیش کرتا ہوں۔

آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز میں فعل کا صیغہ اسکا کچھ عرصہ جاری رہنا یعنی استمرار چاہتا ہے۔ لہٰذا یہ ہمیں تخلیق کائنات سے قبل یا اسکے فوراً بعد کے زمانہ سے آگے بڑھاتا ہے۔ اس بناء پہ آئینہ سے مراد نورِ محمدؐی یا ذات گرامی آدمؑ نہیں ہو سکتے ابلیس پر اسکا اطلاق نہ طبیعت قبول کرتی ہے اور نہ فعل کا صیغہ کیونکہ انکارِ ابلیس کا واقعہ بھی تخلیق کے فوراً ہی بعد کا ہے اسلئے آئینہ ساز کو ذرا آئینہ (یعنی کائنات مخلوق) کو دیکھتے رہنے دیجئے تاآنکہ وہ وقت آئے جس مرحلہ پہ "آئینہ ساز" یعنی خالق، آئینہ (یعنی کائنات عالم میں)، "عکس" یعنی اپنے عکس کی آواز یعنی عکس کی زبانِ حال کی آواز سنکر چونک اٹھے۔

ہ تک اشتانہ تشنگی کی بنا پہ ہوتا ہے جو تخلیق نور محمدی سے خالق کو ہوسکتی ہے نہ اپنی صنعت پہ کہ آدم کی بوالعجبی اسکا باعث ہوسکے
کار عزازیل بھی چونکنے کا جذبہ نہیں پیدا کرسکتا بلکہ وہ موجب اشتعال ہوسکتا ہے جیسا کہ ہوا۔

لہذا ان سب مراحل سے گذر کر اس مرحلہ تک آئینے نے چونکا دیا۔

ایک عکس یعنی مظہر حق نے دعوے کردیا کہ انا الحق۔ چونکنے کی بات ہے کہ مخلوق خالق ہونیکا دعوی کررہا ہے اور گرفت
ن بھی نہیں آتا کہ وہ کل ہی کا ایک جزو یا صوری کیفیت یا عکس ہے اور ہر عکس اپنے عکاس کی ہو بہو تصویر ہوتے ہوتے زبان
ال سے بغیر بولے لفظ یہی کہتا ہے کہ۔

" جو تو ہے وہی میں ہوں "

رہ گئی "عکس کی آواز" کی لفظی گرفت تو میں پوچھتا ہوں کہ کوئی آئینہ دیکھنے والا آئینہ دیکھتا کس مقصد سے ہے۔ اسکے
ذہن میں کچھ سوال ہوتے ہیں یا کوئی سوال ہوتا ہے جسکا جواب آئینہ سے ملتا ہے اگر جواب نہ ملتا تو رسم آئینہ بینی بے سود اور
فعل عبث بنکر ترک ہوچکتی۔ فروغ نہ پاتی۔ تو جب آئینہ سے جواب ملتا ہے تو اس جواب کو آواز سے تعبیر کرنا اور عکس کو زبان
حال قرار دینا کون سی بے تکی بات ہے کہ اس سے ہم چونکیں۔

جیسے حضرت صبا صاحب کے انتخاب الفاظ کی بیجد داد دی جنکی موجودگی میں مفہوم کو اپنی جگہ سے ہٹنے کی اور کسی دوسری
تعبیر کے لئے کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی یہ کام آسان نہیں ہوتے۔

اس موقعہ پر میں اپنا بھی ایک مقصد پورا کرلینا چاہتا ہوں کہ صبا صاحب مدظلہ کے اس مطلع سے استفادہ کرکے میںنے
بغیر اجازت موصوف ایک مطلع کہا ہے جس کے معنی اور الفاظ کچھ مختلف ہوتے ہوئے بھی صبا صاحب کے مفہوم والفاظ سے
کچھ مشابہت رکھتے ہیں چنانچہ عذر تقصیر کرکے عفو تقصیر کی امید کے ساتھ اپنے مطلع کو بحال رکھنے کی اجازت خواہ ہوں وہو ہذا۔

آئینہ وار پیش آئینہ ساز
میری آواز عکس کی آواز

ارشد کاکوی:۔

چونکہ اردو میں التماس کے ہم معنی جتنے الفاظ مستعمل ہیں سبکے سب مؤنث ہی بولے جاتے ہیں اسلئے التماس کو لازماً مؤنث بولنا ایک ایسی
بات ہے جسکا کوئی جواز نہیں۔ چراغ مذکر ہے اور شمع مؤنث۔ لیمپ مذکر ہے اور لالٹین مؤنث۔ شیروانی مؤنث ہے انگرکھا مذکر۔ شلوار مؤنث ہے غرارہ
مذکر۔ اوڑھنی مؤنث ہے اور دوپٹہ مذکر ہمارے یہاں۔ قیاسات "ہی" پر انحصار ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ التماس کے سلسلے میں ہمارے یہاں
بھی دہلی اور لکھنؤ کا اختلاف ہے۔ شادانی صاحب کا ایک شعر سنئے ؎

اب نہ آئیں گے تاثر کے وہ لمحے لوٹ کر
رائیگاں ہے اب نگاہِ آرزو کا التماس (ندیم - فروری ۶۰ء)

آپ اداریہ بڑی دلسوزی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اپریل کا اداریہ بھی پسند آیا۔

سید عبدالقدوس ہاشمی

چند غلط فہمیاں اور ان کی تصحیح

پچھلی سطور پر غور کیجئے۔ آپ ان حقائق پر غور کرنے کے بعد ہرگز یہ نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے کہ مسلمان رو بہ زوال ہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ مسلمان پچھلے پچیس تیس سال سے سیاسی طور پر حیرت انگیز ترقی کر رہے ہیں۔ اور اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں کہ آپ گذشتہ پانچ ہزار سال کی تاریخ میں کوئی مثال اس حیرت انگیز رفتار ترقی کی نہیں تلاش کر سکتے۔ آپ کہیں اور کسی دور میں کسی قوم کو چاہے وہ مذہبی داعیہ پر پیدا شدہ اجتماع نوع انسانی ہو یا وطنی و نسلی بنیادوں پر استوار قومیت ہو پچیس تیس سال کے قلیل عرصہ میں اس طرح سیاسی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر بیس پچیس کروڑ کی تعداد میں آزاد ہوتی ہوئی اور بارہ پندرہ لاکھ مربع میل کے رقبہ کو غلامی کی لعنت سے آزاد کرتی ہوئی نہیں پا سکتے

اقبال و ادبار حقیقت یہ ہے کہ قومیت چاہے دین و عقیدہ کی بنیاد پر قائم ہو۔ یا وطن و نسل کی بنیاد پر ایک بڑی مدت اس کے داخلی استحکام پر صرف ہو جاتی ہے، اس کے بعد اس قوم کو سربلندی اور سرفرازی اس زمین پر حاصل ہوتی ہے یہ سربلندی کا و سرفرازی کا زمانہ جیسے افراد میں یکساں نہیں رہتا۔ اقوام میں بھی یکساں نہیں رہتا۔ تاریخ میں کسی ایسی قوم کا حال نہیں ملتا جس کا زمانہ اقبال مندی ہمیشہ قائم رہا ہو۔ اقبال مندی کے بعد ادبار اور ادبار کے بعد اقبال کے دور آتے ہی رہتے ہیں۔ تلک الایام نداولہا بین الناس پھر اگر یہ قوم مختلف اوطان میں پھیلی ہوئی بڑی قوم ہے تو مختلف حصوں میں اسکی مختلف کیفیت بھی دکھائی دیتی ہے اسی طرح وسیع اور عمیق مطالعہ تاریخ آپ کو بتاتا ہے کہ قومیں جتنی پھیلتی جاتی ہیں، ان میں مقامی اثرات کام کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے دین و عقیدہ میں کچھ بنیادی اور مشترک امور ان کو باہم مربوط رکھتے ہیں۔ اور ان ہی اصول کی برتری پر قوموں کے دور ادبار سے تیزی کے ساتھ نکلنے کا دار مدار ہے قومیں ان ہی بنیادوں پر حیات نو حاصل کرتی ہیں۔ اور اپنے اسی ناموس کہن کی حفاظت کے ذریعہ ان میں زندگی کی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ حکیم مشرق علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

زندہ فرد از ارتباط جان و تن
زندہ قوم از حفظ ناموس کہن

قدرت کے اس کارخانہ کون و فساد میں تغیر ایک کلی قانون کی حیثیت رکھتا ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس آئین مسلّم سے کوئی قوم بلکہ کوئی ایک فرد بھی محفوظ رہ سکے۔ مسلمان اس سے کیوں کر محفوظ رہ سکتے تھے۔ ان کی پچھلی تیرہ چودہ سو سالہ کی تاریخ میں ان کا دور اقبال و ادبار دکھائی دیتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک بہت بڑی قوم ہے جس کے افراد دنیا کے ہر اس حصہ

میں پائے جاتے ہیں جہاں نوع انسانی آباد ہے۔ اس لئے اس قوم کے ساتھ یہ ہوتا رہا ہے کہ ایک جگہ ان پر ادبار و زوال کا دور دکھائی دیتا ہے تو ٹھیک اسی زمانہ میں دوسری جگہ یہ رو بہ ترقی نظر آتی ہے۔ جس زمانہ مسلمانوں پر اندلس میں انتہائی ظلم ہو رہا تھا اور یہ اندلس سے نکالے جا رہے تھے، ٹھیک اسی زمانہ میں اسلام جنوب مشرقی ایشیا میں پھیل رہا تھا۔ جس زمانہ میں عراق و شام میں تاتاریوں کے بے پناہ مظالم ہو رہے تھے، ٹھیک اسی زمانہ میں مشرقی بنگال اور بہار وغیرہ میں لوگ جوق جوق مسلمان ہو رہے تھے، دہلی اور جونپور میں مسلمانوں کا پرچم اقبال لہرا رہا تھا۔ افریقہ کے مختلف قبائل میں اسلام پھیل رہا تھا۔ اور یہ تو کل کی بات ہے کہ جس سال مسلمانان فلسطین پر تباہی و بربادی آئی ہے اسی سال انڈونیشیا نے آزادی حاصل کی ہے

اس طرح صورت حال سے مایوسی اور اضمحلال کی بجائے قوموں میں اور زیادہ جوش عمل پیدا ہوتا ہے۔ یاس و قنوط کی کوئی وجہ نہیں۔ فلسطین میں یہودیوں کی یہ حکومت بھی چند دنوں کی چیز ہے۔ یہ بھی اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح اس سے پہلے عیسائی حکومت فلسطین دو بار قائم ہوئی اور ختم ہوئی ہے۔

اتحاد کا فقدان

مسلمانان عالم کی سیاسی حالت پر غور کرتے ہوئے ایک بات ہر صاحب فکر مسلمان کیلئے انتہائی سوہان روح کا باعث ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگرچہ پچھلے پچیس تیس سال کے اندر بہت سے مسلمانوں نے آزادی حاصل تو کر لی ہے اور بہت بڑے رقبۂ زمین کو مستعمرین یورپ کے قبضۂ غلامی سے نجات مل گئی ہے مگر ان میں باہمی اتحاد و ارتباط کی جد و جہد نہیں پائی جاتی، اور ظاہر ہے کہ بموجب حدیث نبوی۔ لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولہا (اس امت کا آخری دور صرف اسی طریقہ سے بہتر ہو سکتا ہے جس طریقہ سے اس کا اولین دور بہتر ہوا) امت اسلامیہ کی فلاح و برتری باہمی اتحاد و ارتباط ہی پر منحصر ہے۔

یقیناً یہ صورت حال ہر صاحب نظر کے لئے سوہان روح کا باعث ہے اس کے لئے ہر فرد کو اپنے امکان کی حد تک ہر طرح جد و جہد کرنی چاہیئے۔ مسلمانوں کی بہتری خصوصاً اور اقوام مشرق کی عموماً باہمی سیاسی اور معاشی ارتباط ہی پر منحصر ہے لیکن موجودہ صورت حال سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ صورت حال قائم نہیں رہ سکتی مسلمانوں کو ایک ایسی تنظیم قائم کرنی ہی پڑے گی جو ان کی سیاسی اور معاشی اتحاد کی ضامن ہو۔ میں نے پچھلے دس بارہ سال کے اندر سارے اسلامی ممالک کا سفر کیا ہے۔ اور بعض ملکوں میں تو ایک مرتبہ سے زیادہ گیا ہوں۔ میں نے ان ممالک میں ہفتوں اور مہینوں رہ کر ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقاتیں کی ہیں میں نے یہ محسوس کیا کہ اسلام کا اصول اخوت عامہ اتنا گہرا اثر رکھتا ہے کہ دنیا کی کوئی دوسری قوت جامعہ اس کو وقتی طور پر دبا تو سکتی ہے مگر بالکلیہ فنا نہیں کر سکتی، یہ مسلمان کی فطری و جبلی تمنا ہے کہ مسلمانوں کے مابین سیاسی و معاشی ارتباط بلکہ مضبوط و استوار تنظیم قائم ہو جائے۔ ہر جگہ کے عام مسلمان چاہے وہ پیشہ اور معاش کے اعتبار سے کسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں، یہی چاہتے ہیں اور اس تمنا کی تکمیل کی طرف اپنی اپنی حکومتوں کا قدم نہ اٹھتے ہوئے دیکھ کر اپنے حکمرانوں سے ایک حد تک متنفر ہیں۔ یہ کیفیت انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک ہر جگہ محسوس کر سکتے ہیں کہیں کافی شدت کے ساتھ اور کہیں کم تر۔

صدیوں کی غلامی کے بعد جب ان ممالک کو سیاسی آزادی ملی تو اقتدار کی باگ ڈور خواہ مخواہ ان زعیموں کے

میں آگئی جو دورِ غلامی کے پروردہ اور تعلیم یافتہ تھے۔ وہ ناقص تعلیم و تربیت جو ان بیچاروں کو ملی ہے وہ اپنی انتہائی بلند پروازی میں بھی رقبہ جاتی خود مختاری سے زیادہ بلند افکار تک ان کو پہنچنے نہیں دیتی اس وجہ سے ہر جگہ یہ نظر آتا ہے کہ عوام تو اپنے عمل کی کوتاہیوں کے باوجود جذباتی اور ذہنی طور پر سچے مسلمان ہیں مگر ان کے لیڈر اپنے یورپی لباس اور بڑی بڑی تعلیمی ڈگریوں کے ساتھ ذہنی طور پر ابھی تک یورپ کے غلام ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی۔ نہ نواب کاخ شاہی کا احترام بہت دنوں تک قائم رہے گا اور نہ القصر الملکی کا جلال۔ نہ زعامت مقدسہ لازوال ہو سکتی ہے۔ اور نہ ان بوڑھے لیڈروں کی ہمیشہ چلتی رہے گی، یہ ایک قسم کا عبوری دور ہے جو اب بہت جلد ختم ہونے والا ہے اور مسلمان عوام کی تمنائیں ان ممالک پر حکمران ہونے ہی کو ہیں

دوسری بات جو اس سلسلہ میں غور کرنے کے قابل ہے، شاید یہ ہے کہ اتحاد "منافع مشترک" کی بنیاد پر بھی ہوتا ہے "ضرر مشترک" کی بنیاد پر بھی، مگر وہ اتحاد جو "منافع مشترک" کے حصول کے لئے ہوتا ہے وہ کمزور اتحاد ہوتا ہے۔ قوی اتحاد وہی ہوتا ہے جو "ضرر مشترک" کی مدافعت کے لئے ہو —— اور ضرر مشترک کی مدافعت کا خیال اب ہر جگہ پیدا ہو چکا ہے اس لئے مسلم ممالک ارادی طور پر عمل کریں یا اضطراری طور پر۔ یہ تو انہیں کرنا ہی پڑے گا کہ باہمی معاشی ارتباط قائم اور استوار کرلیں۔ مشترک بنک قائم کرلیں۔ باہمی لین دین کو ترقی دیں۔ اور شاید وہ دن بھی اب بہت دور نہیں ہے جب کہ یہ ممالک ایک تنظیم قائم کرکے سیاسی ارتباط کو بھی استوار کرنے کی جد و جہد شروع کر دیں تاکہ ان سب کی خارجہ حکمت عملی اور دفاع تک مشترک ہو جائے۔

معاشی حالات

شاید بعض لوگوں کو یہ خیال ہو کہ سیاسی اعتبار سے اگرچہ مسلمان ترقی کر رہے ہیں مگر معاشی اعتبار سے رو بہ زوال ہیں۔ آیئے اس کا بھی جائزہ لے کر دیکھ لیجئے۔ معاشی اعتبار سے مسلمان ہر جگہ جہاں انہیں مل گئی ہے کس قدر تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔ اس کا اندازہ آپ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے پاکستان اور ۱۴ مئی ۱۹۶۰ء کے پاکستان کی معاشیات کا تقابلی مطالعہ کرکے بڑی آسانی کے ساتھ لگا سکتے ہیں۔

اگرچہ پچھلے بارہ سال میں سیاسی دھڑے بندیوں اور پارٹی بازیوں سے پاکستانی لیڈروں کو ملک کی عام ترقی کی طرف توجہ کرنے کی نسبتہً کم فرصت میسر آسکی لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کے دور میں ملک نے صنعتی اور زراعتی ترقی کی اور اتنی کی، کہ مغربی جرمنی کے سوا دنیا کے اور کسی ملک نے اس مدت میں پاکستان سے زیادہ ترقی نہیں کی ہے۔ اسی طرح اور تمام نو آزاد ممالک نے ترقی کی ہے۔ کہیں ترقی کی رفتار بہت سست ہے مثلاً ایران اور انڈونیشیا اور کہیں یہ رفتار بہت تیز ہے۔ مثلاً پاکستان اور مصر لیکن بہر حال یہ تمام ممالک معاشی اعتبار سے ترقی ہی کر رہے ہیں، جیسے ہر کلیہ میں استثناء کا وجود عام طور سے ہوا کرتا ہے، اس کلیہ میں بھی افغانستان کا استثنا ہے، مدت زیر بحث میں وہاں کوئی تعلیمی یا معاشی ترقی ایسی نہیں ہو سکی ہے جس کو نمونہ کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ اس کے برخلاف ترکی نے زراعت اور خصوصیت کے ساتھ تعلیم و تعمیر راہ میں ایسی ترقی کی ہے کہ ہر طرح قابل تعریف ہے۔ آج ترکی کا کوئی دیہات ایسا نہیں جو پختہ سڑک سے محروم اور جدید ذرائع خبر رسانی اور وسائل حمل و نقل سے بے بہرہ ہو۔

یہ تو ناممکن ہے کہ تمام مسلمان ممالک کی معاشی و تعلیمی ترقی کا تفصیلی جائزہ اس مضمون میں لیا جا سکے۔ اس کے لئے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے لیکن ایک مجمل بیان کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تمام مسلم ممالک میں بیداری ہے اور ہر جگہ تعلیمی اور معاشی ترقی کے لئے بڑے یا چھوٹے پیمانہ پر کام ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ خفتہ و غافل ملک میں بھی جس پر ماضی میں اکثر صدیاں بغیر کسی تبدیلی و حرکت کے گزرتی رہی ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یورپ کے ترقی یافتہ ممالک یا امریکہ و جاپان کے مقابلہ میں ابھی ہماری ترقیاں قابل شمار و بیان نہیں ہیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہزاروں موانع اور لاکھوں رکاوٹوں کے باوجود ہم ترقی کر رہے ہیں۔ کسی میدان میں بھی صدیوں آگے نکل جانے والوں کا مقابلہ آسان نہیں ہوتا۔ اس لئے ہمارے دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے معاشیات کے میدان میں آگے بڑھنے کا سوال خارج از بحث ہے اور یہ حالت صرف ہماری نہیں بلکہ ان ممالک کی بھی ہے جو ترقی یافتہ ممالک کہلاتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ سویڈن اور ناروے کی تفصیلی سیاحت کے بعد فرانس اور اٹلی کے دیہی علاقوں میں جا پہنچیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ اسکنڈینیوین ممالک کے مقابلہ میں وسط یورپ اور خصوصاً جنوبی یورپ کے ممالک محض کورده اور غیر ترقی یافتہ ہیں۔

اخلاقی و روحانی حالات

مسلمان اخلاقی و روحانی اعتبار سے ترقی کر رہے ہیں یا رو بہ زوال ہیں اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ اخلاقی اور روحانی کے الفاظ کی تشریح کریں اور واضح حدود متعین فرمائیں کہ کن امور اور کون سی تحریکات کو آپ اخلاقی اور روحانی قرار دیں گے اور کسی جسمانی اور مادی۔

ممکن ہے کہ کوئی صاحب علم ایسے حدود متعین کر سکے، لیکن کم از کم میرے جیسے کم سواد کے لئے تو یہ ناممکن ہے مجھے تو اسلامی تاریخ، اسلامی تعلیمات، قرآن مجید اور احادیث نبویہ کے مطالعہ سے یہ نظر آتا ہے کہ انسان کو دین اسلام نے ایک غیر منقسم کل کی حیثیت دی ہے، روحانیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان میں خدا ترسی، ہمدردی، اور فرض شناسی وغیرہ کے محمود خصائل پیدا ہو جائیں۔

اس زاویۂ نظر سے موجودہ مسلمانان عالم کو دیکھئے تو نظر آتا ہے کہ ایران و عراق کی حالت سب سے زیادہ خراب ہے۔ مذہبی احکام سے بے پروائی۔ ہوا و ہوس کی حکمرانی، جرائم کی کثرت، اور عیش کوشی و عیش پرستی کی بہتات نے ان ممالک کے شہروں کو خراب کر رکھا ہے — الا من رحم ربی۔

لیکن عراق و ایران کی یہ حالت کچھ جدید نہیں، بڑی مدت سے وہاں یہ برائیاں بہ کثرت موجود ہیں — اور اصلاح جو وہاں کے اہل دین و تقویٰ کرتے ہیں کچھ زیادہ کامیاب نظر نہیں آتی ہیں۔

ان کے علاوہ ہر ملک میں اصلاحی اور دینی جماعتیں کامیابی کے ساتھ بداخلاقیوں کی اصلاح کر رہی ہیں۔ اور بہتر حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ رہا یہ تصور کہ برائیاں بالکل مفقود ہو جائیں گی، یا عہد نبوی کے مدینہ منورہ جیسے حالات کسی ملک کی ساری آبادی میں پیدا ہو جائیں گے۔ کچھ حقیقت پسندانہ تصور نہیں۔ شہری زندگی میں عہد نبوی کا سا

خلاق میں، جدید یورپی تمدن کی پیدا کردہ کمزوریاں ہر جگہ کچھ نہ کچھ موجود ہیں لیکن اتنی ترقی پذیر نہیں ہیں کہ آپ اس سے "زوال اقدار اجتماعی" کا خطرہ محسوس کریں۔ اگر قاہرہ، انقرہ، جکارتا، لاہور اور کراچی میں آپ کو برائیاں نظر آتی ہیں تو مصر، ترکی، انڈونیشیا اور پاکستان کے عوام میں خصوصاً ان کے دیہاتوں کے بسنے والوں میں قابل تعریف اخلاقی قوت بھی نظر آتی ہے بلکہ یہ صاف نظر آتا ہے کہ لوگ خصائل حمیدہ کی طرف زیادہ مائل ہیں ایک بالغ نظر شخص کو جو ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرے قنوطا اور مایوسی سے دوچار ہونا نہیں پڑتا ہے۔ تغافل و تساہل کے باوجود مسلمان اچھے اخلاق اور اسلامی تعلیمات کی طرف کافی حد تک متوجہ ہیں۔

مغربی چالیں

آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ مشرق پر سیاسی قبضہ اور معاشی دستبرد کیلئے یورپ کی استعماری حکومتوں نے مقدس دین عیسوی کو آلۂ کار کے طور پر ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے مقدس نام پر تعلیمی و طبی ادارے قائم کرتے ہیں۔ پولوس اعظم کا دین، عیسائیت کے نام سے پھیلاتے ہیں اور اندرونی مقصد یہ رکھتے ہیں کہ ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی طبی خدمات سے متاثر ہوکر،

تا بہ کام خواجہ اندیشد غلام

اس طرح استعمار کی راہیں ہموار کی جاتی رہی ہیں۔ اور اب بھی خون آشامان استعماریت مشرقی اقوام سے عموماً اور مسلمانوں سے خصوصیت کے ساتھ استعمال کے لئے یہ طریقہ استعمال کر رہے ہیں۔ بلکہ حالیہ جنگ عظیم کے بعد سے جب کہ انہوں نے محسوس کر لیا کہ اب سیاسی غلامی کے بندھن ٹوٹ رہے ہیں۔ ان نام نہاد مبلغین مذہب پر زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے دولتمند بے دریغ روپیہ ان پر صرف کر رہے ہیں ان کی تبلیغی (یا زیادہ صحیح الفاظ میں سیاسی و استحصالی) حرکتیں سارے مشرق میں عموماً اور مسلم ممالک میں خصوصاً بہت تیز ہوگئی ہیں۔ بلکہ خود ان کی رپورٹ کے بموجب سب سے زیادہ توجہ انہوں نے پاکستان پر کی ہے اور سب سے زیادہ کامیابی انہیں یہیں حاصل ہو سکی ہے۔

ان کی وجہ سے مسلمانوں کو دینی و دنیوی دونوں طرح کے شدید خطرات پیدا ہوگئے ہیں مسلمانوں کو ان خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا یہ ضروری تو نہیں کہ تبلیغ کی اجازت نہ دی جائے لیکن تبلیغ کی اجازت کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے۔

قاضی عبدالودود

عبدالحق بحیثیت محقق

(آخری قسط)

متن ۱) مرتب کا فرض اولین صحیح و جامع متن پیش کرنا ہے، اور بہ مستثنیٰ حالات سے قطع نظر، کتاب زیر ترتیب کے متعدد نسخوں کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق کو ۱۹۲۶ء میں یا اس کے کچھ ہی بعد[1] یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ذکر میر کا ایک نسخہ جناب سید مسعود حسن رضوی کے پاس ہے، لیکن، اور نسخوں کی تلاش[2] درکنار، انہوں نے اس نسخے سے استفادہ بھی غیر ضروری متصور کیا، اور صرف نسخۂ نادرہ پہ قناعت کرکے آمادۂ اشاعت ہو گئے۔ حسن اتفاق سے ڈاکٹر محمد شفیع کو اس کا علم ہوا، اور انہوں نے مرتب کو لکھا کہ ضرورت ہو تو اپنا نسخہ بھیج دوں۔ ذکر مطبوعہ کا متن مقدم الذکر کے مطابق ہے اور حواشی میں موخرالذکر کے اختلافات درج ہیں۔

۲) مرتب نے ذکر کا مکمل متن پیش نہیں کیا۔ قلمی متن سے الگ مقدمے میں ہے اور جو عبارت ظاہراً اس کے ساتھ تھی وہ کسی جگہ درج نہیں۔ لطائف مع تمہید بکقلم کتاب سے خارج ہیں، اس کے وجوہ مرتب کے الفاظ میں یہ ہیں:۔

"کتاب کے آخر میں... کچھ لطیفے بھی جمع کر دئیے ہیں[3]، بعض پہلے اور تاریخی ہیں، اور بعض خود ان کے زمانے کے ہیں اور پر لطف ہیں، مگر افسوس کہ بعض ان میں سے ایسے فحش ہیں کہ ان کا لکھنا یا بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس سے اس زمانے کا ذوق معلوم ہوتا ہے، اور نہ میر صاحب کی تہذیب اور متانت کا کیا کہنا ہے۔ اس وجہ سے، نیز اس لئے کہ یہ ایک غیر متعلق چیز تھی، ہم نے یہ لطیفے اس کتاب سے خارج کر دیئے۔"

(الف) حماسہ و سبعۂ معلقہ کے مطبوعہ ہندوستانی متن میں فحش اشعار موجود ہیں؛ کلیات سعدی کے مطبوعہ نسخوں میں ہزلیات شامل ہیں، رومی کی مثنوی میں جو فحش حکایات ہیں (بعض فحش الفاظ بھی ان کے یہاں ہیں) انہیں، مشرق و مغرب کے کسی مرتب (بشمول نکلسن) نے خارج نہیں کیا۔ یورپ میں یونانی اور لاطینی زبانوں کے جو متن شائع ہوتے رہتے ہیں، ان میں فحش الفاظ

۱؎ یہ بات خود مالک کتاب سے معلوم ہوئی۔

۲؎ رامپور کے نسخے کا ذکر آ چکا ہے۔ ایک کرم فرما نے مجھے اطلاع دی ہے کہ گوالیار میں کلیات میر کا ایک نسخہ ہے اور اس میں ذکر شامل ہے۔ یاد آتا ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست مخطوطات فارسی میں بھی ذکر کا ذکر ہے۔

۳؎ یہ کس طرح پتا چلا کہ خود میر نے جمع نہیں کئے تھے؟۔

و عبارات برقرار رہتے ہیں۔ اصل متن کے ساتھ کسی نئی یورپی زبان میں جو ترجمہ ملتا ہے، اس میں کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ کوئی مقام بہت فحش ہو تو اس کا ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ میں نے بعض کتابوں کے انگریزی ترجموں کا یہ حال دیکھا ہے۔ کہ بعض مقامات کا ترجمہ کسی دوسری جدید زبان مثلاً فرانسیسی میں پیش کیا گیا ہے۔ ذکر کی زبان نامانوس محاورات و مصطلحات سے مملو ہے؛ اس کے لطائف کو فحش ہونے کی بنا پر خارج کرنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔

(ب) یہ بتایا جا چکا ہے کہ لطائف کے علاوہ بھی ذکر میں "غیر متعلق" باتیں درج ہیں، ڈاکٹر عبدالحق "متعلق" و "غیر متعلق" کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے، اسے اس کے بارے میں خود مصنف کی رائے پر ترجیح دینا چاہتے تھے، تو انہیں لطائف کے ساتھ اور کچھ باتیں بھی نکال دینی تھیں۔

(ج) متعدد لطائف[1] کا معاصرین سے تعلق ہے؛ جن میں شعرا بھی ہیں، میر چاہتے تو آسانی سے اصل کتاب میں انہیں کھپا سکتے تھے۔ ان کا اخراج، مرتب کا نقطۂ نظر قبول بھی کر لیا جائے تو قابل اعتراض ہے۔

(د) ڈاکٹر عبدالحق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ میر کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ ذکر کسی دوسرے شخص کی نظر سے گزرے گی، تو یہ کہنا کہ لطائف سے میر کے "زمانے کا ذوق معلوم ہوتا ہے، ورنہ میر" کی تہذیب اور متانت کا کیا کہنا "بے معنی سی بات ہے۔ لطائف کے اندراج پر وہ مجبور نہیں کئے گئے تھے؛ یہ خود ان کے ذوق کا تقاضا تھا جس کی بدولت لطائف شامل کتاب ہوئے۔ "میر کی تہذیب اور متانت" کی تعریف مشاعروں کی تحسین سے زیادہ وزن نہیں رکھتی۔

(ہ) میر کی شخصیت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ اچھا برا جو کچھ ان کے قلم سے نکلا ہے سامنے آ جائے۔ ان کی کتابوں میں کاٹ چھانٹ؛ جو در اصل مرتب کا کام نہیں، اس سے مانع آتی ہے۔

۳) (الف) یہ بتایا جا چکا ہے کہ نسخۂ لاہور کے بعض نہایت اہم اختلافات مرتب نے قلم انداز کئے ہیں؛ اس صورت میں یہ توقع نہیں کہ انہوں نے اختلاف نسخ کی نشاندہی کا کام اطمینان بخش طور پر انجام دیا ہوگا۔

(ب) نسخۂ اٹاوہ میں کوئی لفظ صریحاً غلط بھی ہے، تو مرتب نے متن میں اسی کو رکھا ہے، اور نسخۂ لاہور میں جو اس کا صحیح بدل ہے، اسے حاشیے میں درج کیا ہے، اور یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ مقدم الذکر غلط ہے۔ مثالیں: مسعود = مسعود ص۲۶، مستقر خلافت = مستقر الخلافت ص۳۰ (یہ اکبر آباد کا لقب)، کلید = کلید شد ص۵۵، حقہ و قلیاں = قہوہ و قلیاں ص۹۱، برا موسے از امورات = برا مرے از امورات ص۱۱۹۔

۴) ذکر کے قلمی نسخوں میں بکثرت محاورات وغیرہ کے معانی ملتے ہیں اور ان میں اختلافات بھی ہیں، مرتب نے ان سب کو حواشی میں اختلافات متن کے ساتھ ساتھ درج کیا ہے۔ بہتر ہوتا اگر یہ علٰحدہ بترتیب حروف تہجی لکھے جاتے۔ بعض جگہ عجیب شکلیں پیدا ہو گئی ہیں: ص۱۰۵ کے متن میں ہے: "خر خود را در از بستہ"۔ حاشیے میں "خر خود را" کے معنی "مغرور" اور "در از بستہ"

---

[1] جناب سید مسعود حسن رضوی نے لطائف میر پر ایک مضمون لکھا ہے (شائع کردہ "آجکل") میں نے کلیم واسد یار خان کا لطیفہ اسی سے لیا تھا۔ سید صاحب کا نسخۂ ذکر سرسری طور پر میری نظر سے گزرا ہے

کے معنی ماما (یا مائی) لکھے ہیں۔

مرتب نے اس سوال سے بحث نہیں کی کہ معانی کس نے درج کئے ہیں، میرا خیال ہے کہ خود میران کے ذمہ دار ہیں۔

۵) مرتب نے مقدمے یا حواشی میں متن کے کسی لفظ یا عبارت کو غلط یا مشتبہ نہیں بتایا۔ اور کتاب غلطیوں سے عاری ہے۔ اس صورت میں پڑھنے والے اگر اس نتیجے پر پہنچیں کہ مرتب کے نزدیک ذکر مطبوعہ کا لفظ لفظ صحیح ہے تو حق بجانب ہوں گے مگر جیسا کہ فصول بالا کے مطالعے سے ناظرین پر واضح ہو چکا ہے، متن مختلف الانواع اغلاط سے مملو ہے۔ املا کا جہاں تک تعلق ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتب اس کے متعلق کسی قاعدے کے پابند نہیں۔ ذیل میں کچھ الفاظ و عبارات جو غلط یا مشتبہ ہیں، درج کئے جاتے ہیں:-

درویشے = درویشی ۵، عندلیب گے باش کہ ہمیشہ بہار است آں سادہ مشو کہ یک پر کار است و در آسمان دو رنگ و رنگ ندارد = آں سادہ سے قبل کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے۔ و در آسمان الخ ؟ ۔ ایں سعادت متفاوت گر آید = گرا ید ۱۳، تو کہ غزالے = غزالی ۱۴، چوں من نا بلدے رونمائے تو = نا بلدے رہنمائی تو ۱۵، چیز بخور = چیزے ۱۸، گرہ سخت = گرہ ۲۱، ایں بیست = خالیست ۲۴، سر رشتہ = سر رشتہ ۲۸، زود باید برخواست = برخاست ۲۷، افتادہ گان = افتادگان، عزیزاں تا خدا نید دلدادگان رہنمانید = با خدا نید ؟ ۳۶، دام آب = دم ۴۲، خدا برد = جلد برد (ر)، گاؤ = گاو ۴۸، جائے نرو جائے ۴۹، بعد یک ہفتہ = بعد ۵۱، بخشائے = بخشائے، آزردہ = آزردہ ۵۴، خونبابی = خونابے ۵۶، بچشم وردی ۶۰، بہ ہیچ = ہیچ ۶۱، بجائے رسید = بجائے ۶۹، با سحاق۔ جہت سیر = با سحاق ۷۱، گزرانید = گذرانید ۷۵، متفرا قتل شد = در متفرا۔ قتل عام شد ۷۶، دیگر بعد از نماز عشا = دیگر روز ۷۹، روزانہ وطن = روانہ، سرپا پاں = سر بہ ۸۷ و دہر بزنے بزنگا ہے با زاسے وگیرو داری = بہ آزارے ؟ گذارش یافت = گذارش ۸۹، و میانہ = آدمیانہ ۹۱، دام داد = دل ۹۳، باو تشریف داد = باو ۹۵، دیدۂ و دانستہ = دیدہ ۹۷، با سلسلہ = باسلسلہ ۱۰۰، ہرچہ فرار بود.. داوند = ہرچہ ۱۰۲، موزن = موذن ۱۰۴، خرابہ وحشت ناکی = خرابۂ وحشت ناکے، بفریب و عذر = غدر ۱۰۵، سرکار بیگم کہ عبارت از نام شجاع الدولہ باشد = مادر ؟ ۱۰۶، تاکار از تقریر بر آید باید کہ سردار بہ پسر نفر بائی تا از پسر شدہ نمود = تاکار از نفر ۱۰۷، مطیع مطیع ۱۱۱، نوشتن با و مکرے آنہارا = ؟، حمد = احمد ۱۱۲، بایں تقریر = تقریب ۱۱۴، عہد ۱۱۹، دو آبہ کوچ = از دو آبہ ۱۲۳، دیلوچاں = دلبوچاں، اجل رسیدگان چند کے جاتے ہم سرتی ندا شتند = کہ ہے۔ مگر جامہ الخ ؟ دعوی تنخواہ = دعوائے تنخواہ ۱۲۵، برآئید = بر آئید ۱۲۶، چوں فتح باد باراں قوم بود = باد اور الف الگ لکھے ہیں، باد یار ؟ نہ دلش = تہ ۱۳۲، سکوک = سلوک، مرعات = مراعات ۱۳۵، ترتب = مترتب ۱۳۸، میر پیش من بیاید = بیاید ؟ البلم = بلبلم ؟، خود از یں جا = ایں جا، از رئیس آنجا = از نہیں چاہیے، روزے = روز ۱۴۱، گنور نر = گورنر ۱۴۳، مدعو اں شاعران مربوط جانان مضبوط = جاناں سے قبل کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے ۱۴۴، منفرد = متفرق ۱۴۶، دور زیں غزل پسند افتادہ = دود ؟ ۱۴۸، مفید = مقید ۱۱۳، آمدن بسر حد خود من از واجبات است = مریجا زائد ہے ۱۱۵، مقید جنگ = مستعد ۱۵، نجف قلی جان = خاں ۱۴۹

(۷) متن کے اردو عنوانات گئے ذمہ دار جیسا کہ مقدمے میں ہے، مرتب ہیں، ان میں سے بہتیرے غلط یا ناکافی اس قسم کے بعض عنوانات کا ذکر آچکا ہے، باقی حسب ذیل ہیں :-

(۱) ص۳۳ "بزرگان میر کا .. قیام دکن .." اس عنوان کے تحت جو عبارات ہیں، ان میں قیام دکن کا ذکر نہیں، احمد آباد دکن میں شامل سمجھا جائے تو اور بات ہے۔

(۲) ص۱۴۱ "نوجوان کی .. بیوی (بیبی) سے بیزاری" اس عنوان کے تحت بیبی کا مطلقاً ذکر نہیں۔

(۳) ص۴۲ "نوجوان کامل کی نظر .. کا اثر .." "نوجوان پر لڑکے کو دیکھنے کا کیا اثر ہوا، یہ تو ہے، مگر اس عنوان کے تحت جو عبارات ہیں، ان میں نوجوان کی نظر کے اثر کا ذکر نہیں۔

(۴) ص۴۹ "حفظ قرآن عم بزرگوار" علی متقی نے بھی حفظ کیا، ذکر میں، "یاد گرفتند" ہے۔ میر امان اللہ کے لئے التزاماً فعل واحد استعمال کرتے ہیں۔

(۵) ص۵۷ "ریختے میں .. سعادت علی کی شاگردی" ترغیب دینا استادی نہیں، مرتب نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ میر کسی کے شاگرد نہ تھے۔

(۶) ص۶۹ "صفدر جنگ کی وزارت" "ذکر میر" میں مرکزی شخصیت میر کی ہے، اس لئے اس عنوان میں اس امر کا ذکر ضروری تھا کہ میر رعایت خاں کے ساتھ راجپوتانہ گئے۔

(۷) ص۸۲ .. "درانی کا دلی پر حملہ کرنا اور شکست کھانا" سرہند میں لڑائی ہوئی جو دہلی سے دور ہے۔ یہ بات لائق بیان تھی کہ میر فوج شاہی کے ساتھ گئے تھے۔

(۸) ص۸۶ "جنگ وزیر با افغاناں" مرتب نے یہ نہیں لکھا کہ میر بھی وزیر کی فوج کے ساتھ گئے تھے۔

(۹) ص۸۷ "ماموں کی ہمسائگی (ہمسائگی) چھوڑ کر امیر خاں کی حویلی میں سکونت اختیار کی" اس کے تحت وفات آرزو کا ذکر بھی ضروری تھا۔

(۱۰) ص۸۹ "راجہ ناگرمل کا .. فوج دکن کو شہر سے نکال دینا" "وزیر و اعزہ و دیگر .. فوج دکن را رخصت نمودند" عنوان ٹھیک نہیں۔

(۱۱) ص۸۹ .. "جگل کشور سے شکایت .. اور کچھ مدت کی پریشانی کے بعد قدر دانی" اس کے تحت ناگرمل کی ملازمت کا صراحتہً ذکر ہونا تھا۔

(۱۲) ص۹۱ "دھوکے سے .. انتظام الدولہ .. کا قتل" نہ میر نے دھوکے کا ذکر کیا ہے اور نہ یہ واقعہ ہے کہ دھوکا دیا گیا تھا

(۱۳) ص۹۱ "میر کا .. راجہ کے ساتھ کاماں جانا .." "کاماں گئے بھی ہوں تو راجہ کے ساتھ نہیں گئے۔ نہ راجہ جگل کشور کے ساتھ گئے۔

(۱۴) ص۹۸ "راجہ کی وساطت سے شجاع الدولہ کی صفائی وزیر .. سے" یہ بات قابل ذکر تھی کہ میر راجہ کے ساتھ گئے تھے۔

(۱۵) ص۱۰۶ " جواہر سنگھ کی دست درازی۔۔" اس عنوان کے تحت سب سے اہم بات لڑائی میں سورجمل کا مارا جانا ہے ۔ وہ عنوان سے خارج ہے۔

(۱۶) ص۱۲۲ " میر۔ کا۔۔ ہرسرکردے کے پاس جانا اور مایوس ہونا" مگر اس عنوان کے تحت یہ عبارت بھی ہے ۔ " مردماں رعایت گونہ بحال من مبذول داشتند "

(۱۷) ص۱۳۱ " حسب وعدہ نجف خاں بادشاہ ملک کا تیسرا حصہ دینے پر مجبور ہوا " اس عنوان میں " کو" بادشاہ کے بعد چھوٹ گیا ہے ۔ یہ چھاپے کی غلطی معلوم ہوتی ہے ۔

(۱۸) ص۱۳۵ " میر۔۔ کی خانہ نشینی " شاہ عالم اور ابوالقاسم خاں کی علمی قدرشناسی کا بھی ذکر چاہیئے تھا۔

(۱۹) ص۱۳۵ " وفات شجاع الدولہ " مسند نشینی آصف الدولہ بھی قابل ذکر تھی ۔

(۲۰) ص۱۴۰ عنوان میں وفات نجف خاں اور تقرر مرزا محمد شفیع کے ساتھ قتل موخرالذکر اور تقرر افراسیاب خاں کا بھی ذکر ہونا تھا۔ عبارات بآسانی دو حصوں میں منقسم بھی ہو سکتے تھے

(۲۱) ص۱۴۶ " گورنر کا واپس کلکتہ جانا اور شاہزادے کو واپس بھیج دینا " اس سے گمان ہوتا ہے کہ دہلی واپس آ[illegible] مگر میر نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ قتل افراسیاب خاں کا حال مرقوم ہے ، مگر یہ عنوان سے غیر حاضر ۔

(۲۲) ص۱۰۸ ایک عنوان میں وفات فیروز جنگ کا ذکر ، لیکن ، اس سے کہیں اہم بات عماد الملک کا میر بخشی ہونا ہے اور یہ عنوان میں نہیں ۔

(۲۳) ص۱۱۵ " دکنیوں اور جواہر سنگھ کی لشکر آرائی ۔ " میر کے آگرہ جانے کا ذکر نہیں ۔ حالانکہ میر نے یہ لکھا ہے

(۲۴) ص۷۲ " تماشائے ۔۔ کی ملازمت " مگر ملازمت کا ذکر میں ذکر نہیں ۔

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

نادانِ دل کو مرگ کا اب تک یقیں نہیں

۲۵ اپریل ۱۹۶۱ء کے ہفتہ وار چٹان میں یہ مضمون چھپ چکا ہے اور اب ہم اس کو مولانا کی نظرثانی و اضافہ کے بعد ہمہ روزہ میں درج کر رہے ہیں یہ مضمون اپنے واردات و تاثرات کے علاوہ اہم علمی و ادبی نکات کا حامل اور فکر انگیز ہے
(ادارہ)

جن حضرات نے تعزیت نامے بھیجے ہیں وہ اسے شکریہ نامہ سمجھیں اور جنھیں
اطلاع نہیں دے سکا وہ اسے اطلاع نامہ تصور فرمائیں ۔ (محمد جعفر)

عجیب توافق ۱۹۴۷ء میں جب قیام پاکستان کا اعلان ہوا تھا تو وہ جمعتہ الوداع کا دن تھا۔ اور ۲۶ رویں رمضان۔ ستائیسویں شب رمضان کو جسے عام طور پر شب قدر بھی کہا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کا اعلان ہوا۔ آج تیرہ سال بعد ۱۹۶۰ء میں اسی چھبیسویں رمضان کو جمعۃ الوداع تھا۔ دن اور رات کا اتصال عین افطار کے وقت ہوا اور ستائیسویں شب رمضان کا آغاز ہوا۔ عین افطار کے وقت ایک مریضہ نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ اور اپنے چھتیس سالہ رفیق زندگی شوہر کا رشتہ رفاقت ہمیشہ کے لئے منقطع کر لیا۔ شوہر کی زبان پر اس وقت بے ساختہ مولانا تمنا پھلواروی کا یہ شعر آگیا ؎

مانع ذوقِ فنا تھا صوم یک روزہ حیات　　　موت کیا آئی کہ ساعت آگئی افطار کی

اس مرنے والی کا ذکر اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ قدرت نے اس کے لئے بڑی قابل رشک ساعت کا انتخاب کیا۔ عین اسی وقت اور بھی ہزاروں موتیں دنیا میں ہوئی ہوں گی۔ ہمارا جو کچھ بھی مقصد ہے وہ بالکل الگ ہے۔

انسانی بے بسی مریضہ سات آٹھ ماہ تک بیمار رہی۔ اسے حلق کا کینسر ہو گیا تھا۔ یہ مرض اس کم از کم اس وقت تک میڈیکل سائنس کی بے بسی اور ناکامی کا سب سے واضح اعلان ہے۔ سائنس والے اپنے مصنوعی سیارے سورج کے مدار تک پہنچانے میں تو کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن زمین پر بسنے والوں کے ایک معمولی سے مرض زکام پر قابو نہ پا سکے۔ انسان کتنا بڑا قادر اور پھر کتنا بے بس ہے

غلط فہمی مرحومہ کو ہو تو گیا تھا کینسر، لیکن ہمیں برابر یہی غلط فہمی رہی کہ مریضہ بہرحال اچھی ہو جائے گی۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ مرحومہ کی وہ باتیں ہیں جو انھوں نے مجھ سے وقتاً فوقتاً بیان کیں۔

مرحومہ نے مجھ سے اپنا پہلا خواب یوں بیان کیا۔

پہلا خواب دیکھتی کیا ہوں کہ میری چارپائی کے پاس نیچے ایک بلی ہے جس کی طرف میں ہاتھ بڑھانا چاہتی ہوں تو جو لوگ وہاں موجود تھے انھوں نے کہا کہ اسے ہاتھ نہ لگانا، یہ تو بلا ہے۔ میں نے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بلا تو نہیں۔ ایرانی بلی معلوم

ہوتی ہے۔ دیکھو اس کے بال کتنے بڑے اور نرم ہیں پھر میں نے انسانی بچے کی طرح اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانا چاہا تو وہ قد و قامت میں بڑھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے شیر سے بھی کئی گنا بڑھ گئی۔ اس وقت خیال آیا کہ فی الواقع کوئی بلا ہے۔ پھر میں نے فوراً ہی اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنا شروع کیا۔ اس طرح کہ لا الٰہ الا اللہ کہہ کر اسے گویا اوپر سے نیچے اشارے سے کاٹتا اور محمد رسول اللہ کہہ کر دائیں سے بائیں اشارے سے کاٹتا۔ اسی وقت خواب ہی میں مجھے اپنی والدہ مرحومہ کا بھی یہ خواب یاد آیا کہ انھوں نے عرصہ ہوا خواب میں ایک بد ہیئت سیاہ فام مرد یا عورت کو دیکھا جس کے سر پر گھڑا رکھا تھا۔ اس گھڑے پر اور اس شخص کی پیشانی پر طاعون لکھا ہوا تھا۔ والدہ نے اسے اسی طرح لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر کاٹا۔ تو چیختا چلاتا بھاگا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں بڑے زوروں پر طاعون پھیلا مگر الحمد للہ والدہ کے گھرانے کے تمام لوگ محفوظ رہے۔ مجھے اپنی والدہ کا خواب اسی خواب میں یاد آیا اور میں بھی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ پڑھ کر اس عظیم الجثہ بلی کو اشارے سے کاٹتی رہی۔ ذرا دیر میں وہ طرا مسلا ہوا کاغذ سی بن گئی۔ پھر دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔

دوسرا خواب | پھر ایک دن مرحومہ نے دوسرا خواب بیان کیا کہ ایک عورت اندر آئی اور میری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا میں تمھاری صحت ہوں۔ بہت دنوں سے تمھیں ڈھونڈ رہی تھی۔ شکر ہے کہ آج تم مل گئیں

تیسرا خواب | پھر ایک دن تیسرا خواب بیان کیا کہ :۔
ایک جنازہ جا رہا ہے میں نے جنازہ لے جانے والوں سے دریافت کیا کہ یہ کس کا جنازہ ہے؟ اتنے میں کاندھا دینے والوں نے جنازے کو چھوڑ دیا اور وہ جنازہ معلق خود ہی چلا جا رہا تھا۔ ان میں سے دو آدمی خوش رو سفید پوش، سیاہ ریش میرے پاس آئے اور نظر نیچی کر کے کہنے لگے کہ یہ آپ کی بیماری کا جنازہ ہے جسے ہم لوگ لئے جا رہے ہیں اور ہم کو بہت افسوس اور شرمندگی ہے کہ آپ کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔

ان خوابوں کو سننے کے بعد مجھے تقریباً سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہ مریضہ ضرور اچھی ہو جائے گی کیونکہ بظاہر ان خوابوں سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔

ایک عامل | اس کے بعد میرے ایک عزیز کرم فرما — جو سائیکو پامسٹ، منجم، جفار اور بڑے "عامل" بھی ہیں — عیادت کے لئے آئے۔ انھوں نے پہلے شکایت کی کہ آپ نے اب تک مجھے بیماری کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ اور میں فلاں صاحب سے سن کر آیا ہوں۔ پھر کہا کہ رات میں نے چراغ کا ایک مخصوص عمل کیا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کی روشنی سیاہ نہ تھی جو سخت خطرناک ہوتا ہے۔ بلکہ گلابی تھی جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مریض قطعاً و یقیناً اچھا ہو جائے گا۔ ممدوح نے یہ بھی یقین دلایا کہ یہ باتیں محض تسکین کے لئے نہیں کہی جا رہی ہیں۔ ان کو مرحومہ سے اتنی زیادہ محبت تھی جتنی کسی سعادت مند فرزند کو اپنی لائق ماں سے ہوتی ہے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ تینوں خواب اور یہ یقین دہانی ایسی تھی، جس کے بعد مریضہ کی تندرستی میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہم آخر آخر وقت تک یہ یقین رہا کہ ہم اپنی استطاعت کے مطابق علاج معالجہ تو کر رہے ہیں جس سے اگرچہ حالت روز بروز خراب سے خراب ہوتی جا رہی ہے لیکن کوئی نہ کوئی سبب اللہ تعالیٰ ضرور پیدا فرما دے گا۔ جس سے مریضہ تندرست ہو جائے گی۔

ایک اور خواب | وفات سے کوئی ایک ہفتہ پہلے صوفی حاجی یار محمد خاں صاحب تاجر چرم جہلم کا ایک خط آیا جس میں ایک خواب یوں درج

میں صبح کی نماز کے بعد سو گیا تو اپنے پیر و مرشد (حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی) کو خواب میں دیکھا۔ حضرت موصوف کے ساتھ میں ایک جگہ گیا جہاں کچھ لوگ ہیں اور کچھ پرچیاں پڑی ہوئی ہیں۔ وہاں پرچیاں ڈالی جارہی ہیں اور دوسری جانب آپ (یعنی محمد جعفر) کے حق میں پرچیاں ڈالی جارہی ہیں۔ اور دوسری جانب آپ کے مخالف کے حق میں۔ آپ کی پرچیاں بہت زیادہ ہیں اور مخالف کی بہت کم۔ نتیجے کا انتظار کئے بغیر ہی حضرت ممدوح وہاں سے روانہ ہوگئے اور آپ (محمد جعفر) کے متعلق فرمایا کہ ان اللہ معنا (خدا اس کے ساتھ ہے) اس کے بعد صوفی صاحب موصوف نے اپنی سمجھی ہوئی تعبیر یہ دی کہ انشا اللہ آپ کی اہلیہ کے موذی مرض پر آپ کو فتح حاصل ہوگی۔

بظاہر یہ خواب بھی ایسا تھا جس نے میرے یقین میں اضافہ کر دیا، اور اب مجھے سو فیصد مریضہ کی تندرستی کا یقین ہوگیا۔ مگر ــــ آہ ــــ یہ سب کچھ روحانی جذبات کی کرشمہ سازیاں تھیں جو سراب ثابت ہوئیں۔ مرحومہ کے خواب کوئی اشارہ مستقبل نہ تھے بلکہ اندرونی خواہشیں تھیں، جو متشکل ہو کر نظر آگئیں اور صوفی صاحب کے خواب میں صرف نزولِ سکینہ کا اشارہ تھا کیونکہ سیدنا صدیق اکبر کے متعلق قرآن پاک میں جو کچھ ارشاد ہے وہ یوں ہے:

اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا فانزل اللہ سکینتہ علیہ وایدہ بجنود لم تروھا۔

وہ وقت یاد کرو جب رسول اللہ اپنے ساتھی (ابو بکر) سے (غار ثور میں) کہہ رہے تھے کہ حزن نہ کر۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اس (ابو بکر) پر اپنی سکینت نازل کی اور اس کی تائید ایسے لشکر سے کی جسے تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔

نزولِ سکینہ

اس میں شک نہیں کہ میں خود اپنے ذہن کو اور اپنی سب سے چھوٹی اولاد اکلوتے ہشت سالہ فرزند محمد موسیٰ کے ذہن کو کئی ماہ سے تیار کر رہا تھا۔ لیکن خواب و خیال کی دنیا میں بسے رہنے سے مجھے سو فیصد مرحومہ کی صحت کا یقین بھی تھا اس امید کے یکسر خلاف اچانک یہ حادثہ پیش آنے کے بعد میرے دماغ پر غیر معمولی اور مجنون بنا دینے والا اثر پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن مجھ پر اتنا بھرپور نزولِ سکینہ تھا کہ میں خود حیران ہوں اور اس سے زیادہ حیرت مجھے موسیٰ کے یتیم و لطیم کے اطمینان قلب پر ہے (جس نابالغ بچے کا باپ مر جائے وہ یتیم ہوتا ہے۔ جس کی ماں مر جائے اسے لطیم کہتے ہیں اور جس کے ماں باپ دونوں مر جائیں اسے قطیع کہتے ہیں) اس ہشت سالہ بچے سے میرا جو وقتاً فوقتاً مکالمہ ہوا ہے اس کا خلاصہ سنئے:

"کوئی مر جاتا ہے تو جنت میں چلا جاتا ہے؟"
"ہاں بیٹے! اگر اچھا آدمی مرے تو وہ جنت میں جاتا ہے۔"
"پھر تو مر جانا اچھی ہی بات ہے۔"
"اور کیا ــــ"
"قبر میں آدمی سڑ گل جاتا ہے نا؟"
"ہاں سڑ گل جاتا ہے ــ"
"تو پھر جنت میں کیا چیز جائے گی؟"
"یہ جسم تو فقط لباس ہے۔ آدمی کی روح یہ لباس چھوڑ کر دوسرا لباس پہن لیتی ہے اور جنت میں چلی جاتی ہے۔"

میری یہ بات شاید پوری طرح اس کی سمجھ میں نہ آسکی مگر وہ خاموش ہوگیا اور سوچنے لگا۔ یہ گفتگو اس وقت ہوئی جب مرحومہ ابھی

میں ہسپتال میں تھیں۔

ماں کے انتقال کے بعد لوگوں کو روتا ہوا دیکھ کر مجھ سے پوچھا کہ یہ لوگ روکیوں رہے ہیں ؟ میں نے متوازن لہجے میں الگ لے جاکر بتایا کہ تمھاری باجی (مرحومہ کو ان کی ساری اولاد اور ان کے سب ملنے والے باجی کہا کرتے تھے) کا انتقال ہوگیا ہے نا۔ لوگ خواہ مخواہ رو رہے ہیں ـــــ یہ سن کر وہ ذرا رودیا۔ میں نے اسے سمجھایا تو وہ ایک منٹ میں خاموش ہوگیا اور مجھ سے ایک دلخراش سوال کیا کہ۔ پھر اب میری ماں کون بنے گا ؟ میں نے کہا۔ میں تمھارا باپ بھی ہوں اور ماں بھی۔ اس کے علاوہ تمھاری تو بہت سی مائیں ہیں۔ تمھاری سب بہنیں بھی تمھاری مائیں ہی ہیں ـــــ اس کے بعد وہ مطمئن ہوگیا اور اپنے عام مشاغل میں لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بہت سی عورتیں اور مرد جمع ہوگئے تو اس نے کہا۔

"یہ لوگ روکیوں رہے ہیں ؟ باجی کو کتنی تکلیف تھی۔ اس سے نجات مل گئی اس سڑی بسی دنیا سے وہ چلی گئیں۔ اب وہ بہت اچھی دنیا میں جاکر رہیں گی۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ ؟"

اس کے بالکل یہی الفاظ تھے جو میں نے نقل کئے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ اس بچے کے اندر کسی اچھے مومن فلسفی کی روح بول رہی ہے۔ وہ کھانا کھاکر سوگیا۔ صبح وہ خوش و خرم دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ دن کے سوا بارہ بجے جنازہ اٹھنے لگا تو اس نے کہا میں بھی ساتھ چلوں گا کیوں کہ میں نے آج تک کوئی قبر نہیں دیکھی ہے۔ وہ جنازے کے ساتھ ساتھ قبرستان تک گیا۔ سب کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی۔ دفن تک وہ ادھر ادھر مختلف قبروں کو دیکھتا رہا سب مٹی ڈال چکے تو وہ بھی آیا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مٹی ڈالی۔ پھر اپنے نازک ہاتھوں سے پھولوں کی چادر کا ایک کونہ پکڑ کر چادر رکھی اور ہم سب کے ساتھ ہنستا کھیلتا گھر واپس آگیا۔

عید کے دوسرے یا تیسرے دن وہ باصرار میرے ساتھ اپنی باجی کی قبر پر پھول چڑھانے گیا کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اس وقت اس معصوم بچے نے مجھ سے پوچھا۔

"اب اس قبر میں باجی پڑی ہوں گی ؟"

"وہ یہاں کہاں ؟ وہ تو جنت میں چلی گئیں۔"

"تو پھر اس میں کوئی چیز نہیں ؟"

"قبر میں اب کیا رکھا ہے ؟" ـــ اس کے بعد اس نے ایک عجیب سوال کیا۔

"جب آدمی کو مرنا ہی ہے تو وہ پیدا کیوں ہوتا ہے ؟"

"اللہ میاں اس لئے پیدا کرتے ہیں کہ دیکھیں آدمی اچھے کام کرتا ہے یا برے۔ اگر اچھے کام کرے تو مرنے کے بعد جنت میں جاتا ہے اور برے کام کرے تو جہنم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ قبر تو صرف ایک دروازہ ہے۔ اس دروازے سے اچھے لوگ جنت میں جاتے اور برے جہنم میں پہنچ جاتے ہیں۔" غرض مجھ پر بھی عجیب نزول سکینہ تھا اور میرے فرزند پر تو اس سے بھی زیادہ نزول سکینہ آج تک ہے۔ اور میرے خیال میں صدیقی صاحب کے خواب کی یہی تعبیر ہے۔

نتیجہ اس داستان خواب کو بیان کرنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ نہ خوابوں پر زیادہ اعتماد کرنا چاہئے اور خوابوں کی تعبیر پر۔ نہ ہر خواب کی تعبیر ضروری ہے اور نہ ہر تعبیر کا درست ہونا لازمی ہے۔ خواب اور اس کی تعبیر بالکل بے حقیقت چیز بھی

یں لیکن اس پر زیادہ اعتماد کرنے سے بہت سی ذہنی اور عملی کمزوریاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ خواب و خیال کی دنیا میں جتنا زیادہ
ماک ہوگا۔ اتنا دنیائے بیداری کے کارخانے میں خلا پیدا ہو جائے گا۔ بلاشبہ دنیا امیدوں پر قائم ہے لیکن موہوم توقعات میں کھو جانا بھی
صحیح نہیں۔

تقریباً یہی حال کشوف کا بھی ہے۔ کشف وغیرہ پر بھی زیادہ اعتماد درست نہیں۔ بعض اوقات تو خود صاحب کشف کشف کا مطلب
یں سمجھتا اور بعض اوقات اس میں ایسا ابہام سا ہوتا ہے کہ اس میں کئی پہلو نکلتے ہیں اور سننے والا اس سے جو مطلب اخذ کرتا ہے وہ غلط
بت ہوتا ہے۔

یہ ہے وہ سبق جو مرحومہ کی موت مجھے دے گئی ہے۔ میں اپنے اس تصور کو عام کرنے کی غرض سے شائع کر رہا ہوں۔ کوئی یوسف وقت
و یا ابن سیرین جیسی تعبیر خواب کا ملکہ رکھتا ہو تو بے شک ایسی تعبیروں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ خوابوں یا اس کی سرسری تعبیروں پر بیداری
ی زندگی کا دار و مدار نہیں رکھنا چاہیے۔

ناقابل تلافی نقصان

مرحومہ کی وفات سے میرا جو ایک ناقابل تلافی نقصان ہوا وہ علمی و ادبی نقصان ہے۔ اس سلسلے میں ایک
ایک لطیفہ سن لیجیے۔ ایک بار مرحوم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے مجھ سے کہا: بعض الفاظ ہم لوگوں کی زبان پر
یسے بھی جاری ہیں جن کے صحیح مفہوم سے ہم لوگ آشنا نہیں۔ بتائیے ہم لوگ "حلوہ مانڈہ" بولا کرتے ہیں۔ مانڈے کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا
کل بتاؤں گا: دوسرے دن انھیں بتایا کہ حلوے کے ساتھ جو بڑے بڑے پراٹھے ہوتے ہیں۔ انھیں "مانڈا" کہتے ہیں۔ پوچھا۔ یہ کس لغت میں
دیکھا ہے؟ میں نے کہا: "زدج اللغات" میں۔ پوچھا۔ یہ کونسا لغت ہے؟ میں نے کہا۔ یہ صرف میرے پاس ہے یہ کوئی کتاب نہیں بلکہ میری اہلیہ
محترمہ ہے۔ جس محاورے۔ روزمرے۔ ضرب الامثال۔ کہاوت۔ الفاظ۔ تذکیر و تانیث وغیرہ کا مجھے علم نہیں ہوتا یا مجھے شک رہتا ہے۔ میں
اسی زدج اللغات سے دریافت کر لیتا ہوں۔ اردو زبان میں میری استانی وہی ہیں ـــ مرحوم خلیفہ صاحب نے اس پر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا
اس کے بعد بھی انھوں نے کئی موقعوں پر مجھ سے بعض باتیں دریافت کیں۔ مرحوم کی کتاب: "فکر اقبال" پر ایک اخبار (ہماری زبان کراچی) نے
تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس میں خلیفہ صاحب نے "عار" کو مذکر لکھا حالانکہ یہ مونث ہے۔ خلیفہ صاحب نے ہم لوگوں سے دریافت کیا۔ مولانا رئیس احمد
جعفری نے کہا کہ عار مذکر ہے۔ میں نے کہا۔ میرے کان اس کی تانیث سے آشنا ہیں۔ مزید تصدیق زدج اللغات سے کی جائے گی۔ دوسرے دن
"زدج اللغات" نے میری رائے کی تائید کی۔ اور اتفاق سے اسی دن "جامع اللغات" سے بھی اس کی تصدیق ہو گئی۔

میں جب کپور تھلہ (مشرقی پنجاب) میں تھا تو جناب خواجہ حسن نظامی نے میرے پاس ایک کتاب بھیجی کہ اس کتاب کی تصحیح کر کے اس کی زبان
کو سہل بنا دیا جائے۔ اس میں بلا مبالغہ پچاسوں محاورات، ضرب الامثال اور کہاوتیں ایسی تھیں۔ جن سے میں بالکل ناواقف تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد
ہے کہ دو چار مقامات کے سوا سارے مقامات مرحومہ ہی نے حل کیے تھے۔ ایک بار مولانا تمنا عمادی نے مجھے اپنی ایک غزل سنائی جس میں ایک مصرعہ
یوں تھا ـــ

شاید ہجر ایڑا لب جو تصرہ سہو گیا

میں نے عرض کیا کہ مضمون کے متعلق تو کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک لفظ کھٹکتا ہے۔ "بڑا بڑا" صحیح نہیں۔ کہنے لگے تم کوئی سند
نہیں ہو۔ اندر جا کر دریافت کرو۔ میں نے جا کر اپنی زدج اللغات سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ "بڑ بڑے بڑے" ہونا چاہیے۔ اس کے
بعد علامہ مدوح نے بھی تصحیح فرمالی۔

مجھے یاد ہے کہ کئی موقعوں پر میں نے مرحومہ سے کہا کہ " فلاں لفظ جو تم بولتی ہو صحیح نہیں کیونکہ یہ فلاں قاعدے کے خلاف ہے " اس کا جواب انھوں نے ہمیشہ یہی دیا کہ " قاعدہ قانون آپ اپنے پاس رکھئے ۔ یہ لفظ اس لئے صحیح ہے کہ میں یوں ہی بولتی ہوں ۔ میری زبان قاعدہ قانون سے نہیں بنی ہے بلکہ قاعدے قانون میری زبان سے بنے ہیں ۔" یہاں آکر میرے پاس لاجوابی کے سوا اور کوئی جواب نہ ہوتا تھا ۔ میں ان کی کئی باتوں کو تسلیم نہیں کیا ۔ اس کے باوجود ماہنامہ مہر نیمروز (کراچی) کی اس بات سے اتفاق ہے کہ مرحومہ کو اردو زبان میں درجۂ استناد حاصل تھا ۔

ادبی لطیفے

مرحومہ کے بعض ادبی لطیفے بھی خوب ہوتے تھے ۔ ایک بار وہ کوئی مصفّی دوا بنا رہی تھیں میں نے کہا اس میں نیم کی پتیاں بھی شامل کر لو کہنے لگیں : " یہ آپ کہاں سے " نیم حکیم " بن کر ٹپک پڑے ؟ "

ایک بار لکھنؤ میں ڈاکٹر عبدالعلی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) نے انھیں بتایا کہ ۔ بکری کا کچا دل پیس کر پی لیا کرو ۔ مرحومہ نے برجستہ کہا اس سے تو " بزدل " بن جانے کا بھی خطرہ ہے ۔

لائل پور کے ہفت روزہ المنبر نے مرحومہ کی تعزیت کرتے ہوئے صحیح لکھا تھا کہ .... محمد جعفر کی ساری زندہ دلی اور شگفتگی مرحومہ ہی کے دم سے قائم تھی ۔

فتوے کی اصلاح

سب سے زیادہ تعجب مجھے اس وقت ہوا جب مرحومہ نے میرے ایک فتوے کی اصلاح کی ۔ وہیں کپور تھلے میں ایک بیوہ عورت کے (شوہر کے مرنے کے ڈیڑھ سال بعد) بچہ پیدا ہوا ۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ حلالی ہے یا حرامی ؟ میں نے استفتا پر لکھ دیا کہ حرامی ہے ۔ لیکن پھر خیال آیا کہ عورتوں کا معاملہ ہے ۔ ذرا اپنی بیوی سے بھی پوچھ لوں ۔ مرحومہ نے کہا ۔ آپ کا فتویٰ بالکل غلط ہے ۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ شوہر کے مرنے کے ڈیڑھ سال بعد جو بچہ پیدا ہو وہ لازماً حرامی ہو ۔ ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات رونے دھونے یا ہاتھ پاؤں پٹخنے سے خون جاری ہو جاتا ہے اور بچے کی پرورش نہیں ہو پاتی ۔ لیکن وہ تخم محفوظ رہتا ہے اور جب خون بند ہو کر اسے غذا ملنے لگتی ہے تو اس کی پرورش شروع ہو جاتی ہے اور وہ بالکل حلالی بچہ ہوتا ہے ۔ جو بہت دنوں کے بعد وجود میں آجاتا ہے —— پھر کہا ۔ یوں حرامی ہونے کا امکان تو اس وقت بھی ہے جبکہ شوہر زندہ ہو ۔ لیکن شوہر کی وفات کے بہت دنوں کے بعد پیدا ہونا حرامی ہونے کی دلیل بالکل نہیں " —— اس کے بعد مرحومہ نے کئی مثالیں دیں ایک مثال خود اپنے گھر کی ایک خادمہ (امینہ) کی دی اور کہا کہ ۔ اس کی پاک دامنی پر ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس کے شوہر کے مرنے کے کوئی دو یا ڈھائی سال بعد بچہ ہوا ۔

میرے لئے مرحومہ کی یہ تقریر بالکل نئی اور انوکھی تھی اس لئے کہ یہ مسئلہ میرے حافظے سے بالکل غائب ہو چکا تھا ۔ میں نے شرح وقایہ نکال کر دیکھنا شروع کیا ۔ اس کے حاشیے پر یہ مسئلہ موجود ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ضحاک اور عبدالعزیز ماجشونی چار سال بعد پیدا ہوئے تھے ۔ اقلِ مدتِ حمل چھ ماہ ہے اور اکثر مدت امام ابو حنیفہ کے نزدیک دو سال تک ہے ۔ لیث بن سعد کے نزدیک تین سال ، امام شافعی کے نزدیک چار سال اور امام زہری کے نزدیک سات سال ہے ۔ اس کے بعد میں نے مزید تحقیق شروع کی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ فقہا کو زیادہ سے زیادہ مدت کی مثال سات سال کی مل سکی ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ مدت بھی ہو سکتی ہے ۔ وہاں کی ایک ہوشیار ۔ لیڈی ڈاکٹر ۔ ہیرا دیئی ۔ نے بتایا کہ " بارہ سال تک کا سارٹیفیکیٹ تو میں دے سکتی ہوں " ایک اور صاحب نے بتایا کہ کلکتہ ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ بھی بارہ سال کی تائید کرتا ہے ۔ واللہ اعلم ۔

غرض میں نے اپنا فتوے فوراً بدل دیا اور لکھ دیا کہ جب تک کوئی قوی ترین شہادت اس کے خلاف موجود نہ ہو یہ بچہ حلالی ہی ہوگا۔ اور محض اتنی بات کہ شوہر کی وفات کے ڈیڑھ سال یا اس سے زیادہ مدت کے بعد بچہ پیدا ہوا ہرگز اس کے حرامی ہونے کی دلیل نہیں" مجھے اس ٹھوکر سے بچانے والی وہی مرحومہ تھی جو محض اردو زبان ہی کی نہیں بلکہ فقہ کی بھی استانی ثابت ہوئی۔

علمی ماحول

مرحومہ کو اشعار اس قدر یاد تھے کہ بیسیوں موقعوں پر جب کوئی مصرعہ یا پورا شعر یا کوئی لفظ میں بھول گیا تو میں نے انھیں سے دریافت کرلیا۔ مرحومہ ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں یعنی ان کی والدہ مرحومہ نواب سید صدیق حسن خاں بھوپال کی نواسی تھیں اور ان کی گودوں میں کھیلی تھیں اور ان کے والد (جو ابھی کراچی میں موجود ہیں) سید احمد شہید کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مرحومہ کی بڑی بہن خود شاعرہ تھیں۔ انورؔ تخلص کرتی تھیں۔ ان کا ایک شعر سن لیجئے ؎

آتشِ عشق ہے کہ دوزخ ہے فقنا ربنا عذاب النار

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کئی بار اس شاعرہ مرحومہ کو پیامِ نکاح بھیجا تھا۔ مگر انھوں نے تجرد کی زندگی ہی میں عمر ختم کردی۔ اس علمی ماحول میں میری رفیقۂ زندگی نے پرورش پائی تھی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تو ان کو ورثے میں ملی تھی۔ وہ میرے اندازے کے مطابق کم از کم بیس ہزار کتابیں ختم کرچکی تھیں۔ لیکن وہ اکثر و بیشتر یا تو قرآن اور کچھ وظائف کی کتاب پڑھتی تھیں یا پھر ادبی کتابیں، جاسوسی ناولوں سے انھیں بغایت دلچسپی تھی، ہندو مسلمانوں میں کوئی لکھنے والا ایسا نہ تھا جس کے ادبی مضامین اور تصانیف ان کی نظروں سے نہ گذرے ہوں خواہ نظم ہو یا نثر۔ پھر ہر ایک کی نگارش پر آزادانہ تنقید بھی کرتی تھیں۔ وہ بے تکلف یہ بھی بتادیتی تھیں کہ یہ فلاں کی چوری ہے اور یہ فلاں کی نقالی ہے۔

محبوبیت

مرحومہ کی محبوبیت کا اندازہ مجھے ان کی وفات کے بعد ہوا، بے شمار ایسی عورتوں سے گھر بھر گیا تھا۔ جن کو میں جانتا تک نہ تھا، ان کی علالت کے دوران بھی بہت سی عورتیں پابندی سے ان کے پاس آکر گھنٹوں بیٹھتی تھیں۔ سب سے زیادہ تعجب مجھے اس وقت ہوا جب پروفیسر سید قار عظیم کی بیگم نے ایک عجیب بات بیان کی۔ یہ دل کی مریضہ ہیں اور مرگ وغیرہ کا تصور بھی ان کو اختلاج میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ انھوں نے اپنے شوہر سے بیان کیا کہ "مجھے یہ زندگی میں پہلا گھر ملا ہے جہاں مرگ ہوئی اور مجھے کسی قسم کی دحشت نہ ہوئی۔ لاش کے پاس بہت سی عورتیں دیر شب تک بیٹھی رہیں اور میں بھی بیٹھی رہی۔ وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی مرگ نہیں بلکہ کوئی شادی وغیرہ کی تقریب ہے۔

ریٹائرڈ تحصیل دار جناب محمود صاحب کی بیگم صاحبہ اور بہت سے لوگ میرے ساتھ نماز عید کے بعد مرحومہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے اس وقت میں نے دعائے مغفرت کے بعد بآواز بلند یہ دعا کی۔

"خداوندا! میں ان سب لوگوں کو گواہ بنا کر اقرار کرتا ہوں کہ مرحومہ نے میرے ساتھ ساری عمر وفا کی ہے اور میں اس کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے مرحومہ کے حقوق ادا کرنے میں بڑی بڑی کوتاہیاں اور زیادتیاں کی ہیں اگر مجھے دس منٹ پہلے بھی یہ خطرہ ہوتا کہ یہ رخصت ہونے والی ہیں تو میں ان کے قدموں سے اپنی آنکھیں مل مل کر اپنی کوتاہیوں اور زیادتیوں کی معافی مانگتا۔ بارالہا! تو میری مرحومہ کی روح کو یہ توفیق دے کہ وہ مجھے معاف کردے ـــــ"

اس کے بعد مجھ سے کچھ بولا نہ جاسکا۔ بیگم محمود میرے پاس روتی ہوئی آئیں اور کہا کہ "میری ایک وصیت کا پورا کرنا تمھارے ذمے ہے۔ اگر میں یہاں تمھاری موجودگی میں مرجاؤں تو میری قبر مرحومہ باجی کے پہلو میں بنوا دینا ـــــ" آپ اس سے اس محبت و عقیدت کا

اندازہ کر سکتے ہیں جو بیگم صاحبہ کو مرحومہ کی ذات سے تھی۔

عجیب اجتماع

مرحومہ کے جنازے پر میرے مخلص دوست مولانا وقار کاظمی بی۔ اے مدیر چٹان موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے لاہور کے کسی جنازے پر اتنے مختلف مکاتیب خیال کے پڑھے لکھے لوگوں کا اجتماع نہیں دیکھا ہے۔ محترم غلام احمد پرویز، ملک نصر اللہ خاں عزیز، جناب کوثر نیازی، جناب محمد طفیل، مولانا امام خاں، جناب عبادت بریلوی، جناب اثر صہبائی، جناب سید وقار عظیم، جناب پروفیسر ایم ایم شریف (ڈائرکٹر ادارۂ ثقافت اسلامیہ) جناب بشیر احمد ڈار (رفیق ادارہ) مولانا حمید الرحمان طاہر سورتی، جناب عبدالصمد خاں مدیر استقلال وغیرہ جیسے مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات کہاں یکجا ہوتے ہیں۔ وشب کو ٹرنک کال ملتے ہی کراچی سے سید علی اکبر قاصد، سید عماد الدین رفاعی اور میری بڑی لڑکی تینوں بذریعہ طیارہ صبح پہنچ کر شریک جنازہ ہوئے۔ میں اپنے بے شمار کرم فرماؤں کو بروقت اطلاع نہیں دے سکا۔ اہل تعزیت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان میں قابل ذکر بیگم صادق (جو بیدہ کپٹن صادق تھے) بیگم خلیفہ عبدالحکیم، سابق میئر لاہور میاں امیر الدین۔ سید نذیر نیازی اور ان کی والدہ وغیرہ ہیں۔

تعزیتی خطوط اور تار کا سلسلہ ابھی تک منقطع نہیں ہوا ہے۔ کلکتہ، پھلواری شریف، لکھنؤ، کانپور، بمبئی، جویلی، کراچی، لائلپور، بہاولپور، سکھر، لاڑکانہ، حیدرآباد، گوجرانوالہ، وزیرآباد، گورکھپور، جہلم، گوجرہ، ڈھاکہ، میکسکو، لندن، جدہ اور خدا جانے کہاں کہاں سے بے شمار تعزیت نامے آئے ہیں۔ ان سب کی شکر گذاری کے بعد یہ تاثرات ارسال کر رہا ہوں۔ ان میں تین تاروں کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا، نواب سید شمس الحسن (نواب سید صدیق حسن خاںؒ کے پوتے) نے اردو میں تار دیا تھا۔

"دلی صدمہ ہوا۔ سب کو تلقین صبر"

عزیزم حسین عرب نے کراچی سے عربی زبان (مگر انگریزی حروف) میں یہ تار دیا۔

"نکبتکم نکبتی۔ الہمکم اللہ الصبر والسلوی" (تمہاری مصیبت میں ہماری مصیبت ہے۔ خدا تم سب کو صبر اور تسکین بخشے)

مولانا شاہ غلام حسنین سلیمانی نے پھلواری شریف سے یہ تار دیا جو انگریزی ادب کا شاہکار ہے۔

"INNA LILLAH WORDS FAIL TO CONDOLE"

(انا للہ الخ - تعزیت کے لئے الفاظ ناکام ہیں)

ہم دونوں عمر کی ایسی منزل سے گذر رہے تھے کہ ایک میں دوسرے کے لئے کوئی صنفی کشش نہ تھی۔ میری عمر ۵۸ سال کی ہے اور مرحومہ مجھ سے تقریباً چار سال چھوٹی تھیں۔ مگر یہ نکتہ اسی عمر میں آکر سمجھا جا سکتا ہے کہ جنسی کشش محض نقطۂ آغاز ہے اور زوجی رابطہ دراصل وہ ہے جسے قرآن نے لتسکنوا الیہا اور جعل بینکم مودۃ ورحمۃ فرمایا ہے۔ اصل رشتہ وہ ہے جس میں سکون، مودت اور رحمت ہو۔ یہ نہ ہو تو زندگی جہنم ہے اور یہ ہو تو جنتی زندگی کا آغاز اسی دنیا سے ہو جاتا ہے۔

موت کی مصلحت

میں نے اور سارے صدمے سہے ہیں، والدین، اولاد، بھائی بہن، دوست احباب وغیرہ کے صدمے دیکھے ہیں، لیکن رفیقہ حیات کے صدمے سے ناواقف تھا۔ اب اس صدمہ کی نوعیت بھی حیطۂ علم و ادراک میں آگئی۔ سوچتا ہوں کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو تو پہلے مرنا ہی تھا۔ تو کیا مرحومہ کا پہلے مرنا ہی رحمت و خیر نہیں؟ دل کہتا ہے کہ یہی ٹھیک ہوا۔ خدا نے رحیم اپنے بندوں پر ماں سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنی مہربان خود مرحومہ اپنی اولاد پر تھیں۔ والدین محض بہانہ ہوتے ہیں ورنہ پرورش تو خدا ہی کرتا ہے۔ سوچتا ہوں

کہ اگر میں پہلے مرتا تو مرحومہ کا کیا حال ہوتا۔ اچھا ہوا جو انھوں نے وہ وقت نہ دیکھا۔ ورنہ وہ پاگل ہو جاتیں یا معلوم نہیں اور کیا ہوتا۔ یہ میں یوں ہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ مجھے اس محبت کا اندازہ ہے جو مرحومہ کو اپنے بدقسمت شوہر سے تھی۔ انھوں نے میری خاطر بڑے سے بڑے پیغام نکاح کو صاف رد کر دیا حتیٰ کہ مالدیپ کے مرحوم شہزادے نے پیغام دیا جس کے مقابلے میں میری حیثیت ایک گدا سے زیادہ نہ تھی مگر مرحومہ نے اسے بھی صاف جواب دے دیا۔ میں نے مرحومہ کو کبھی نہ دیکھا تھا نہ ان کو جانتا تھا۔ پھر انھوں نے میرے ساتھ فقر و مسکنت کی زندگی گذارنے کو شاہانہ زندگی پر کیوں ترجیح دی؟ یہ ایک دلچسپ داستان ہے جو مرحومہ نے ازدواج کے بہت دنوں بعد مجھے خود سنائی۔ ہم اس کا ذکر آگے کریں گے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ مرحومہ کے محض مودت و رحمت کے تقاضوں سے مجھے ہر ایک پر ترجیح دی اور یہ رشتۂ رحمت و مودت برابر اضافہ پذیر رہا۔ اس لحاظ سے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میری موت ان کے لئے زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتی۔ اور ان کا پہلے رخصت ہونا خود ان کے لئے بھی رحمت ہی ہوا۔

میرے احساسات

اس وقت مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرحومہ کہیں ملنے ملانے یا خرید و فروخت کرنے باہر گئی ہوئی ہیں۔ اور بس اب واپس آیا ہی چاہتی ہیں۔ معلوم نہیں کیوں یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مر چکی ہیں اس کے باوجود اندر سے ایک خلا بھی یقینی طور پر محسوس کرتا رہتا ہوں۔ میری ساتوں لڑکیاں مجھ پر جان چھڑکتی ہیں۔ میرے پانچوں داماد مجھے اپنا باپ سمجھتے ہیں اور میری کسی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے۔ دس نواسے نواسیاں میری زندگی کی رونق ہیں۔ بظاہر کسی چیز کی کمی نہیں مگر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ وہ کیسے؟ کسی لمبی تمہید کے بغیر اسے سن لیجئے!

۔ اب ایسا کوئی نہیں جس سے دل کی بات کہہ سکوں۔

وہ مجھے یاد آتی ہیں اور یاد آتی رہیں گی۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کب کب یاد آتی ہیں۔ آپ صرف یہ پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کون کون ساعت ہوتی ہے جب وہ یاد نہیں آتیں۔ لیکن میرے لئے تو وہ ساعتیں بھی تلاش کرنا دشوار تر ہے۔ کبھی کبھی تنہائی میں اپنی پوری پینتیس سالہ ازدواجی زندگی ایک فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گردش کرتی ہوئی آتی ہے اور میں کسی ایک سین میں کھو کر رہ جاتا ہوں۔

ایک خاص بات اور بھی سن لیجئے۔ بے عیب ذات صرف خدا کی ہے۔ مرحومہ میں ہماری طرح بہت سی کمزوریاں بھی تھیں جن پر میں انھیں ٹوکا اور جھڑکا بھی کرتا تھا لیکن آج قسم لے لیجئے۔ مجھے جب بھی وہ یاد آتی ہیں تو اپنی بے شمار خوبیوں کے ساتھ یاد آتی ہیں۔ ان کا کوئی نقص ذہن میں نہیں آتا۔ اب وہ ہر آن ایک معصوم مجسم کی شکل میں میرے سامنے آتی ہیں۔ جس سے میں ایک ہی نتیجہ نکالتا ہوں کہ مرحومہ میں خوبیاں بہت زیادہ غالب تھیں اور میں زندگی میں جس قسم کی خردہ گیریاں کیا کرتا تھا ان کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی۔

ایک اور خلا

عام باپوں کی طرح میں بھی اپنی اولاد کو ڈانٹ پھٹکار کیا کرتا ہوں لیکن جب اولاد کی شادی ہو جائے میں اسے کچھ نہیں کہتا۔ محض احتراماً ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ اب میرا اس پر زیادہ حق اختیار نہیں اور ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اس نے برابر سے جواب دیا تو میں شاید آپے سے باہر ہو کر اس سے قطع تعلق کر لوں گا۔ لیکن بیوی میری خفگی کو برداشت بھی کرتی تھی اور بعض اوقات میری اینٹ کا جواب پتھر سے بھی دیتی تھی۔ اس کے باوجود جس طرح وہ میری اینٹ کو برداشت کر لیتی تھی اسی طرح میں اس کے پتھر کو پی جاتا تھا۔ آج میں اپنے اندر یہ عجیب سا خلا پا رہا ہوں کہ اب دنیا میں ایسا کوئی موجود نہیں جو میری خفگی کو برداشت کرے اور اسی طرح میں اس کی خفگی کو پی جاؤں۔

رومان نہیں رحمت

اچھا آیئے ذرا وہ داستان بھی سنئے کہ مرحومہ نے مجھ جیسے گدائے بے نوا کو شاہزادوں پر کیوں ترجیح دی تھی؟ غالباً ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء کا ذکر ہے کہ میں اپنے والد ماجد (حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمانؒ پھلواروی) کے ساتھ لکھنؤ گیا۔ نواب سید نور الحسن خاں (نواب سید صدیق حسنؒ خاں کے بڑے صاحبزادے) کے ہاں قیام ہوا کیونکہ دونوں ہم مرشد یعنی حضرت مولانا فضل الرحمان گنج مراد آبادی کے مسترشد تھے اور دونوں میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ میری عمر اس وقت نو دس سال کی تھی۔ میں "لطیم" تھا۔ یعنی میں ابھی شیر خوار ہی تھا کہ میری ماں دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ نواب صاحب مرحوم میری بڑی ناز برداری کرتے تھے۔ میری فرمائش پر گراموفون ریکارڈ نکال نکال کر سنایا کرتے تھے اور خود مجھ سے گانے سنا کرتے تھے۔ میں بے تکلف زنانے مکانوں میں دوسرے بچوں کی طرح آتا جاتا تھا۔ پاس ہی نواب صاحب کی بھانجی (نواب اشرف جہاں بیگم) کی کوٹھی تھی ایک دن میں اپنا کوئی پھٹا کپڑا اسے کرو ہاں سلوانے کی غرض سے اندر گیا۔ اسی گھر میں پانچ سال کی ایک بچی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ یہ لڑکا جو اپنا پھٹا کپڑا سلوانے آیا ہے بے ماں کا بچہ ہے۔ اس وقت اس نے مجھے بڑی رحمت کی نظروں سے دیکھا اور دل میں یوں ہی ایک آرزو پیدا ہوئی کہ اس بے ماں کے بچے سے میری شادی ہو جائے تو میں اس کے کپڑے سی دیا کروں۔ بات آئی گئی ہوگئی، میں اپنے وطن پھلواری شریف چلا آیا۔ اس کے بعد نواب سید نور الحسن خاں صاحب کا انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے ہمارے گھر سے اور بھوپال ہاؤس سے ایک بے تعلقی سی ہوگئی ۱۹۱۹ء میں ترک موالات کی تحریک اپنے شباب پر آئی۔ انگریزی تعلیم چھوڑنے کی تحریک نے زور پکڑا۔ میں نے دسویں سے اور میرے بھائی مولانا شاہ غلام حسنین مدظلہ نے بی۔ اے سے اسٹرائک کی۔ اور چند دنوں کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی تعلیم کے لئے آگئے، اس دوران میں حضرت قبلۂ والد ماجد بھی چند بار لکھنؤ تشریف لائے اور بھوپال ہاؤس ہی میں قیام فرما ہوئے اور برسوں کے ٹوٹے ہوئے تعلقات پھر سے جڑ گئے۔ ہم دونوں بھائی بھی عموماً یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ یہاں مجھ سے اکثر مثنوی اور ایسی چیزیں ترنم کے ساتھ پڑھنے کی فرمائش ہوتی۔ کسی دن میرے گانے کی آواز وہاں بھی گئی جہاں میں کبھی اپنی طفلی میں اپنا پھٹا ہوا کپڑا سلوانے گیا تھا۔ جس معصوم بچی نے مجد لطیم کو رحم کی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ جوان ہو چکی تھی۔ بھولی ہوئی یاد نے چٹکی لی اور اسی نے میری آواز سن کر اپنی ذہانت اور حافظے سے بھانپ لیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی لطیمی پر مجھے کبھی ترس آیا تھا اور اس کے پھٹے کپڑے سینے کی معصوم تمنا دل میں پیدا ہوئی تھی ـــــــ اللہ اللہ کتنی پاکیزہ اور معصوم آرزو سے آغاز ہوا تھا۔ اور آغاز کس انجام کی طرف لئے جا رہا تھا یہ کوئی رومان نہ تھا صرف رحمت کے تقاضے سے تھے، جو اپنی تکمیل چاہتے تھے۔ اسی آرزو نے استقامت اختیار کرلی۔ پانچ سال کے بعد میں ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا۔ اس درمیان میں اچھے سے اچھے پیغام آئے، لیکن وہ خدا کی بندی اپنی معصوم و پاکیزہ آرزو پر چٹان کی طرح جمی رہی ـــ

یہ ہے وہ مختصر سی داستان جو مرحومہ نے مجھ سے خود بیان کی۔ یہی تھی وہ بات جس کی وجہ سے مرحومہ نے ایک گدائے بے نوا کے ساتھ فقیرانہ زندگی گذارنے کو شاہانہ زندگی پر ترجیح دی۔ انقلاب زمانہ دیکھئے وہ میرے کپڑے سینے کی آرزو لے کر آئی تھی اور ۲۶ مارچ ۱۹۶۰ء کو میں اس کا آخری لباس سلوا رہا تھا۔ اسے میری لطیمی پر ترس آیا تھا اور اب اس کا فرزند لطیم ہے۔ تلک الایام نداولہا بین الناس

رخشاں ابدالی

بادۂ عرفاں

حضرت عرفان (جناب مولوی شاہ اکرام الدین احمد صاحب مرحوم رئیس اسلام پور ضلع پٹنہ (بہار) المتولد ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء المتوفی ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۳ء حضرت صوفی منیری (تلمیذ حضرت غالب) کے ارشد تلامذہ میں سے تھے گلدستہ "جلوہ یار" میرٹھ۔ رسالہ "الامین" بہار شریف ضلع پٹنہ۔ رسالہ "ندیم گیا"۔ رسالہ "سُہیل" گیا، رسالہ "فطرت" راجگیر رسالہ "معارف" اعظم گڈھ میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا۔ جناب معین الدین دردائی کی کتاب "بہار اور اردو شاعری" میں آپ کا حال اور رسالہ معارف اعظم گڈھ جون ۱۹۳۲ء اور رسالہ اردو کراچی ماہ جولائی ۱۹۵۰ء میں بہ ذیل حالات حضرت صوفی منیری آپ کا ذکر آپ کے حالات پر ایک شذرہ (نوٹ) بعنوان "حضرت عرفان اسلام پوری" رسالہ "الحمرا" لاہور جون ۱۹۵۴ء میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ "مہر نیمروز" کی وساطت سے آپ کا کچھ کلام ارباب ادب کی ضیافت طبع کے لئے پیش کش ہے۔

رخشاں ابدالی

سرچشمۂ معانی ذوقِ خیال تیرا — معنیٔ زندگانی شوقِ وصال تیرا
دل خوں کنِ عزیزاں شورِ جلال تیرا — مجموعۂ بہاراں رنگِ جمال تیرا
ادراک سے منزّہ یارب ہے ذات تیری — کیا کر سکے تصور فکر خیال تیرا

تیرے جلال سے دل تھرا رہا ہے لیکن
تڑپا رہا ہے دل کو پھر بھی جمال تیرا

وہ دینِ حق کا ہادی، ہادیٔ حق نما تھا — خود جلوہ گاہِ حق تھا، خود جلوۂ خدا تھا
کیا رشتے مصطفیٰ تھا سبحانہٗ تعالیٰ — سبحانہٗ تعالیٰ کیا روئے مصطفیٰ تھا
بے سایہ تھا وہ قامت گیسو تھے ظلِ رحمت — بے سائگی و سایہ! عالم ہی یہ جدا تھا

عاشق ہے وہ گلعذار کس کا — دل اس کا ہے داغدار کس کا
جو ناز کرے وہ سب بجا ہیں — زخمی ہے دلِ فگار کس کا

دل کا وہ خون ہونا آنکھوں سے پھر ٹپکنا — وہ دل کی بھی شہادت۔ یہ اشکِ خوں بہا تھا
راہِ طلب میں اس کی صورت نئی یہ دیکھی — ہے پاؤں میں وہ چھالا، جو دل کا آبلا تھا

کبھی بت خانہ تھا خود کعبہ بھی، نومید ہوں کیوں — میرا بت خانۂ دل بھی کبھی کعبا ہوگا
رنگِ عالم بھی ہے نیرنگ سراسر۔ یعنی — کیا سے یہ کیا ہوا! پھر کیا سے یہی کیا ہوگا
کم سے کم حشر کے فتنے سے بھی کم کیا ہوگا — آپ کی چال سے جو فتنہ کہ برپا ہوگا
دل یہ کہتا ہے درِ دوست پہ یوں محوِ سجود — وہی عرفاں! وہی مایوسِ تمنا ہوگا

شور انگیز ہے ہر لب پہ ترانہ تیرا — تو بھی کیا گل ہے کہ بلبل ہے زمانہ تیرا

بے نقاب آہ سرِ بزم وہ آنا تیرا — ہائے یہ ہوش ربا جلوہ دکھانا تیرا!
دام میں پھنس کے تڑپ اور زیادہ اے دل — کچھ مزا تو انھیں دے جائے پھنسانا تیرا

کیوں حال نہیں وہ بے کسی کا — غم ان کی بلا کرے کسی کا!
قامت اک فتنۂ قیامت — مکھڑا دیکھو تو بس پری کا!

دل مرا راہ پر نہیں آتا — رنگ اچھا نظر نہیں آتا
ہو گیا یہ بھی کیا رقیب مرا — پھر کے کیوں نامہ بر نہیں آتا

اے برقِ طور! تیری تجلی ہے کس جگہ — اے حسنِ یار! تیرا وہ جلوہ کہاں ہے اب

وہ یہاں آئیں یہ نہ تھی قسمت — ہم بنا لیتے کیا نئی قسمت
مجھ سے عاشق کی تو بنی قسمت — یہ بھی ہے تجھ کو آگہی، قسمت
مجھ سے برگشتہ رہتی ہو ہر دم — خوئے معشوق بن گئی قسمت

پری وہ گل ہے، اس گل کی پری نیند — تماشا ہے نزاکت بن گئی نیند
جو سویا بھی تو کچھ بیتاب سویا — جو آئی بھی تو کچھ وحشت بھری نیند

کس کو خبر ہے کیا ہو اس ارض و سما کے بعد کیا جانے کیا دکھائیں گے اس سیمیا کے بعد
واعظ! ہیں ہم تو رندِ خطا کے ہیں معترف وہ اور ہیں جو پیتے ہیں چھپ کر عشا کے بعد

تصویر بن گیا رُخِ جاناں کو دیکھ کر
حیراں ہیں لوگ حیرتِ عرفاںؔ کو دیکھ کر
جی خوش ہوا ہے آج بہت مدتوں کے بعد پیوستہ دل میں ناوکِ جاناں کو دیکھ کر
یارب! لگے نہ اس کو خزاں کی نظر کہیں جی ڈر رہا ہے رنگِ گلستاں کو دیکھ کر
اک مُشتِ خاک اور دو عالم میں اسکی دھاک حیراں تمام خلق ہے انساں کو دیکھ کر
دل سے جو میرے تیر کو کھینچا پھڑک اُٹھے رنگیں وہ خوں سے تیر کے پیکاں کو دیکھ کر

خطِ سبز اس آتشیں رُخسار پر ہے دلیل اعجازِ حُسنِ یار پر
گر پڑے اے کاش تابِ روئے یار بن کے بجلی طالبِ دیدار پر
ہائے ساقی! تیرے میخواروں کا جوش آنکھیں پڑتی ہیں ترے میخوار پر

تسکینِ جاں تجھی سے، تجھی سے قرارِ دل اے نوبہارِ ہستی وائے نوبہارِ دل
یارب ہے کس کے آئینۂ رخ کا حیرتی سو جان سے ہے آپ تحیر نثارِ دل

کیا کہئے دلکشی تری اے دامِ زلفِ دوست! ہوں گے اک ایک خم میں ترے سو ہزار دل

یہی سوزش ہے گر اپنے بیاں میں کہیں باتیں نہ جل جائیں زباں میں
ادائے روح پرور بھی ملی ہے کسی کے غمزہ ہائے جانستاں میں
ہمارا شوقِ سجدہ، صورتِ نقش عیاں ہے ان کے سنگِ آستاں میں

مرے جگر میں رہے نوکِ خنجرِ قاتل مرا جگر رہے قاتل کی نوکِ خنجر میں
گرا دو حسن کی بجلی۔ اُٹھا دو رخ سے نقاب بڑھا دو اور تڑپ میری جانِ مضطر میں

ذرا جذبِ دلِ نخچیر دیکھو! نہیں کھینچا تھا را تیر دیکھو

نہیں تصویرِ یوسف اس سے بڑھکر بلاکر اپنی تم تصویر دیکھو!
تمھارے ہوتے یہ مجھ پر کرے ظلم! ذرا شوخیِ چرخِ پیر دیکھو

زاہد! غمِ دنیا، غمِ دیں، سب سے ہے فرصت لے پی لے ذرا اس مئِ اندوہ ربا کو
سنتا ہوں کہ خود دیکھ کے وہ ہو گئے بیخود آئینے میں اپنی نگہِ ہوش ربا کو
بیمارِ غمِ دوست کو تدبیر سے مطلب؟ یہ کام میں لائیں نہ دوا کو، نہ دعا کو

اے جانِ آرزو و تمنائے آرزو تیری نہ آرزو ہو تو مٹ جائے آرزو
نومیدِ آرزو بھی ہوں، ہے ضبط سے بھی کام کہتا ہوں دل ہی دل میں مگر ہائے آرزو
پہلو میں جو نہاں ہے مرے، دل ہے جس کا نام یارب یہی ہے محملِ لیلائے آرزو
اے شانِ صد حیا! تری کیا آرزو کروں دیکھے تجھے تو آپ ہی شرمائے آرزو
تو اور بزمِ دوست؟ ہے عرفاں، یہ کیا خیال
اے شرمسارِ الفت و رسوائے آرزو

مصیبت تجھ سے ہمدم! کیا کہوں شبہائے فرقت کی بس اب کاٹے نہیں کٹتی ہیں یہ راتیں مصیبت کی
ترے قامت کے فتنے سے ہے ششدر فتنۂ عالم تری آنکھوں کی شوخی سے خجل شوخی قیامت کی
یہ میرے جام میں کیا ہے، بتا دوں میں تجھے زاہد! مئے الفت اسے کہتے ہیں یہ ہو جس کی قسمت کی

وہ اصلِ ہستی کہ ہے تو سب میں مگر ہے پھر بھی نہاں نظر سے اسی کے پرتو ہیں سب یہ اشیا اسی کے جلوے عیاں بشر سے
مجھے ہے جلووں سے اسکے مطلب عیاں نہاں سے غرض نہیں کچھ وہ میرے دل میں تو جلوہ گر ہوں بلا سے پنہاں رہیں نظر سے
نہیں ہے تو اس سے واقف اے دل! یہی ہے دستور اس جہاں کا کہ جو ہیں آگاہِ رازِ باطن وہی ہیں ظاہر میں بے خبر سے

دیکھیں گے وہ ملا کے دلِ داغدار سے اک پھول توڑ لائے کوئی لالہ زار سے
بس چین سے تمھیں ہو کچھ۔ اے خفتگانِ خاک کچھ کام ہی نہیں ہے غمِ روزگار سے

جیب تا دامن سراسر غیرتِ گلزار ہے دیکھنا کیا خونفشاں یہ دیدۂ خونبار ہے

خدنگِ ناز کے دیکھو کرشمے ادھر دل خوں، ادھر زخمی جگر ہے

وہ خود ہی دل وہ خود دل کی تمنا
نظر وہ خود، وہ خود ذوقِ نظر ہے

جو ہے رنگیں نوائی تجھ میں بلبل!
وہی پرواز میں رقصِ شرر ہے

عجب آئینہ ہے یہ قلبِ انساں
اس آئینہ میں خود آئینہ گر ہے

باہر نہ پھینکئے دلِ غمگیں کو زلف سے
صیدِ حزیں بھی کوئی تہِ دام چاہئے

کیوں شکوہ سنج ہجر ہے تو اے دلِ حزیں
کمبخت! عاشقی میں بھی آرام چاہئے

نگہِ ناز بھی نیرنگ نما ہوتی ہے
کبھی ناوک تو کبھی تیغِ ادا ہوتی ہے

اور ہوتی ہے دوبالا ترے عارض کی جھلک
جب قریں اس کے تری زلفِ رسا ہوتی ہے

منبعِ صد شوق و حسرت ہے تماشا ہے یہ دل
خرمنِ عشق و محبت ہے، عجب یہ دانہ ہے

کسی کی برقِ تجلی سے دل کا جل جانا
یہی خزاں بھی ہے اس کی یہی بہار بھی ہے

دل کبھی اس سے تپش میں، کبھی آرام میں ہے
کیسی اے دوست! یہ تاثیر ترے نام میں ہے

دل میں گرمیِ محبت جو چھپی رہتی ہے
اسی گرمی سے یہ آنکھوں میں تری رہتی ہے

کون کٹواتا ہے سر، عاشقِ جانباز ہے کون
تیغِ ناز اس کی تو ہر وقت کھچی رہتی ہے

اتنا دلکش ہے جو یہ رنگِ تعین اس میں
شوخیِ جلوہ تری یار! ملی رہتی ہے۔

تمہارے جلوے کا کہنا ہی کیا ہے
یہاں اس کے سوا جلوہ ہی کیا ہے

نقابِ گل ہے دلکش پردۂ راز
چمن رازِ چمن آرا ہی کیا ہے

چھپے برقع میں کیا وہ روئے روشن
یہ پردہ ہے مگر پردا ہی کیا ہے

یہی ہستی ہے عرفاں! پردۂ دوست
یہ مٹ جائے تو پھر پردا ہی کیا ہے

انوار ظہوری

کیا پایا

بجز حرماں نصیبی جی لگا کر میں نے کیا پایا
مری اک اک تمنا کو مسلسل تم نے ٹھکرایا

کبھی دیں تم نے مجھ کو تھپکیاں اپنی جفاؤں سے
کبھی آہستہ آہستہ کوئی غم دل میں چمکایا

محبت رفتہ رفتہ اپنی حد سے بڑھ گئی اتنی
ستایا جس قدر تم نے مجھے اتنا ہی پیار آیا

تمہارے سامنے نذرانۂ دل بے حقیقت ہے
مجھے احساس ہے خود بھی کوئی تحفہ نہیں لایا

مرا دل توڑ کر جاتے ہوئے اتنا تو بتلا دو
مرا دل توڑ کر کتنی خوشی کتنا سکوں پایا

چلا منہ پھیر کر آخر چھڑا کر ہاتھ سے دامن
بہت منت سماجت کی بہت ظالم کو سمجھایا

عیاں ایسے طریقے سے ہوا اقرار کا پہلو
کہ اس کو عقل نے مانا نہ کچھ دل کو یقیں آیا

یہی ساری ملاقاتوں میں تم کہتے رہے مجھ سے
وہ قصہ کیا سنیں آخر جسے ہر بار دہرایا

مقدر میں لکھا تھا غالباً یہ رنج تنہائی
کہ میرا غنچۂ امید کھلنے بھی نہیں پایا

کفِ افسوس ملتی برق بھی خود ہو گئی واپس
مرا باغ تمنا دفعتاً اس طرح مرجھایا

اسی کو تم نے عادت ڈال دی ہے اشکباری کی
وہ جس نے مسکرانا اپنے غمخواروں کو سکھلایا

اسی کے پائے استقلال میں اب آ گئی لغزش
قدم جس کے ہٹے پیچھے نہ جو مشکل میں گھبرایا

کئے تھے جس سے وعدے زندگی بھر ساتھ رہنے کے
تماشہ ہے اسی کو قابل نفرت بھی ٹھہرایا

کبھی مجھ سے جو پیماں تم نے باندھے تھے
تعجب ہے تو بس اتنا نہ کیوں ان کا خیال آیا

اسی احسان کے باعث تمہاری یاد آئے گی
کہ میری زندگی کی گتھیوں کو اور الجھایا

نہ ٹھکرایا مرے ہر مشورہ کو بے سبب تم نے
خلافِ مصلحت جانا خلافِ مصلحت پایا

بھلا سکتا نہیں پہروں مری ہر سانس کو تم نے
سراپا ناز بن کر جسم کی خوشبو سے مہکایا

یقیناً زندگی بھر مضطرب رکھنے کی نیت سے
مرے جذبات کو تسکین کا آئینہ دکھلایا

یہ اپنی مصلحت کی آڑ بھی اب خوب لی تم نے
خراشیں ڈال دیں دل پر جبینِ غم کو جھلسایا

رہیں گے جاوداں — بن کر محبت میرے سینے میں
وہ شعلے جن سے تم نے آتشِ الفت کو بھڑکایا

رہے گا — دیکھ لینا! — اب تاسف عمر بھر تم کو
انیسِ جان و دل — انوار کو بے وجہ ٹھکرایا

ضیاء الرشید

"دلوں کے بادل"

خلیج فارس کی دیوانی لہریں اور جنوری کی ایک ٹھنڈی مگر دلوں میں مدھم آنچ بن کے سلگتی ہوئی رات تھی۔ میں جہاز کے عرشے پر ریلنگ سے لگ کر کھڑا تھا۔ بانو تھوڑی دیر پہلے سونے کے لئے کیبن میں چلی گئی تھی۔ مجذوب لہریں حسب معمول وجد کی سی کیفیتوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ حدِ نظر پر ستارے سمندر میں نہاتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے دوسری جانب سمندر اور آسمان کے سنگم پر ایک کندن کا سا تھال تھا۔ اس کندن کے تھال سے لے کر میرے چیونٹی کی چال چلتے ہوئے جہاز تک ایک سنہری راہ گذر بنی ہوئی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی اس راہ گذر پر سے ہوتی ہوئی چند جل پریاں آئیں گی اور دیر تک جہاز کے ویران عرشے پر تہذیب و عقل کے سنگین زنداں میں زندگی کی اسیر تمناؤں کو رہا کر دینے والا رقص کرتی رہیں گی!!

جہاز کا سست رفتار سفر اسوقت اسقدر تکلیف دہ ہو چکا تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں دو دن سے جہاز پر سوار ہونے کے بجائے اس کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے چلتے تھک گیا ہوں۔ سگریٹ سلگا کر عرشے پر پڑی ہوئی ایک آرام کرسی پر میں یوں نیم دراز ہو گیا جیسے سنہری راہ گذر پر سے آنے والی جل پریوں کا انتظار کر رہا ہوں!

یہ کونسی چاند نگری کیسی سنہری راہیں اور کہاں کی جل پریاں —— سائنس کے ہائیڈروجن بنانے والے بے رحم ہاتھ نے تو خوبصورتی کے ہر ممکن تصور کو مسخ کر دیا تھا۔ دنیا کے کروڑوں بدقسمت انسان زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لئے ترستے رہے مگر چاند نگری میں قیمتی راکٹ دھول اڑانے لگے!! چاند ان سب کا خیال چھوڑ کر یاروں کی کہکشاں پر چلدیا!!

★ ★ ★

سرما کی ہی ایک رات تھی وہ۔ ٹھنڈی مگر دلوں میں مدھم آنچ کی طرح سلگتی ہوئی رات!

ایک بند دروازے پر ایک نوجوان نے آہستہ سے دستک دی۔

"کون"!

"عابدہ —— میں ہوں انور۔۔۔۔۔۔" نوجوان نے فرطِ مسرت سے اپنی چشمے کی طرح ابلتی ہوئی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

جب دروازہ کھلا تو پکی ہوئی گندم کے نشیلے رنگ اور جاپانی قد کی ایک مسکراتی ہوئی لڑکی کی رسیلی آنکھیں انور

کو دیکھنے لگیں۔ یہ آنکھیں انور کو دیکھتی رہیں اور انمیں پجارنوں کی عقیدت اور جذبوں کی صداقت اور مسرتوں کی وارفتگی بھی تھی۔

ان آنکھوں میں پراسرار اندھیری راتیں رہتی تھیں۔

ان آنکھوں میں گھبرا کر بھاگتی ہوئی ہرنی کی آنکھوں کی جھلک بسی ہوئی تھی۔

ان آنکھوں میں وہ "حسین ترین تعجب" بھی مقید تھا جو دنیا کی سب سے پہلی عورت کی آنکھوں میں اسوقت پیدا ہوا تھا جب اسنے پہلی بار اپنے ساتھی کو دیکھا تھا۔

اِن آنکھوں میں ذرا سی دیر دیکھتے دیکھتے انور کو نیند سی آنے لگتی تھی۔ اِن ہی آنکھوں والی لڑکی کا نام عابدہ تھا جو اسوقت اپنے مخصوص ساحرانہ انداز میں انور کی طرف دیکھ رہی تھی اور اسکے بے خیالی میں ادھ کھلے لبوں پر خوشیوں کی کلیاں سی چٹک رہی تھی۔ دفعتاً انور نے عابدہ کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ عابدہ آہستہ سے ہنس دی اور اسکی اِس مختصر سی ہنسی میں "آنکھوں کا پیار" جھلک رہا تھا۔ جب انور کمرے میں داخل ہوا تو عابدہ اسکے یخ بستہ رخساروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "ہائے باہر کسقدر ٹھنڈ تھی"۔

"اپنی تو شائد ناک ہی اڑ گئی ہے" انور نے ٹھٹھری ہوئی ناک کو چھوتے ہوئے کہا۔

عابدہ انور کی ناک پر پیالی میں سے نکالے ہوئے بھتے بھتے ٹام جیسے لب رکھ کر ہولے ہولے تیز گرم پھونکیں مارنے لگی۔

اس کمرے کا ایک دروازہ اندر صحن میں کھلتا تھا کمرے میں ایک سنگھار میز تھی۔ دو آرام کرسیاں تھیں جن پر سیاہ مخمل کے غلافوں والی گدیاں رکھی ہوئی تھیں۔ باہر سڑک کی طرف کھلنے والے اس دروازے کے سامنے جسکے ذریعے انور اندر آیا تھا قدِ آدم الماری رکھی ہوئی تھی۔ مگر یہ الماری انور کی آمد پر ہمیشہ گویا زیرِ لب مسکراتی ہوئی ایک طرف کھسک جاتی تاکہ دروازہ کا پٹ کھل سکے۔ ایک کونے میں میز پر عابدہ کی کتابیں رکھی تھیں۔ دوسری طرف ایک پلنگ بچھا تھا جسکے سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر ٹیبل لیمپ روشن تھا اور چند کتابیں اور کاپیاں پڑی تھیں۔ یہ کمرہ میٹرک کے بعد عابدہ کو مستقل طور پر مل گیا تھا۔

عابدہ نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا۔ انور نے ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر اپنے پاؤں دوسری کرسی پر پھیلا لیئے۔ عابدہ نے اپنا سیاہ پلش کا وہ کمبل انور کو اڑھا دیا جو اسکے ابا کلکتے سے لے کر آئے تھے۔ اور وہ خود حسبِ معمول انور کی آنکھوں میں جھانک کر اسے مسحور کر سکتی تھی اور جب چاہتی اپنا سر انور کے پہلو میں رکھ کر آسودگی اور سکون کی طلسمی وادیوں میں پہنچ سکتی تھی

اور پھر احساس کا جادو جگاتی ہوئی تاریکی تھی اور ان دونوں کی مدھر اور رسیلی سرگوشیاں۔

اور پھر آنکھوں نے آنکھوں میں دیکھنا شروع کیا تو گویا پسِ منظر میں ستار پر ہنس دھن بجنے لگی اور انسانی وجدان کی بلندی دیکھ کر جیسے وقت کی سانس رک گئی۔

اور پھر یہ دنیا گویا دنیا نہیں —— ایک جنت تھی جسمیں عابدہ اور انور ابھی تک پیدائش کے مقصد سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔

لیکن پیدائش کا وہ مقصد تو انسان کا نصیب ٹھہرا۔ اور انور اور عابدہ کو جذبات کی اوس میں بھیگی بھیگی سی ان اندھی تنہائیوں میں اکثر یوں لگا جیسے پیدائش کا وہ مقصد آدھی رات کے سرمست چاند کا سرور بن کر انکے احساسات پر چھا گیا ہوا

اور جیسے کیسر کی کیاریوں میں ہنسی کی سوئی ہوئی جھانجھنیں آپ ہی آپ بج اٹھتی ہیں .... اسی طرح پیدائش کا وہ مقصد آپ ہی آپ پورا ہونے لگا ہو .... کہ آدھی رات کی چپ دھوپ، چاندنی میں مخمور کوئی بہکی ہوئی قسمت کی مضراب ـــ اچانک ہوش کے کسی تار سے ٹکرا جاتی !!

اور پھر ایک طرف تو عابدہ اور انور ایک دوسرے کے سامنے شرمسار ہو جاتے اور دوسری طرف جذبات کی اوس میں بھیگی بھیگی سی اندھیری تنہائی اپنی جگہ پر کسمساتی رہ جاتی !!!

اور پھر جب گھر کے صحن میں کسی صبح دم اٹھنے والی کی آہٹ سنائی دی تو عابدہ نے ہلکی سی آہ بھر کر کہا :-

"صبح ہو گئی ...."

"صبح ہو گئی ...." عابدہ کے الفاظ دہرا کر انور کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دل اداسی کے سمندر کی تہہ کی ت چلا جا رہا ہو۔

انور نے کمرے سے باہر نکل کر کہر آلودہ یخ بستہ فضا میں ایک لمبا سا سانس لیا۔ پھر اسنے آسمان کی طرف دیکھا جہاں ں کہیں چند ستارے رہ گئے تھے۔ اور پھر جب اسکی نظر دوشیزہ افق پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتے ہوئے زہرہ پر ی تو اسنے دروازے میں کھڑی ہوئی عابدہ سے کہا :-

"وہ صبح کا ستارہ دیکھو ـــ کہتے ہیں اسے دیکھنے سے نصیبوں کی سیاہی مٹتی ہے۔"

"اور جنکے نصیب ہماری طرح روشن ہوں !" عابدہ نے ہنستے ہوئے پوچھا ۔ انور چند لمحوں کے لئے عابدہ کی طرف یکھتا رہا ۔ پھر اسنے کسی بوڑھے پجاری کی سی عقیدت کے ساتھ اس کی پیشانی کو چوما اور ہونٹوں پر گمبھیر سی مسکراہٹ لئے ـــ چلدیا ـــ

★ ★ ★

ینے دیکھا ـــ

چاند لہروں کو تڑپتا چھوڑ کر اب جہاز کے عین اوپر آ گیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر اس اسپوتنکی دور میں بیل گاڑی جیسے سفر تکلیف دہ احساس ہو رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر بانو کے کہنے کے مطابق ہم لوگ کویت سے ہوائی جہاز سے روانہ تے تو کب کے پاکستان پہنچ کر پرانے بھی ہو چکے ہوتے۔ یہ لمبا گھائل کر دینے والا سفر نہ ہوتا۔

........!

"حد ہو گئی۔ ...." میں نے چونک کر دیکھا بانو واقعی غصّہ میں تھی۔ حسب معمول اسکی برمی عورتوں جیسی چپٹی ک کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور پیشانی پر وہی دو شکنیں پڑی ہوئی تھیں جنکے ساتھ بانو مجھے اور بھی اچھی لگتی تھی۔

میں مسکراتے ہوئے کرسی پر سے اٹھا اور چلتے چلتے بانو کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ بانو ابھی تک غصّے میں تھی۔

"آدھی رات ہو گئی ہے۔ آخر مجھے بھی تو پتہ چلے کیا سوچا جا رہا تھا ـــ

دو دن سے دیکھ رہی ہوں ...."

میں نے موضوع بدلنے کے لئے کہا "شاہد سو رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اور کیا آپ کی طرح جاگتا رہتا" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بانو کا غصہ آہستہ آہستہ کم ہوتا نظر آ رہا تھا ۔ اس نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا ۔ یہ گھڑی میں نے بانو کو منہ دیکھائی کے طور پر شادی کی رات پہنائی تھی ۔ ہم اپنے کیبن میں جانے کے لئے اب گیلری میں سے گزر رہے تھے کہ بیگم توحید سرخ و سفید چیک کا کوٹ لاپرواہی سے کندھوں پر لٹکائے اپنے کیبن میں سے نکلیں ۔

بانو اگرچہ میری بیوی تھی مگر نہ جانے کیوں میں نے گھبرا کر بانو کی کمر سے اپنا بازو ہٹا لیا میں نے دیکھا ۔ بیگم توحید کے گلاب رنگ ہونٹوں پر ہلکی سی بامعنی مسکراہٹ کھیل گئی ۔ ہمیں ایک طرف ہٹ کر بیگم توحید کو راستہ دینا پڑا جب وہ ہمارے قریب سے گزر رہی تھیں تو نہ جانے کیوں انکے یوڈی کلون اور میکس فیکٹر کی مٹیں مجھے سخت ناگوار گزریں ۔

"بڑا بور سفر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" بیگم توحید نے جاتے جاتے بانو کی طرف فضول سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا

" واقعی سخت بور ہے" میں نے بانو کی طرف سے جواب دیا ۔

مگر بیگم توحید خاموشی سے عرشے پر جانے کے لئے گیلری کا موڑ مڑ گئیں بانو کہنے لگی ۔

"لیجئے ایک سے فوراً دو ہو گئے ۔ اب سارے جہاز میں بوریت کا مرض پھیل جائے گا ۔"

میں ہنسنے لگا ۔ بانو کہتی رہی ۔ "میں کہتی ہوں اگر آپ لوگ خود بور ہونا چھوڑ دیں تو میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بیگم توحید اور توحید صاحب بصرہ سے آ رہے تھے ۔ توحید صاحب کئی برس سے عراق میں مقیم تھے اور حکومت عراق کے بجلی کے محکمے میں ایک انجنیر کے عہدے پر مامور تھے ۔ وہ دہرے بدن کھلتے ہوئے رنگ اور تعجب کے سے انداز میں پوری طرح کھلی ہوئی آنکھوں والے آدمی تھے ۔ کلائی کی گھڑی باہر کے بجائے اندر کی جانب باندھتے تھے ۔ نہایت شرمیلے واقع ہوئے تھے اور تکلیف دہ حد تک پتلی نوک والے جوتے پہنتے تھے ۔ ان کی پتلونوں کے پائنچے بڑے اور انکے کوٹ فٹ اور چھوٹے ہوتے تھے ۔ انکا چہرہ ذہنی عظمت کی پرچھائیوں سے عاری تھا ۔ وہ بدصورت نہیں تھے مگر ان میں کوئی ایسی کشش بھی نہیں تھی کہ دیکھنے والی آنکھ کو انکی شخصیت اور ان کے وجود کا احساس ہو سکے کسی سے رسمی گفتگو کے دوران میں بھی وہ اسکی طرف اپنی بڑی بڑی حیرت زدہ سی آنکھوں سے یوں دیکھتے رہتے جیسے ان پر کسی گہرے راز کا انکشاف ہو رہا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ حیرت کے سمندر میں ڈوبتے جا رہے ہوں ۔

ان سے سفر کے دوران میں بجلی کے جنریٹروں اور پاور ہاؤس پاور کے سوا زندگی کے کئی موضوعات پر گفتگو کرنے کی کوشش میں نے کی مگر مجھے ہمیشہ مایوسی ہوئی ۔ توحید صاحب سے اکثر عرشے پر ہی ملاقات ہوتی تھی وہ اپنی بچی نجمی کی انگلی پکڑ ادھر سے ادھر پھرا کرتے بانو اور بیگم توحید عموماً ایک جگہ بیٹھ کر بات چیت شروع کر دیتیں ۔ توحید صاحب اس موقع پر ہم الگ تھلگ رہتے اس لئے میں بھی شاہد کی انگلی پکڑ کر ایک طرف چل دیتا ۔

جہاز کے باقی کیبنوں میں خلیج فارس کی مختلف تیل کمپنیوں کے چھوٹے ملازمین تھے ۔ ان لوگوں کے لباس عمدہ گھڑیاں قیمتی تھیں اور ان میں سے اکثر کے پاس بڑھیا کیمرے تھے ان میں سے اکثر دن بھر وسکی اور بیر پیتے رہتے تھے ۔ یہ لوگ دو دو ڈھائی ڈھائی برس تک مشرقِ وسطیٰ کے صحراؤں میں تجرد کے بے روح و بے کیف زندگی گزار کے اب گھر

ہاز میں سفر کرنے والی ہر قسم کی عورت کے سامنے اشوک کمار بنے پھرتے تھے۔ چونکہ میں بھی ان ہی لوگوں کی طرح تیل کمپنی کا ملازم تھا اس لئے میں ان اشوک کماروں کے اندر چھپے ہوئے کلرکوں اور دستکاروں کو خوب پہچانتا تھا۔ یہ لوگ جہاز کے عرشے پر صبح شام نئے نئے سوٹ بدل کر ٹہلتے ہوئے آپس میں اس قسم کی گفتگو کیا کرتے۔

"آپ یہ گھڑی دیکھ رہے ہیں۔ بائیس کیرٹ گولڈ کی کرونومیٹر ہے ــــ ساڑھے سات سو کی لی ہے ــــ پاکستان میں پندرہ سو کی بھی نہیں ملے گی ــــ میرے پاس ایک اور کرونومیٹر گھڑی تھی مگر مجھے اسکی شیپ پسند نہیں تھی چنانچہ میں نے اپنے بھائی کو دے دی"

"آپ کا بھائی کیا کرتا ہے؟"

"اجی۔ کرے گا کیا ــــ ہمارے مال پر عیش کرتا ہے ــــ ویسے تو بینک میں ملازم ہے پر آپ جانتے ہیں اپنے وطن کی تنخواہیں کیا ہوتی ہیں"

"اجی بس کچھ نہ پوچھئے ــــ اپنے ہاں کا یہ جوائنٹ فیملی سسٹم نے کر بیٹھ گیا ہے ایک کمانے والے تو بہتر کھانے والے"

"ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ کاش ہم امریکن وے آف لیونگ اڈاپٹ کر سکیں ــــ"

"کاش ــــ"

ایک اور صاحب دوسرے سے کہہ رہے ہوتے:۔

"بھئی میں تو سیریسلی سوچ رہا ہوں کہ کویت کی ملازمت ختم ہونے پر کنیڈا مائی گریٹ کر جاؤں"

ایک اور صاحب . . . . . .

"بھئی اپنا تو اصول ہے کہ چیز جب بھی خریدو بڑھیا خریدو ــــ چنانچہ کیمرہ جب لیا تو رولی ہی لیا"

"اپنا بھی یہی اصول ہے ــــ پہلی مرتبہ رولی پاکستان لے گیا تھا۔ اس دفعہ ایگزیکٹا لے جا رہا ہوں ــــ"

ایک جنوبی بھارت کا عیسائی دوسرے عیسائی کو اپنا جوتا دکھاتے ہوئے کہہ رہا ہوتا۔

"او ــــ نو مین ــــ اٹ از امریکن ــــ آئی لو امریکن شوز ــــ دے آر سو کمفرٹیبل ــــ"

ایک اور جگہ گفتگو ہو رہی ہوتی۔

"میرے پاس ریڈیو کے علاوہ ٹیپ ریکارڈ بھی ہے ــــ پتہ نہیں کتنا کسٹم لگے ــــ"

"ارے ــــ فکر مت کرو ــــ ابھی پندرہ دن ہوئے میرا ایک دوست ریڈیوگرام اور ٹیپ ریکارڈر لے گیا تھا۔

"واقعی"

"ہاں بھئی ــــ تم چلو تو . . . . . ."

اس کے علاوہ تیسرے درجے کا ڈک تو بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں عراق سے لوٹنے والے زائرین تیل کمپنیوں میں پندرہ پندرہ برس سے ملازمتیں کرنے والے وہ کنجوس ملازمین تھے جنکے اپنے نصیبوں میں ریت اور ناک کے روکھی سوکھی روٹی، خاکی پتلونیں اور ٹائرسول کی پشاوری چپلیں تھیں اور جنکی ہزاروں روپے سالانہ کی آمدنی کا بڑا

حصہ ان کی دوسری جوان بیویوں یا پہلی بیوی ہی کی روز بروز جوان ہوتی ہوئی اولاد کے عیش و آرام پر صرف ہوتا تھا۔ یہ لوگ لمبے لمبے وقفوں کے بعد تیل کمپنیوں کے قوانین سے مجبور ہو کر ہی چھٹی پر جاتے تھے اور پھر ہنسی خوشی صحراؤں کی طرف لوٹ آتے گھر والے ان کے مختصر قیام کے دوران میں انکی عیش و عشرت کی دلدادہ اولاد دعائیں مانگتی رہتی "خدایا ـــــ اباجی کو جلدی پرمٹ پر واپس بلالے ـ آجکل انکے کنٹرول نے تو ناک میں دم کر دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ان کوامبو کے بیلوں کے علاوہ ڈیک پر کچھ "ماجھے ساجھے" قسم کے دستکار بھی تھے جنکے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اکثر یہ خیال آتا کہ آخر ان لوگوں نے کونسی میٹھی مرچیں "سی۔آئی۔ڈی" والوں کی آنکھوں میں جھونک کر اپنے پاسپورٹ بنوا لئے ـــ یہ لوگ ڈیک پر جگہ جگہ فلاش کھیلنے، چرس کا بجا اڑانے یا پھر گانے بجانے اور ذرا ذرا سی شراب پی کر اٹھلانے میں مصروف تھے

کچھ عورتیں جگہ جگہ سلائی کی مشینیں لے کر بیٹھی ہوئی تھیں اور کرٹے والوں کو بے بس کرنے کے لئے مسلسل شنیل کے زنانے سوٹ کچے پکے سینے میں مشغول تھیں۔ ان میں کچھ ایسی عورتیں بھی تھیں جنہیں بعض بڑے معزز شہری (تاجر) بحرین کی سیر کے لئے آئے دن بھیجا کرتے ہیں۔

راستے میں ـ دبئی، شارجا اور مسقط، وغیرہ سے کچھ چلتی پھرتی دکانوں والے جہاز میں سوار ہو گئے تھے اور انہوں نے تیسرے درجے کے ڈیک پر جگہ جگہ اپنی دکانیں سجالی تھیں۔ ان دکانوں پر انگریزوں کی فری پورٹ بحرین کی بدولت عمدہ اور قیمتی سامان موجود تھا۔ اور یہ سامان پاکستان اور بھارت جیسے درآمدی پابندیوں والے ممالک کے باشندے دھڑا دھڑ خرید رہے تھے ـ

بانو کے اصرار پر میں اسے تیسرے درجے کا ڈیک دکھانے لے گیا۔ کپڑے سیتی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر بانو کہنے لگی۔

"حد ہو گئی ـــ یہ عورتیں راستے میں بھی کپڑے سیتی جا رہی ہیں"

میں نے جواب دیا "بیگم تم نے بھی تو کویت میں دو برس تک کپڑا ہی خریدا اور سیا ہے"

ایک جگہ ایک بوڑھی پیا پاکٹنی بڑے ہی پیار سے اپنی دو مرغیوں کو کہہ رہی تھی "نی تسی چول کھاؤگی کہ روٹی کھاؤگی"

مرغیوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا ـ

"نئیں بے بے اسی تے سونا ہی کھاواں گی"

میں نے جب بانو کو مرغیوں کی آنکھوں کا جواب سنایا تو وہ جنیس "امگلہ بے بے" کی طرف رشک آمیز نظروں سے دیکھنے لگی ـــ میں نے ازراہ مذاق کہا "بے بے اسے کنگریاں وکاؤ نئیں"؟

"نئیں پتر نئیں ـــــ" بے بے جلدی سے مرغیوں کی طرف دیکھتے ہوئے ـ بولی !!!

کیبن میں سونے کی کوشش کرتے کرتے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جگ بیت گئے ہوں۔ میں نے تنگ آ کر بانو کو آواز دی اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سو رہی ہے تو میں نے ایک بار پھر عرشے پر جانے کے ارادے سے اٹھ کر دروازہ کھولا ـــ مگر عین اسی وقت توحید صاحب اور انکی بیگم سامنے سے چلے آ رہے تھے میں نے نہ جانے کیوں ان لوگوں کو دیکھتے ہی دروازہ بند کر دیا مگر بیگم توحید نے مجھے دیکھ لیا تھا اور ان کی پر معنی نظر کیبن کا دروازہ بند کرنے کے باوجود میرے

سامنے تھیں۔ میں دوبارہ لیٹنے کے لئے اپنی برنتہ کی طرف بڑھا کہ بانو کی آنکھ کھل گئی۔

"آپ ابھی تک سوئے نہیں،" بانو نے بیزاری سے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"ذرا لیبوٹری گیا تھا —— میں نے جلدی سے جھوٹ بولا ——"

پھر میں نے کہا "بانو —— وہ توحید صاحب ابھی ابھی اپنی بیگم کو پکڑ کر لے جارہے تھے"

"جیسے میں آپکو باہر سے پکڑ کر لاتی تھی" —— نیند میں ڈوبی ہوئی بانو ہنس دی —— میں نے بھی ہنس دیا ——

اور پھر مجھے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے نیند آتی رہی!!!

★ ★ ★

انور دس گیارہ برس سے اپنے بڑے بھائی کے ہاں رہ رہا تھا جو پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ایس۔ ڈی۔ او تھے۔ بڑے ہی مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے۔ ہر لحاظ سے شریف —— شرافت کا یہ عالم کہ رشوت نہیں کھانی چاہتے تھے اور نہ ہی کبھی منہ سے مانگتے تھے۔ لیکن اگر کوئی بن مانگے ہی پیش کر دیتا تو ہچکچاتے ہوئے قبول کر لیتے مگر گھر آتے ہی وہ پیسے بیگم کے حوالے کر دیتے اور کہتے۔

"بھئی ان کمبختوں کو جلدی سے خرچ کر ڈالو"

اور انور کی بھابھی فوراً ہی ان پیسوں کی شاپنگ کر ڈالتیں۔ انور کی بھابھی کی ایک کلاس فیلو ان کی بہن بنی ہوئی تھیں اور عابدہ —— انور کی بھابھی کی اس منہ بولی بہن کی چھوٹی بہن کا نام تھا۔

عابدہ بڑی بہن کی شادی ہو جانے کے بعد بھی انور کے ہاں آتی رہی۔ چونکہ دونوں گھرانے معزز اور روشن خیال تھے اس لئے عابدہ اور انور کو ایک دوسرے کو پہچاننے اور سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ انور کی بھابھی کا میکہ کراچی میں تھا جہاں ایک قابل ذکر ہستی بھابھی کی کنواری چھوٹی بہن عطیہ رہتی تھی۔ عطیہ اکثر بہن کے ہاں آیا کرتی اور آٹھ آٹھ دس دس دن رہا کرتی۔ عطیہ عابدہ کو جانتی تھی۔ شروع شروع میں تو دونوں خوب گہرے دوست بن گئے۔ عطیہ کراچی سے آتے ہی عابدہ کو بلا لیتی اور پھر انور یا ورچی خانے میں گھس کر شام کی چائے کے ساتھ اپنے ہاتھ سے پکوڑے تلا کرتا اور کبھی کتابیں پڑھ پڑھ کر پڈنگ بنایا کرتا اور بھابھی اور عطیہ اور عابدہ قہقہے لگایا کرتیں۔

"وہ دن —— انور کی زندگی کے حسین ترین دن تھے —— یہ بات نہیں تھی کہ "وہ" دن گزر جانے کے بعد انور کو احساس ہوا ہو کہ "وہ" دن تو اسکی زندگی کے حسین ترین دن تھے —— جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے —— بلکہ ان زندگی کے حسین ترین دنوں کے ہر ہر لمحے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی انور جانتا تھا کہ یہ اسکی زندگی کے حسین ترین لمحات ہیں —— اسکی زندگی کے کسی اور لمحے کو یہ حسن نصیب نہیں ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی نہیں ہوگا!!!

مگر پھر حالات بدلتے گئے۔ عطیہ کو کراچی سے آئے ہوئے ہوئے آٹھ آٹھ دن ہو جاتے اور وہ عابدہ کا نام تک نہ لیتی اور اگر عابدہ اچانک خود ہی آجاتی تو انور سہم سا جاتا اور اسے بھابھی اور عطیہ کے سارے اخلاقی فرائض خود ادا کرنے پڑتے اسوقت انور بار بار نگاہوں کے ذریعے عابدہ کو اس قسم کے پیغامات دیا کرتا۔

"عابدہ بی ـــــ آپ کیوں اِن پستیوں میں اتر آتی ہیں آپ بھابھی
اور عطیہ جیسے لوگوں سے بہت بلند ہیں اور آپ کو اپنی بلندیوں پر ہی
رہنا چاہیئے ـــــ اگر مجھ میں پرواز کی سکت ہوگی تو میں ان بلندیوں
پر ہی پہنچ جاؤں گا ....!!!"

جب انور بی ایس سی کا امتحان دے چکا اور عابدہ ایف اے کا اور ادھر عطیہ ایک مرتبہ ناکام ہونے کے بعد میٹرک میں کامیاب ہوگئی تو بھابھی نے وہ بات جو انور پہلے ہی جانتا تھا انور سے صاف الفاظ میں کہہ دی انور کے کورے انکار پر بھابھی کی سٹی گم ہوگئی ـ بے حد صدمہ ہوا ـ صدمے کی بات ہی تھی ـــــ بھابھی نے تو گویا اس گھر میں قدم رکھتے ہی عطیہ کو انور کے لئے ایک عطیہ تصور کر لیا تھا ـ

اس روز پہلی مرتبہ بھابھی نے انور کو کہہ دیا کہ اب عابدہ اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی ـ

اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ انور کو احساس ہوا کہ زندگی میں پیٹ کی بھوک اور افلاس اور موت اور بیماری کے علاوہ اور بھی غم ہوتے ہیں انور نے غصہ سے کانپتی ہوئی بھابھی کے سامنے نہائت تحمل اور بردباری کے ساتھ زندگی کے پہلے غم کو سینے سے لگا لیا !!

لیکن اگر انور بی ـ ایس ـ سی کے امتحان میں فیل نہ ہوتا تو بھابھی بھائی کو بھائی کے خلاف ابھارنے میں کامیاب نہ ہوتیں اور حالات اس قدر خراب نہ ہوتے چند دنوں کے بعد انور نے گھر چھوڑ دیا وہ ایک دوست سے سفارشی چٹھی لے کر ملازمت کی امید پر پشاور چلا گیا ـ

اور پھر تقریباً سال بھر کے بعد انور ـــــــــ کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑا تھا تو اس کے اس محبوب ترین شہر میں اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا ـ اسکے بھائی کی یہاں سے تبدیلی ہو چکی تھی لیکن اگر تبدیلی نہ بھی ہوئی ہوتی تو انور اس بھابھی کے در پر کبھی نہ جاتا جیسنے چاند پر تھوکنے کی کوشش کی تھی اور عورت کے نصیب کی سب سے بڑی تہمت عابدہ پر لگا دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ عابدہ کے اِن ہی لچھنوں کی بدولت وہ امتحان پاس نہیں کر سکا ـ انور ایک ہوٹل میں جا کر ٹھہر گیا اور پھر اس نے عابدہ کے دیئے ہوئے خفیہ پتہ پر جا کر اطلاع دی (اسی پتہ پر وہ عابدہ کے نام خط لکھا کرتا تھا)

اور پھر دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب وہ عابدہ کے انتظار میں ہوٹل کی بالکنی میں کھڑا تھا کہ ایک وکٹوریہ نیچے ہوٹل کے دروازے کے سامنے آکر رکی ـ

مخصوص البشیائی حجاب کے ساتھ دوپٹہ سر پر ٹھیک کرتی ہوئی عابدہ اتری ـ انور عابدہ کو لینے کے لئے زینے کی طرف بجلی کی سی تیزی سے بھاگا ـ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا اور عابدہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی ـــــ اور پھر وہ پھیکی پھیکی پڑی ہوئی سوگوار مسکراہٹوں اور مسرت آمیز غم میں بسی ہوئی خاموش نظروں کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے

اور پھر دفعتاً جیسے سوئے ہوئے آتش فشاں جاگ اٹھے اور جذبات کا لاوا پھوٹ نکلا اور دلوں کی بھری ہوئی دھڑکنیں

گلے ملنے لگیں ۔ اور بلکتے ہوئے پیاسے لب ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں میں رس بس گئے اور ناگنوں جیسی بے تاب بانہیں ترسے ہوئے جسموں سے لپٹ گئیں اور مجبور روحیں اتصال کی دیوانی کیفیتوں میں کھو گئیں اور ان چند لمحوں میں ذہن کے لئے مسرت و انبساط کی جیسے صدیاں گزر گئیں !!!

ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر انور نے عابدہ کو کرسی پر بٹھایا اور پھر اسنے اپنی انگلیوں سے عابدہ کے آنسو پونچھے اور پھر وہ کہنے لگا :-

" عابدہ میں تمہاری طرح نہیں رو سکتا ـــــ میں سال بھر تک پشاور کا پانی پی پی کر پٹھان دل ہو گیا ہوں "۔

" پٹھان دل ـــــ " عابدہ نے روتے روتے کہا اور پھر وہ مختصر سی ہنسی کے ساتھ بولی جو بیک وقت اداس بھی تھی اور مہربان بھی -

" تم ذرا بھی نہیں بدلے "۔

پھر وہ دیر تک ایک دوسرے کو اپنے اپنے دل کی کہانیاں سناتے رہے ۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے رہے ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے ۔ ایک دوسرے کی طرف مسلسل دیکھتے رہے ۔ اچانک عابدہ کو خیال آیا اور وہ پوچھنے لگی -

" انور ـــ تمہیں آجکل کتنی تنخواہ ملتی ہے ۔ ؟ "

" دوسو پندرہ روپے اور اب تک تقریباً ایک ہزار روپے سیونگ بینک میں جمع کر چکا ہوں "

" بس ـــــ ؟ "

" بس ـــــ " انور نے ہلکی سی آہ بھرتے ہوئے دل میں سوچا -

" عابدہ تجھے کیا معلوم مہینے کسطرح روزمرہ کی ضروریات کا گلا گھونٹ گھونٹ کر تھوڑی سی تنخواہ میں سے یہ رقم بچائی ہے "

" اور تم بی ۔ ایس ۔ سی فیل ہو "

" دوسرے الفاظ میں میں ایف ایس سی کر چکا ہوں " انور نے ہنستے ہوئے کہا ۔ مگر عابدہ اسی سنجیدگی کے ساتھ کہتی گئی ۔

" انور تمہیں معلوم ہے میرے سرپرستوں کے سر پر آجکل ایک بجلی کا انجینئر سوار ہے ـــ عراق میں ملازمت کر رہا ہے "

" تمہارے والدین کو بڑی دور سے "شاک" لگا ہے "

" بھئی " ڈیلیٹ " بھی تو زیادہ ہے ـــــ مجھے سنایا گیا ہے کہ عام ملکی الیکٹریکل انجینئروں سے تگنی ماہوار آمدنی ہے "

" تو پھر تم میرے ساتھ پشاور بھاگ چلو ـــ زیادہ خطرہ ہوا تو قبائلی علاقے میں لے چلوں گا "

" انور ـــــ تم تو واقعی پٹھان دل ہو چکے ہو "۔ عابدہ نے مصنوعی تعجب کے ساتھ کہا اور پھر وہ دونوں ہنسنے لگے ۔ مگر جلد ہی عابدہ کے چہرے پر پھر سنجیدگی چھا گئی ۔ وہ کہنے لگی -

" انور ـــ آخر تم کچھ کرتے کیوں نہیں "

" کیا کروں ـــــ " انور انگڑائی لیتے ہوئے بولا -

" تعلیم ہی مکمل کر ڈالو ـــــ "

"کر ڈالی — آ گئے —"

"آ گئے — آیت —"

عابدہ کو غصہ آ گیا اور اسنے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا انور نے عابدہ کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"عابدہ سنو — تم بی۔ اے کر لو —"

"پھر کیا ہوگا"

"پھر ادھر عطیہ کی کہیں شادی ہو جائے گی۔ ادھر میں اپنے محکمے میں ترقی کر لوں گا اور اسکے علاوہ کچھ روپے بھی جمع ہو جائیں گے — اور پھر میں بھابھی کو کسی نہ کسی طرح — تم سمجھیں نا —"

"نہیں" — عابدہ نے قصداً کہہ دیا۔

"بھئی مطلب یہ کہ پھر ہم میاں بیوی کی حیثیت سے سوات چلیں گے اور وہاں جو نیلم ندی ہے — نا —"

"لیکن اس عرصے میں اگر کوئی انجنیئر آ گیا —"

"تو پھر میں کیا کروں گا یہ جاننا چاہتی ہو —"

"دیکھو انور —" عابدہ نے انور کو سمجھانا چاہا۔

"دیکھ رہا ہوں —" انور کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"میرا مطلب ہے — میرا گھرانہ لاکھ آزاد خیال کہلاتا ہے مگر جو کچھ تم سمجھے بیٹھے ہو وہ ناممکن ہے — دوسرے تمہاری مالی حالت میرے گھر والوں کی نظر میں تسلی بخش نہیں۔ اسکے علاوہ اگر تمہارے والدین ہوتے تو شائد کوئی صورت پیدا ہو جاتی — بھائی اور بھابھی سے تمہاری بنتی نہیں ہے"

"عابدہ — تم بڑی سنگین اور کمینی باتیں کر رہی ہو"

انور تقریباً روتے ہوئے چیخ پڑا۔

"انور — آخر تم کب تک خلاؤں میں اڑتے رہو گے"

عابدہ انتہائی اداس اور مایوس نظر آ رہی تھی۔

اور پھر وہ دونوں دیر تک چپ چاپ بیٹھے اپنے اپنے خیالات کے جالے میں کیڑوں کی طرح پھنسے رہے اور قسمت کی مکڑیاں اپنے ان شکاروں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہیں !!!

★ ★ ★

شام کو بانو کے اصرار پر میں نے شیو بنائی۔ پھر میں دیر تک گرم پانی سے نہاتا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر نہاتا رہا اور پھر سوچتا رہا — آخر بانو نے حمام کا دروازہ پیٹ کر مجھے خیالات کی دلدل سے نکالا۔

میں نے بانو کے اصرار پر کریم کلر کی گیبرڈین کا سوٹ پہنا اور گہری سرخ ٹائی لگائی۔ اگرچہ خوش پوشی میری فطرت ہے مگر اس روز نہ جانے کیوں بن ٹھن کر باہر نکلتے ہوئے مجھے عجیب وغریب الجھن سی ہو رہی تھی بانو میری اس الجھن کو

نے ہوئے محبت کرنے والی وفا شعار بیویوں کی طرح میرا موڈ بدلنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اور مجھے بانو بلاوجہ بری
رہی تھی بس یونہی غصہ آئے جا رہا تھا۔ مگر ان احساسات کے باوجود میرا لہجہ حسب معمول نرم تھا۔ میں نے بانو کے پوچھنے
سکی ساڑھی کی تعریف کی۔ میں نے اسکے جوڑے میں کلپ بھی لگادئے اور میں نے بانو کے کہنے پر شاہد کی جیکٹ کا زپ بھی تبدیل کیا

جب ہم کیبن سے نکل کر ڈیک پر پہنچے تو بڑی ہی پیاری ہوا چل رہی تھی۔ سورج ڈھل چکا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے آسمان
سمندر کے سنگم پر سورج کا نارنجی رنگ کا آدھا تھال سمندر میں ڈوب گیا ہو۔ سورج کے باقی حصے کے قریب ہی سُرمئی
ل کا ایک ٹکڑہ تھا۔ اس سُرمئی بادل میں سے چھن چھن کر نکلتی ہوئی شعاعیں کہیں اودی تو کہیں کاسنی ہوگئیں تھیں اور یہ
یہ دور تک آسمان پر متوازی خطوط بناتی چلی گئیں تھیں۔ اسوقت چونکہ "بار" کھلی ہوئی تھی اس لئے لوگ بیئر کے
ے اور وسکی کے گلاس لئے ہوئے بانو ریلنگ سے لگ کر کھڑے گویا ڈھلتے ہوئے سورج کا "جام صحت" پی رہے تھے یا پھر
بل کی آرام کرسیوں پر نیم دراز تھے رات کے کھانے کے بعد "ہاؤزی ہاؤزی" کا نوٹس لگا ہوا تھا۔ بانو کے سوال پر میں
"ہاؤزی" کے کھیل نما جوئے کا طریقہ بتانے لگا کہ اتنے میں مجھے بیگم توحید صاحب اپنی بچی کے ساتھ آتے نظر آئے۔ عین اس
ت میرے دل کو دھچکا سا لگا جیسے زندگی کی ڈگر پر اپنی مستقل رفتار سے چلتی ہوئی دل کی دھڑکنوں میں سے ایک دھڑکن
لڑکھڑا گئی ہو .... میں نے بانو سے سردی کا بہانہ کر کے کیبن میں واپس چلنے کے لئے کہا۔ مگر بانو انکار کر کے
مسز توحید کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی میں نے سگریٹ سلگائی اور توحید صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ بیگم توحید
کے چہرے پر سست رفتار سفر کی ذہنی تھکن کے آثار تھے انہوں نے ہلکا سا میک اپ کر رکھا تھا اور سفید ساڑھی پر سیاہ پلش
کوٹ پہن رکھا تھا۔ بیگم توحید کو غالباً معمولی سا زکام بھی تھا کیونکہ وہ بار بار ویکس سونگھ رہی تھیں۔ شاہد بیگم توحید کی بچی
ہاتھ پکڑ کر ریلنگ کی طرف لے گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے سمندر کی لہروں کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

میں توحید صاحب کے ساتھ سفر کی طوالت اور بناسپتی گھی کے کھانے کے متعلق باتیں کرنا لگا۔

توحید صاحب بوڑھے انگریزوں کی سی زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ مختصر مختصر جملے ادا کرتے رہے۔ بانو اور بیگم توحید
یک دوسرے سے باتیں کرتی ہوئی عرشے پر کافی دور چلی گئیں۔ اور پھر میں نے دیکھا بانو کسی بات پر کھلکھلا کر ہنسی اور اس نے ہنستے ہوئے
بے تکلفی کے ساتھ بیگم توحید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں حسد کی آنچ محسوس کرنے لگا اور میرا جی چاہا کہ ہنستی ہوئی بانو پر بیگم
حید کے سامنے جا کر برس پڑوں اور اسے فوراً کیبن میں جانے کے لئے کہہ دوں جب رات کے کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم کیبن میں
ٹ آئے۔ بانو بیگم توحید سے بڑی متاثر ہوئی تھی اور انکی خوش مزاجی کا ذکر کر رہی تھی میں نے اپنے آپ کو بستر پر گراتے ہوئے
ا "ابھی کمبخت چھتیس گھنٹے کا سفر باقی ہے" بانو پاس بیٹھ کر میری ٹائی کی گرہ کھولنے لگی۔ پھر اس نے جھک کر میری پیشانی
بوسہ لیا۔ میں بانو کے ہاتھ کو اپنی آنکھوں پر رکھ کر اپنے خیالات پر نادم ہونے لگا جن سے بانو بے خبر تھی !!!

★ ★ ★

دن بھر کھیل کھیل کر تھکا ہوا شاہد جب سو گیا اور بانو کمبلوں میں دبک گئی تو میں ایک کتاب لے کر کیبن سے باہر نکل آیا۔
عرشے پر ہوا اگرچہ تیز تھی مگر اسمیں خنکی قدرے کم تھی۔ جہاز چونکہ خلیج فارس سے نکل کر بحیرۂ عرب کی چنچل لہروں کی گود میں

پہنچ چکا تھا اسلئے ہلکی ہلکی خواب آور "رولنگ" کا لطف آ رہا تھا گویا اگر شراب نہیں تو کم از کم کھجور کے "نیرا" کا سا سرور آ رہا تھا۔

مینے ایک آرام کرسی پہ نیم دراز ہو کر کتاب کھولی۔ یہ ہنری جیمز کے ناول THE PORTRAIT OF A LEADY کا قرۃ العین حیدر کا کیا ہوا ترجمہ تھا۔ مینے ایک بار پھر کتاب کے آغاز میں فراق کے اس شعر کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا :۔

بزم میں جاگتا خواب یہ دیکھا
ہمیں چراغ ہمیں پروانے

اور میں ایک بار پھر اسی شعر کو سوچتا رہ گیا ....!

★ ★ ★

جب انور کو اپنے تیسرے خط کا بھی جواب نہ ملا تو ایک پرانے اندیشے کا بھوت اسکے ذہن میں وحشیانہ ناچ ناچنے لگا اور اسنے گھبرا کر دفتر سے ہفتے بھر کی چھٹی لی۔ اور وہ ایک بار پھر ـــــ کے اسی اسٹیشن پہ کھڑا تھا جہاں سے آٹھ ماہ پہلے اسنے روانہ ہوتے ہوئے روتی ہوئی عابدہ کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کی تھی اور عابدہ نے ایڑیاں اٹھا کر اسے الوداعی اشارے کئے تھے۔ اور وہ عابدہ کے الوداعی اشاروں کا ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آخر ریل کے حرکت کرتے ہی ایکدم عابدہ کے چہرے کی رنگت اس قدر ڈرا دینے والی حد تک کیوں سفید ہو گئی تھی۔ اور پھر پشاور تک عابدہ کی اڑی اڑی سی رنگت، خوفزدہ ادھ کھلے لب اور بے بسی کے آنسو بہاتی ہوئی آنکھیں اس کے خیالوں میں بسی رہیں۔ اور ریل کے ساتھ ساتھ ٹیلی فون کے تار کے لامتناہی سلسلے کی طرح اسکے ذہن میں طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں کا تانتا بندھا رہا۔ وہ جاگتے ہوئے سوچتا رہا اور سوتے ہوئے پریشان خواب دیکھتا رہا۔ اسنے ہر نئے سگریٹ کے ساتھ غم دل کو امید کے دھوئیں میں تحلیل کرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ امید کا دھواں ہی تحلیل ہوتا رہا۔ پھر پشاور کے اسٹیشن پر اتر کر اسے عابدہ کے الفاظ یاد آئے۔

"...اور سنو جی ـــ جب دل بہت گھبرائے تو پشاور کا پانی پی لیا کرنا "

تب تین دن کے مسلسل سوگ کے بعد اچانک اسکے لبوں پہ مسکراہٹ کھیل گئی اور ایک بار پھر اسی اسٹیشن پہ کھڑے سے عابدہ کا وہی جملہ یاد آ گیا۔

"...اور سنو جی ـــ جب دل بہت گھبرائے تو پشاور کا پانی پی لیا کرنا "

اور وہ مسکرا دیا۔

جب وہ عابدہ کے دیئے ہوئے خفیہ پتہ پہ پہنچا تو اسے اپنے تینوں خطوں کے ساتھ عابدہ کا ایک خط بھی ملا۔ اس نے رازداں سے گھبراہٹ میں کئی سوالات کر ڈالے۔ رازداں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ انور نے جھنجلا کر جلدی سے عابدہ کا خط کھولا۔

انور!

شائد تم سمجھتے تھے کہ جب پانی سر سے گزرنے لگے گا تو میں اپنے ہاں کی فلموں کی کسی ہیروئین کی طرح ایک ہلکا پھلکا اٹیچی کیس ہاتھ میں لے کر اور ماں باپ کے روپے چرا کر گھر سے نکلوں گی اور ریلوے اسٹیشن سے تمہیں تار دے کر خود پشاور جانے والی ٹرین میں سوار ہو جاؤں گی۔ پھر تم نہائت اطمینان کے ساتھ پشاور اسٹیشن پہ مجھے اتار لوگے اور پھر بقول

کوئی "پٹھان مولی ساب ہمارا شادی بنائے گا" اور پھر ہم سوات جاکر دریائے نیلم کے کنارے ایک تاج محل بنالیں گے جسمیں ہماری موت کے بعد ہمارے بچے ہمیں دفن کردیں گے ۔!!!

شاید کیا تم یقیناً یہی کچھ سمجھتے تھے ۔ اور میری ہمت بڑھانے کے لئے مجھے پنجاب کی سوہنیوں اور سندھ کی ماروپوں کی وفا کی داستانیں آدھی آدھی رات تک سرگوشیوں میں سنایا کرتے تھے ۔

تم سمجھتے تھے کہ میں پڑھی لکھی ہوں، آزاد خیال گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، پسند نہیں کرتی اور راتوں کی تنہائی میں تمہارے دل کی دھڑکنیں گنا کرتی ہوں ـــــ اور میں وقت آنے پر دنیا کے سامنے چٹان بن کر کھڑی ہو سکتی ہوں ۔

مگر تم نے یہ نہ سمجھا کہ جس طرح انسانی جسم کا ایک سایہ ہوتا ہے ۔ اسی طرح انسانی عقل کا بھی ایک سایہ ہوتا ہے جسے ہم نے "بزدلی" کا نام دے رکھا ہے ۔

میری عقل اور اسکے سائے نے میرے ہاتھوں کو ایک بار بھی "کچے گھڑے" کی طرف نہیں بڑھنے دیا ۔

پھر میری عقل کے نور کا دائرہ پھیلنے لگا اور جینے کے نئے نئے انداز اور زندگی کے نئے نئے رُخ مجھے دکھائی دینے لگے ۔ دل کی باتیں بچکانہ نظر آنے لگیں اور وقت کی مصلحتیں بڑے بڑے چاند بن کر زندگی کے تاریک افق پر ابھر آئیں اور پھر یونہی رفتہ رفتہ میں سوچنے لگی کہ یہ محبت وحبت سب بکواس ہے ـــــ دل تو بادلوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں ـــــ ہر وقت چلتے رہتے ہیں، ملتے رہتے ہیں، بچھڑتے رہتے ہیں ۔!!!

غصہ آرہا ہوگا ؟

مگر ـــ آج نہیں تو کل جب کوئی اور عابدہ تمہاری زندگی میں داخل ہو چکی ہو گی تو تمہیں میرے اس تلخ مگر سچے جملے کی سچائی کا احساس ہوگا ۔

ہاں ـ ایک اور بات !

یاد ہے جب ایک روز ہم نہائت سنجیدگی کے ساتھ دنیا کی اس منڈی کے دلالوں کی سی گھٹیا باتیں کر رہے تھے تو تم نے میری دوراندیشی اور میری کتابی عقلمندی سے تنگ آکر کہا تھا "رانی سنو ـــ ہماری دولت، ہمارا مکان ہمارا بینک بیلنس تو ہماری محبت بھری زندگی کے یہ شب و روز ہیں ۔ اور کل ـــــ یہی شب و روز "یادیں" بن کر آج سے کہیں زیادہ تاثر آفریں اور دلگداز اور روح پرور ہو جائیں گے "

تمہاری یہ بات اسوقت مجھے یونہی شاعری سی معلوم ہوئی تھی کیونکہ اسوقت میں بڑے ہی کاروباری موڈ میں تھی اور گویا تمہیں زندگی کے سنگین حقائق سے نظریں ملانے کے لئے کہہ رہی تھی . . . . مگر آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تمہارے اس جملے کا تابوت میرے دل میں دفن ہے !

آؤ آج ہم اپنی زندگی کے اس بیش قیمت مشترکہ سرمائے کی ہر ممکن حفاظت کا عہد کریں ۔

ہم عہد کریں کہ ہماری زندگیوں کے ساتھیوں کو ہمارے ماضی کے محلات میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی محبت کے مزار ہمارے دلوں میں مستور رہیں گے اور زندگی ہمیں جو بھی نیا غم اور نئی خوشی دے گی ہم خندہ پیشانی

کے ساتھ قبول کرتے رہیں گے ۔ !

میں نے تاریخ میں پڑھا تھا کہ عظیم راجپوتوں کی بیٹیاں ستی ہوجاتی تھیں اور یہ سوچ کر کہ تم بھی راجپوت ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اپنے نازک کندھوں پر ایک قابل رشک فرض کا بوجھ محسوس کرتی تھی ۔ کئی مرتبہ میں نے اپنے اس تصور کو تمہارے سامنے بیان کرنا چاہا مگر ہمیشہ یہی سوچ کر رہ گئی کہ کہیں تم میرے اس مقدس خیال کو ہنسی میں نہ اڑا

مگر آج تمہارا کوئی قہقہہ میرے کانوں میں نہیں پہنچ سکتا ہے ۔ اور پھر آج تو میں خود ان ستی ہونے والی عورتوں کی عظمت کی قائل نہیں رہی ۔ آج تو مجھے ہر وہ عورت بزدل معلوم ہو رہی ہے ـــــ زندگی بھر جلنے سے ڈرتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور چند لمحوں میں زندگی کی اُستروں کی مالا سے نجات حاصل کر لیتی تھی ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی !!

یہ خط کیا ہے ۔ یوں لگتا ہے گویا اپنی ہی زندگی کے مقدمے کا آپ ہی ایک جج کی حیثیت سے فیصلہ لکھ رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ فیصلہ اس قدر دلچسپ معلوم ہو رہا ہے کہ جی چاہتا ہے لکھتی ہی چلی جاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

★　★　★

اور پھر وہ سفر کی آخری رات تھی ۔ اس رات میں بے حد اداس تھا ۔ میں قسمت کے نرالے مذاق پر حیران و پریشان تھا جو سفر کے دوران میں میرے ساتھ کیا جا رہا تھا ۔ کبھی کبھی تو مجھے ذرا سی دیر کے لئے سفر اور اسکے تمام واقعات ۔ سردیوں کی لمبی رات کا ایک لمبا خواب معلوم ہونے لگتے ۔

سفر کی آخری رات ڈھل رہی تھی اور جہاز اپنی مخصوص سست رفتار کے ساتھ کراچی کے ساحل کی طرف رینگ رہا تھا بانو میری خاموشی سے اکتا کر مجھے عرشے پر چھوڑ کر کیبن میں چلی گئی تھی ۔

میں نے دیکھا ـــ سامنے سے عجیب بوہیمین انداز میں اپنے لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے عابدہ چلی آ رہی تھی ۔ گو میں اسی طرح آرام کرسی پر بیٹھا رہا مگر ذہنی طور پر میں اس الوداعی ملاقات کے لئے تیار ہو چکا تھا ۔

"وہی یادوں کے محل ـــــ" عابدہ نے بڑی احتیاط کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا ۔

میں خاموشی سے کسی قدر مسکراتے ہوئے عابدہ کی طرف دیکھتا رہا ۔ دیکھتا گیا ۔ "وہی آنکھیں ـــــ" میں نے سوچا "نہیں وہ کہاں" میں نے اپنے آپ کو سمجھایا "ان میں تو تجربہ ہے، احتیاط ہے، عقلمندی ہے، اطمینان ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان میں گزرے ہوئے دنوں کی کوئی جھلک باقی نہیں ہے "

دفعتاً عابدہ گھوم گئی ۔ مگر وہ اسی طرح کھڑی رہی ۔ صرف اب چہرے کے بجائے اسکی پیٹھ میری طرف تھی ۔ مجھے احساس ہوا کہ میں بالکل پاگلوں کی طرح عابدہ کو گھورے جا رہا تھا اسی لئے اس نے منہ موڑ لیا ۔ میں نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، عابدہ معاف کرنا ـــــ تمہیں دیکھتے دیکھتے میں نہ جانے کیا سوچنے لگا تھا ۔

"میں اب چلتی ہوں انور ـــــ توحید آ گئے تو نہ جانے کیا سمجھ بیٹھیں "

عابدہ یہ کہہ کر بھی اسی طرح کھڑی رہی ۔

میں خاموش بیٹھا رہا ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا بات کروں ۔ اگرچہ میرے ترکش میں باتوں کے بڑے بڑے زہریلے

تیر بھرے ہوئے تھے۔

"بانو ـــ بہت اچھی ہے۔ انور تم بڑے خوش قسمت ہو"

"مگر مجھے توحید صاحب سے مل کر بڑی مایوسی ہوئی کم از کم میں تو انہیں اچھا آدمی نہیں کہہ سکتا" آخر میں نے ہلکا سا تیر چھوڑ دیا تیر نشانے پر لگا۔ عابدہ گھوم کر شکوے اور شکائتیں کرتی ہوئی زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگی۔ ذرا سی دیر کے لئے عابدہ نے مجھ سے نظریں ملائیں اور پھر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں عابدہ کی مشکل کو سمجھ رہا تھا اور مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ اس وقت عابدہ کے چہرے پر دوراندیشی، بدنامی کے خوف، نفرت، غصے، فوراً چلدینے کی آرزو اور بھلائے ہوئے قصوں کو بھولے رہنے کی خواہش کی کرنیں جھلملا رہی تھیں۔ میں عابدہ کے احساسات کی جھلک اسکے چہرے کے آئینے میں دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ عابدہ نے ایک بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور مجھے مسکراتا دیکھ کر اسکے چہرے پر گھبراہٹ اور ندامت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے جلدی سے کہا

"اچھا انور ـــ خدا حافظ"

پھر مجھے محسوس ہوا جیسے عابدہ جانے کے لئے صرف پہلا قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ عابدہ کی یہ پریشانی دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ عابدہ نے نفرت اور غصے کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ اور میں نے اپنے ترکش کا سب سے زہریلا تیر چھوڑ دیا:۔

"یہ محبت وحبت سب بکواس ہے۔ دل تو بادلوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں ہر وقت چلتے رہتے ہیں، ملتے رہتے ہیں ـــ بچھڑتے رہتے ہیں .... ہے نہ عابدہ؟" مگر جواب دینے کے بجائے عابدہ نے پہلا قدم اٹھا لیا۔ وہ تیزی سے چلنے لگی۔ چند قدم چل کر اسنے مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں بدستور آہستہ آہستہ ٹہلنے جا رہا تھا۔ عابدہ تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کیبن کی طرف چلی گئی

اور پھر مجھے محسوس ہوا جیسے کسی بے رحم ہاتھ نے میرے دل کے لوتھڑے کو گیلے اسفنج کی طرح مٹھی میں لے کر دبا دیا ہو۔ میں گھبرا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اسوقت بڑا ہی اداس اور دکھی تھا۔ اسوقت اگر کوئی بھی میرے ساتھ ذرا سی ہمدردی کرتا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ میں کیبن کی طرف چلدیا۔ میں نے آہستہ سے کیبن کا دروازہ کھولا۔ بجلی جلا کر بانو اور شاہد کی نیند خراب کرنے کے بجائے میں نے لالٹین جلا لیا۔ میں نے دیکھا گہری نیند میں شاہد ننھے ننھے سانس لے رہا تھا۔ اسکی چھوٹی سی ناک کے متحرک نتھنے دیکھ کر جی چاہا کہ انہیں چوم لوں۔ مگر میں لالٹین کی کانپتی ہوئی لو کی روشنی میں انسانی زندگی کے سچے اور مقدس سکون کو شاہد کے چہرے پر دیکھتا رہا۔

پھر میں نے برابر کی برتھ پر محوِ خواب بانو کو دیکھا ـــ مجھے بانو کے چہرے پر زندگی سے پیار کی پرچھائیں نظر آئی۔ میں کچھ دیر بانو اور شاہد کے درمیان کسی نادم اخلاقی مجرم کی طرح سرنگوں کھڑا رہا۔ اور پھر نہ جانے کیوں میں نے بیٹھ کر اپنے لب بانو کے پاؤں پر رکھ دیئے۔

اور پھر نہ جانے کب بانو نے میرا سر اپنے قدموں سے اٹھا کر اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبا اکبرآبادی

چھپ رہا ہے ہم سے اے مغرورِ یکتائی کہاں
بزم میں آئیں گے پھر ایسے تماشائی کہاں

پھر وہ نورِ کیف زیرِ چرخِ مینائی کہاں
اٹھ گئے جب ہم تو محفل رنگ پر آئی کہاں

اور دامانِ طلب میں چند رخنے پڑ گئے
ہم فقیروں کی ہوئی ہے ہمت افزائی کہاں

ادھ کھلی کلیاں بھی گلشن میں نہ باقی رہ سکیں
دستِ گلچیں کو ملے گلہائے صحرائی کہاں

جب سے ہے محرومِ ناخن پنجۂ دستِ جنوں
پھر مرے چاکِ گریباں پر بہار آئی کہاں

تم سے کہہ کے طاقتِ گفتار رخصت ہوگئی
ہم نے اپنی داستانِ شوق دہرائی کہاں

دھجیاں جیب و گریباں کی اٹھالے جائیے
آپ سے قیمت طلب کرتا ہے سودائی کہاں

سونے والے بے تکلف اٹھ، ہمیں معلوم ہے
حلقۂ آغوش بن جاتی ہے انگڑائی کہاں

رہ گیا ہے دعوتِ ابر و ہوا پر منحصر
اب وہ پہلا انہماکِ بادہ پیمائی کہاں

کچھ مزا آنے لگا تھا بیقراری میں ہمیں
آپ نے بھی کی ہے تاکیدِ شکیبائی کہاں

وہ سنیں تو حالِ دل ہم مستقل کہتے رہیں
اے صبا رکھتی ہے اپنی تابِ گویائی کہاں

صبا اکبرآبادی

کہتے ہیں محشر میں آ نکلا یہ سودائی کہاں
کام آئی ہے زمانے کی شناسائی کہاں

بیقراروں پر اٹھی انکی نگاہِ التفات
ناشکیباؤں کو اب فکرِ شکیبائی کہاں

صورتِ مکروہ شرمائی نگاہِ عشق سے
ہم نے جب دیکھا تو دنیا سامنے آئی کہاں

غم کا ویرانہ بھی تھا امید کے گلشن بھی تھے
دلمیں سب کچھ تھا توجہ تم نے فرمائی کہاں

خود خطیب و خود مخاطب خود سوال و خود جواب
کیا خبر گم ہو گیا احساسِ تنہائی کہاں

اسطرف دم ٹوٹنا اور اسطرف کسلِ خمار
غم کا خمیازہ کجا مستی کی انگڑائی کہاں

ہم تمہارے نام سے رسوا ہوں جب پھر دیکھنا
تم نے دیکھے ہیں ابھی اندازِ رسوائی کہاں

حیرتِ نظارہ نے پیدا کیا ان کا جواب
آئینے کے سامنے پندارِ یکتائی کہاں

جو اڑا کر دشتِ غربت میں ہمیں لے آئی تھی
پھر وطن کی سمت سے ایسی ہوا آئی کہاں

لگ گئی گھر میں چراغِ شامِ تنہائی سے آگ
اب جلائیں گے چراغِ شامِ تنہائی کہاں

اے صبا میخانے کے در تک تو آیا ساتھ ساتھ
پھر غمِ کونین کی صورت نظر آئی کہاں

حمید عظیم آبادی

دورِ ساغر کا مزا آئے گا میخانے میں جب — روئے ساقی کی جھلک دیکھوں گا پیمانے میں جب

جلوۂ نورِ ازل کی کیا فراوانی کہوں — نقشِ حیرت بن گیا پہنچا صنم خانے میں جب

نور کا دریا نظر آتا تھا لہراتا ہوا — دستِ سیمیں سے انڈیلی اس نے پیمانے میں جب

حسرتِ ناکام کیوں بنتی نہ جزوِ میکشی — خود پرستوں نے قدم رکھے ہیں میخانے میں جب

دیکھا دیوانے نے حسرت سے گریباں کی طرف — بوئے کاکل چھیڑنے کو آئی ویرانے میں جب

پھر تو پینا یا نہ پینا ہاتھ میں رندوں کے ہے — جانِ میکش آ گئی شیشے سے پیمانے میں جب

اک سہارا مل گیا کعبے کے دامن کا اسے — خود پرستی نے جگہ پائی نہ بتخانے میں جب

پھر تو دنیائے خرد ہی اس سے بہتر ہے کہیں — امتیازِ کفر و دیں باقی ہے میخانے میں جب

کیوں تجھے تاریکیِ تربت سے ہے الجھن حمید

شمعِ الفت ہے فروزاں دل کے کاشانے میں جب

ارتضیٰ عزمی

خود رفتہ سے ہیں منزل محبوب میں ہم بھی
دل بھی نہیں قابو میں بھٹکتے ہیں قدم بھی

شکوہ بھی ہے تجھ سے ہمیں امیدِ کرم بھی
ہاں، تیری محبت کی قسم خوب ہیں ہم بھی

ہر راہ گذر میں تری خوشبو سی بسی ہے
لیکن نہیں ملتا ہے ترا نقش قدم بھی

جس وقت تری بزم میں کل ذکرِ وفا تھا
اتنا تو ہمیں ہوش ہے موجود تھے ہم بھی

جب تیری نگاہوں کا خیال آگیا ساقی
ٹھکرا دیا رندوں نے ترے ساغرِ جم بھی

دنیا نے تجھے چھین لیا پہلے ہی مجھ سے
اب دل سے کہیں چھین نہ لے یہ ترا غم بھی

بہلاؤ گے کیسے دلِ بیتاب کو عزمی
آئی نہ کہیں راس جو صبحِ شبِ غم بھی

رعنا اکبر آبادی

عجب فضا تری منزل میں ہم نے پائی ہے
کہ جو قدم ہے وہ عنوانِ نارسائی ہے

شکیبِ عشق میں اک آگ سی لگائی ہے
تمہاری یاد قیامت کو ساتھ لائی ہے

متاعِ ہر دو جہاں جس جگہ گنوائی ہے
اسی گلی میں ہمیں حسرتِ گدائی ہے

ابھی تو زخمِ خزاں ہم قفس میں گنتے ہیں
ابھی یہ ہم سے نہ کہنا بہار آئی ہے

ہزار بار جلے ہیں چراغ امیدوں کے
ہزار بار شبِ ہجر جگمگائی ہے

زمانہ اپنی طرف کھینچنے لگا مجھ کو
دہائی ہے نگہِ یار کی دہائی ہے

کبھی ہوئی ہے یہ احسان نا فراموشی
کبھی شکایتِ غم میرے لب تک آئی ہے

کمالِ ابلہیِ عقل ہے یہ عرفاں بھی
کہ بندگی ہی مری حاصلِ خدائی ہے

اب اپنے رونے کا شکوہ نہیں زمانہ سے
کسی زمانہ میں ہم کو ہنسی بھی آئی ہے

نیازِ عشق کو ٹھکرا دیا حقارت سے
ترے غرور کا احسانِ انتہائی ہے

کیا جو غور تو سمجھا کہ زندگی رعنا
بسر تو ہو نہ سکی ہے مگر گنوائی ہے

کرارؔ نوریؔ

پھر سے دل میں آگ لگی ہے ذہن میں خوش افکاری ہے
شائد اب کے سال بھی نوریؔ جینے کی تیاری ہے

کوئی تو کھل کے بات کہو تم کیسی یہ فنکاری ہے
خوف زدہ ہر مصرعہ ہے ہر بات میں ناہمواری ہے

چپ کا طعنہ دینے والو، کوئی تو ہم آواز بھی ہو
تنہا۔ اور بے ساز کے گانا کتنی بڑی دشواری ہے

گلشن میں آواز اک آئی جیسے بلبل کی چہکار
آنکھ کھلی تو سب نے دیکھا پھولوں کا بیوپاری ہے

کیا غم دوراں کیا غم جاناں کیسے کیسے تیر لگے
نوریؔ اپنا سینہ ہے یا زخموں کی پھلواری ہے

لیث قریشی

ختم ہوگا نہ مرادرسِ وفا میرے بعد — کہ رہیں گے مرے نقش کفِ پا میرے بعد

کون رہ جائے گا آنکھوں میں کھٹکنے کیلئے — گل کھلائے گی نہ گلشن میں صبا میرے بعد

گرمئِ دیدۂ بینا سے رہے گا محروم — حسن ہوگا بھی اگر جلوہ نما میرے بعد

اے خمِ جادۂ دشوار نہ آئے گا کوئی — رہروِ مسلکِ تسلیم و رضا میرے بعد

زلفِ حالات میں تیری لئے رنجیدہ ہوں — تو نہ پائیگی کوئی عقدہ کشا میرے بعد

ابھی آفاتِ زمانہ ہیں مجھی تک محدود — یاد آجائیگا لوگوں کو خدا میرے بعد

فخر فرمائیگا کس بے سروساماں پہ خلوص — ہو گی نازاں نہ کسی پر بھی وفا میرے بعد

کون رکھیگا بھلا ساغر و صہبا کا بھرم — خون برسائیگی ساون کی گھٹا میرے بعد

تھا یہی مسئلۂ ہستیِ موہوم کا حل — سہل اک عقدۂ دشوار ہوا میرے بعد

حسنِ تنظیم تھا دنیا میں مری ذات سے لیثؔ — ناروا شئے بھی ہوئی ہائے روا میرے بعد

ابوظفر صہبا

خواہشِ بادہ کشی تازہ نہیں ہے ساقی
اب مجھے پیاس کا اندازہ نہیں ہے ساقی

تلخ سے تلخ پرانی سے پرانی ہو عطا
غم جو دل میں ہے مرے تازہ نہیں ہے ساقی

بزم سونی سی ہے اک قبلۂ عالم کے بغیر
کوئی فقرہ کوئی آوازہ نہیں ہے ساقی

صحنِ گلشن میں تو بکھرے ہیں گلوں کے اوراق
کیا یہاں بھی کوئی شیرازہ نہیں ہے ساقی

درِ میخانہ پہ کیوں شیخ کو روکا تو نے
یہ تو فردوس کا دروازہ نہیں ہے ساقی

خطِ پیمانہ مٹا دے کوئی کہدے نہ کہیں
کہ تجھے ظرف کا انداز نہیں ہے ساقی

تیرا صہبا تو ہے اک رندِ ریاکار نہیں
اس کے چہرے پہ کوئی غازہ نہیں ہے ساقی

رسالوں میں

(اس ماہ)

ثقافت لاہور:-

اپریل کا شمارہ ہمیں دیر سے موصول شدہ، اس میں تاثرات کے تحت شاہ جعفر صاحب نے اداریہ میں رسالہ معارف پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا مظہر جان جاناں کے مکتوبات کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ ہندوؤں کو مشرک نہیں سمجھتے تھے، ان کی رائے میں ہندو موحد کے بھٹکے ہوئے افراد ہیں، ان کی بت پرستی اُلوہیت میں شرک نہیں، نہ انکا سجدہ سجدۂ عبودیت ہے اس کے برخلاف اہل عرب اپنے بتوں کو متصرف اور مؤثر بالذات مانتے تھے۔ ضمناً سماع کی بحث بھی آگئی ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا مضمون فطرت کا مفہوم بھی اس شمارے میں شائع ہوا ہے اس طویل مضمون میں فطرت (NATURE) کے متعلق طویل تر مباحث کو اور اہل فلسفہ و مذاہب کے تصورات کو خوش اسلوبی سے سمیٹا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ از روئے قرآن کائنات کی ہستی علی الاطلاق مستقل نہیں ہے، واجب الوجود صرف خدائے واحد کی ہستی ہے اور خالقیت و ربوبیت خدا کے جوہری و عینی صفات ہیں خدا کی ذات واحد مصدر وجود بھی ہے اور مقصود وجود بھی، فطرت تنظیم کا نام ہے اور مقصود تنظیم کا ...... شبیر احمد خاں غوری نے "فارابی کے سیاسی افکار" پیش کئے ہیں، فارابی کے افکار پر اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے لیکن غوری صاحب کہتے ہیں کہ فارابی اسلامی سیاسی فکر کا حامل نہ تھا۔ اس کے افکار نہ تو اسلام کے اصولی نظریات سے ماخوذ ہیں، نہ اس نے اپنے زمانے کی یا بعد کی مسلم سیاسی فکر کو اعتقاداً یا عملاً متاثر کیا ہے، وہ یونانی سیاسی فکر کا آخری نمائندہ تھا یہ مضمون اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ غوری صاحب نے فارابی کے افکار اور اسلام کی بنیادی تعلیم کا موازنہ پیش کرکے دونوں کا فرق بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس نے "ریپبلک" کو افلاطون کی ایڈیلزم کے بجائے نو افلاطونیوں کے "نظریۂ صدور کائنات" سے مستخرج کرنے کی کوشش کی ہے۔ جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے اپنے مضمون "مسلمان کا نصب العین" میں یہ سمجھایا ہے کہ مسلمان کا نصب العین اللہ ہے اور حکومت وغیرہ ضمناً بطور انعام الٰہی خود حاصل ہوتی ہے۔ شاہد حسین صاحب رزاقی نے "اقبال اور اسلامی سیاسی تصورات" پیش کیا ہے، اقبال کے سیاسی افکار پر بھی اس سے پہلے مضمون شائع ہو چکا ہے، رزاقی صاحب نے وضاحت کی ہے کہ اقبال فلسفی نہ تھے وہ انقلاب کے نقیب اور کشمکش حیات کے پیغام بر ہیں، اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ سیاست دین کی تابع ہے، سیاست کو دین سے الگ رکھنے کا تصور ایسے لوگوں کی ایجاد ہے جو ایمان عقیدہ اور ضمیر کی پابندی سے آزاد ہوکر انسانی حقوق پامال کرنا چاہتے ہیں، اسی لئے اقبال سیاست بے دین کو کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر کہتے ہیں، اسلامی مملکت ایک مسلکی مملکت ہے جس میں اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کو حاصل ہے، دو ہزار سال کی نظریہ سازی کے باوجود مغربی نظریۂ اقتدار اعلیٰ اس لئے ناقص رہا کہ

مفکروں نے لافانی، لامحدود اور فوق البشر اقتدار کو انسان اور انسانی اداروں سے وابستہ کرنے کی کوشش کی، جو انسان پر انسان کی خدائی کا سبب ہے، اقبال ایسے اقتدار کو ناجائز کہتے ہیں، رزاقی صاحب نے اپنے طویل مضمون میں، تصور امت، دائمی مرکز، دائمی قانون، دائمی آئین، فرد اور مملکت، زمین کی ملکیت، جائز دولت، جنگ، اجتہاد کی سرخیوں کے ساتھ اقبال کے تصور کو سمجھایا ہے۔ محی الدین احمد صاحب نے "زکات اور اسکی حقیقت" پر روشنی ڈالی ہے، اقامت صلوٰۃ اور نظام زکات پر ان کے تفصیلی مضمون کی یہ پہلی قسط ہے

فاران کراچی :۔

مدیر فاران نے مئی کے تازہ شمارے میں جدت و انقلاب اور اصلاح و تعمیر کی اصطلاحوں پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ اگر نقطہ نگاہ غلط ہو تو یہ خوشنما اصطلاحیں مستقل گمراہی بن جاتی ہیں، مغرب کے فکر و نظر کا، اخلاق و کردار کا، طرز زندگی اور اصول سیاست کا ہماری زندگی، اخلاقیات اور افکار و معتقدات سے کوئی ... نہیں ہے، لہذا پاکستان کے دستور کا ماخذ اساس اور منبع کتاب و سنت ہونا چاہیئے۔ محمد سلیمان فرخ آبادی کے قلم سے ایک مضمون "آداب جمعہ" شریک اشاعت ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس کا قوم ہونا اس کو یاد نہ دلایا جاتا رہے۔ قومی احساس، جماعتی شعور اور ملی تصور کو زندہ رکھنے کے لئے مختلف ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، اس روشنی میں جمعہ کی اہمیت کو سمجھنا چاہیئے، فرخ آبادی صاحب نے تفصیل کے ساتھ جمعہ کی اہمیت اور آداب سمجھائے ہیں، عبدالمجید حیرت شملوی کے نام مرحوم اسد ملتانی کے اکیس[۲۱] خطوط بھی اس شمارے میں درج ہیں، خطوط کی اہمیت ادب میں یوں بھی مسلم ہے چہ جائیکہ وہ کسی مشہور شاعر وادیب کے ہوں، ایک خط میں دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ عقل کے صحیح استعمال کا نام دین ہے اور غلط استعمال کا نام فلسفہ، یہ جملہ انہوں نے مولانا ایوب دہلوی کا نقل کیا ہے اور اسکی داد دی ہے۔ اخیر میں روح انتخاب کے تحت وحید الدین خاں کی کتاب "مارکسزم، تاریخ جسے رد کر چکی ہے" سے چند صفحات بھی درج کئے گئے ہیں جن میں کمونسٹ پارٹی کے سکریٹری اول مسٹر خروشچیف کی اس تقریر کے اقتباسات پیش کئے ہیں جو پارٹی کی بیسویں کانگریس فروری ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی اور جس میں اسٹالین کے جرائم گنائے گئے تھے۔

المجلس کراچی :۔

اس ماہ درس قرآن کے عنوان سے مولانا عبدالجبار نے چند آیتوں کی تفسیر پیش کی ہے جن میں حسن عمل اور تعمیر کردار کی ہدایات ہیں۔ مولانا محمد ایوب دہلوی کا مضمون "سبحان اللہ" بھی شریک اشاعت ہے اردو میں یہ عنوان بظاہر انشائیہ کا نظر آتا ہے لیکن بحث خالص ذات و صفات خداوندی کی ہے اور لفظ سبحان، اور تسبیح کے معنی سمجھائے گئے ہیں۔ شاہ حمید القادری کا اپنے مضمون "تصورات حیات و عمل اضداد" میں کائنات کی رنگارنگی اور اضداد پر روشنی ڈال کر بتایا ہے کہ سارا نظام حیات اسی پر قائم ہے۔ مولانا جیلانی کامل نظامی نے تنظیم و اتحاد کے عنوان سے سمجھایا ہے کہ وحدت مقصود اسلام ہے اور تفریق شیطانی عمل، اور یہ شیطانی عمل گذشتہ صدیوں میں انگریزوں کے ہاتھوں پرورش پاتا رہا جنہوں نے ساری دنیا میں مختلف ناموں سے انتشار پھیلا کر انسانوں کو اور خود مسلمانوں کو ٹکڑیوں میں بانٹ دیا۔ مولانا محمد تقی نجفی لکھنوی کے قلم سے "آغاز و انجام" کتاب زندگی پر ایک نظر دلنشیں انشائیہ ہے آدمی اپنے آغاز و انجام کو بہت کم سوچتا ہے حالانکہ اسی کو سب سے زیادہ سوچنا چاہیئے۔ صدر المجلس عبدالکریم اسماعیل مرچنٹ صاحب نے "جدید علم الکلام" کی ضرورت اور اسکی تدوین کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس مسئلہ پر صوفی غلام مصطفےٰ صاحب نے مفید خیالات

کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ اشتراکیت تو خطرناک ہے ہی، مگر اس سے بھی زیادہ خطرناک مغربی فلسفۂ حیات ہے اشتراکیت
اس کا صرف ایک پھل ہے۔ ضرورت پورے مغربی فلسفے کے توڑ کی ہے، اس کے علاوہ یہ تصور غلط ہے کہ دورِ حاضرہ کے مسائل اور [illegible]
کے مطابق اسلامی فقہ کو مرتب کیا جائے دورِ حاضرہ کے مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کیا جانا چاہئے اسی طرح جدید
کلام مرتب کرنے والوں کو بھی اسی اصول پر کام کرنا ہوگا۔

افکار کراچی :۔

تازہ شمارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے جدید شاعری اور نظم آزاد پر اظہار خیال کیا ہے، انہوں نے بتایا ہے کہ ۱۹۱۳ء
میں انگلستان اور امریکہ کے بعض شاعروں نے جدید نظم میں انقلابی تبدیلیوں کا خواب دیکھا جن میں ایلیٹ، اور پاؤنڈ وغیرہ
تھے، اور فرانسیسی ادیبوں نے بھی اسے آگے بڑھایا، ان کے خیال میں وہی شاعری اعلیٰ درجے کی ہے جس میں اظہارِ خیال اشاروں
کنایوں کے ذریعے ہوتا ہے اور اسی نقشے پر آزاد نظمیں اردو میں بھی لکھی گئیں ۱۹۳۶ء کے بعد کا زمانہ اس کے فروغ کا ہے۔ آزاد [illegible]
کے علمبردار جدت پسند تھے وہ ایک نیا اسلوب نکالنا چاہتے تھے۔

الشجاع کراچی :۔

مئی کے شمارے میں پروفیسر سید فیضی نے خودگری و خودنگری کے عنوان سے ایک مختصر مضمون میں اقبال کے اس [illegible]
امتیازی پر روشنی ڈالی ہے جو عام شاعری سے الگ ہے اور جس میں اثباتِ خودی کا پیغام ہے ''لیلیٰ معصوم تے'' یادوں کے
چراغ جلتے ہیں'' میں ٹھٹھ کی قدیم یادگاروں پر قلم اٹھایا ہے، شاہی مسجد، مقبرۂ سلطان ابراہیم، مقبرۂ دیوان شرفا خان، مقبرۂ
عیسیٰ خان کی تصویریں بھی درج کی ہیں۔

سید رضا کاظمی نے فرانس کے انجینئر گستاف ایفل کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے جس کا بنایا ہوا ایفل ٹاور آج دنیا
مشہور ہے گستاف ایفل ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوا تھا، اور ۱۹۲۳ء میں مرا تھا۔ ارشد تھانوی کا مضمون کشمیر کا مغل فرماں روا
بھی اس شمارے میں درج ہے، ۱۵۴۱ء میں یارقندی مغل مرزا حیدر نے کشمیر پر قبضہ کیا تھا۔ یہ سلطان سعید والیٔ یارقند کا [illegible]
افسر تھا، سلطان سعید کے بیٹے سلطان رشید سے جب ان بن ہوئی تو وہ لاہور آگیا جہاں کامران مرزا سے اس کی ملاقات ہوئی او
بابر و ہمایوں کی سلطنت میں اسکو بلند درجہ ملا۔ مرزا حیدر صاحبِ علم بھی تھا۔ اس نے تاریخ رشیدی لکھی ہے جس میں مفتوحہ مقامات
کے باشندوں کے تاریخی روایات عقاید نسل و نسب وغیرہ کے احوال درج کئے ہیں، نیز مذہب اسلام کا تذکرہ خاص طور پر [illegible]
ہے، وحید قیصر ندوی نے مشرقی پاکستان کی کہاوتیں پیش کی ہیں اور ان کے ساتھ ہی اسی کہاوتیں بھی درج کر دی ہیں یہ مضمون
دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔

ادیب علیگڑھ :۔

تازہ شمارے میں عبدالغفار شکیل نے دکنی زبان کی ابتدا و ارتقا کا خاکہ پیش کیا ہے اردو زبان کے وجود میں آنے کی
کی تاریخی بحث کے بعد انہوں نے دکن میں زبان کے مختلف ادوار دکھائے ہیں، بہمنی قطب شاہی و عادل شاہی دور اور پھر فتح اورنگ زیب کے
بعد کی زبان اس میں مختصراً تمام ممتاز شعرا کا تذکرہ آگیا ہے اور اچھا مفید مضمون ہے عبدالمغنی نے مولانا ابوالکلام کے اسلوب کی

چند نادر خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ممتاز حضرات نے بھی ابوالکلام کے اسلوب پر جو بحث کی ہے تو یہی لکھا ہے
کہ وہ فارسی اور عربی علامتوں سے گراں بار ہے، اور یہ گرانی گو خاصے کی چیز ہے اور عظیم بھی لیکن اردو زبان کی سہل روایت کو اس
سے جھٹکا لگا اور افادیت مجروح ہوئی۔ عبدالمغنی نے کہا ہے کہ یہ نقطۂ نظر حکیمانہ نہیں بلکہ اس ذہنی خلجان کا نتیجہ ہے جس سے اہل
اردو موجودہ ہندوستان میں ایک بحرانی فضا سے دوچار ہیں۔ عبدالمغنی نے لکھا ہے کہ جہاں تک اردو نثر کا تعلق ہے غالب کے
بعد ابوالکلام دوسرے مجتہد ہیں، دونوں اختراع پسند ہیں اور انکی نفسیات بھی ایک جیسی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابوالکلام نے اردو اسلوب
کو فارسی کی گرفت سے آزاد کرایا، یہ بات عجیب تو معلوم ہوگی لیکن اسلوب کا کردار مجرد الفاظ و تراکیب استعارات و تلمیحات
سے متعین نہیں ہوتا بلکہ لب و لہجہ اور انداز و ادا سے متعین ہوتا ہے کسی ادیب کا محض دقیق یا ثقیل ہونا اس کے طرز کی پہچان نہیں
بالخصوص جبکہ اس کی تمام تحریریں دقیق و ثقیل نہ ہوں، اسی لئے غالب، اقبال اور ابوالکلام کے اسلوبوں کی دقت و ثقالت
کے بارے میں ہم نے جو عام روش اختیار کر رکھی ہے وہ غیر حکیمانہ اور غیر تنقیدی ہے۔ ابوالکلام کی روحِ اسلوب فعالیت ہے
مولانا کے اسلوب کو موجودہ اصطلاح میں سائنٹفک اور تجرباتی تو نہیں کہا جا سکتا مگر ان کے اسلوب کی ایک زبردست خصوصیت
تجزیۂ احساس ہے اور افسانہ از افسانہ خیز دو الی کیفیت اسی کا نتیجہ۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کبیر احمد جائسی کی کتاب "فانی پر ایک
نئی نظر" پر اظہار خیال کیا ہے، کبیر احمد جائسی نے لکھا ہے کہ فانی کی شاعری ان کے دور کے انتشار اور انہدام کی آئینہ دار ہے اس
لئے ان پر فراریت پسندی کا الزام نہیں رکھا جا سکتا، فانی کے یہاں سکون کی کمی اور بے چینی کی گھٹن وہی ہے جو شبلی کی تمام شاعری
میں نمایاں ہے اور یہ کمی تاب و تواں ایک بے چین ذہن کا عطیہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ کبیر
احمد جائسی نے فانی کے ذہن کی صحت پر زیادہ دھیان نہیں دیا حالانکہ بقول آئی اے ریچرڈس نقاد ادیب کے ذہن کی صحت
کا اتنا ہی دھیان رکھتا ہے جتنا ڈاکٹر مریض کے جسم کی صحت کا خیال رکھتا ہے"۔ فانی کے یہاں خود پر رحم کھانے کا جذبہ اس شدت
سے نمایاں ہے کہ اس سے آنکھ نہیں چرائی جا سکتی۔ تاہم جائسی نے تمام نقادوں کا بے باک دستی اور دیدہ ریزی سے جواب دیا ہے
اور بڑی نقادانہ جرأت سے کام لیا ہے بہرحال فانی کے بارے میں چند ایسے مسائل اٹھائے ہیں جن پر مزید بحث ہو سکتی ہے اور
تنقید کا ایک اہم منصب سوالات اٹھانا بھی ہے۔ حسین عباس فطرت نے آلھا اودل پر روشنی ڈالی ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ ہندوستانی
عوام کا شاہنامہ ہے جو ہندوستان کے دو مشہور جیالے آلھا اودل کے کارناموں کی دلچسپ داستان ہے اور اسکی تصنیف
کو لگ بھگ آٹھ سو برس سے زیادہ بیت چکے پھر بھی زندہ و مقبول ہے۔ انہوں نے اسکی رزمیہ کردار نگاری پر بھی بحث کی ہے اور
بتایا ہے کہ سارے کردار فطری ہیں، اس میں سب سے اہم کردار "سیّد" ہے جس کی حیثیت ایک فکر اور آلھا کے صلاح کار و قوت
بازو کی ہے، حبّ وطن، جان فروشی، اور ثبات و استقلال کا مجسمہ۔ آفاق احمد نے سید اعجاز احمد معجز بسہوانی کے مقالے مومن
و غالب پر ایک مختصر مضمون میں اظہار خیال کیا ہے اور کہا ہے کہ مومن و غالب کا موازنہ معجز صاحب نے بڑے دلچسپ انداز میں کیا
ہے جس سے نئے رخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تارا چند کی صدارتی تقریر "مرزا غالب" بھی اس شمارے میں موجود ہے۔ انہوں نے
نئے انداز سے غالب کو تصوف و ویدانت کا جامع بتایا ہے اور دلیل میں غالب کا مشہور شعر "نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر"
پیش کیا ہے۔ آخیر میں ایک مضمون غالب کے حالات زندگی پر بھی ہے اور جامعۂ اردو علیگڑھ کے کنووکیشن ۱۹۵۹ء کا خطبہ صدارت بھی۔

اچھا ساتھی کراچی :۔

نیا رسالہ بچوں کے لئے نکلا ہے۔ تیسرا چوتھا نمبر اشاعت خاص کی صورت میں سامنے ہے۔ رشید ارشد، محمد خالد فاروقی، آمنہ فاروقی اور بلقیس مدنی ادارت کے ذمہ دار ہیں، بچوں کے لئے کہانیاں اور مضامین اور نظمیں مہیا کر دینا تو آسان ہے لیکن یہ سب کچھ مہیا کرتے وقت بچوں کی ذہنی تربیت اور ارتقا کو نصب العین کی طرح پیش نظر رکھنا بڑا صبر آزما کام ہے بچوں کا معاملہ بیحد نازک ہے، وہ جو کچھ سنتے ہیں، پڑھتے ہیں یا دیکھتے ہیں اسی کے سانچے میں ان کی ذہنی ساخت ڈھل کر تیار ہوتی ہے، اچھا ساتھی میں بھی جو کچھ وہ پڑھیں گے اور دیکھیں گے اسی کے مطابق وہ آئندہ بن کر تیار ہوں گے اس نکتے کو "اچھا ساتھی" نے سامنے رکھا ہے، ماہر القادری، مائل خیرآبادی، بندھو لال ٹیگور، کوثر اعظمی، بنارسی لال، احمد جمیل، ابن فرید، افضل صدیقی پروفیسر عطاء الرحیم اور رام لال ورما وغیرہ سبھی اچھے اور ممتاز اہل قلم ہیں، کہانیاں لطیفے، انمول ہیرے، کام کی باتیں، نظمیں غزلیں سب اچھی مفید اور مقصدی ہیں، تلفظ کی غلطیاں بھی ایک عنوان ہے۔ جو بچوں ہی کے لئے نہیں بچوں کے بڑوں کے لئے بھی راہ نما ہوگا۔

کامران سرگودھا :۔

اس مرتبہ سالنامہ ۱۹۶۱ء (مارچ اپریل کا مشترک شمارہ) شائع ہوا ہے۔ اور اچھے اچھے مضامین کا مجموعہ ہے۔ "رومانیت" کے عنوان سے پروفیسر سید علی عباس نے یہ بتایا ہے کہ رومیوں کے دور تسلط میں فرانس میں جو ملکی زبان ظہور پذیر ہوئی اسے "رومانا لنگوا" کا نام دیا گیا۔ اس میں جو قصے لکھے گئے وہ رومان کہلائے بعد میں رومان کا اطلاق شجاعانہ قصوں پر ہونے لگا، سترھویں صدی میں انگلستان نے یہ لفظ تحقیر و تنقیص کے لئے استعمال کیا گوئٹے اور شلر نے رومانی شاعری اور ناول کی بنیاد رکھی۔ اخیر عمر میں گوئٹے نے رومانیت سے رجوع کر لیا تھا کہ "کلاسیکیت صحت ہے اور رومانیت . . . . . . طور پر روسو کو "رومانیت کا باپ" کہا جاتا ہے رومانیت معاشرے کی پابندی کے خلاف بغاوت ہے، رومانیت میں عقلیت کی بجائے جبلت، قانون کی بجائے مزاج اور معاشرے کی بجائے نیچر، اخلاقیات کی بجائے جذبات و تخیل کی بے راہ روی کو اختیار کیا گیا ہے، پروفیسر موصوف نے بتایا ہے کہ ہمارے زمانے میں رومانی بے راہ روی کی مثال ڈی ایچ لارنس کے ناولوں میں ملیگی، رومانی نظریہ انسان کی انا پرستی کی تخلیق ہے جو ادب میں کج روی، فلسفے میں خرد دشمنی، عمران میں فردیت، سیاسیات میں استبداد اور مذہب میں تشبیہ کی تقویت کا باعث ہوتا ہے، سہیل بخاری نے اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانیں، لکھ کر سمجھایا ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے سب سے بڑا کام یہاں کی علاقائی زبانوں کا فروغ ہے۔ امجد الطاف نے "روایت، جدید ناول اور افسانے میں" لکھ کر یہ سمجھایا ہے کہ ناول نگاری ہو یا افسانہ نویسی ہم نے اسے مغرب سے سیکھا ہے، داستان گوئی اور قصہ کہانی کی روایت سے پہلا کامیاب انحراف امراؤ جان ادا ہے جسے پریم چند نے فروغ دیا مگر یہ دور تعمیری روایات سے نا آشنا تھا اور مستقل اقدار سے عاری لہٰذا یہ رجحان زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا، ان حالات میں مختصر افسانے نے جنم لیا، جدید افسانے کی روایت سرتاسر ایک نئی روایت تھی اس لئے یہ ہمارے مزاج میں رچ گئی، اور اگرچہ کرشن چندر کے ابتدائی افسانوں جیسی جذباتیت اور منٹو کے ابتدائی افسانوں جیسی ہیجان انگیزی [illegible] جیسی کمزوریوں کے باوجود ترقی پسند مکتب فکر نے اس صنف ادب کو نظریاتی مسائل کی تبلیغ کا ذریعہ بھی بنانا چاہا تاہم اپنے افسانے کو ہم اعلیٰ مغربی معیار سے جانچ سکتے ہیں، آج افسانے کی رفتار دھیمی ہے پرانے لکھنے والے مائل بہ تنزل اور نئے لکھنے والے تن آسان ہو گئے ہیں اپنے اہل

اور اس کے ساتھ مغرب کے نئے اور پرانے ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ سید وقار عظیم نے "ادب کی اعلیٰ قدریں" میں یہ بتایا ہے کہ ابدی حیات صرف ان تخلیقات کو حاصل ہوتی ہے جو ہر زمانے کے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں، بڑے ادیبوں کی نظر ہمیشہ عالمگیر حقیقتوں اور صداقتوں پر رہی ہے، ادب کا دوسرا منصب یہ ہے کہ انسان کو حق اور حسن کی اعلیٰ قدروں کا حامل و پاسبان بنائے۔ ادیب حیات انسانی کی اعلیٰ اقدار کا ترجمان مفسر محتسب معلّم اور مبلغ ہے۔ اسکی منطق دلیل و برہان کی نہیں، جذبے اور احساس کی ہے، ــــ اور پھر ایثار و قربانی بھی۔ سعید احمد رفیق نے "کروچے کا فن۔ اظہاریت" پیش کیا ہے، کروچے کے نظریہ میں لفظ اظہار کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس لفظ کا مطلب ذہنی اور داخلی اظہار ہے نہ کہ خارجی اور عملی کسی متشکل احساس اور جذبے کا ذہن میں آنا اور ذہن کا اس پر وقوف حاصل کرنا اظہار اور وجدان ہے۔ الفاظ، آواز اور رنگ وغیرہ اظہار کے ذریعے ہیں، سعید احمد نے کروچے کے نظریہ کو تفصیل سے سمجھایا ہے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر کا مضمون اظہاریت اور ابلاغ بھی اس شمارے میں شامل ہے، وہ لکھتے ہیں کہ کروچے کی رائے میں ہر فنی تجربہ بنیادی طور پر انفرادی ہوتا ہے اور ناقابل انتقال، ــــ وہ کہتے ہیں کہ جذبے کی شدت کے اظہار کے لئے الفاظ نہیں عضو و دوں اور پٹھوں کی حرکات زیادہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں جیسے انتہائی غم میں آنسو، انتہائی غیظ میں چہرے کی تمتماہٹ وغیرہ۔ اس شمارے میں "تخلیق اور عمل تخلیق" ایک نیا عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں شاعر کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ شعر کے بارے میں بالعموم اور اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں بالخصوص اپنے خیالات ظاہر کرے۔ پہلا مضمون ڈاکٹر وزیر آغا نے پیش کیا ہے۔ مضامین کے علاوہ نظمیں غزلیں گیت اور افسانے بھی شریک ہیں۔

مہر نیمروز

ستمبر ۱۹۶۰ء

جلد نمبر ۵

شمارہ نمبر ۹

قیمت

سالانہ — چھ روپے

ششماہی — تین روپے چار آنے

فی پرچہ — آٹھ آنے ۸/

پتہ

نمبر ۴/۲۰ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی۔ ہاؤسنگ یونین ایریا۔ کراچی ۵

دفتر رسالہ "مہر نیمروز" ۷ کوی روڈ صدر کراچی ۳

اس شمارے میں

حسن مثنیٰ ندوی ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے انجمن پریس میں چھپوا کر بہار ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی سے شائع کیا

پہلی کرن

بہارِ اوّلیں

ساتویں صدی عیسوی میں دنیا کی حالت آج سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی تمدن انسانی کی تعمیر پہ چار ہزار سال سے زیادہ کی مدت گذر چکی تھی، بڑی بڑی شہنشاہیاں وجود میں آچکی تھیں، بڑی بڑی تہذیبیں اور بڑے بڑے نظام الاخلاق سامنے آچکے تھے، انسان بڑا متمدن اور ترقی یافتہ تھا۔ مگر اسکے باوجود انسانیت پامال تھی، اور بری طرح پامال تھی قبیلے قبیلے کا ایک بت جدا، صرف عرب ہی میں نہ تھا ساری دنیا اسی کیفیت سے گذر رہی تھی، اور بقول مورخ اسچ ایچ ڈیگسن) تمدن کا سفینہ تباہی کے کنارے آن لگا تھا، انسانیت پھر سے اسی عہد وحشت و بربریت کی طرف لوٹ چلی تھی، جہاں قبیلہ قبیلے کا، گروہ گروہ کا، قوم قوم کی، بلکہ فرد فرد کا دشمن جانی تھا، صورت حال المناکیوں سے بھری ہوئی تھی، قدیم قوانین و ضوابط اپنا اثر کھو چکے تھے، مسیحیت نے جدید قوانین و احکام وضع کئے تو تھے مگر وہ انسانیت کو سنبھالنے اور متحد کرنے کی بجائے اور زیادہ انتشار پھیلانے کا سبب بنے ہوئے تھے، اور زیادہ تباہ کن ثابت ہو رہے تھے، ضرورت شدید تھی کہ کوئی نئی تہذیب ایسے میں کہیں رونما ہوتی اور انسانیت کی دستگیری کرتی،

یہ نئی تہذیب رونما ہوئی اور اس نے انسانیت کو تباہی کے غار میں جا پڑنے سے بچا لیا ۔ اس نئی تہذیب کا نام اسلام ہے ۔ اس کا ظہور چین میں نہیں، ہندوستان میں نہیں، یونان و روما میں بھی نہیں اور مصر و فارس میں بھی نہیں بلکہ ریگستانِ عرب کی بالکل کوری سرزمین میں ہوا ۔

اس تہذیب کے ظہور سے پہلے دنیا بے شمار بتوں کے سامنے سرنگوں تھی، پتھر سے لیکر خواہشات نفس تک کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو بت نہ بنا لیا گیا ہو اور بت کی فطرت ہے کہ اس پر بھینٹ چڑھائی جائے چنانچہ ان بتوں کے پجاری انسانیت کو بھینٹ چڑھانے میں مصروف رہے اور جو کچھ ہوا اس کے تذکرے سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں،

لہٰذا صورت تھی یا تو ان بتوں پر انسانیت کی بھینٹ ہمیشہ کیلئے چڑھا دی جاتی اور اس کا خاتمہ ہو جاتا یا انسانیت کو بچانے کیلئے ان بتوں کو قربان کیا جاتا ۔ اسلام نے بتوں کو قربان کیا اور انسانیت کو بچا لیا ۔ اس کا پہلا نعرہ "لا الٰہ الا اللہ" تھا "کوئی خدا نہیں ہے بجز اللہ کے" اس نعرے نے جتنے متضاد عناصر کو شیر و شکر کیا، اتنے متضاد عناصر کو دنیا کی کسی قوت نے کبھی شیر و شکر نہیں کیا نہ پہلے نہ آج ۔

آج اس دور میں جس کو ترقی کا دور کہا جاتا ہے۔ دنیا تو ایک طرف رہی، قومیں بھی درکنار، کسی ایک قوم کے اندر بھی وہ دل شیر وشکر نظر نہیں آتے فنی ترقی یقیناً دنیا نے بہت شاندار کی ہے لیکن فنی (ٹکنکل) قابلیت انسانیت کے تحفظ و بقا اور امن وسلامتی کی ضامن ہرگز نہیں ہے جن بتوں نے عہد قدیم میں انسانیت کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا تھا، ان سے یہ توقع غلط ہے کہ وہی بت عہد جدید میں انسانیت کو تباہ نہ کریں گے بلکہ بنا اور سنوار دیں گے۔ عہد جدید میں نیشنلزم کے بت کو پھر سے دل و دماغ میں بسا یا گیا، ریشیلزم کے بت کو از سر نو نصب کیا گیا، رنگ و روغن اور جغرافی برتری کے بت نئے سرے سے سجائے گئے۔ اغراض وخواہشات اور حرص وہوس کے بت خانے دھوم دھام سے تعمیر کئے گئے مختصر یہ کہ بہ اعتراف ٹوئن بی "خدائے واحد کو چھوڑ کر نسل کو، وطن کو، قوم کو، قومی پرچم کو، اسٹیٹ کو، معاشیات کو اور سائنس کو اپنا معبود بنا لیا گیا۔" ان کو معبود بنا لینے کا منطقی نتیجہ ظاہر ہے۔ لیکن آدمی اکثر ٹھوکریں کھانے کے بعد ہوش میں آتا ہے پروفیسر ٹوئن بی کی آنکھیں بھی پہلے نہیں کھلیں، اپنے خود ساختہ بتوں کی اداؤں کے گھائل ہو کر نیم بسمل جب ہوئے تب بات سمجھ میں آئی بلفظ دیگر ؎

یہانتک بتوں نے ستایا انہیں　　　　کہ آخر خدا یاد آیا انہیں

اور ایک وہی نہیں، اب تو اور بھی ہیں جن کی بے اختیارانہ فریادیں مسلسل سنائی دے رہی ہیں اور بسملوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے، ایمری ریوز کی یہ عبارت تنہا انہیں کی نہیں، بلکہ بہتوں کے ذہن و فکر کی آئینہ ہے ——— وہ لکھتے ہیں کہ "ہم انٹر نیشنلزم سے بہت کھیل چکے۔ دنیا کے سامنے جو الجھن آج درپیش ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ اس کو۔ قومیں۔ (نیشنز) حل کریں، فساد تو سارا نیشنلزم ہی کے تصور نے انسانی معاشرے میں برپا کیا ہے۔ اب وہی نیشنلزم اگر انٹرنیشنلزم بن بیٹھے، تو وہ اس الجھن کا حل کیسے دریافت کرلے گی، اس الجھن کا صرف ایک ہی حل ہے" اور وہ حل ہے وحدتِ انسانی کا عقیدہ۔

لیگ آف نیشنز کے قیام پر جب اقبال نے کہا تھا کہ ؎

مکہ نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام　　　　جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

تو اہل مغرب تو اہل مغرب خود اس کے بعض مغرب زدہ ہموطنوں نے بھی اسکی ہنسی اڑائی تھی؛ اقبال خود بھی جانتے تھے کہ ان کی نظمیں اہل مغرب کے طرز عمل کو بدل نہیں سکتیں، نہ انہوں نے اس مقصد سے نظمیں کہی تھیں انکے پیش نظر تو یہ تھا کہ مغرب سے رہ رہ کر جو طوفان اٹھتا ہے اور طرح طرح کے بھیسوں میں جو جھکڑ چلتے رہتے ہیں اس میں کہیں یہ نہ ہو کہ ہماری غفلت سے اسلامی تصورات کا وہ چراغ گل ہو جائے جو شب تاریک عالم میں واحد راہ نما ہے۔ اس لئے وہ اور ان کے جیسے دوسرے اہل فکر و نظر اسلامی تصورات کی یاد تازہ کرتے رہتے تھے۔ اور یہ اسی کا اثر تھا کہ برعظیم میں جب سیاسی رد و بدل کا زمانہ قریب پہونچا تو مسلمانوں نے اپنے اسلامی تصورات کی بنیاد ہی پر اقدامات کئے، اور ان مسائل میں کسی قسم کی مفاہمت گوارا نہیں کی۔

قائد اعظم نے اسلامی تصور قومیت پر جس شدت سے اصرار کیا اور جس شاہکارانہ انداز میں اسکی وضاحت کی، یا مسلمانوں نے اس کو منوانے کے لئے جس انداز سے سر دھڑ کی بازی لگائی، وہ کوئی بے سوچی سمجھی بات نہیں تھی، اگرچہ

(باقی صفحہ ۱۹)

یارانِ نکتہ داں

محمد عمر سیفی (ٹونک۔ بھارت)

چونک اٹھا حسن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا، آئینہ ساز

اس مطلع کا مصرعہ ثانی تو بالکل واضح اور صاف ہے۔ اسمیں کسی قسم کا ابہام ہے نہ الجھن پھیرا سے حقیقت اور مجاز دونوں طرف لیا جا سکتا ہے۔ البتہ مصرعہ اولی میں "چونک اٹھا" اور "عکس کی آواز" یہ دونوں فقرے دعوت فکر دیتے ہیں۔ .... یہی وجہ ہے کہ اب تک اس شعر پر کافی بحث ہو جانے کے بعد بھی موضوع بحث باقی نظر آرہا ہے۔

میں مصرعہ اولی کے انہیں دو فقروں سے بحث کرونگا۔ جو باعثِ نزاع ہیں۔

"چونک اٹھا" یا "چونک اٹھنا" کوئی خاص بحث نہیں ہے۔ عام طور پر روزمرہ میں استعمال ہوتا ہے مفہوم ظاہر ہے۔ "عکس کی آواز" استعارہ ہے مگر عام فہم نہیں۔ تاہم ایسا غیر مانوس و بعید از عقل بھی نہیں جسے غلط کہا جائے جبکہ غالب کا مصرعہ موجود ہے کہ

"میں ہوں اپنی شکست کی آواز"

لہٰذا اس استعارہ پر ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق رائے دے سکتا ہے۔

یہ مسلمہ ہے کہ شعر کے دونوں مصرعے باہم مربوط ہونے چاہئیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے چونک اٹھنے کی نسبت ذات باری تعالیٰ سے قائم کرنا کسی طرح جائز اور مناسب نہیں ہو سکتا۔ عکس کی آواز سے نورِ محمدی کی تسبیح و تہلیل، آدم و حوا کی لغزش، کائنات کے تخلیقی ارتقار کے ساتھ ساتھ بے راہروی مراد لی جا سکتی ہے۔ لیکن ان چیزوں پر اللہ تعالیٰ (خالق کائنات اور علام الغیوب) کا متعجب ہونا یا چونک اٹھنا کسی طرح قرین عقل و فہم نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ یہ ہمارا عقیدہ ہے اور ایمان کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور علم میں ازل سے ابد تک ہر چیز، ہر بات، اور ہر ظہور پذیر واقعہ موجود ہے۔ خواہ وہ بال سے بھی زیادہ باریک ہی کیوں نہو۔ اور زمین و آسمان کے کسی بھی حصہ میں کیوں نہو۔ لہٰذا خالق کائنات کا اپنی کسی سوچی سمجھی، اور جانی بوجھی تخلیق پر چونک اٹھنا یا چونک پڑنا غلط ٹھہرا۔ اور جب یہ چیز خالق کائنات سے منسوب نہیں کیجا سکتی تو مصرعہ ثانی کو حقیقی مفہوم سے تعبیر کرنا بھی غلط ہوگا۔ کہ اسطرح دونوں مصرعوں کا رابطہ ہی ختم ہو جاتا ہے اس

کے بعد اب ہمارے پاس صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس شعر کے مجازی معنی تلاش کئے جائیں۔ سو اسکے لئے کوئی دقت و دشواری نہیں رہتی ....

"چونک اٹھا" کی نسبت حضرتِ انسان کی طرف ہے

عکس کی آواز سے" مراد انسان کا اپنا ضمیر۔ ضمیر کی آواز۔ اعمال، یا کوئی یادگار تاریخی واقعہ حادثہ، سانحہ، ماضی و حال میں بیّن تضاد، کوئی ناقابلِ معافی جرم و گناہ یا ان میں سے کسی کی "صدائے بازگشت" وغیرہ ہوسکتی ہے۔

آئینہ سے مراد اپنا دل ہوسکتا ہے۔ جہاں تمام چیزوں کا عکس موجود ہے۔ اور نقوش ثبت۔

آئینہ ساز۔ سے مراد خود انسان ہے جو اعمال، واقعات، سانحات، اور حادثات کا حامل و عامل رہا ہے۔

اتنے استعاروں کے بعد جو بالکل عام اور قرین قیاس نہیں۔ ہم اس شعر کا مفہوم و مطلب اسطرح سمجھ سکتے ہیں

(۱) انسان اپنے دل کا آئینہ دیکھ رہا تھا۔ اسمیں اسے اپنے اعمال کا عکس نظر آیا۔ اور وہ چونک اٹھا

(۲) " " " " " " " " اس میں ماضی کی صدائے بازگشت تھی " " "

(۳) " " " " " " " " " کوئی خاص حادثہ " " " " " "

(۴) " " " " " " " " " " سانحہ " " " " "

(۵) " " " " " " " " ناقابلِ معافی جرم " " " " " "

ان تمثیلی فقروں اور جملوں میں انسانی زندگی کے وہ تمام پہلو ملیں گے جن سے انسان اس دنیوی زندگی میں آئے دن دوچار رہتا ہے۔

بہر حال یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ آئینے میں وہی کچھ نظر آئے گا۔ جو اسکے سامنے ہوگا۔ اور سامنے والا اپنے عکس میں وہی کچھ دیکھ سکیگا۔ جو اسمیں موجود ہوگا۔ اب اپنے اندر موجود چیزوں پر اگر عکس (ضمیر) کچھ بولے یا متنبہ کرے تو اس پر آئینہ دیکھنے والا چونک سکتا ہے۔ ایسے موقع پر چونک اٹھنا کے معنی سنبھل جانا بھی لئے جاسکتے ہیں۔ اور یہ بات کچھ قرین قیاس بھی ہے اور الفاظ سے ظاہر بھی۔

میرے نزدیک اس شعر کا مطلب حقیقت میں نکالنے سے شعر میں عیب پیدا ہوجائے گا۔ اور وہ عیب "چونک اٹھا" کے فقرے سے پیدا ہوگا۔ البتہ چونک اٹھا کی جگہ "خوش ہوا" یا "ہنس پڑا" ہوتا تو شعر کا مفہوم حقیقت کا جامہ پہن سکتا تھا۔ یعنی اسطرح کہ ...

خوش ہوا سن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

اب عکس کی آواز سے "نورِ محمدیؐ کی تسبیح و تہلیل" یا کائنات کا تخلیقی ارتقا۔ اور "معرفتِ ذات" وغیرہ بہت آسانی سے مراد لئے جاسکتے ہیں۔ ذاتِ باری کا اسبابِ پر خوش ہونا۔ بالکل بجا ہوسکتا ہے کہ نورِ محمدؐ نے تخلیق ہوتے ہی تسبیح و تہلیل شروع کردی تھی۔ اسی طرح کائنات کے تخلیقی ارتقا پر بھی کہ اسکا بنایا ہوا انسان کیا

[وہ]اں پہونچ گیا، چاند سورج کو تسخیر کر رہا ہے علیٰ ہٰذا معرفتِ ذات میں بھی انسان کا مرتبہ سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ ؎

فرشتے نہ پہونچے کبھی جس جگہ پر
وہاں پر یہ پہونچا البشر اللہ اللہ

نیز انا عرضنا الامانت علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا [ا]لانسان انہ کان ظلوماً جہولا سے بھی انسان (تخلیق اول) کا کمالِ معرفت عیاں ہے۔ ایسی صورت میں چونکہ [اُ]ٹھا کے بجائے "خوش ہوا" ہی مناسب ہو سکتا ہے۔ پھر چونکہ اٹھا میں استعجاب وحیرت کے پہلو سے خود اللہ تعالیٰ کی ذات [ص]فات کی ایک طرح نفی و تنقیص ہوتی ہے (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو "کودکے ناداں" سمجھ لیا ہے۔ کہ برغلط بر ہدف زند [تی]ر" میرے نزدیک مجازی معنیٰ کے لئے چونکہ "اٹھا" اور حقیقی معنی کے لئے "خوش ہوا" موزوں ہو سکتے ہیں۔

محشر بدایونی؛۔

آپ کے موقر جریدے میں بہت عرصے سے ایک شعر موضوع بحث بنا ہوا ہے شعر یہ ہے:۔

چونکہ احساس کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا۔ آئینہ ساز

آج میرا بھی جی چاہا کہ لاؤ اس سلسلے میں میں بھی کچھ لکھوں جب لکھنے بیٹھا تو اس قبیل کے دو اور شعر مجھے یاد آگئے پہلے [ش]عر قلمبند کرتا ہوں ؎

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی
منہ پھیر لیا میں نے تو دنیا نہ رہے گی		(فانی)

حسن ان کا ہے ادا ان کی ہے جلوہ ان کا
پھیر لیں منہ وہ تو آئینے میں کیا رکھا ہے		(رمیش)

میں نے ان دونوں شعروں کا حوالہ یہاں اس لئے مناسب سمجھا ہے کہ ان کی مدد سے شعر زیر بحث کے معنی سمجھنے میں [مد]د مل جاتی ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں جو حضرات اس شعر کو مہمل کہتے ہیں لفظی بے آہنگی، فکری بے ربطی۔ یا ابہام [کا ذ]کر کرتے ہیں۔ وہ شعری نزاکت بیان، اسلوب اظہار، اور اشاریت و رمز کو مخصوص ساقی طور پر قبول کرنے سے عاجز ہیں حالانکہ [رمز] اور اشاریت شعر کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔ آرٹ کا حسن ہی یہ ہے کہ وہ اپنی ہیئت و صنعت کے دائرے سے دور کر کے [ایس]ی فضا میں پہنچا دے جہاں سوچنے اور غور کرنے کی بے شمار راہیں ہوں۔ اور ذہن جس مقام پر بھی ٹھہرے اپنے لئے نئی دنیا [پید]ا کرے جن میں سکون بھی ہو اور تشنگی بھی۔ میں ذرا آگے نکل گیا معاف کیجئے گا۔ یہ شعر ایسا زیادہ مبہم بھی نہیں کہ جس کے لئے [یہ] بحث چھیڑی جائے۔

اس شعر پر اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ عکس کی آواز کہاں ہوتی ہے۔ اور یہ کہ آئینہ ساز سے مراد اگر خالق ہے تو اس کے لئے [یہ] لفظ موزوں نہیں۔ اول الذکر کے بارے میں میں یہ عرض کروں گا کہ اگر شعر سے اس قبیل کے اسالیب بیان کو مطلق [نکال دی]ا جائے تو شعر ایک بڑی خوبی سے محروم ہو جاتا ہے۔ آخر الذکر کے بارے میں یہ عرض ہے کہ کیا ضروری ہے کہ خالق

سے مراد خالق حقیقی ہی ہے۔ خالق مجازی کیوں نہیں۔ میرے خیال میں ابہام اور اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے
کہ شعر اپنی جملہ کیفیات کے اعتبار سے (شاید) زیادہ معیاری نہیں کہ اسے کوئی بڑا مرتبہ دیا جائے۔ تاہم عام اشعار کی فہرست میں اتنا
گھٹیا بھی نہیں کہ قابل اعتنا ہی تصور نہ ہو۔

شعر کو سائنسی نقطہ نظر سے دیکھنا شعر کے ساتھ صریح ناانصافی ہے۔ شعر کو محض فنکارانہ نظر سے دیکھنا چاہیئے اور یہ سوچنا
چاہیئے کہ شاعر نے کس خیال کو الفاظ میں سمیٹ کر پیش کرنے کی سعی کی ہے اور وہ کس حد تک مشکور ہوئی ہے۔ بے تعلق
الفاظ، غیر ضروری طومار، اور محض ترکیبوں کا جوڑ توڑ یقیناً شعر کو بے بضاعت کر دیتا ہے۔ لیکن ایسا نہ ہو تو ہمیں اپنی ذہنی عصبیتوں کو
یکسر فراموش کر کے غور و توجہ سے شعر کو دیکھنا چاہیئے۔ اور اس میں معنی ڈھونڈنا چاہئیں۔ اگر ذوق شستہ ہے اور ذہانت
و فطانت ہماری مدد کرتی ہے تو شعر کے معنی سمجھنے میں ہم کسی طرح بھی ناکامیاب نہیں ہو سکتے
یہاں میں شعر کے معنی بیان کر کے آپ کا اور قارئین کا زیادہ وقت خراب نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس شعر کی صحت
کے حق میں ہوں اور ان حضرات کا ہم خیال ہوں جنہوں نے اس شعر کو بامعنی قرار دیا ہے۔

بقیہ:- اداریہ

گذشتہ زمانے میں بھی مسلمان اسلام کے بنیادی تصورات سے کبھی بے خبر نہیں رہے اور نہ مغرب سے بلند ہونے والی ہر آواز
کو آنکھ بند کر کے کبھی تسلیم کیا۔ بلکہ جب بھی موقع ملا اس کی تصحیح ہی کی تفصیلی طور پر نہ سہی اجمالی طور پر مسلمانوں کے ذہن و فکر میں یہ
چیز آج بھی موجود ہے کہ اسلام نے کن کن جراثیم کا استیصال خصوصی اہتمام کے ساتھ کیا تھا اور وحدت انسانی کا درجہ اس
کے نزدیک کیا ہے۔ اس لئے جب تک ان تمام جراثیم کا خاتمہ نہ کیا جائے گا۔ وحدت انسانی کا تصور ہمیشہ خطرے میں رہے گا
ماہ ربیع الاول ہر سال مسلمانوں کے ذہن و فکر کو نئی تازگی اور نئی روشنی دے جاتا ہے۔ اور رسول اکرم کی سیرت [illegible]
کے آئینے میں وہ اسلام کے انسانیت پرور پیغام کی صورت دیکھ لیتے ہیں۔ اور یہ تاریخی حقیقت از سر نو تازہ ہو جاتی ہے
کہ انسانیت کے خزاں رسیدہ اور پامال شدہ چمن میں "پہلی بہار" رسول اکرم کی تشریف آوری ہی کا نام ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم

بقیہ:- تنہائی

وہ رک گیا اپنے مخروطی چوٹی والے پتھر کے اس بڑے سے مستطیل مینار کی طرف اپنا ہاتھ اٹھایا۔ جو ہیرن کے مرقد پر ایستادہ
تھا اور جس کا لمبا مصری چہرہ تاروں بھری رات میں کھویا ہوا تھا۔ ایک جلا وطن کتبہ، جس کے ایک رخ پر عجیب اشاروں میں اس کے
ملک کی کہانی درج تھی ——— اس نے الفریڈ سے کہا۔ "دیکھو ہم سب اسی پتھر کی طرح ہیں"
پھر وہ اور کچھ کہے بغیر مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ کیا وہ نشے میں تھا؟ یا مجنوں تھا؟ یا کوئی [illegible] تھا۔ مجھے اب تک اس کا
جب کبھی خیال آتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل ٹھیک تھا اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ اس کا دماغ چل گیا۔

مدیر

مولانا احسن مارہروی

اردو زبان کی خدمت ویسے تو ہر شاعر و ادیب نے کی ہے لیکن ایسے خدمتگذاروں کی تعداد بہت کم نکلیگی جنکی عمر کا بیشتر حصہ زبان کو بنانے اور سنوارنے میں شعوری طور پر صرف ہوا ہو۔ ان ہی لوگوں نے اکثر لفظوں کے خوشنما نگینے تراشے ہیں، محاوروں کہاوتوں فقروں اور جملوں کا منتخب ذخیرہ مہیا کیا ہے، اظہار و ابلاغ کے سانچے بنائے ہیں، الفاظ و حروف کے رنگ روپ اور رس کا تجزیہ کیا ہے صوت و صدا کے کیف کو پرکھا ہے۔ پھر ان کی قسمیں کی ہیں اور تذکیر و تانیث کی نگہداشت کی ہے، حضرت ناسخ کا کلام ممکن ہے بہتوں کو پسند نہ آئے۔ جوہریوں کے ذخیرے کی ہر چیز کا ہر شخص کو پسند آ جانا بھی کچھ ضروری نہیں لیکن جوہریوں کے ذخیروں کا دیکھنا اور سمجھنا بھی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، کہیں کوئی حسین سا ترشا ہوا یاقوت چاندی کی بھدی سی انگوٹھی میں لگا رکھا ہوگا کہیں کوئی ادنیٰ درجے کا نگینہ کسی نہایت ہی خوبصورت سی ڈھلی ڈھلائی انگوٹھی میں جڑا ہوا جگمگ جگمگ کر رہا ہوگا اور آپ کی سمجھ میں نہ آئیگا کہ تعریف نگینے کی کریں یا انگوٹھی کی یا دونوں کی، کہیں جواہرات کا یونہی ڈھیر ہوگا جس میں فیروزہ نیلم پکھراج پنا موتی ہیرا سبھی طرح کے پتھر موجود ہوں گے، مگر فیروزہ فیروزہ، موتی موتی، رہا ہیرے ہیرے میں بھی امتیاز کرنا کچھ آسان نہ ہوگا، اور جوہری سے پوچھئے تو ہر ایک کا شجرہ اسکی نوک زبان پر، وہ بتا دیتا ہے تو ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں، اور نہیں بتاتا تو پھر ہر رنگین پتھر پر جواہرات ہی کا دھوکا ہوتا ہے ہم اکثر اعلیٰ درجے کی چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ درجے کی چیز اٹھا لیتے ہیں اور پھر خفت ہوتی ہے۔ غرض جوہریوں کی دنیا عجیب ہے پتھروں کے جوہری ہوں یا لفظ و بیان کے، سب کا ایک ہی انداز ہے۔ حضرت ناسخ، جلال لکھنوی، امیر مینائی، شوق نیموی، معیز بلگرامی، وحیدالدین سلیم وغیرہ اسی قسم کے جوہریوں میں سے چند ہیں جنھوں نے بیش بہا ذخیرۂ جواہرات مہیا کیا ہے بے شمار پتھروں کو الگ الگ چن چن کے رکھا ہے، ان کے استعمال کی صورتیں اور خاصیتیں بتائی ہیں، ان کو پرکھنے تولنے اور برتنے کا سلیقہ سکھایا ہے کوئی شک نہیں کہ ان سب نے خود بھی یہ ساری باتیں اپنی ہی طرح کے جوہریوں سے سیکھی ہونگی، اور ذاتی تجربے نے ان کی معلومات پر مزید صیقل کی ہوگی۔ ان سب کی فہرست اگر کبھی مرتب ہوئی تو اس فہرست میں مولانا سید شاہ احسن مارہروی کا نام بھی ضرور شامل ہوگا جو شاعر بھی تھے اور جوہری بھی، ان حضرات نے بحیثیت شاعر و ادیب اچھی غزلیں اور اچھی نثریں بھی پیش کی ہیں، مگر ان کی زیادہ تر توجہ اچھی غزلوں اور اچھی نثروں کے لئے خوبصورت و دلآویز سامان مہیا کرنے پر رہی ہے۔

پچھلے دور میں امیر و داغ نے غیر معمولی شہرت حاصل کی اور ان دونوں کی وجہ سے اردو زبان کی سلاست صفائی اور آمد کا دائرہ بہت وسیع ہوا داغ کے شاگردوں میں مولانا احسن رضا خان بریلوی نواب میر محبوب علی خاں نظام دکن، سید وحید الدین بیخود

بیخود دہلوی

رشید، نصیر الدین حسین نصیر عظیم آبادی، منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی، مہاراجہ کشن پرشاد، نواب عزیز یار جنگ عزیز، نواب
قادر یار جنگ مؤرخ، حضرت کاظم علی باغ، نواب سعادت علی خاں در بھنگوی، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی، سید نذیر احسن نسیم بھرتپوری، سید محمد اختر
نگینوی، ظہیر الدین ظہیر، منشی سید انور علی بھوپال، صاحبزادہ اشرف یار خاں اشرف جاورہ، نسیم بھرتپوری، فیروز شاہ خاں رامپوری، بے باک
بھوپالی، حضرت رسا رامپوری، خواجہ بیدار بخت بیدار ڈھاکہ، مولانا عبدالحئی بیخود، مہاراجا چندر سیٹھ عیش، جناب آزاد، جناب باقی
جناب ضیا، جناب اٹک، جناب شاغل گورکھانوی، آغا شاعر قزلباش، نواب سائل، علامہ اقبال، سیماب، فانی، نوح ناروی ۔ اور
مولانا احسن مارہروی مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ اور ضرور ہوں گے جن کے نام آج ہمارے سامنے نہیں ہیں، آغا شاعر قزلباش
نے اپنے رسالے آفتاب میں داغ کے ارشد تلامذہ کی ایک فہرست تیرہ [۱۳] حضرات کی پیش کی ہے۔ اور نواب سائل و نوح ناروی
کو اس حصے میں شمار نہیں کیا ہے جو ان کے ذہن میں تھا۔ اور نظام دکن کا نام بھی تبرکاً ہی شریک ہے۔ آغا شاعر نے اپنا نام
اس فہرست میں نہیں لکھا، لیکن وہ اس فہرست میں داخل ہیں، اور یوں یہ فہرست تیرہ کی نہیں چودہ کی ہے۔ اور ان چودہ حضرات
میں بھی مولانا احسن مارہروی کا نام بڑے احترام سے لیا گیا ہے۔ اس احترام کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ داغ کے شاگرد پہلے ہوئے تھے
داغ کے سلسلۂ تلامذہ میں ان کے داخل ہونے کا سال تو کم و بیش ۱۸۹۴ء ہے جبکہ داغ کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی اور مولانا سے
پہلے بھی لوگ داغ کے شاگرد ہو چکے تھے۔ مثلاً بیخود دہلوی، نصیر الدین حسین نصیر عظیم آبادی، ڈاکٹر مبارک اور مولانا حسن رضا خاں اور
نسیم وغیرہ، مولانا سے پہلے داغ کی بارگاہ شعر میں پہنچے تھے، پھر مولانا کا یہ احترام اس بنا پر بھی نہیں ہے کہ انہوں نے استاد کے رنگ
کو اس طرح اپنایا ہو کہ کوئی دوسرا اس طرح نہ اپنا سکا، ایسا بھی نہیں ہے، داغ کے شاگردوں میں مولانا حسن رضا خاں وغیرہ کا
رنگ خاصا چوکھا ہے، اور داغ کے حلقے سے باہر ریاض و مضطر کا رنگ تو اتنا چوکھا ہے کہ وہ دوسرے داغ معلوم ہوتے ہیں
داغ کے شاگردوں میں سعادت در بھنگوی، نسیم بھرتپوری، اختر نگینوی اور ظہیر الدین ظہیر وغیرہ صاحب دیوان ہونے میں پہل کر چکے
اور ان کے دیوان شائع ہوئے تو خود داغ نے ان سب کی اشاعت کی تاریخ کہی۔ ان میں سے بعض فخر داغ بھی کہلائے ـــ
مولانا کا احترام ان کے علم و فضل اور اس قابلیت کی وجہ سے تھا جس نے علم و فن کی گرانقدر خدمات ان سے انجام دلوائیں
خصوصی قابلیت جس کی بنا پر استاد بھی ان کی "فکر رسا اور طبع رسا" کا قائل تھا۔
مولانا احسن صوفی تھے، صوفی کی فطرت کا خلاصہ تجسس اور تعمق ہے۔ ان کو تصوف بھی وراثت میں ملا تھا اور علم و اد
اور علم و ادب کے تحفظ کی خاطر تحقیق و تفتیش کا جذبہ بھی حضرت شاہ برکت اللہ ان کے مورث اعلیٰ تھے جو بڑے نام سے مارہرہ
حضرت شاہ برکت اللہ کے دو صاحبزادے ہوئے اور دونوں صاحب خانقاہ، یہ دونوں خانقاہیں سرکار کلاں اور سرکار
کے نام سے مشہور ہوئیں، سرکار خورد کے سجادہ نشین حضرت صاحب عالم مرزا غالب کے ہمعصر تھے غالب کے مجموعۂ
میں متعدد خطوط حضرت صاحب عالم کے نام ہیں اور غالب کو ان سے بڑی عقیدت تھی وہ ان کو مولائی و مرشدی کہ
سے یاد کرتے ہیں حضرت صاحب عالم کے خطوط سامنے نہیں لیکن غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے درمیان
تحقیقی مراسلت ہوا کرتی تھی غالب نے اپنے خطوط میں بڑی دقیقہ سنجی، نکتہ آفرینی اور بحث و استدلال سے کام لیا ہے اور
منوانے کے لئے پورا زور صرف کیا ہے یہ دونوں ہم عصر ہی نہیں ہم عمر بھی تھے مشہور ہے کہ ایک مرتبہ غالب نے حضرت

سال کا سن ولادت دریافت کیا تو انہوں نے لکھا کہ میرا سن ولادت خود لفظ "تاریخ" ہے، غالب کی ذہانت اور فطری ظرافت نے گدگدیاں کی انہوں نے صاحب عالم کو یہ شعر لکھ کر بھیجا۔

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا　　　ان کی "تاریخ" "میرا تاریخا"

غالب اپنے اس ظریفانہ اندازِ کلام سے (تناہی) ظاہر کرنا نہ چاہتے تھے کہ میں آپ سے ایک ہی سال چھوٹا ہوں بلکہ خود کی بے تکلفی بتاتی ہے کہ محبت وخلوص اور یگانگت کا اظہار بھی مقصود تھا۔ مولانا احسن انہیں حضرت صاحب عالم کے اخلاف میں تھے اور سرکار خورد کے سجادہ نشیں سجادگی کے ساتھ بوریا نشینوں کا علم وفضل اور تحقیق وجستجو کی روایت بھی ان کو ورثے میں ملی تھی —— خدمتِ زبان اردو کی روایت کو بھی اگر مولانا کی خاندانی روایت قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، سب جانتے ہیں کہ صوفیوں کے مشہور مقولے (الاولیاء کنفس واحدہ) کی بنا پر تمام صوفیہ درحقیقت ایک ہی خانوادے کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے مولانا نے اپنے عہد میں زبان اردو کی جو خدمت انجام دی ہے وہ سلسلۂ ماضی کی ایک اہم کڑی تھی۔ مولانا اگر صوفی نہ ہوتے جب بھی سادات بلگرام کا علم وفضل تو مسلمات تاریخ میں شمار ہوتا ہے امیر عبدالجلیل بلگرامی، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی، سید حسین بلگرامی وغیرہ کے نام اور کام سے کون واقف نہیں۔

مولانا نے "تاریخ نثر اردو" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اور اس میں ہر دور کی نثر اردو کا نمونہ ایک جگہ جمع کر دیا ہے نمونے میں عدالتوں کے احکام، فرامین شاہی، رقعے، کتابوں کے شذرے، پہلے اخبارات ورسائل کی تحریریں، اور مکاتیب بڑی محنت سے مہیا کئے ہیں اور پھر ہر عہد کے اندازِ تحریر اور زبان وبیان پر جامع تبصرہ بھی کیا ہے۔ مکاتیب سب ممتاز لوگوں کے ہیں، اور یہ حصہ بھی اتنا بڑا اور اہم ہے کہ کوئی صاحب علم اسے نظر انداز نہیں کر سکتا بیشتر خطوط غیر مطبوعہ ہیں جن میں زبان کے علاوہ دوسرے مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب نویں صدی ۸۰۱ھ / ۱۳۹۸ء سے ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء تک ساڑھے پانچ سو برس کی رفتار اردو کا آئینہ ہے، پہلا نمونہ حضرت خواجہ گیسو دراز (۸۰۱ھ) کی کتاب معراج العاشقین کی تحریر ہے، اور آخری نمونہ (میری رائے میں) خود حضرت احسن (۱۳۴۸ھ) کی تحریر ہے۔ حضرت احسن نے اپنی کوئی تحریر بطور نمونہ اس کتاب میں درج تو نہیں کی ہے لیکن کتاب کی ترتیب وتبصرہ اور اس کا مقدمہ بھی تو آخر ایک نمونہ ہی ہے۔ اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ آخری تحریر خود یہ کتاب ہے اور وہ حضرت احسن ہی کی ہے۔ آپ چاہے سنہ شمار کریں، نمونہ دیکھیں یا خدمت پر نظر رکھیں، صوفی سے صوفی تک ایک سلسلہ برابر قائم ہے۔ سنہ ۸۰۱ھ سے سنہ ۱۳۴۸ھ تک۔

مولانا نے اس کتاب پر ۹۰ صفحوں کا مقدمہ لکھا ہے، اس مقدمے میں اردو زبان کے وجود میں آنے کی بحث بھی چھیڑی ہے اور اس بحث کے وقت وہ تمام دعوے ان کے سامنے تھے۔ جو اردو کی جائے پیدائش کا کھوج لگاتے ہوئے مختلف علاقوں کے اہل قلم نے پیش کئے ہیں، محمود شیرانی صاحب کی کتاب "پنجاب میں اردو" بھی تازہ تازہ چھپ کر آ چکی تھی، مولانا نے یہ مقدمہ سنہ ۱۹۲۹ء میں لکھا ہے اور محمود شیرانی صاحب کی کتاب ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی، مولانا نے اس کو پڑھا بھی تھا اور اس پر تنقید بھی کی ہے، پتہ نہیں "پنجاب میں اردو" کی دلیل بھی مولانا کے علم میں تھی یا نہیں جس میں اسی قسم کی ایک تاریخی اور جغرافی شہادت پیش کی جاتی ہے کہ اشوک کے عہد میں جب پاٹلی پتر کے راجکمار کا رشتہ ایران کے شاہی خاندان میں ہوا تھا تو شہزادی کے

ڈوبے کے ساتھ دس ہزار فوجی بھی جہیز میں آئے تھے۔ اور وہ سب پاٹلی پتھر کے اطراف و اکناف میں بسائے گئے تھے، ان دس ہزار ایرانیوں کے میل جول سے ایک نئی زبان جو وہاں پیدا ہوتی رہی دراصل اردو کی پہلی صورت ہے۔ ——— بہرحال پنجاب میں اردو، دہلی میں اردو، اور بہار میں اردو کے دلائل جو کچھ بھی ہوں، مولانا ان میں سے کسی کے حق میں نہیں ہیں وہ اپنے علم و بصیرت اور تحقیق و نظر کی بنا پر اردو کا منبع و مصدر اور پرورش گاہ دکن کو بتلاتے ہیں، وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اگرچہ کوئی شک اس میں نہیں ہے کہ عہد تغلق میں اردو زبان کی باقاعدہ تشکیل کی فضا تیار ہو چکی تھی، اور امیر خسرو نے اس پر محنت بھی خاصی کی تھی لیکن تغلق کے پاگل پن نے اس فضا کو غارت کر دیا، ایک بسے بسائے مرکز کو اجاڑ کر دولت آباد بسانے کے جنون نے شمالی ہند کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا کہ یہاں اردو مروج ہی نہ ہو سکی اس کے برخلاف دکن میں جب حسن گنگو نے بیجاپور کی سلطنت قائم کی تو اس نے فارسی کو دفتر سے خارج کیا اور اردو نے بے تکلف اس کی جگہ لے لی۔ یہی سبب ہے کہ دکن میں اردو زبان کی باقاعدہ شاعری ہمیں اس وقت سے ملتی ہے جب شمالی ہند میں ہمایوں کی سلطنت مستحکم کی جارہی تھی،

مولانا نے شمالی ہند میں اردو کے مروج نہ ہونے کے اسباب میں حکومتوں کے رد و بدل اور جنگ و جدل کے سلسلوں کو بھی شمار کیا ہے۔ اس لئے گمان ہے کہ مولانا کے سامنے شاہ سعد اللہ گلشن کا وہ مشورہ بھی ضرور رہا ہوگا۔ جو انہوں نے بروایت میر تقی میر ولی دکنی کو دیا تھا کہ- "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد کرد"، گویا اردو زبان حکومت کی نظر میں ایک جرم کا درجہ رکھتی تھی اور محاسبے کی بات سمجھی جاتی تھی، ——— سبب ظاہر ہے کہ یہ اثرات تھے ہمایوں اور شیر شاہ کی اس جنگ کے جس میں ملکی اور غیر ملکی یا انلسٹ اور نیشنلسٹ جماعتوں کے جذبات نے شدت پکڑ لی تھی، شیر شاہ کی قیادت میں نیشنلسٹوں نے ایک مختصر مدت کے لئے کامیابی تو حاصل کی لیکن شیر شاہ کی وفات کے بعد ہمایوں نے ان کو پوری قوت سے کچل دیا، ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمایوں کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد کیا کیا کچھ ہوا ہوگا بلکہ ہمایوں کے بعد اکبر کے زمانے میں جو پالیسی اختیار کی گئی اس کی تہہ نشیں لہروں کو بھی پہچان سکتے ہیں، ۱۸۵۷ء کی ملکی تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے جو کچھ کیا وہ نقش ثانی تھا، اکبر کے نقش اول کا ——— اکبر کے زمانے میں جو رعب دلوں میں بٹھایا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری زبان کے دوش بدوش کسی گستاخ ملکی زبان کو لانے کا بھول کر بھی ارادہ کسی نے نہیں کیا البتہ سلطنت مغلیہ جب کمزور ہوگئی، اور محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ آیا تب کہیں شمالی ہند کے ارباب علم نے اردو کی طرف باقاعدہ توجہ کی، مرزا عبد القادر بیدل میر عبد الجلیل بلگرامی اور سراج الدین علی خاں آرزو بلکہ عمدۃ الملک انجام وغیرہ کے کچھ اشعار بھی ہمیں مل جاتے ہیں۔

مولانا احسن کا یہ مقدمہ اس لحاظ سے بھی بڑا اہم ہے کہ انہوں نے صرف ماضی ہی پر تبصرہ نہیں کیا بلکہ مستقبل پر بھی فکر انگیز روشنی ڈالی ہے بلکہ رہنمائی کی ہے ان کے متوازن ذہن و فکر نے بڑی محنت اور سوجھ بوجھ سے نتیجہ اخذ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"نویں صدی ہجری ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) سے اس وقت ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) تک ساڑھے پانچ سو برس کا زمانہ ہوتا ہے اس زمانے کو بحساب صدی چھ دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے اس طرح پانچ دور تو اپنے تمام ارتقائی مراحل طے کر چکے ہیں البتہ چھٹے دور نے ابھی آدھا راستہ طے کیا ہے۔ اس ناتمام دور کو بھی مکمل سمجھنا چاہیے کیونکہ بظاہر اردو میں اگر کوئی اضافہ ہو سکتا ہے تو طرز انداز بیان اور ذخیرۂ الفاظ کے فیضان عام کا جدید اثر ہوگا

نہ مشرقیات کہیں کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سنہ ۱۹۲۹ء سے سنہ ۱۹۶۰ء تک تیس سال کی مدت میں اردو ادب کی جو رفتار رہی ہے اس کو دیکھئے اور مولانا احسن کی اس پیشن گوئی کو دیکھئے، جو کچھ انہوں نے آج سے تیس برس پہلے، اکبر الہ آبادی کی طرح، کہا تھا، وہ ہمارے سامنے ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اردو پر مغربی انداز بیان اور یورپی الفاظ کے فیضان عام کا جدید اثر کس کس طرح اور کتنا ہو رہا ہے۔

مولانا نے اپنے دور میں پوری کوشش کی ہے کہ زبان بحیثیت زبان ہر طرح مکمل اور مستحکم رہے اسی لیے مصطلحات محاورات و امثال، تذکیر و تانیث اور سلاست و شستگی اور فصاحت کے مسائل پر ان کی توجہ زیادہ رہی، وہ جانتے تھے کہ دنیا کی کوئی زبان اپنے قواعد و اصول اور اپنے فطری لازمی اثاثے کی طرف سے بے نیاز ہو کر کبھی زندہ نہیں رہی ہے اسی لئے ان کی ساری زندگی اسی ذخیرے کی ترتیب و تفصیل اور تحفظ میں صرف ہوئی، اور بحیثیت اہل زبان انہوں نے اپنے اطمینان بخش ذخیرے کی بنا پر پورے اعتماد کے ساتھ یہ حقیقت واضح کی کہ بظاہر اردو میں اگر کوئی اضافہ ہو سکتا ہے تو مغربی انداز بیان اور یورپی الفاظ کے فیضان عام کا جدید اثر ہوگا ـــــــ یعنی زبان مکمل ہے اور زندہ ہے، ویسے کوئی اسے قتل کر دے تو یہ دوسری بات ہے۔

مولانا نے داغ کے سامنے زانوئے تلمذ بقول سیماب سنہ ۱۸۹۴ء میں اور بقول ڈاکٹر عبدالحق سنہ ۱۸۹۶ء میں تہ کیا تھا اس وقت سے لیکر استاد کی وفات یعنی سنہ ۱۹۰۵ء تک اور اس کے بعد سے لیکر خود اپنی وفات یعنی سنہ ۱۹۳۰ء تک انہوں نے بے شمار مضامین و مقالات لکھے فصیح الملک کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا جو بجائے خود ایک انجمن تھا، شوق نیموی اور جلال لکھنوی کی طرح تذکیر و تانیث پر خود کوئی رسالہ تو نہیں لکھا لیکن محاورات و امثال اور تذکیر و تانیث پر استاد سے اشعار کہلوا کہلوا کر ایک بڑا سرمایہ استناد تیار کر دیا فصیح اللغات مرتب کرنے کی داغ بیل ڈالی اور اس کے حصے ماہنامہ فصیح الملک میں شائع کرتے رہے، لیکن افسوس ہے کہ امیر اللغات کی طرح وہ بھی ناتمام رہ گئی، استاد کا دیوان شائع کیا اور پھر ان کے تمام دواوین کا ایک اچھا انتخاب بھی مرتب کیا، ان کی سوانح عمری بھی لکھی، لالہ سری رام دہلوی کی کتاب خمخانۂ جاوید کی پہلی جلد کی ترتیب و تدوین میں کوئی برس سوا برس تک معین و مددگار رہے، کلیات ولی پر محنت کی اور تمام نسخوں سے ملا ملا کر ایک ضخیم مجموعہ تیار کیا، اور اس پر مبسوط مقدمہ لکھا قومی اور اخلاقی نظموں کے چھوٹے بڑے منظوم رسالے بھی شائع کیے حتیٰ کہ نصاب اردو کے لیے بھی کتابیں لکھیں کہ ابتدا ہی سے نوخیزوں کی ذہنی تربیت صحیح رخ پر ہو، شعراء کے لئے ایک ہدایت نامہ عام بھی استاد سے فرمائش کر کے لکھوایا اور شائع کیا جس کو پیش نظر رکھنا ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو شعر گوئی کو اس شرط کے ساتھ سیکھنا چاہتا ہو کہ اس میں زبان و بیان، اسلوب و ادا، تشبیہ و استعارہ ہر پہلو سے حسن پیدا ہو، استاد داغ کہتے ہیں۔

شعر گوئی میں رہیں مدنظر یہ باتیں ۔ کہ بغیر ان کے فصاحت نہیں ہوتی پیدا

"بندش چست ہو، کوئی حرف دبتا نہ ہو، حرف علت گرتا یا دبتا نہ ہو، مفہوم گنجلک نہ ہو، تعقید پیدا نہ ہو، (بجز ایسی جگہ کے جہاں بندش مجبور ہو) حشو و زوائد نہ ہوں، ایطائے جلی نہ ہو، استعارے اور تشبیہ میں مزا پیدا کیا جائے، اصطلاح اچھی، مثل اچھی، بندش اچھی، مضمون صاف، اور فصیح ہو، اضافت ہو مگر توالی (یعنی اضافت در اضافت) نہ ہو، لف و نشر ہو۔

اور سلیقے سے ہو، ایہام بھی ہو مگر اس میں کیف پیدا کیا جائے۔ ردیف نامرغوب اور قافیہ بے ڈھنگا نہ اختیار کیا جائے۔ شتر گربہ نہ ہو عروض سے واقفیت بہم پہونچائی جائے

مختصر یہ ہے کہ ہوتی ہے طبیعت استاد		دین اللہ کی ہے حسن کو یہ نعمت ہو عطا"

طبیعت کے استاد ہونے یا شاعرانہ فطرت لیکر پیدا ہونے کا یہی مفہوم ہے کہ ذوق سلیم مذکورہ بالا صورتوں میں شاعر کی صحیح رہنمائی کرے اور بھٹکنے سے روکے۔

مولانا آسی ایک وسیع النظر عالم تھے، حافظ قرآن بھی تھے۔ عربی فارسی اردو زبانوں کے لٹریچر پر اچھی نظر رکھتے تھے اور حافظہ بھی خداداد پایا تھا۔ وہ شاعر بھی تھے، نثر نگار بھی، نحوی صرفی بھی تھے عروضی بھی، مورخ بھی تھے، محقق بھی اور نقاد بھی، وہ مدت دراز تک مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں پروفیسر بھی رہے۔ علاوہ ازیں ان کی تحریروں سے ملک کے طول و عرض میں بے شمار لوگوں نے فیض پایا ہے ارباب علم و فن کی نظر میں انکا اور انکی تحقیقات کا مرتبہ بلند ہے۔ ———— انہوں نے خاصہ بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے جسں کو مرتب صورت میں منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے بلکہ شاید آج اسکی ضرورت زیادہ ہے۔ ان کا دیوان غالباً کبھی شائع نہیں ہوا، اور مولانا کی فطری خاکساری کی نذر ہوا، حالانکہ غزلیات اور قومی سیاسی نظموں کا ذخیرہ خاصا بڑا ہے۔ داغ کے تو وہ شاگرد ہی تھے حالی و شبلی کے بھی ہمزبان تھے۔

مولانا غلام مصطفیٰ خاں ایم اے۔
ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی۔

نکاتِ احسنؔ

موجودہ دور کے فضلا، ادبا اور شعرا بلکہ اونچے درجے کے طلبا میں بھی بہت کم ایسے ہوں گے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت احسن مارہروی سے واقف نہ ہوں۔ جلوۂ داغ۔ یادگارِ داغ۔ منتخباتِ داغ۔ انشائے داغ۔ لالۂ سرِ بام۔ کاشانۂ جاوید۔ ریاضِ سخن۔ بیاضِ خلیل (فصیح الملک)۔ فصیح اللغات۔ کارنامۂ غم۔ کلیاتِ ولی۔ تاریخ نثرِ اردو (نمونۂ منثورات) کشف الحقیقین اردو لشکر وغیرہ متعدد ادبی صحیفے ہیں جو اردو کی رہتی دنیا تک رہیں گے اور ان کی یاد تازہ کریں گے۔ ان کے علاوہ اردو قواعد، عروض مع صحت زبان و بیان انشا پردازی و شاعری میں بھی ان کی خدمت اربابِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ علیگڑھ میگزین کے احسن نمبر، "آجکل" (دہلی) ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء وغیرہ مختلف رسالوں میں مرحوم کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے تو ہم ان کے کچھ ایسے ادبی نکات پیش کرنا چاہتے ہیں جو کہنے کو تو موٹی موٹی باتیں ہیں لیکن اپنی افادیت میں بہت اہم ہیں اور جو ایک دو دن میں نہیں بلکہ بہت مدت تک ان جیسے اساتذہ کی خدمت میں رہ کر ہی حاصل ہوا کرتی ہیں۔ ان ادبی نکات کو ہم اپنی سہولت کے لئے تقسیم کئے لیتے ہیں اور پہلے زبان کے متعلق عرض کرنا چاہتے ہیں۔

زبان

(۱) جناب اختر بریلوی کو لکھتے ہیں کہ لوٹنا (پلٹنے کی جگہ) گنواری بولی ہے اس لئے یہ مصرع "ایسا گیا کہ لوٹ کے لی ہی خبر نہیں" اس طرح ہوگا: ع ایسا گیا کہ اس نے پلٹ کر نہ لی خبر۔

پھر لکھتے ہیں کہ۔

(۲) تنہا دیدہ لکھنا اردو میں فصیح نہیں۔ اسی طرح بغیر ترکیب کے گوشش لکھنا مذاقِ صحیح کے خلاف ہے (خط بنام سلیم سہسوانی)

(۳) دلی والے تیوری بروزن رہبری بولتے ہیں جیسے ع۔ ملتا ہوں تیوری سے کسی کی چڑھی ہوئی۔ مگر میں اب اسکو (یعنی تیوری بروزن نوری) بھی جائز سمجھتا ہوں۔ اصلاح اختر۔

اسی طرح دیوتا ہندی لفظ ہے بروزن فعلن بھی صحیح ہے اور بروزن فاع لن بھی (خط بنام ابر احسنی)

(۴) [illegible] مستند شعرا کے یہاں غیر مستند ہے۔ مگر اردو بول چال میں ہے اس لئے میں بجا سمجھتا ہوں۔ اصلاح اختر

(۵) خلط ملط ہونا بولتے ہیں اور ربط ضبط بڑھانا صحیح ہے (اصلاح اختر)

(۶) بغیر ترکیب جب جان لکھو تو نون کا اعلان کرو۔ ہاں ترکیب فارسی میں اخفائے نون ضروری ہے۔ (اصلاح اختر)
جناب ابواحسنی کو لکھتے ہیں کہ جبیں۔ آستیں۔ آسماں۔ جاں۔ گمریہاں سب بقاعدۂ فارسی مضاف الیہ یا معطوف ہو گئے تو بالاخفاء
پڑھے جائیں گے اور فغاں کسی حالت میں بھی بہ اظہار نون نہیں۔ ۔ ۔ ۔ متذکرہ بالا الفاظ کو اگر مرکب نہ کیا جائے تو بحالت
افراد بھی بالاخفاء کہہ سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(۷) بے کلی۔ یہ صحیح نہیں خصوصاً اس لئے کہ یہ عورتوں کا اندرونی مرض ہے جو پہلو نے ذم رکھتا ہے (اصلاح اختر)

(۸) خدا مست (بمعنی مست مولیٰ) اچھی ترکیب نہیں (اصلاح اختر)

(۹) کیسے بمعنی کیونکر۔ داغ اور امیر نہیں لکھتے۔ میں بھی نہیں لکھتا۔ مگر اب اکثر لکھنے لگے ہیں لہٰذا بخیال توسیع زبان رہنے
دیا (اصلاح اختر) مطلب یہ ہے کہ ناسخ وغیرہ متوسطین تک کیسے بمعنی کیونکر لکھتے تھے۔ لیکن متاخرین نے اس معنی میں ترک کر دیا تھا

(۱۰) اختر بریلوی کو حضرت احسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ ناراضگی بھی صحیح ہے۔ حالانکہ "ناراض" سے "ناراضی" ہی لفظ بن سکتا
ہے "ناراضگی" نہیں بن سکتا لیکن عموماً رائج ہے اس لئے صحیح بلکہ فصیح بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اب ادائگی بنا لیا گیا ہے
سر سید اسکی جگہ صرف ادا بولتے تھے جیسا کہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں: جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم
و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ
اختیار کیا "

(۱۱) پیراہن کے لئے پارہ پارہ ہونا (بجائے ٹکڑے ٹکڑے ہونا) فصیح ہے (اصلاح اختر)

(۱۲) شبِ فرقت میں فصیح نہیں۔ صرف شبِ فرقت فصیح ہے۔ (اصلاح اختر)

(۱۳) زلف کے لئے "ترتیب دینا" اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ (اصلاح اختر)

(۱۴) (تم ہی کے بجائے) تمہیں فصیح ہے۔ (اصلاح اختر)

(۱۵) آؤ۔ اشارہ مخاطب بعید کو اور آئے مخاطب قریب کو چاہئے (اصلاح ابیما)

(۱۶) دھوکے۔ یا کے وغیرہ بجائے دھوکہ پاکر لکھنؤ کا ایجاد ہے۔ دلی والے اسکو فصیح نہیں سمجھتے۔ (اصلاح راز)

(۱۷) عبداللطیف اعظمی کو لکھتے ہیں مخصر کو منتر اور فصیل کو سفیل بولنے والے جہلا اور بازاری لوگ ہیں اور اسی زمرہ میں وہ
حروف شناس آجاتے ہیں جنہیں فن سے آگاہی نہیں اور ادبی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کو عوام کہا جائیگا نہ عام۔ میرے نزدیک "غلط
العام فصیح" سے وہ اہل علم مراد ہیں جو مستند اور معتبر ہیں۔ اور وہ لوگ جو بوجہ ناواقفیت یا عدم توجہی فن تحقیق سے نابلد ہیں انکو
عوام میں شامل کرنا چاہئے۔ اور انکے لئے "غلط العام فصیح" کے ساتھ یہ فقرہ بڑھانا چاہئے کہ "غلط العوام فحیح"

(۱۸) محمد ریاض حسن خیال شاگرد داغ "چل کارے" کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کے معنی چل دور۔ دھتکار کے ہیں۔ اور
وہ غزل (جسمیں یہ لفظ آیا) میری موجودگی میں (حضرت داغ نے) فرمائی تھی۔ اور میں نے اسی وقت اس لفظ کو مشکوک حیثیت کا
اظہار کیا تھا مگر بوثوق کہا گیا ہے کہ یہ دلی کی زبان ہے اور ہم بولتے ہیں۔ لیکن یہ تحقیق ہے کہ عورتوں کی زبان ہے اور عام استعمال
نہیں۔ بہرحال ہمارے لئے سند ہے۔ وہ ایک لفظ اور بھی انکے استعمال میں تھے۔ اگر سوانح کی تکمیل ہو گئی تو انشاءاللہ ایسے الفاظ

کے متعلق عرض کیا جائے گا۔

(۱۹) بات کرنا اور کرنی کا فرق یاد رکھو جب کسی مذکر لفظ کے بعد فعل آئے تو مذکر اور جب مؤنث لفظ ہو تو اس کا فعل مؤنث چاہئے۔ جیسے روٹی کھانی جان دینی وغیرہ۔ یہ زبانِ دہلی کی خصوصیت ہے۔ بات کرنا۔ روٹی کھانا لکھنؤ کا روزمرہ ہے۔ اب اگرچہ وسعتِ زبان کے خیال سے دونوں روزمرے خلط ملط ہو گئے ہیں اس لئے عام طور سے اسکا لحاظ اٹھ گیا ہے یہ بات بطور آگاہی لکھدی۔ ورنہ میں بات کرنا غلط نہیں سمجھتا۔ خط بنام (سید احسن صاحب)

(۲۰) کیفیت کی دوسری یائے تحتانی مشدد بھی جائز ہے اور بہ تخفیف بھی (خط بنام ابراحسن)

(۲۱) بیہودا فارسی لفظ ہے اور اس میں لا نہیں ہے (خط بنام ابراحسن)

(۲۲) ہنود کی جگہ۔ اہل ہنود غلط۔ صرف ہنود صحیح ہے جیسے مسلم۔ نہ اہل مسلم (خط بنام ابراحسن)

(۲۳) سخن بفتح ثانی اور بضم ثانی دونوں صحیح و مستعمل ہیں۔ (خط بنام اختر بریلوی)

(۲۴) افیون اور افیم دونوں صحیح ہیں۔ ایک فارسی اور دوسرا اردو مگر بسکون اوسط ہے۔ مگر ولی اور انکے معاصرین و متاقبین شعرا ابتداءً بول چال کے مطابق لکھ جاتے ہیں۔ (خط بنام اختر)

(۲۵) ٹھنڈی گرمیاں تو اردو محاورہ ہے جسکے معنی بے مزہ شوخیوں کے ہیں۔ ٹھنڈی آنچ میں نے نہیں سنا (خط بنام صفیر احسن)

(۲۶) قفلی ہر معنی میں صحیح ہے یعنی قاف کے بعد ف ہونی چاہئے۔ قلفی یعنی قاف کے بعد لام۔ یہ بازاری اور جہلا کا تلفظ ہے جیسے یہ لوگ فصیل کو سفیل بولتے ہیں۔ یہ زبان نہ صحیح اور نہ مستند اور نہ اسے اردو زبان کا لفظ کہا جائے گا (خط بنام صفیر احسن)

(۲۷) اردو میں اسرار بحالت واحد بھی مستعمل ہے جیسے آئیں کیا اسرار ہے (خط بنام صفیر احسن)

(۲۸) مِسَل missal انگریزی لفظ ہے اور وہ ایک کتاب ہوتی ہے جو گرجوں میں رہتی ہے اور اسکا رواج قدیم ہے۔ ث سے لکھنا صحیح نہیں۔ اسی طرح مسّی —— (خط بنام صفیر احسن)

(۲۹) دائم اور مریض دونوں اسم فاعل ہیں۔ ان دونوں کا بقاعدہ عربی (بہ ادخال الف لام) استعمال صحیح نہیں۔ دائم المرض دائم الحبس۔ دائم الخمر صحیح ہے۔ ورنہ دونوں اسم فاعل اسطرح مرکب نہیں ہو سکتے۔ (خط بنام صفیر احسن)

(۳۰) غالب کی طرح "یادگارِ غالب" مولانا احسن بھی ذال کو عربی سمجھ کر فرماتے ہیں کہ ذال فارسی حرف نہیں لہذا گزارش اور گزر وغیرہ کو زے سے لکھو ہی میں لکھتا ہوں لیکن ذال دراصل قدیم فارسی میں بھی ہے جیسے کاغذ فارسی لفظ ہے (خط بنام صفیر احسن)

(۳۱) عربی میں طیّار اور تیار دونوں صحیح ہیں۔ میرے نزدیک طیّار اگر اپنے اصلی معنی (طائر) میں نہ بولا جائے تو ت سے لکھنا چاہئے۔ (خط بنام صفیر احسن)

(۳۲) منائع۔ بدائع۔ جائز۔ فائز۔ حائل۔ سائل منائع میں دراصل ی ہے ہمزہ کوئی مستقل حرف نہیں صرف تلفظ کیلئے ہمزہ لکھدیا جاتا ہے۔ تاریخ میں اسکے عدد نہیں لئے جاتے ہیں اور گھائل اردو کا لفظ ہے محققین اس پر ہمزہ نہیں لکھتے اور قائل وغیرہ کا قافیہ نہیں کرتے۔ بلکہ ازیل۔ کرل کی طرح یل کو حرف نسبت سمجھتے ہیں۔ خط بنام صفیر احسن)

(۳۳) مُلزم ... اردو نے قواعد و لغت بفتحہ زا سمجھا ہے۔ مگر عام بول چال میں مجرم کا ہم وزن اور ہم معنی ہے

میرے نزدیک توسیعِ اردو کے خیال سے یہ استعمال جائز ہے۔

(۳۴) حفظِ ما تقدم، دال مشدد و مفتوح صحیح ہے۔

(۳۵) نظر کی جمع (نظریں) بسکون ظ صحیح ہے حرکتِ بسکون رائے عطا (بھی صحیح ہے)

(۳۶) سدا کا لفظ قطعاً متروک نہیں۔ ورنہ سدا سہاگن، سدا بہار جیسے الفاظ متروک ہو جائیں گے جو یقیناً نہیں ہوئے۔ علاوہ

کی جمع حوادث ہے جمع الجمع حوادثات محتاط نہیں لکھتے۔ (خط بنام اعجاز صدیقی)

اب بعض عام اغلاط کے متعلق حضرت احسن کا قول دیکھئے۔ آج کل مع کے بجائے بمع۔ موقع کے بجائے موقعہ لکھتے ہیں یہ غلط ہے۔ اسی طرح "تو یہ کام کیا نہ ہی وہ اس جملہ میں ہی کی ضرورت نہیں ہے۔ چند ایک میں ایک نہ لکھیں اژدہام کو اژدحام لکھیں فی زمانہ نہیں فی زمانا چاہیئے سینکڑوں جھوٹ سونچ میں نون نہیں چاہیے لاابالی میں الف کی جگہ واو غلط ہے۔ فطرۃً۔ قدرتاً۔ دفعتاً۔ مقابلتاً۔ نسبتاً۔ معنیً وغیرہ کے آخر میں الف نہیں چاہیئے۔ تینوں۔ چاروں وغیرہ کے آخر میں نون لکھتے ہیں لیکن بعض لوگ دونوں کے آخر میں نون نہیں لکھتے۔ لکھنا چاہیئے۔ بعض لوگ قرآن پاک کی عبارت یتیماً و اسیراً سے اردو میں یتیم و یسیر لکھتے لگے ہیں یسیر کو یتیم کا مترادف سمجھنا غلط ہے۔ یسیر کے معنی قلیل کے ہیں۔ اسی طرح دجیر کا مترادف شکیل نہیں ہے۔ (ماخوذ از رسالہ فصیح الملک اگست ۱۹۰۵ء)

(۲) اب کچھ ایسے الفاظ بھی دیکھئے جن کی تذکیر و تانیث حضرت احسن نے بڑی خوبی کے ساتھ سمجھائی ہے۔ اور لکھنؤ و دہلی کے اختلافات پر مطلق زور نہیں دیا۔

(۳۷) حضرت داغ کے شاگرد متین مجھلی شہری کو لکھتے ہیں کہ تمتماتا میری سماعت میں یکسر ہر دو تائے فارسی ہے لغت دیکھنے سے بھی دہلی اور لکھنؤ میں یہی استعمال معلوم ہوا۔ ممکن ہے کہ پنجاب اور پورب میں بفتح بولتے ہوں۔

(۲) حضرت اختر نگینوی کو لکھتے ہیں۔ وادی زبانِ فصحا پہ تو یقیناً مذکر ہے۔ فرہنگ آصفیہ نے بحالت مفرد مؤنث اور وادیِ ایمن کو مذکر لکھا ہے۔ مگر اسکی یہ تحقیق اہلِ نظر کی نگاہ میں وقیع نہیں۔ شعرائے لکھنؤ میں متفق علیہ مذکر ہے صبا کا مصرع ہے۔ ع

خاک میں مل گیا سب وادیِ ایمن کیسا

نوازش شاگرد رند کہتے ہیں ؎

دل کو کس وقت خیالِ رخِ روشن نہوا　　　ہم سے وحشت میں جدا وادیِ ایمن نہوا

میری سماعت میں اردو زبان پر بھی مذکر ہے۔ موجودہ بول چال میں ایجاد (مذکر) اصلاح (مؤنث۔ برت (مذکر) فہم (مذکر) وغیرہ کی طرح یہ لفظ بھی غلط طریقہ سے مستعمل ہے

(۲) اختر بریلوی کو لکھتے ہیں ببول کو ناسخ نے مؤنث لکھا ہے

دل کو خوش آتی ہیں صحرا کی ببولیں پر خار
اب کسی سرو و گل اندام سے کچھ کام نہیں

مگر ہماری زبان پر مذکر ہے۔ اور فرہنگ آصفیہ نے بھی مذکر لکھا ہے۔

(۳) افق مذکر ہے۔ نوازش کا مصرع ہے۔ ؎

افق چرخ بھی ڈوبا ہوا آتا ہے نظر

پتنگ (ہر معنی میں) مذکر ہے۔ (خط بنام اختر بریلوی)

(۴) حضرت شفا جالندھری کو لکھتے ہیں۔ ادرک اور کھیل بروزن (ریل) دونوں مونث ہیں میر کا شعر ہے۔ ؎

کیا کہوں مرچ تھی نہ ادرک تھی ۔۔۔ اس مچھندر میں کچھ بھی بھدرک تھی

جس لفظ کی جمع "یں" سے مستعمل ہو وہ لفظ یقیناً مونث ہوگا مذکر مفرد کو کبھی یں سے نہیں بولا جاتا۔

(۵) نقاب مختلف فیہ ہے۔ میں مونث لکھتا ہوں اور اب بکثرت یہی استعمال جاری ہے۔ نشاط بھی مونث ہے اور میں مونث لکھتا ہوں۔ موجودہ زمانے کے اہل ان پابندیوں کے عادی نہیں جن کا التزام پرانی لکیر کے فقیر کیا کرتے تھے۔
(خط بنام صغیر احسن۔)

(۷) متاع کو بعض نے مذکر لکھا ہے۔ مگر متند اور مستعمل مونث ہے میں بھی مونث لکھتا ہوں بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں۔ ؎

بلا غارتگری آتی ہے ظالم تیرے غمزے کو
متاعِ صبر و طاقت سب مری اک پل میں غارت کی

لیکن نسیم نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

کی گھر ریزی ہمارے آبلوں نے لوٹ کر ۔۔۔ تھا متاعِ عمر جو وقف بیاباں ہو گیا

خط بنام صغیر احسن۔

۱۹۴۲ء میں راز چاندپوری کو لکھتے ہیں کہ تقریباً چھبیس برس ہوئے کہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری صاحب نے ایسی [illegible] کے متعلق بذریعہ خطوط خاص خاص لوگوں سے مشورت چاہی تھی چنانچہ مجھے بھی اسی خصوص میں لکھنا پڑا اور وہ تحریریں [illegible] الاخبار اور مشرق (ربا) وارث حکیم برہم گورکھپوری کے ذریعہ سے معرض بحث میں آئیں۔ اہل لکھنؤ یہ فرماتے ہیں کہ جس غیر ذی [illegible] مفرد لفظ کی جمع بقاعدۂ عربی مستعمل ہو وہ بحالت جمع مذکر ہونی چاہئے۔ مثلاً کتاب سے کتب۔ کیفیت سے کیفیات۔ خدمت [illegible] خدمات اس میں مفرد کے مذکر و مونث کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے گا۔ مگر اہل دہلی کا استعمال اکثر اس کے خلاف ہے میں نے اس وقت [illegible] عرض کیا تھا کہ اس کے لئے یہ اصول قرار دینا چاہئے کہ بحالت انفراد جو لفظ مونث ہو اس کی جمع بھی مونث ہو۔ اور جو لفظ مفرد [illegible] ہو اس کی جمع بھی مذکر ہو۔ اس اصول میں جو آسانی ہے ظاہر ہے۔ . . . . . ورنہ ان کے قاعدے کے مطابق عورت (خواہ مفرد [illegible] میں بھی) کو عورات کرنے کے بعد مذکر کہئے۔ ممکن ہے کہ اس قاعدۂ کلیہ کے بعد دو چار لفظ ایسے مل جائیں جن کے واحد [illegible] میں اختلاف ہو اور زبانوں پر جاری ہو لیکن اکثر کلیوں میں استثنا ہوتا ہے وہی مانا جائے گا۔ میں وجوہ کو مذکر نہ [illegible] لوں گا۔ اگرچہ اہل قلم لکھتے ہیں۔ اسی طرح حضرت احسن نے فصیح الملک اپریل ۱۹۰۶ء میں بحث کی تھی کہ خط لکھنا چاہئے کتاب [illegible] ہے۔ کتابیں چاہئیں مکانات ڈھونڈھتے چاہئیں ہی دہلی والوں کے نزدیک صحیح ہے۔

ان کے علاوہ حضرت احسن کے کچھ نکات املا کے متعلق بھی ہیں جن کی تفصیل علیگڈھ میگزین کے احسن نمبر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسکی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ انجمن ترقی اردو کی موجودہ املا میں اکثر و بیشتر اصول حضرت احسن کے تجویز کردہ ہیں بہرحال اجمالاً عرض کیا جاتا ہے ۔

(۱) جب یائے ساکن کے پہلے زبر ہو تو وہ ی نصف دائرے کی بنائی جائے مثلاً ۔ تے ۔ شے ۔ کے ۔ خے ۔ طے ۔

(۲) نون جب پڑھا جائے تو نقطہ لگایا جائے ۔ اگر صرف اخفا ہے تو نقطہ نہ لگایا جائے ۔ اور اگر درمیان میں ایسا نون آئے تو اس پر جزم رکھ دیا جائے تا کہ یا ہنسی وغیرہ

(۳) ہائے مخلوطی ہمیشہ دو چشمی لکھی جائے

(۴) ہندی الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی لکھنا غلط ہے ۔ پٹنہ ۔ کلیجہ ۔ مہینہ ۔ ٹھیکہ ۔ بھروسہ وغیرہ کے آخر میں ہ غلط الف چاہئے :۔

(۵) حالت جار ۔ حالت اضافت و عطف میں بھی الفاظ اسی طرح لکھے جائیں جس طرح بولے جاتے ہیں ۔ مثلاً اس بات میں ۔ اس زمانے میں ۔ اس مشاعرے کا ادیب ۔ قاعدے اہل زبان ۔ شایان شان وغیرہ

(۶) مرکب الفاظ کے اجزاء ہمیشہ علیحدہ علیحدہ لکھے جائیں جیسے چوں کہ ۔ چناں چہ ۔ کیوں کہ ۔ حال آں کہ ۔ بل کہ وغیرہ اسی طرح افعال میں اجزاء الگ الگ ہوں جیسے آئیں گے ۔ لکھوں گا ۔ لکھ سکے گا ۔ دے دیا ہے ۔

(۷) کیجئے لیجئے ۔ اسلیئے وغیرہ میں ہمزہ نہیں لکھتے بلکہ انشا کی طرح دو "ی" لکھتے تھے ۔

حضرت اختر نگینوی کو لکھتے ہیں کہ دیکھئے کے ۹۵ عدد ٹھیک ہیں تاریخ میں مکتوبی عدد لئے جاتے ہیں ۔ دیکھئے میں کھ کے بعد دو یائے تحتانی تلفظاً بھی ہیں اور تحریراً بھی لہذا اسکو ہمزہ سمجھنا ناواقف ایک یائے تحتانی سمجھتے ہیں ۔ ان کی غلطی ہے

اسی طرح حضرت احسن ذرا کو ذال ہی سے لکھتے تھے ۔ اب اسکو زے سے لکھا جاتا ہے ۔ اس دلیل پر کہ "ذرہ" اپنے معنی اور تلفظ میں بدل گیا ہے ۔ اس کے خلاف حضرت احسن نے رسالہ فصیح الملک میں بحث کی تھی ۔ اور کچھ عربی الفاظ ایسے بھی پیش کئے تھے جو اپنی اصلی شکل میں لکھے جاتے ہیں گو کہ تلفظاً اور معنی میں بدل چکے ہیں ۔ اسی طرح "ٹھہرنا" کے متعلق لکھتے ہیں کہ اسمیں تو ہندی کا (مخلوط ہ) حرف ہے ۔ ۔ ۔ اسی بنا پر ایرانی زبان میں ٹھیرنا یائے تحتانی سے بولتے ہیں اور لکھتے ہیں ۔ خط بنام اعجاز صدیقی

اس کے علاوہ فن عروض کے متعلق بھی بہت سے نکات حضرت احسن کی تحریروں میں ملتے ہیں جسکو بخوف طوالت فی الحال یہاں نہیں لکھا جا رہا ۔ تاہم مذکورہ بالا تیں ایسی ہیں جن کی اہمیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے زبان کی اصلاح پر خصوصیت کے ساتھ توجہ فرمائی ہو ۔ اور ایک کامل استاد سے عرصہ دراز تک استفادہ کیا ہو (از رسالہ احسن المیوہ اسٹیٹ بابتہ جنوری ۱۹۴۶ء)

ا۔ اس پیرا وہ گرائمر نے سب سے پہلے توجہ کی ۔ سپرانشانے دریائے لطافت میں بحث کی تھی ۔

"اسلامی ڈیپوٹیشن پر ایک دلچسپ نظم"

از وجاہت حسین جھنجھانوی مع تبصرہ از حضرت سید علی احسن احسن مارہروی

(یہ ایک تاریخی یادگار نظم ہے سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن سر آغا خان بالقابہ کی رہنمائی میں شملہ گیا تھا جہاں لے والسرائے سے ملاقات کر کے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت اور ان کے مطالبات پیش کئے تھے اس نظم میں ان تمام حضرات کے نام درج ہیں جو اس میں شریک تھے آخیر میں مولانا احسن نے اس پر تبصرہ بھی درج کیا ہے جو چوّن برس پہلے کی داستان ہے)

ہے ممبران قوم کا شملے پہ اجتماع — اب تو برس کے بعد بدلتی ہے ہسٹری
آئے ہیں دور دور کے حضرات شوق سے — کیا حب قوم دل میں ہے ہر ایک کے بھری
اصحاب باوقار جماعت میں ہیں شریک — ہے وجہ فخر اس ڈیپوٹیشن کی ممبری

تفصیل ممبروں کی پڑھیں ناظرین اب
ہیں سب یہ واقعات نہیں ان میں شاعری

بمبئی

سر آغا خاں کا نام ہے سر نام ملک میں — ۵ اچھا کیا جو قوم نے دی ان کو برتری
شملہ پہونچ گئے وہ لکھنؤ سے کیا ہی جلد — دیکھی نہ راہ بھر میں کہیں خشکی و تری
آدم جی پیر بھائی چلاتے ہیں ریل بھی — ان کیلئے یہ قوم کی گاڑی ہے دوسری
احمد رفیع دین کا ہے رتبہ بہت بلند — مجھ سے نہ ہوگی ان کی بجز بی شناگری

بہار و بنگال

جب بختیار شاہ جماعت میں ہوں شریک — پھر کیوں کھلے نہ قوم کی تقدیر یاوری
سید علی امام ہیں قوم کے امام — ۱۰ سید ہیں۔ انکو یوں بھی تو زیبا ہے سروری
نواب ہیں امیر حسن خاں سی آئی ای — اب قوم کی انہیں سے ہے ظاہر تو نگری
سب جانتے ہیں مرزا شجاعت علی کا نام — ضرب المثل ہے قوم میں ان کی بہادری
کافی اسی قدر ہے نواب علی کا وصف — گویا ہماری قوم کے اک وہ ہیں چودھری
کلکتہ سے نصیر حسین آئے سعی کو — نصرت ملے جو یہ تو نہ ہو کیوں مظفری

عبدالرحیم اور شرف الدین وہ لوگ ہیں ۱۵ کوشش سے جن کی قوم کو ہے بار آوری
نواب سرفراز حسین آئے پٹنہ سے شملہ پہ دی انہوں نے بھی ہر وقت حاضری

متوسط
مولانا ایچ ایم ملک ناگپور سے ہیں میرے وصف اور مری تعریف سے بری

مدراس
احمد محی الدین بھی وہ ہادی ہیں قوم کے کہتے ہیں اچھے کاموں میں جو اسکی رہبری

دکن
سردار ہیں علی تو نہیں اس کی فکر کیا بڑھ جائے بڑھ رہی ہے اگر اپنی لاغری

واقف ہیں ملک و قوم کے محسن سے اہل ملک ۲۰ تعلیم گاہ قوم کے ہیں وہ سکرٹری
مضمون ہے یہ "شمع مقدار علم" کا یعنی وہ نقد علم و ہنر کے ہیں جوہری

متحدہ
مشتاق سے وقار ہے اب ملک و قوم کا گر یہ نہ ہوں تو قوم میں بڑھ جائے ابتری

آگرہ
حاجی ذبیح قوم - مزمل فدائے قوم کب ہو سکے گی ان کی کسی سے برابری

اودھ
احمد کے آفتاب کی ایسی ہے روشنی ہیں ماند جس کے آگے مہ و مہر و مشتری
سب جانتے ہیں نام کرامت حسین کا ۲۵ حاصل انہوں نے کی ہے بہت نام آوری
رحمان کے حبیب ہیں بے شبہ مولوی کہتے ہیں بحر علم میں کیا کیا شناوری
عبدالرؤف سید و عبدالسلام خاں سرداری ان کی قوم میں- ان کی ہے افسری
موزوں اسی لئے نبی اللہ کا ہے نام کیوں اپنی قوم میں نہ کریں وہ پیمبری
ہیں منشی احتشام علی صاحب حشم کرتے ہیں ان کی حشمت و اقبال چاکری

پنجاب
ہو شان خضر عمر و حیات ملک دراز ۳۰ ہیں قوم میں وہ افسر فن سپہ گری
اجمل طبیب قوم ہیں دلی میں آج کل حکمت سے سوچتے ہیں وہ تدبیر بہتری
یہ بات سچ ہے خان بہادر ہیں شاہ دین دنیا میں جانتے ہیں سب ان کی دلاوری

وہ نوجوان قوم محمد شفیع ہیں — کرتے ہیں جو تمیز میں بڑھوں کی ہمسری
ممتاز ہیں خلیفہ محمد حسین بھی — ہے ان کی بات قوم میں اکر حکم نادری
عبدالمجید خان بہادر کے واسطے — ۳۵ موزوں ہوئی ہے خوب ہی فارن منسٹری
ہر دل عزیز خواجہ یوسف ہیں کس قدر — ان کو عزیز رکھتی ہے دل سے برادری
آیا غلام صادق امرتسری کا نام — چھوٹے ہیں وہ جوان کو سمجھنے نہیں جری

سندھ

کافی ہے بس یہ وصف الہ داد شاہ کا
مجموعۂ صفات یہ ممبر ہیں آخری

ان سب کی والیسرائے نے کی قدر و منزلت — گویا یہ آفتاب کی ہے ذرہ پروری
شکر خدا کہ ہم پہ ہے وہ قوم حکمران — ۴۰ مشہور جس کی دہر میں ہے عدل گستری
ہم کامیاب ہوں گے ضرور اپنی سعی میں — شاخ مراد ہو کے رہے گی ہری بھری
چاہیں تو والیسرائے دلا سکتے ہیں ضرور — کچھ چیز ہی نہیں ہے ججی اور کمشنری
جو کچھ کہا ہے کر کے اب اس کو دکھائیں گے — اس وقت والیسرائے کی باتیں تھیں سرسری
کھوٹی مگر نہ ہو کہیں تقدیر قوم کی — اسپیچ والیسرائے کی تو ہے بہت کھری

خوش حال ہو گی قوم وجاہت یہ ہے یقین
۴۵ اب اپنا رنگ بدلے گا یہ چرخ چنبری

تبصرہ از ایڈیٹر احسن مارہروی

اب کامیابیاں ڈیپوٹیشن کی دیکھئے — کیا جلد اپنی شاخ تمنا ہوئی ہری
پنجاب چیف کورٹ میں خالی تھی اک ججی — ہے بس یہ شاہ دین کی موزوں تقرری
کلکتہ کی ججی شرف الدین کو ملی — ۴۸ گویا ہے لیے "دینوں" سے دنیا کی بہتری

(رسالہ فصیح الملک جلد ۲ نمبر ۷۔ ۸ ص ۴۳-۴۴ نومبر دسمبر ۱۹۰۶ء)

سالک کانپوری

حافظ محمد سلیمان نام، سالک تخلص ــــ جوتے بیچتے ہیں، شاید وطن کی روایت کا احترام کرتے ہوئے ــ
دن تاجروں کے ساتھ گزرتا ہے۔ راتیں حافظ، فردوسی، خیام، غالب اور اقبال کی صحبت میں ــ شاید
یہ بھی کانپور کی روایت ہے کہ اس کے فن کاروں کی زندگی "اک طرفہ تماشا" ہی ہے۔

سالک جیسا قہقہہ لگاتے ہوئے میں نے کم ہی لوگوں کو دیکھا ہے۔ ان کے قہقہے میں کبھی طنز ہوتا ہے کبھی
ہمدردی، کبھی نفرت، کبھی محبت اور کبھی علم کا وقار۔ . . . ان کا قہقہہ ان کی شاعری کا ہمزاد ہے۔

سالک کی شاعری میں بڑا رکھ رکھاؤ ہے۔ وہ بہت سوچ کر سمجھ کر شعر کہتے ہیں اسی لئے ان کی نظموں
اور رباعیوں میں تجربے کے اوقاف و علامات کی کمی نہیں۔ سالک ان چند شعرا میں سے ہیں جنہوں نے فکر اور
شعریت کو بڑی کامیابی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ وہ ہماری بہترین شعری روایات کے پروردہ ہیں لیکن
غزل ان کے مزاج کو راس نہ آئی۔ نظم، قطعہ اور رباعی ان کا ذریعۂ اظہار ہے۔

سالک کا پہلا مجموعۂ کلام "آشیانِ فکر" ۱۹۴۷ء کے غدر دلی کی نذر ہو گیا۔ شاید اس انسان دوست
شاعر کے مجموعۂ کلام کا مقدر اس کے سوا اور کچھ ہو بھی نہ سکتا تھا۔ (کشفی)

دوری

روح، جذبات کے اندھیرے میں
دل، خیالات کے اندھیرے میں

میرا احساس، شعلۂ امید
وہ، محالات کے اندھیرے میں

دل پہ صدمات کے اندھیرے میں
ضو سی اک رات کے اندھیرے میں

کوندتی ہے فضا میں بجلی سی
جیسے برسات کے اندھیرے میں

آج کل ان سے رسم و راہ نہ پوچھ
ہم نشیں! حالتِ تباہ نہ پوچھ!

لیلیٰ

ایک پردہ نشین۔ برسات کی اندھیری رات میں

اندھیری رات، یہ ٹھنڈی ہوا، یہ گرم وجود — نصیب میں ہیں فقط کروٹیں، مرے معبود!
فضائے صحن میں، بارش نے چھیڑ رکھا ہے — جگر گداز ترنم، جنوں نواز سرود
دیارِ روح میں ہنگامہائے حشر و فساد — جوارِ شوق میں تخئیل کا ہبوط و صعود
کبھی کبھی، کوئی بجلی چمک سی جاتی ہے — تمام منظرِ آفاق بس سیاہ و کبود
کوئی خیال مرے دل کو گدگداتا ہے — نہ توڑ دے یہ جوانی شرافتوں کی حدود
غضب ہے، یہ حرمِ آہنیں، یہ صنفِ لطیف — ستم ہے ہمتِ مرداں نسائیت پہ قیود

میں خاندان کی عزت گنوا نہیں سکتی — طلسمِ ہجر میں ہوں، پاس آ نہیں سکتی
یہ بندشیں اور یہ پابندیاں ہیں کچھ ایسی — انہیں ہٹا نہیں سکتی، اٹھا نہیں سکتی
تمہارا نام، تمہاری وفا، تمہارا خلوص — اگرچہ دل میں ہیں، پر لب پہ لا نہیں سکتی
وہ نغمہائے محبت، جو روح گاتی ہے — میں زیرِ لب بھی انہیں گنگنا نہیں سکتی
تم اک حقیقتِ عریاں ہو میری خلوت میں — مگر "دریچے" کی چلمن اٹھا نہیں سکتی
میں آتشِ غمِ پنہاں میں، جل تو سکتی ہوں — مگر چراغِ محبت جلا نہیں سکتی

میں چاہتی ہوں بس اک رات، ایک اندھیری رات — سیاہ رات۔ کہ سوجھے نہ جس میں ہاتھ کو ہات
وہ رات جس میں تصور بھی دن کا، کر نہ سکوں — وہ رات جس میں تخیل اٹھائے پردۂ ذات
بڑھوں، میں بڑھ کے تمہیں سونپ دوں امانتِ حسن — یہ لب، یہ چشم، یہ رخسار، یہ جبیں، یہ ہات
وفا کے پھول، تمنا کا باغ، دل کی بہار — فسونِ چشم و خمارِ شباب و کیفِ حیات
گلے میں ڈال کے باہیں، میں منتقل کر دوں — یہ خواہشوں کا سمندر، یہ محشرِ جذبات
خدائے عشق! میں دل میں شکست کر ڈالوں — خیال و شوق کے جتنے چھپے ہوں، لات و منات

شبِ سیاہ! اب آنا اگر مرے گھر میں
تو میرا چاند بھی لانا، چھپا کے چادر میں

قطعات

قہقہہ

مسموم ہوا، پھول کی نازک بدنی کو!
بوسیدہ ہوا جاتا ہے، دل میں غم تازہ
عفریت کی آغوش میں ہے روحِ تبسم
طوفان کے کاندھے پہ ہے غنچہ کا جنازہ

رقابت

گھنی تاریکیاں، ماحول کی غمناک تنہائی
امید و یاس کا۔ جذبات کے جنگل میں دوراہا
گرفتارِ عذابِ کشمکش اب ہوں کہ آخر کیوں
انہیں دیکھا تو آنکھیں بند کر لینے کو جی چاہا

کبھی موجِ نفس صرصر کبھی بادِ سحر گاہے
کبھی سر منزلِ عظمت کبھی رسوا سرِ راہے
کبھی دل میں یہ جوش ابھرے کہ انکو قتل کر ڈالوں
کبھی قدموں پہ ان کے جان دینے کو جی چاہے

ایک آرزو

فکر میں پھنس کر، فروغِ شادمانی دیکھتے
موت کی آنکھوں سے حسنِ زندگانی دیکھتے
عشق، اگر ہوتا۔ بقا کو بھی بناتے رازدار
آگ لگتی۔ تو نشاطِ عمرِ فانی دیکھتے

حسنِ عبادت

حالتِ سجدہ، اور انگڑائی
مقتدی ۔ حیرتِ تماشائی
کون کہتا ہے۔ شیخ مسجد کو
صحبتِ دخترِ رز نہ راس آئی!

ازرہِ تفریح

زاہد کی زباں پر کبھی لعنت کبھی جھڑکی
یوں ناچ رہا تھا کہ چھپی تیش بھڑکی
سجادہ و تسبیح پہ مئے۔ ازرہِ تفریح
ساقی کی سرِ انگشتِ حنائی نے جو جھڑکی

رباعیاں

ہاتھ اپنے نظر سے دھو رہی ہیں آنکھیں
اب ہوتے ہیں بے نقاب خوبانِ چمن
ہنستے ہیں کبھی، جیسے رو رہی ہیں آنکھیں
جب طاقتِ دید کھو رہی ہیں آنکھیں

پی لینے کو بادہ، باوضو آیا تھا
کیا جانے تو کہاں ہے، تجھ سے ملنے
چھو لینے کو زلفِ مشکبو، آیا تھا
اے شامِ اودھ! میں لکھنؤ آیا تھا

مہکی وہ شمیمِ سنبلستاں مہکی
یارانِ نشاط! آؤ، خوشبو سونگھو
فردوس کی بوئے دین و ایماں مہکی
شانے پہ ہمارے زلفِ جاناں مہکی

دل وہ ستم آزمائے خوش خو بھی نہیں
اے یادِ دیارِ دوست! کیا دوں تجھکو
جاں وہ تپش آشنائے گل رو بھی نہیں
افسوس اب اپنے پاس آنسو بھی نہیں

کچھ ایسے بھی بزمِ مے میں گل رو نکلے
ان خندہ جبینوں کو، بوقتِ رخصت
سانسوں میں لئے بادہ کی خوشبو نکلے
دیکھا تو خوشی کے چند آنسو نکلے

اللہ! پھر اور ایک تازہ افتاد
سمجھے تھے یہ ہم کہ اب ہے سینہ خالی
برباد حیاتِ چند روزہ، برباد
دیکھا تو ہے آرزو کا اک شہر آباد

(زیر ترتیب مجموعے سے)

میں آج اس واقعے کا حال سناتا ہوں۔ تم شاید یہ کہو کہ میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں لیکن تم نے کبھی اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ وہ شخص جو زندگی سے محبت کرتا ہے کبھی کبھی ایسی حرکتیں بھی کر بیٹھتا ہے جن سے سرد مہری اور زندگی سے نفرت ٹپکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو زندگی نے کچھ ایسی ایذا پہنچائی ہے کہ وہ زندگی کی خواہش کو گھونٹ کر اس سے دور بھاگنے لگتا ہے اور اپنے گوشۂ عافیت میں اس کی راہوں کو بھول جاتا ہے لیکن اس کی محبت کبھی مر نہیں سکتی اور اس کی آگ خوابوں کے کھنڈرات کی تہ میں اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے۔ چونکہ خوابوں کی دنیا میں رہنے کی وجہ سے وہ زندگی سے بے بہرہ ہو جاتا ہے اس لئے اپنی منزل مقصود کے قریب پہنچ کر وہ خوشی اور غرور سے اس قدر بھر جاتا ہے کہ اپنی سب تدبیروں کو خود ہی الٹا کر دیتا ہے اور اس خیال میں کہ اب تو ماحصل مل گیا وہ اپنی محبوبہ کو بہلانے خوش کرنے کے بجائے متنفر کر بیٹھتا ہے۔ بس یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔

اب اپنی زندگی کے حالات دہرانے سے کیا حاصل! تاہم تمہیں میری زندگی کا وہ لاجواب اور سوگوار زمانہ تو یاد ہی ہوگا جب میں نے اس سے محبت کی تھی۔ مجھے تمہاری محبت بھری تسلی و تشفی خوب یاد ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنے کئے کو نہ مٹا سکا۔ میں نے محبت کا خون محبت سے کر ڈالا اور حالانکہ میں اس وقت اپنے کو قاتل نہ سمجھتا تھا مگر اب مجھے اپنے جرم کا یقین ہے۔ سماج اس قتل کو جرم قرار نہ دے گا کیونکہ سماج تو اخلاقی جرم پر سزا نہیں دیتا بلکہ سماجی جرم پر، نیت کی بنا پر نہیں، بلکہ ثبوت پر۔ لیکن اخلاقی جرم ہی سب سے خراب ہے اور میں اپنے کو محبت اور زندگی دونوں کی نگاہوں میں مجرم پاتا ہوں۔ مرتے دم تک میں اس معصوم زمین پر گنہگاروں کی طرح اپنے ہمنواؤں اور رفیقوں سے منہ چھپاتا مارا مارا پھروں گا۔ پر افسوس! کہ میرا جرم محبت کے خلاف تھا اور منہ چھپانے کو بھی جگہ نہیں۔

وہ اب مر چکی ہے اس لئے مجھے ہمت ہوئی کہ یہ داستان کہہ سناؤں۔

یہ تم جانتے ہی ہو کہ اس کی شروعات کس طرح ہوئی۔ میں اس سے دل و جان سے محبت کرتا تھا اسی کی بدولت وہ خزانۂ بے نظیر ہاتھ لگ گیا تھا جس کی تمنا سارے جہاں کو تھی۔ جہاں بھی وہ جاتی چاہے خریداری کرنے یا اپنی سہیلیوں سے ملنے، وہ مجھ کو ساتھ لے جاتی اور میں ایک رفیق کتے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔

بھئی میں اپنے گونڈا کو بھی ساتھ لائی ہوں۔ وہ دور ہی سے چلا کر کہتی اور میں خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ میری محبت ریگستانوں سے زیادہ وسیع اور سمندروں سے زیادہ گہری تھی لیکن مجھ کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی محبت میری محبت سے مل کر ایک عالم بن گئی ہے جس میں ستارے بھی ہیں اور دنیائیں بھی۔

میں اسی طرح اس سے برسوں محبت کرتا رہا اور برسوں امیدو یاس کی موجیں مجھے تھپیڑے مارتی رہیں۔ جب میں سونے لیٹتا تو اسکی
میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتی اور جب سو جاتا تو خوابوں میں خوشنما پہاڑ اور دریا اور لالہ زار دکھائی دیتے۔ صبح جب اٹھ کر
ایک سحر طرازنغمہ میرے کانوں میں اس کے حسن کی موسیقی الاپنے لگتا۔ محبت کے خواب میں وہ راحت تھی کہ میں دنیا سے بے نیاز
وہ اکیلی میری دنیا تھی اور میری جنت اور لوگ تو اس گلاب کو مسل دیتے تھے جو میرے دل کی گہرائی میں کھلا ہوا تھا۔

اپنے خواب کو بچنے سے لگائے میں تنہا پھرتا اور صرف پرندوں اور نرم ہوا سے گفتگو کرتا کیونکہ وہ میرے کانوں میں ہار
محبت کے پیغام لالا کے سناتے تھے۔ میرے ساتھی شفق چاند اور ستارے تھے جو آسمان پہ اس طرح بکھر جاتے جیسے اس
پہ سرخی اس کی موجودگی میری ہستی میں اس طرح سما گئی جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ اپنے وجود کے احساس سے اس کو بھر دیتا ہے۔
سورج کی گرمی میری محبت کے سامنے ہیچ تھی، خود غرضی کا خیال میرے دل میں کبھی نہ آیا کیونکہ محبت ایک حسین تخیل تھی
جس کا ایک بے نام جذبہ جو سچ پوچھو تو محبت نے مجھ کو نامرد کر دیا تھا اور وہ بھی اپنے دل میں کہتی ہو گی۔ میں نے اس بات کو قطعی
تھا کہ وہ عورت ہے۔ میں ایک تمنّاؤں کی جنت میں رہتا تھا، اس میں شک نہیں کہ وہ دل آویز تھی پر موہوم اور غیر حقیقی، محبت
اور جسم دونوں کے احساسات کا سنگم ہے اگر ان میں سے ایک چیز بھی کم و بیش ہو جائے تو محبت یا تو نفسانی خواہشات
ہو کے رہ جاتی ہے یا ایک شاعر کا ناممکن خواب، مگر میں ابھی جوان تھا اور حقیقت سے بے بہرہ۔ ایک مرتبہ جب میرے
نے مجھے صلاح دی کہ اس کو پیار کہہ دو تو میں بے آپے ہو گیا اور چانٹا رسید کیا۔ برسوں تک میں نے اس سے بات بھی نہ کی
اس وقت ہوا جب ایک روز میں رنج و الم سے چور شراب خانے میں بیٹھا قدح بھر بھر کر پی رہا تھا اور آنسوؤں کی لڑی آنکھوں
جاری تھی۔ اگلی وفاؤں کے خیال سے اس نے آکر میرے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا اور ہمارے دل پھر مل گئے۔

حالانکہ یہ بات مجھے صحیح طور پہ کبھی نہ معلوم ہوئی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اس کے دل
لئے بیگانہ تھی، مگر میں نے خود ہی محبت کا خاتمہ محبت سے کر دیا۔

مارچ کی حسین شام تھی اس نے نئی نئی سائیکل چلانی سیکھی تھی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومنے جاتی۔ ایک
سے کہا کہ میرے ساتھ چلو، یہ کہہ کر اس نے مجھ کو وہ شرف بخشا جسے میں بھول نہیں سکتا۔ تمام دن ایک خواب کی سی حالت
طاری رہی۔ میں نے سائیکل صاف کی تیل ڈالا، اور بار بار جاکے دیکھتا کہ کہیں ہوا تو نہیں نکل گئی؛ میں نے گھڑیاں گن گن کر
اور پھر بھی آدھ گھنٹے پہلے ہی نکل کھڑا ہوا۔ جب میں اس کے ہوسٹل پہنچا تو بہت سویرا تھا وقت کاٹنے کو میں میلوں
پھرا لیکن وقت کاٹے ہی نہ کٹتا تھا۔ میں لوٹ آتا اور پھر چلا جاتا۔ لمحے میرا پیچھا بوڑھی کی طرح گذر رہے تھے۔

آخر کار وہ آ ہی گئی اور شرماتی ہوئی ہنسی ہنسی ہنس کے سائیکل پہ بیٹھی۔ شروع شروع میں تو وہ خودی کے احساس
ڈرتی رہی۔ لیکن جب ہم سنسان سڑک پہ پہنچ گئے تو اس کا ڈر نکل گیا۔

۔ تم تو بڑی اچھی سائیکل چلاتی ہو۔ میں نے کہا۔

۔ نہیں، ابھی تو ڈر لگتا ہے، مگر آج نہیں گروں گی تم جو ہو گے۔"

یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ اسکی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں چمک تھی؛ مجھ پہ بھروسے اور اعتماد کی

تاہ محبت بھی، الہامیں بھی عشق ہو گیا۔ میں جب تک جیوں گا یہ خیال میرے دل میں پوشیدہ روشنی کی طرح چھپا رہے گا اور کوئی بھی اس کی
ل نہیں کر سکتا۔ میں اس طرح خوشی سے پھول گیا جیسے میں نے اس کے دل پر قابو پا لیا ہے اور نازاں ہوں۔ اس غرور سے میں خود
یں خوش قسمت معلوم ہونے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ تھک گئی، ہم پارک میں سے گذر رہے تھے اور اس نے کہا کہ آؤ بیٹھ جائیں سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور
شوخ رنگ آسمان پر بکھرے ہوئے تھے۔ سائیکلیں زمین پر رکھ کے ہم ایک ولایتی مٹر کے تختے کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ پیار اور تیزی
کرتی رہی اور میں ہر لفظ کو جو اس کے منہ سے جھڑتا رس اور شہد کی طرح پیتا رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس نے کیا کیا باتیں کیں مجھے یہ
ی کہ موضوع سخن کیا تھا۔ پر ابھی تک اس کی گلابی ساڑھی کا رنگ مجھے یاد ہے۔ اس کی انگلیوں کی نزاکت اور ولایتی مٹر کی پتی بھری
دل اس کے قدموں پہ تھا اور میری روح اس طرح اس کی طرف بہہ رہی تھی جیسے پانی کے چشمے چٹانوں سے نکل کر ایک دم ایک
یں کھو جاتے ہیں۔

"جب میں مروں تو مجھے گلابی کپڑوں میں دفن کرنا اور بہت سے ولایتی مٹر کے پھول میرے اوپر ڈال دینا۔" اس نے افسردگی سے
ے کہا۔ میرا دل درد سے سمٹ کر ایک نقطہ سا معلوم ہونے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ زمانہ آگیا جب وہ میرے پاس
ہ میں اکیلا ہوں گا۔ یہ خیال ایک تیر کی طرح سے میرے جگر کے پار ہو گیا۔ آم کے درخت میں ایک کوئل درد سے یکایک کو کو اور
ساتھ ہی ساتھ ایک مور کی درد انگیز جھنکار سنائی دی۔

"ایسی باتیں تو منہ سے نہ نکالو، نہ تم موت کے لئے ہو نہ موت تمہارے لئے۔۔۔۔۔"
ایک غمگین مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی اور میرا دل دنیا کے سب گلابوں اور ولایتی مٹر کے پھولوں کی محبت سے بھر آیا
پر اس سے وہ کہنیوں کے بل لیٹ گئی اور میری طرف دیکھا۔ میری آنکھیں ان حسین آنکھوں کی چمک سے چکا چوند ہو گئیں۔ اس
بیکراں محبت کے دو سمندروں کی طرح کی تھیں جن کی سطح کی وسعت نگاہ کی زد سے باہر تھی اور ان کی گہرائی آنکھوں کی روشنی سے
سمندروں میں دو روحیں یک وقت بل کھاتی ہوئی اٹھیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور بہتی ہوئی میری روح کی گہرائیوں
میں اس لہر کے جذبے میں غرق ہو گیا۔ وہ مجھے اپنی روحیں بلانے لگی، خوشی سے میری زبان پر مہر لگ گئی، میرا جی چاہتا تھا
کروں لیکن خوف مجھ پہ طاری ہو گیا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے اپنی محبت کے اظہار کرنے کا کوئی حق نہیں، میں اپنی
سکتا تھا۔ اس ایک لمحے میں میں نے موت اور زندگی دونوں کا مزا چکھ لیا۔۔۔۔۔
بار پھر اس نے اپنا سر نیچے جھکایا اور اس قدر جھکی کہ سر زمین سے لگ گیا، اس کے کالے بال ہری ہری گھاس پر بکھر گئے
بی ساڑھی نے سیاہ چاند کے گرد ہالہ بنا لیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں بوسے کی دعوت
دل دھڑکنے لگا۔ خون پہلے تو جوش میں آیا پھر یکایک رگوں میں رک گیا۔ یہ جو کچھ بھی میری آنکھوں نے دیکھا اس کا دل نے اعتبار
میری قسمت کہ اس کے ہونٹوں کو پیار کر سکتا۔
صرف میرا گمان ہے" میں نے کہا، "وہ تو آسمان کو دیکھ رہی ہے۔"
کلیجے جھکا اور آسمان کو دیکھنے لگا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور آسمان کی بڑھتی ہوئی سیاہی میں ایک پرانی مسجد

کی دمکتی ہوئی میناریں دکھائی دے رہی تھیں

"کس قدر دلفریب اور رنگین شام ہے"

میرے الفاظ میرے ہی کانوں میں گونجے۔ ایک لمحہ لہرائے اور خاموش فضا میں کھو گئے وہ جادو جو ابھی تک ہوا میں موجود تھا ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح پلکوں میں غائب ہو گیا اور صرف تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی تھی، میرے دل پر ایک غالب ڈھک گیا اور خوشی کی کیفیت افسردگی سے بدل گئی

وہ اٹھ بیٹھی اور دور مغرب کی بڑھتی ہوئی تاریکی کو گھورنے لگی پھر تھکی ہوئی آواز سے بولی

"اب تو دیر ہو گئی، چلنا چاہئے"

میں نے اسکی سائیکل اٹھا کے دیدی اور اس کے برابر برابر چلتا رہا۔ ہم میں سے کسی نے بات چیت نہ کی، وہ تھکی ہوئی اور خیال میں محو معلوم ہوتی تھی لیکن میں ابھی تک اس کے قریب ہونے کی خوشی میں مست تھا اور اسکی محبت پہ نازاں۔ مجھ کو یہ خیال نہ تھا کہ میں اسکی محبت کو ٹھکرا رہا ہوں۔ میں زندگی کو اپنی آغوش میں لینے سے ڈرتا تھا۔ پھولوں کی طرح گود میں سمٹنے سے، بذات خود تو اس لاپرواہی میں کوئی بری بات نہ تھی لیکن اس کا نتیجہ مہلک ثابت ہوا۔ میں ایک خیالی دنیا میں رہتا تھا اور صرف عشق کی محبت میں گرفتار، وہ جوانی کے آم کی طرح پختہ تھی، محبت کے لئے تیار۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے اس سے محبت تھی اور محبت ہی کی وجہ سے میں نے ایسے پیار کرنے سے پرہیز کیا اور اسکی طرف نفسانیت سے نگاہ نہ اٹھائی۔ وہ ایک فرشتہ تھی اور ان دنیاوی چیزوں سے بالاتر۔ اسی لئے دراصل میری محبت ہی نے محبت کا خاتمہ کر دیا۔

لیکن اس واقعے کے بعد بھی ہمارے تعلقات قائم رہے۔ حالانکہ وہ اس کوفت اور تکلیف کے احساس کو ہرگز نہ بھولی ہوگی جو اس کے باعث پیدا ہوئی۔ میں اس سے اب بھی اسی طرح محبت کرتا رہا۔ اور محبت کے رنجوں ہی نے مجھ کو انسان بھی بنا دیا اور عظمت کا احساس بھی پیدا کیا۔ اور جب تک کہ میں درد والم سہنے کے قابل رہا اس وقت تک انسانیت کا جذبہ میرے اندر باقی رہا بعد میں جب میں نے زندگی کی خواہش کو گھونٹ دیا جب میں حقیقت سے گھبرا کر دھوکے کی اس دنیا میں رہنے لگا جو صرف میری ذات سے وابستہ تھی تو میں معذور بھی ہو گیا اور حسن کے احساس کو بھی بھول گیا۔

رات کو جب میں سونے کے لئے لیٹا تو یکایک خیال آیا کہ وہ ناراض ہو گئی ہے۔ نہ تو جدا ہوتے وقت اس نے افسردگی کا اظہار کیا تھا اور پلٹ کر میری طرف دیکھا ہی تھا جیسے جیسے میں شام کے واقعات کا خیال کرتا ویسے ویسے غم مجھے اپنے پنجوں میں جکڑتا جاتا تھا۔ بار بار کہتا "ہائے میں نے کیا کیا" اور دل ہی دل میں اس سے ہزار بار معافی مانگتا اور اپنا سر اس کے قدموں پہ رکھ کے اپنی محبت کا یقین دلاتا۔

میری محبت غیر فانی تھی اور اس میں کوئی کمی نہ ہوئی، حالانکہ میں جب آخری بار اس کی موت سے ذرا پہلے ملا تو وہ بدل چکی تھی اور میرے جذبات میں طغیانی نہ آئی۔ لیکن میرے دل کی گہرائی میں عشق کی آگ اس طرح سلگ رہی تھی جیسے سورج کی روشنی میں اس سے اپنی محبت میں عشق کرتا تھا جو ابتک فنا نہیں ہوئی . . .

اگلے روز اس سے ایک پارٹی میں ملاقات ہوئی۔ میرا چہرہ زرد تھا، میرا دل دھڑک رہا تھا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔

وہ بیٹھی ایک ٹکٹکی سے کھیل رہی تھی مگر اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہ دیکھا، میں بیٹھ گیا، لیکن جی یہی چاہتا تھا کہ تنہائی میں اس سے اپنے قصور کی معافی مانگوں، سب ہلس بول رہے تھے اور وہ بھی خوش تھی، مگر میرے ہونٹوں پہ خاموشی کی مہر لگ گئی تھی کیونکہ اس وقت میں ایک زندہ انسان نہ تھا۔ ایک شخص نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے، خاموش کیوں ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں" اور یہ کہہ کر میں پھر یاس کے سمندر میں ڈوب گیا۔

پھر سب گانے بجانے لگے۔ لیلا نے مجھ سے بھی کہا کہ گاؤ۔ لیکن اس وقت میرے دل میں اس بلا کا غم تھا کہ میں ہرگز نہ گا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری ایشیا کے پہاڑ میرے اندر سما گئے ہیں۔ جب لیلا نے اصرار کیا تو وہ بھی پیار سے بولی:۔

"آخر گا کیوں نہیں دیتے"

"میں نہیں گاؤں گا" میں نے کچھ اس طرح چلا کر کہا کہ یکایک سارے مجمعے میں خاموشی چھا گئی۔ میں کہنا تو کچھ اور ہی چاہتا تھا لیکن نہ جانے میرے منہ سے یہ جملہ کیسے نکل گیا۔ میرا دل اسکی محبت سے لبریز تھا اور میں اس کو کسی طرح بھی ناخوش نہ کر سکتا تھا۔ مگر اس وقت کچھ ایسا معلوم ہوا کہ میری آواز کھو گئی ہے، میرا دل تو کچھ کہہ رہا تھا اور زبان کچھ اور، اس کے باوجود مجھ کو یقین تھا کہ وہ ہرگز برا نہ مانے گی مجھ کو یقین تھا کہ وہ اور میں ایک ہیں اور وہ میرے جذبات و احساسات کو محسوس کر لیتی ہے۔

میں نے بات بنانی چاہی اور لیلا سے کہا۔

گیا جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

اس پر ایک صاحب نے جملہ کسا۔ "اچھا، آپ عشق میں مبتلا ہیں!"

اس کے بعد اس نے میری طرف مڑ کے بھی نہ دیکھا اور جب سب کھانے کے لئے بیٹھے تو اس نے پہلے ہی سے اعلان کیا کہ میری جگہ یہ ہے" اور مجھ سے بہت دور میز کے دوسرے سرے پہ بیٹھ گئی۔ یہ اعلان صرف میرے لئے نہ تھا بلکہ سارے مجمع کو بتلانے کے لئے کہ اب مجھ سے قطع تعلق ہو گیا ہے۔ اس سے بیشتر وہ مجھ کو بھیڑ میں سے ڈھونڈ نکالتی تھی اور ہمیشہ میرے ہی پاس بیٹھتی، لیکن اب تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ . . . .

میرا دم گھٹنے لگا، لوگوں سے وحشت ہونے لگی میرے پیر بوجھل ہو گئے، میری نگاہ دور سے اس کے چہرے پر جم گئی میں بیوقوفوں کی سی باتیں کر رہا تھا اور میرا راز سب کو معلوم ہو گیا۔ پھر عشق میں نہ تو پندار باقی رہتا ہے نہ عزت و خودداری، وہ کچھ کھنچ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں طشتری پہ گڑا لیں، لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے کہ وہ میرے جذبات کو محسوس کر رہی تھی، میری آنکھوں تلے اندھیرا آگیا اور میں دیوانہ وار کمرے سے بھاگ نکلا۔

سب کچھ ایسے متحیر ہوئے کہ کسی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا مگر جب میں برآمدہ کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا تو ایک قہقہے کی آواز آئی۔ رقابت اور جلن کی لہر میرے اندر دوڑ گئی، وہ منہ سے کہہ رہی تھی، اسے میری کیا پرواہ تھی اسے تو کسی اور سے محبت تھی، یہ خیال آرے کی طرح میرے جسم کو کاٹتا ہوا دل کے پار ہو گیا۔ میرا دماغ معطل ہو چکا تھا، میری آنکھیں پارے کی طرح بیقرار تھیں، ساری رات میں مارا مارا پھرا۔ اپنے بالوں کو نوچتا اور سینے پہ گھونسے مارتا، میں نے زور زور سے اپنے چٹکیاں لیں لیکن

درد نے میرے جسم کو سن کر دیا تھا اور جسمانی تکلیف کا احساس مٹ چکا تھا۔ کوئی بیس میل پھرنے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں آیا تو صبح صادق کی تھکی ہوئی روشنی آسمان پر پھیل رہی تھی لیکن نیند مجھ سے رات کی طرح دور تھی، دل کی جگہ میرے سینے میں ایک لاوا درد تھا، یہی جی چاہتا تھا کہ نشتر سے اسے کچوکوں اور مٹھی میں بھینچ کر سب احساس نچوڑ ڈالوں۔ درد ایک پھوڑے کی طرح لپ لپ کر رہا تھا ——— میری نگاہ قلم تراش پر پڑی، گریبان چاک کر کے میں نے گوشت کو چاقو کی نوک سے گودنا شروع کیا لیکن تکلیف کا احساس اٹھ چکا تھا پھر مجھے اور ہی خیال آیا۔ درد دل سے نکل کر دماغ میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے اپنے سینے پر دل کی شکل گودنی شروع کی، اس کے بعد گودے ہوئے دل میں اس کی شبیہ بنائی، خون بہہ بہہ کر ٹپک رہا تھا، لیکن اس کے بہنے سے میرے دماغ کو سکون ہوا۔ پھر آئینہ اٹھا کر بڑی دیر تک اپنی دستکاری کو دیکھا کیا۔ اب درد کم ہو گیا تھا، اور تھکن معلوم ہونے لگی۔ اجالا ہو چلا تھا اور لوگ جاگ گئے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں پکڑا نہ جاؤں قمیض کے بٹن لگا کر میں لیٹ گیا۔ میٹھا میٹھا درد دھیرے ہونے لگا اور اسی حالت میں آنکھ لگ گئی

اب بیان کرنے سے کیا فائدہ کہ مجھ پر کیا گذری؛ یہ بھی بیکار ہے کہ میں نے کیا کیا کیا۔ میں ایک ایسا بدنصیب تھا جسے زندگی دوبھر ہو گئی ہو۔ انسانوں کی صحبت سے بھاگ کر میں جنگلوں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ دنوں نہ کچھ کھایا نہ پیا اور جب کھایا بھی تو نوالہ حلق میں اٹکنے لگا۔ رات گئے چوروں کی طرح اپنے کمرے میں گھستا اور صبح ہوتے ہی پھر نکل کھڑا ہوتا۔ میرے دوست تسلی دینی چاہتے تھے میری حالت دیوانوں کی سی ہو گئی اور ان کے چہروں سے پریشانی ٹپکتی تھی، لیکن میں ان سے دور دور رہتا، اور انسانوں سے بچتا پھرتا۔۔۔۔ جب میں اس سے ملنے گیا تو معلوم ہوا وہ کہیں چلی گئی ہے مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کہاں اور کیوں چلی گئی۔ اس نے مجھ سے تو کہا بھی نہ تھا کہ باہر جانے والی ہوں۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں گئی نہیں ہے، بلکہ صرف بہانہ کر دیا ہے۔ اس خیال سے وحشت اور بھی بڑھ گئی مجھے اس کا پتہ تک معلوم نہ تھا اور میں خط بھی نہ لکھ سکا۔۔۔۔۔۔

پندرہ روز کے بعد وہ لوٹ آئی۔

"تمہاری طبیعت تو اب اچھی ہے؟" اس نے پیار سے پوچھا۔

میری بیماری کا حال اسے کیونکر معلوم ہوا! لیکن پھر خیال آیا کہ یہ بات تو اسی رات کو میرے چہرے سے ظاہر ہو گئی ہو گی۔ یا شاید کسی نے اس کو میری داستان کہہ سنائی ہو، میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ خوشی کا بھی احساس ہوا اس کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ میں نے کیا کیا مصیبت اٹھائیں۔ شائد اسی سے اس کا دل پسیج جائے اور وہ مجھ سے محبت کرنے لگے، میں نے بات بنائی اور اس کے سوال کا جواب نہ دیا۔

"مجھے معلوم ہے" وہ بولی اور ایک عجیب طریقے سے مسکرائی۔ اس طرح سے جیسے اس کو کسی پوشیدہ شبہے کا یقین ہو گیا ہو۔ میرے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔

"لیکن تمہیں کوئی چیز ستا رہی ہے" اس نے محبت سے کہا "کہہ دینے سے بھڑاس نکل جاتی ہے۔ مجھے تو بتا دو کیا بات ہے تم اس قدر مغموم کیوں رہتے ہو! شائد میں کچھ مدد کر سکوں۔"

میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ زبان اندر کو کھنچنے لگی، جذبے کی شدت سے میری آواز بند ہو گئی، میں اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دینا چاہتا تھا لیکن میری محبت لفظوں سے ادا نہ ہو سکتی تھی، میرا رونگٹا رونگٹا محبت کی داستان بنا ہوا تھا۔ میں جو کچھ

محسوس کر رہا تھا الفاظ ادا نہ کر سکتے تھے، جب میں نے ان لفظوں کا خیال کیا "مجھے تم سے محبت ہے" تو اس قدر بھونڈے اور کرخت معلوم ہوئے کہ میرا دل اور دماغ متنفر ہو گئے۔ وہ تو میرے نزدیک ایک خیال تھی جو حقیقت کے پردے میں چھپا ہوا ہے، وہ لگاوٹ جو تاروں کو یکجا رکھتی ہے، وہ تو ہوا کا ایک نرم جھونکا تھی، ایک نغمہ جو دور سے اپنا جادو ستاتا ہے، وہ مجھ جیسے انسانوں کے لئے پیدا نہ ہوئی تھی اور میرے منہ سے وہ لفظ نہ نکلے جو مجھ کو اپنی ناممکن تلاش کی منزل مقصود تک پہونچا کر میرے خوابوں کو پورا کر دیتے

میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا اور اپنے ارادے اور منصوبے بنانے لگا۔ وہ بھی ہوں ہاں کرتی رہی، تھوڑی ہی دیر میں روانہ ہو گیا حالانکہ اسکی صحبت سے میرا دل نہیں بھرا تھا۔ اس کے پاس رہنے کی خواہش دنیاؤں سے بھی زیادہ وسیع تھی میں صدیوں اسے دیکھا کرتا اور کبھی سیری نہ حاصل ہوتی۔ لیکن پھر اسکی مسکراہٹ میری آنکھوں میں رقص کرنے لگی اور اس کے محبت بھرے جملے میرے کانوں میں گونج اٹھے۔ خوشی کی لہر میرے دل میں اٹھی اور ایسا معلوم ہوا کہ زمین جون کی پہلی بارش کے بعد شاداب ہو گئی ہو، پندرہ دن کے بعد پہلی بار میں انسانوں کی جون میں آیا۔ . . . .

محبت اور نفرت مجھے اسی طرح برسوں جھولے جھلاتی رہی۔ میں کبھی اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا جو سچ پوچھو تو میں اس کا تذکرہ کر ہی نہ سکتا تھا۔ میری محبت اتنی گہری تھی کہ الفاظ اسکی تہ کا پتہ نہ دے سکتے تھے۔

پھر وہ چلی گئی لیکن میری محبت کو زوال نہ تھا۔ چھٹیوں میں کبھی کبھی اس سے ملاقات ہوتی اور ہم گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے، اور یہ لمحے میری زندگی کے بہترین لمحے تھے جن کی امید میں جدائی کے دن آسانی سے کٹ جاتے تھے۔ جتنی دیر میں اس کے ساتھ رہتا مجھ سے زیادہ خوش قسمت کوئی اور انسان نہ ہوتا۔ جب میں چلا آتا تو میرا دل اس کے قدموں میں رہ جاتا۔ اس ذرا سی خوشی کے لیے جو مجھ کو اسکی صحبت میں حاصل ہوتی تھی میں ہزار بار مر مر کے جیتا تھا۔

اپنے آپ کو اس کے لائق بنانے کے لئے میں نے بہتیرے جتن کئے اور اس نے جس بات کی بھی مجھ کو دعا دی وہ پوری ہوئی ——— پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے مجھ کو دعائیں دینی چھوڑ دیں میرے کان اس کی اچھی اچھی باتیں سننے کو ترستے تھے، لیکن پیشین گوئی کا چشمہ خشک ہو چکا تھا، میرے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ مضراب جس سے سوز پیدا ہوتا تھا ٹوٹ گئی، میں رنج اور یاد کے الم سے نڈھال ہو گیا۔ میرے دل نے کہا کہ وہ اب میرے ہاتھوں سے نکل گئی، اس احساس سے پچھلا طوفان بپا نہ ہوا بلکہ ایک فلسفیانہ افسردگی میرے اوپر چھا گئی، موت کا راگ میرے کانوں میں بجنے لگا جس کا ساز وقت اور ازل بجا رہے تھے: اور ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی دل میں بیٹھ گیا کہ میرے نصیب اب نہ جاگیں گے، محبت کی جگہ ملامت نے لی اور میری کیفیت اس شخص کی سی ہو گئی جو بادشاہ سے گدا ہو گیا ہو، میری قوت ارادی ختم ہو گئی اور ذلت کے بدترین خیال دل میں آنے لگے مگر میں ابھی تک اس سے خط و کتابت کرتا رہا اور وہ جواب دیتی رہی۔ وہ محبت جس پر میں نے اپنی زندگی کی بنا ڈالی تھی اس قدر مضبوط تھی کہ میں ان ہرا دینے والی طاقتوں کا مقابلہ کرتا رہا جو میرے اندر پیدا ہو گئی تھیں۔

مگر وہ پھر عورت تھی اور میں اس خیال میں تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی رہے گی اور محبت جتانے پر مبنی نہیں، یہ ایک ناممکن خیال تھا چنانچہ ایک روز اس نے لکھا کہ میں شادی کر رہی ہوں

"گو وعدا تم برا تو نہ مانو گے، آخر سوسائٹی کا بھی تو خیال کرنا پڑتا ہے . . . . "

الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، رنج اور ملامت نے مجھ کو گھیر لیا۔ زندگی کے ہاتھوں ہار مان کے میں محبت کو شراب میں ڈبونے لگا۔ نفرت اور جلن کے صحرا میں خودداری کا نام بھی باقی نہ رہا۔ اگر کوئی پوچھتا تو میں کہتا کہ وہ بھی سب عورتوں کی طرح دولت اور آزمائش کی دلدادہ ہے اور مجھے اس سے کبھی محبت تھی ہی نہیں، میں عشق پر ہنستا اور کہتا کہ عشق کوئی چیز نہیں محض ایک دھوکا ہے۔ بچوں کے بہلاوے کے لئے بازی گر کا تماشہ، وہ حقارت جس سے خدا انسان کو دیکھتا ہے، لیکن ان سب کے باوجود شراب پیتا اور نفرت کی نکیلی چٹانوں پر سر لہولہان کرتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے بعد مجھے جسمانی مزوں کا چسکا پڑ گیا۔ میں عورتوں سے اس طرح کھیلتا جیسے بچے کھلونوں سے، ان کو سلیقے سے چلاتا اور پھر چوسے ہوئے میٹھوں کی طرح پھینک دیتا۔ میرے سب نصب العین ایک ایک کر کے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح جھڑ گئے ان کی سرخی سے زمین چمک اٹھی ہو گی، لیکن افسوس کہ میں خود ہی ان کی رنگینی کو نہ دیکھ سکا۔ میں عورتوں سے اس طرح اداکاری سے پیش آتا کہ وہ اس بات کا شبہ بھی نہ کر سکتی تھیں کہ تصنع سے کام لے رہا ہوں وہ آسانی سے دھوکا کھا جاتیں اور بلائے محبت میں گرفتار ہو جاتی تھیں، اس وقت تک مجھے علم نہ تھا کہ عورت کو قبضہ میں کرنے کے لئے صرف ہنسی اور سرد مہری کے ساتھ تھوڑی سی خوشامد کافی ہوتی ہے، عورت کو نہ سنجیدگی پسند ہے اور نہ اسے روح کے سوز و ساز کی پرواہ ہے۔ وہ تو زندگی کا صرف ایک ہی مقصد جانتی ہے اور اس کو پورا کرنے کے لئے فنکاری کا بھیس بدل کر اس فن کی سب چالوں کو بڑی استادی سے چلتی ہے لیکن میں نے عورت کو اس میدان میں بھی ہرا دیا، میری باتوں میں بڑی نرمی اور محبت ہوتی تھی، میری اداؤں میں توجہ اور عشق کی گرمی اور وہ مجھ پر جان تک قربان کرنے کو تیار ہو جاتی تھیں، لیکن مجھ میں انسانیت کی بو باقی نہ رہی تھی میں زمین پر ایک مغرور آہو کی طرح پھرتا اور خود غرضی اور خود پسندی میری عادت ہو گئی جنت کا پھل کھا لینے کے بعد میں دنیا کی نعمتوں کا مزا بھول گیا۔ میرا دل ایک پیڑ کی طرح سورج میں سوکھ گیا اور زندگی کے بیش بہا عرق میرے اندر خشک ہو گئے جب تک میں رنج سہتا رہا میرا دل بھی نرم رہا جب تک محبت میرے دل میں رہی انسان بنا رہا۔ اب تو میں ایک جانور سے بھی بدتر ہو گیا تھا۔ نہ مجھ میں درد کا احساس باقی تھا اور نہ زندگی کی عظمت، میں اپنی ہی دنیا میں رہنے لگا جس کا مرکز میری خودی تھی، میرے دوست مجھ پر تعجب کرنے لگے، وہ مجھ پر رشک ضرور کرتے تھے کیونکہ وہ سب بزدل تھے اور ان میں میری طرح زندگی کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی، بزدل میں بھی تھا لیکن وہ میری بزدلی کی خاصیت نہ جانتے تھے۔

پھر کئی سال بعد اس سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ بس ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے سُن جسم پر گھونسہ مارا ہو رفتہ رفتہ غبار آلود جلن کے پردے میں سے اس سنہری شہر کی مٹی مٹی میناریں جو وقت کی دھندلی وادی میں مدھم خوابوں پر بنا ہوا تھا پھر دکھائی دینے لگا۔ بغیر جانے بوجھے میں پھر ان جادو بھری گلیوں کا طواف کرنے لگا۔ جو اب برسوں کے گرد و غبار سے میلی ہو چکی تھیں، اس راگ کے دھیمے سروں کی طرح انتشار دکھائی دیا اور الاپ کی بلند آواز کانوں میں گونجنے لگی جس سے میرا دماغ چکرا گیا ——

—— سوائے ان چند لمحوں کے جب مجھے دیکھتے ہی اس کا رنگ اڑ گیا تھا، اس کے چہرے سے اطمینان ٹپکتا رہا۔ اس کے سکون کا خیال کر کے میرے جسم میں آگ لگ گئی، وہ ایک پھول کی طرح بھونرے کی تڑپ سے بے خبر تھی۔ میرے دل کو ویران کر کے میرے سب خزانوں کو مٹا کر اسے بنا و سنگار کا کیا حق تھا۔

وہ اطمینان سے باتیں کرتی رہی اور ان افواہوں کا تذکرہ کیا جو میرے بارے میں سنی تھیں، اسکی گفتگو میں شائستگی وہی پرانا انداز تھا لیکن میں بدل چکا تھا! میرا جی چاہتا تھا کہ کہہ دوں کہ ہاں تم ہی تو ہو جس کی خاطر میں نے یہ سب ذلت اور برائیاں مول لیں لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہمارے درمیان ایک خلیج حائل ہو چکی ہے جس نے وقت کے دونوں کناروں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا ہے، میری باتوں میں تصنع آ گیا اور نفرت کی آگ میرے اندر بھڑک اٹھی یہی جی چاہتا تھا کہ اسے مسل ڈالوں، گلا گھونٹ دوں، تاکہ وہ بھی اس طوفان کی تیزی کو محسوس کر سکے جو میرے اندر بپا تھا اور اطمینان سے باتیں نہ بنائے۔

میں ایکدم سے اٹھ کھڑا ہوا، پیار سے اس نے کہا۔

"گو وندا، زندگی سے نفرت نہ کرنا، یہ میری دوستانہ صلاح ہے۔۔۔۔"

جلدی سے خدا حافظ کہہ، میں چل دیا۔

میں چلا تو آیا لیکن ایک جنگل میں کھو گیا اور راستہ کہیں سے نہ ملتا تھا۔ دو چیزیں مجھ کو پریشان کر رہی تھیں ایک تو جلن اور دوسرے نفرت، جوں جوں میں اس کے اطمینان اور سکون کا خیال کرتا میرے دل میں نفرت بڑھتی جاتی حتیٰ کہ اس کے آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے اور میرے دماغ میں ایک ڈراؤنے خواب کے شور وغل کی طرح بھر گئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں، میری زبان میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ میرا حلق خشک تھا، دل کی جگہ سینے میں ایک خلا تھا جس میں سب ڈراؤنی آوازیں گونج رہی تھیں، میں نے چھاتی پہ زور زور سے گھونسے مارے۔ یکایک مجھے اس تصویر کا خیال آ گیا جو میں نے اس جگہ گودی تھی، اپنا گریبان چاک کر کے میں نے سینے پہ نگاہ ڈالی۔ نشان رات کے اندھیرے میں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہے تھے مجھے اس تصویر سے نفرت ہو گئی مجھے خود اس سے نفرت تھی وہ اب میری نہ تھی۔ وہ تو اسکی پہچان تھی۔۔۔۔ میں نے جیب سے چاقو نکال اس تصویر کے آر پار اپنے سینے پہ چلا دیا۔ اس وقت تو عجیب سکون حاصل ہوا اور میں میرے دل کی جلن کم ہو گئی لیکن خون نکلنے کی وجہ سے کمزوری بڑھ گئی اور میں بیہوش ہو گیا۔

لوگوں نے مجھے ہسپتال پہونچا دیا۔ سب کو حیرت تھی کہ ماجرا کیا ہوا، کوئی کہتا تھا کہ حادثہ پیش آیا کوئی کہتا تھا کہ خودکشی کرنے کی نیت تھی۔

چند ہفتے میں زخم بھر گئے اور میں تندرست ہو گیا لیکن اب جوانی جا چکی تھی اور خزاں کا موسم تھا۔

اس واقعے کے بعد میں اس سے کئی بار ملا لیکن پھر کبھی ایسی حالت نہ ہوئی۔

جب آخری بار اس سے ملاقات ہوئی تو وہ بیمار تھی، وہی مارچ کا دلسوز مہینہ تھا۔ وہی شام کا سناٹا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور برآمدہ کی جالیوں سے روشنی چھن چھن کے آ رہی تھی، اور ہوا میں ولائتی مٹر کے پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی۔ حسن اتفاق سے بیک وقت ہم دونوں کو ایک ہی خیال آیا۔

"مجھے ولائتی مٹر کی خوشبو بہت پسند ہے" اس نے نرمی سے کہا اور ایک خفیف سی افسردگی اس کے چہرے پر آ گئی، اس نے آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ یاد کی مرتی ہوئی روشنی کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"اور دنیا کے سب گلاب۔۔۔۔۔"

وہ میرے دل میں بھی بھر آیا تھا۔۔۔۔۔

اس کے بعد پھر اس سے ملاقات نہ ہوئی اور کچھ ہی عرصہ میں وہ مر گئی اس کی لاش پانی میں سے پائی گئی، وہ گلابی ساڑی اور

ولائتی مٹر کا بارہ پہنتے ہوئے تھی۔ لیکن نہ میرے دل میں پہلے کی طرح طوفان ہی بپا ہوا اور نہ اس کی یاد ایک خواب بن کے آئی۔ وہ تو میرے دل میں بس چکی تھی۔ اس سنگ دل دنیا کی نبض کی طرح میری روح کی گہرائیوں میں آہستہ آہستہ چل رہی تھی جیسے ہوا درختوں کو ایک لازوال محبت بھری لوری سنا رہی ہو۔۔۔۔۔۔

موپساں
ترجمہ پروفیسر یحییٰ سلام

تنہائی

رات کے کھانے پر ہم ایک دوست کے ہاں مدعو تھے۔ محفل بڑی پُرلطف تھی، میرا ایک پُرانا بے تکلف دوست بھی وہاں موجود تھا۔ کھانا ختم ہوا تو اس نے مجھ سے کہا۔

"آؤ ذرا شینے لیزے بھی ہو لیں"

میں نے کہا چلو، اور پھر ہم دونوں چل پڑے۔ درختوں کے نیچے نیچے جن پر اب چند ہی پتیاں باقی رہ گئی تھیں۔ ہم خراماں خراماں چلتے رہے۔ پیرس کی مستقل اور مدھم ہوتی ہماہمی کے سوا اور کسی آواز کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا ہمارے چہروں پر پنکھا سا جھل رہی تھی، اندھیرے آسمان پر ستاروں کے منتشر گچھے اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی نے سنہری سفوف سارے میں بکھیر دیا ہو۔

میرے دوست نے کہا "خبر نہیں، کیا بات ہے، آج کی رات مجھے بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہے، ہر جگہ سے اچھی، میرے خیالات میں بھی وسعت سی محسوس ہو رہی ہے، کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری روح کے اندر ایک قسم کی روشنی پھوٹ رہی ہے، جو ایک لمحہ کے لئے مجھ کو باور کرا دیتی ہے کہ مظاہر کا اُلوہی راز عنقریب آشکار ہونے کو ہے، پھر یہ روزن بند ہو جاتا ہے اور میرے خیالات کا سارا ہیولیٰ ختم۔

چلتے چلتے ہماری نظر ان دو سایوں پر بھی پڑتی جاتی تھی جو جھاڑیوں کی لمبی قطار پر سے تیرتے ہوئے گذر رہے تھے، پھر ہم ایک بنچ کے پاس سے گذرے جس پر دو آدمی پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کا وجود وہیں دور سے ایک ہی سیاہ دھبہ سا نظر آ رہا تھا۔

"قابلِ رحم لوگ" ان بیچاروں کو دیکھ کر مجھے اُکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی بلکہ ترس آتا ہے۔ انسانی زندگی کے ان گنت اسرار و رموز میں سے میں صرف ایک ہی کی تہہ تک پہنچا ہوں، مگر پہنچ گیا ہوں کہ زندگی کی تلخ ترین اذیت کا سبب صرف ہماری تنہائی ہے۔ ہماری تمام کوششیں اور تمام کارروائیاں دراصل تنہائی سے فرار حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہیں، یہ دونوں محبت کرنے والے بھی، جو وہاں کھلی فضا میں بنچ پر بیٹھے ہوئے ہیں، ہماری طرح۔ بلکہ ساری مخلوق کی طرح۔ اسی ایک چیز کے متلاشی ہیں کہ کسی طرح ان کی تنہائی ختم ہو، ایک ہی منٹ کے لئے سہی، ایک ہی پل کو سہی، یہ تنہا ہیں اور ہمیشہ ہی تنہا رہیں گے — اور ہم بھی،

یہ حقیقت کم و بیش ہم سب پر ظاہر ہے، اور کچھ زیادہ مدت تو نہیں گذری کہ میں اس نکتے تک رسائی حاصل کرنے کے کرب میں، اور کیسے نفرت انگیز کرب میں مبتلا تھا، مگر اب اس گھناؤنی تنہائی کا انکشاف ہو گیا جس میں کہ میری زندگی بسر ہو رہی ہے، اور یہ بھی خوب معلوم ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی اس کو دور نہیں کر سکتی۔ کوئی چیز بھی نہیں۔ سُن رہے ہو نہ؟ ہم چاہے کتنی ہی کوشش کریں، کیسی ہی جد و جہد کریں، ہمارے دلوں کی خلش و اضطراب کا جو رنگ بھی ہو، ہمارے لبوں کا مدعا، ہمارے بازوؤں کی گرفت، کسی سے بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم تنہا ہیں اور ہمیشہ تنہا۔

میں نے اس وقت چلنے کی جو تجویز پیش کی تو اس کا سبب بجز اس کے اور کیا ہے کہ اپنے گھر کے اندر نہ جانا پڑے، گھر کی تنہائی کاٹتی ہے لیکن اس سے
بھی کیا فائدہ؟ میں تم سے بات کر رہا ہوں، تم میری بات سن رہے ہو۔ پھر بھی ہم دونوں تنہا ہیں، ایک دوسرے کے پاس ہیں پھر بھی دور دور
اور تنہا۔ سُنا تم نے؟ دور دور اور تنہا۔

انجیل کہتی ہے کہ "روحانی اعتبار سے جنت تو خود ہم ہی پر نازل ہے" ان کو مسرت کا فریب جو حاصل ہے ہماری اس تنہائی کی بے کسی
ان کو محسوس تک نہیں ہوتی۔ وہ اس طرح مارے مارے نہیں پھرتے جس طرح میں، زندگی میں، مارا مارا پھرتا ہوں، بغیر کسی سے کوئی ربط حاصل کئے
الا یہ کہ لوگوں کی کہنی سے کہنی ٹکراتا ہوا اور بغیر کسی مسرت کے الا یہ کہ سمجھ بوجھ اور مشاہدے سے آگاہ ہونے اور کبھی ختم نہ ہونے والی تنہائی کا علم رکھنے
کی وجہ سے ہر گھڑی اور ہر پل مبتلائے کرب رہنے کی ایک خود پسندانہ تشفی حاصل ہے۔

"تم شاید مجھے کوئی سن چلا یا پاگل سمجھو گے ۔۔ بے شک نہیں ہو مگر سُنو تو سہی، میں اپنے دیو کی تنہائی کو جس وقت سے محسوس کرنے لگا ہوں
مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے روز بروز کسی گہرے غار میں گرتا چلا جا رہا ہوں جس کے گرد و پیش جس کی تھاہ کا کہیں پتہ نہیں، نہ اس کی خبر ہی کسی کو ہے
یا شاید کوئی تھاہ ہی اس کی نہ ہو جس میں ڈوبتا چلا جاتا ہوں اور کوئی میرا ساتھی نہیں، نہ میرے ارد گرد کوئی ہے نہ کوئی ایسا زندہ انسان ہی نظر آتا
ہے جو اس گھناؤنے سفر میں میرا ہمقدم ہو۔ یہ گہرا غار زندگی ہے جس میں بعض اوقات آوازیں سنتا ہوں، شور و غوغا سنتا ہوں، چیخیں سنتا ہوں
اور ان پریشان آوازوں کی طرف ڈرے ڈرے سہمے ہوئے انداز سے بزدلی کے ساتھ بڑھتا بھی ہوں، لیکن ٹھیک سے بتلا نہیں سکتا کہ یہ آوازیں کن
لوگوں کی ہیں، میری مڈبھیڑ کسی سے نہیں ہوتی۔ اس اندھیاری میں جو ہر طرف سے مجھ کو گھیرے ہوئے ہے مجھے کوئی دوسرا ہاتھ نہیں سُوجھتا، سنتے ہو؟

کچھ اور لوگوں نے بھی اس ہولناک اذیت کو کبھی کبھی محسوس کیا ہے، ڈی موسے لکھتا ہے:۔

"کون آتا ہے؟ کون پکارتا ہے مجھے؟ کوئی نہیں، کوئی نہیں،

میں اکیلا ہوں تنہا ہوں، گھنٹہ بج رہا ہے۔

ہائے تنہائی، وائے بے کسی!"

لیکن یہ اذیت اس کے لئے ایک لمحاتی ٹسک یا وسوسے کا ایک لمحۂ گریزاں ہے، کوئی ٹھوس حقیقت نہیں ہے جیسے میرے لئے ہے۔ وہ ایک شاعر تھا
اس نے زندگی کو طرح طرح کے خواب و خیال سے بھر رکھا تھا۔ اس لئے واقعی وہ کبھی اکیلا نہ رہا۔ لیکن میں ۔ میں ہوں، اکیلا۔

گستاف فلابیر نے ۔ جو اس دنیا کے عظیم بدبختوں میں سے اور اسی دنیا کی ایک تجلی تھا، اپنے ایک دوست کو کہیں لکھا تھا

"ہم سب ایک صحرا میں ہیں، کوئی کسی کو نہیں جانتا، نہیں سمجھتا"

کوئی نہیں، واقعی کوئی کسی کو نہیں جانتا، کسی کو نہیں سمجھتا، چاہے وہ کچھ ہی خیال کرے، کچھ ہی کہے، کتنی ہی کوشش کرے، کیا زمین کو خود بھی اس کا
علم ہے کہ ان ٹوٹتے ہوئے ستاروں پر کیا گذرتی ہے جو چنگاریوں کی طرح آسمان پر بکھیر دیئے جاتے ہیں؟ پھر ہم کو تو ان میں سے چند ہی کا
چمک دمک کا علم ہوتا ہے۔ ذرا سوچو تو سہی یہ بے شمار ستارے جو فوج در فوج اس ناپیدا کنار میں کھوئے چلے جاتے ہیں حالانکہ وہ ایک
دوسرے سے اتنے قریب اور اتنے بندھے ہوئے ہیں کہ شاید کسی کل کی تشکیل و تکمیل ان سے ہوتی ہو، اور وہ ایسے ہی ہوں جیسے بہت سے
اور ساتھ جانے کتنی ہیں، بہرحال انسان نہیں جانتا کہ دوسرے پر کیا بیت رہی ہے، ہم تو ایک دوسرے سے ستاروں سے کہیں زیادہ دور ہیں
ان سے بھی زیادہ لاتعلق اور بے خبر گویا ایک اتھاہ سمندر ہے۔

جن ہستیوں کی تہ تک تم پہنچ نہیں سکتے کیا ان کے ساتھ مستقل مربوط ہونے کی حقیقت سے بھی زیادہ ہولناک کوئی اذیت ہو سکتی ہے؟
ہم ایک دوسرے سے کچھ اس طرح محبت کرتے ہیں جیسے باہم جکڑ دیئے گئے ہوں، ایک دوسرے میں ڈوبے ہوئے اور پیوست، پھر بھی ایک دوسرے تک پہنچنے سے قاصر، وصل و اتصال کی ایک چبھتی ہوئی خلش اور ایک دائم طلب باقی ہی رہتی ہے اور ساری کوششیں اور کاوشیں رائیگاں جاتی ہیں ہماری یہ خود سپردگی بیکار۔ ہمارا اعتبار و اعتماد بے ثمر، ہماری بغلگیریاں اور ہم آغوشیاں بے مراد، ہماری محبتیں بے حاصل کیونکہ جب ہم ایک دوسرے میں جذب ہو جانا چاہتے ہیں تو ہمارے اچانک ابھر آنے والے جذبات ہیں یک لخت متصادم ہی کر دیتے ہیں۔

میں اپنے آپ کو تنہا سب سے زیادہ اسی وقت محسوس کرتا ہوں جب اپنا دل کسی دوست کے سامنے پیش کرنے لگتا ہوں۔ یہ ناقابل عبور رکاوٹ اچھی طرح سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ میرا محبوب سامنے ہے۔ میں اس کی صاف شفاف آنکھوں کو دیکھ رہا ہوں لیکن ان کے پیچھے جو روح ہے دہ نہیں ملتی۔ وہ میری بات سن تو رہا ہے لیکن سوچ کیا رہا ہے؟ نہ جانے کیا سوچ رہا ہے تم اس کرب کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ مجھ سے نفرت محسوس کر رہا ہے۔ یا شاید اس کے اندر حقارت کا جذبہ ابھر رہا ہے، یا وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے؟ میں نے جو کچھ کہا اس پر غور کر رہا ہے، مجھے تول رہا ہے' مجھ پر ترس کھا رہا ہے، قابل سزا سمجھ رہا ہے، یا احمق یا کوئی سطحی قسم کا انسان؟

آخر میں کس طرح سمجھوں کہ وہ کیا خیال کر رہا ہے، کیسے جانوں کہ اس کو بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے جتنی مجھ کو اس سے ہے' کون سی بات ہے جو اس کے چھوٹے سے گول مول سے سر میں گشت لگا رہی ہے، اُفوہ! کسی ہستی کا نامعلوم، مخفی اور بےلاگ خیال کتنا کچھ پُراسرار ہے؟ جس کو ہم جان ہی سکتے ہیں' نہ اس پر قابو پا سکتے ہیں، نہ اس پر کوئی حکم چلا سکتے ہیں، نہ عبور حاصل کر سکتے ہیں۔

اور میں نے ——— میں نے تو بے نا کام کوشش بھی کی ہے کہ اپنے آپ کو کُلّیتہً سونپ دوں، اپنی روح کے سارے دروازے کھول دوں، لیکن اس سپردگی میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم میں اسی گہرائی میں سکونت پذیر ہوں۔ ہاں اسی گہرائی میں جو میری مخفی رہائش گاہ ہے جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ کوئی اس کا پتہ نہیں پا سکتا۔ کوئی اس میں داخل نہیں ہو سکتا، کیونکہ میرے جیسا کوئی ہے بھی تو نہیں، کوئی مجھ کو سمجھ نہیں پاتا۔

تم کم از کم اس لمحہ تو ضرور مجھے سمجھ رہے ہو گے ——— نہیں؟ ——— خیال کرتے ہو گے کہ میں پاگل ہوں، میرا جائزہ لے رہے ہو گے' مجھ سے ایک کھچاوٹ محسوس کر رہے ہو گے، پوچھو، اپنے آپ سے پوچھو کہ " آخر اس شخص کو ہو کیا گیا آج کی رات "——— لیکن تم میری اس ہولناک بیقراری اور تڑپ اور کرب پر کبھی قابو پانے اور اس کو سمجھنے میں کامیاب ہو جاؤ تو میرے پاس آنا اور صرف اتنا کہنا کہ ہاں میں نے تمہیں سمجھ لیا تو میں شاید نہال ہو جاؤں، ایک ہی لمحے کے لئے سہی،

عورتیں اور بھی مجھے اپنی تنہائی کا احساس دلاتی ہیں، ہائے بیکسی، بیچارگی! عورتوں نے کس کس طرح مجھے تڑپایا ہے! اس لئے کہ انہوں نے تنہا نہ ہونے کا فریب نسبتہً مردوں سے زیادہ دیا ہے۔

جب کوئی محبت میں مبتلا ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ پھیل رہا ہے وسیع ہو رہا ہے اور ایک مافوق البشری مسرت اس کو محیط ہو جاتی ہے، جانتے ہو کیوں؟ جانتے ہو اتنی شدید مسرت کا احساس اسے کیوں ہونے لگتا ہے؟ محض اس لئے کہ ایسے میں آدمی اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا محسوس نہیں کرتا۔ اسے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اس کی بیکسی اور تنہائی کا عالم ختم ہو گیا۔ کیسا دھوکا ہے یہ؟
محبت کی اس ابدی طلب میں، جو ہمارے تنہا دلوں کو چھلنی کرتی رہتی ہے، عورتیں ہم سے بھی زیادہ اذیتیں جھیلتی ہیں! ہائے یہ عظیم فریب!

ہائے یہ سُندر سپنے !

تم ان لذّت آفریں ساعتوں سے اچھی طرح آگاہ ہو جو کسی لمبے لمبے بالوں والی، دلکش خط و خال اور محبت انگیز چشم و نگاہ رکھنے والی کسی ہستی کے روبرو گذری ہوں، کیسی عجیب مدہوشی ہمارے دل و دماغ پر چھا کے ہمیں بہکا دیتی ہے، اور کیسا فریب ہمیں اپنی موجوں میں بہا لے جاتا ہے، کیا یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ابھی ابھی، اسی پل، ہماری روحیں گھل مل کر ایک ہو جائیں گی؟ لیکن یہ "پل" کبھی نہیں آتی، کبھی نہیں بلکہ ہفتوں کے انتظار و امید اور پُرفریب مسرت کے طوفان میں گم رہنے کے بعد جب کسی دن ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو پہلے سے بھی زیادہ اکیلے ہیں، پہلے سے بھی زیادہ تنہا،

"ہر بوسے اور ہر ہم آغوشی کے بعد، تنہائی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور پھر آدمی کس وحشتناک طریقے پر تڑپتا ہے! اُفوہ،
کیا سلی پروڈھوم نے کہا نہیں :-
"بوس و کنار محض بیقرار مدہوشیاں ہیں
اور بے ثمر مساعی، بیچاری محبت کی، جو کوشش کرتی ہے
جسموں کے ذریعے روحوں کے ناممکن اتحاد کی"

"اور پھر خدا حافظ" گویا بات اپنے خاتمے کو پہنچی، اس عورت کو ہم پھر مشکل ہی سے پہچانتے ہیں جو ایک لمحے کے لئے ہماری سب کچھ تھی، اس کے خیالات کتنے ہی انیس و غمگسار اور عام کیوں نہ ہوں مگر ہم ان کو کبھی نہ جان سکے۔

ٹھیک اسی لمحے جب کہ دو ہستیوں کے اس پر اسرار اختلاط میں، خیالات اور تمناؤں کے اس مکمل اتحاد میں ایسا محسوس ہو رہا ہو جیسے تم اس کی روح کی گہرائیوں کی آواز سن رہے ہو، ایک لفظ — صرف ایک ہی لفظ — تمہاری اس غلط فہمی کو بے نقاب کر دے گا۔ اور جیسے رات کی تاریکی میں روشنی کی جھلک نظر آتی ہے اسی طرح اس فاصلے اور دوری کو واضح بھی کر دے گا۔ جو تم دونوں کے درمیان واقع ہے۔

تاہم یہ چیز دنیا میں پُرلطف انگیز ہے کہ جو عورت ہمیں عزیز ہو، اس کے قرب میں، اس کے وجود کے احساس سے پوری طرح شاداں فرحاں ایک رات، بغیر کچھ بولے چپ چاپ بسر کی جائے۔ اور بس اس سے زیادہ اور کچھ طلب نہ کرو کیونکہ دو ہستیاں اب تک تو ایک دوسرے میں کبھی مدغم نہیں ہوئیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے اپنی روح کا دریچہ بند کر لیا ہے، اب میں کسی سے بھی نہیں کہتا کہ میں کیا سوچتا ہوں، کس چیز پر یقین رکھتا ہوں، کس شے سے مجھے لگاؤ ہے، جانتا ہوں کہ یہ مجھے اس ہولناک تنہائی کی سزا ملی ہے۔ اس لئے مدرکات پر نظر کسی رائے زنی کے بغیر ڈالتا ہوں۔ رائیں، خیالات، اختلافات، مسرتیں، اعتقادات میرے لئے کیا اہمیت رکھتے ہیں! میں کسی کا شریک و سہیم کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے سب سے کنارا کر لیا ہے۔ میرا غیر مرئی وجود نایافتہ اور نامعلوم ہے، روزمرہ کی گفتگو اور سوال و جواب کے لئے میرے پاس عام فقرے اور جملے بنے بنائے تیار ضرور رہتے ہیں، اور ایک مسکراہٹ بھی جو "ہاں" کا مفہوم اس وقت ادا کرتی ہے جب میں کچھ کہنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرنا چاہتا۔ سمجھے؟

چلتے چلتے ہم دونوں آرک دی ترامیف کو جانے والے لمبے دو رویہ راستے کو طے کر کے پلیس ڈی لاکنکارڈ واپس پہنچ چکے تھے اس نے اپنے دھیمے دھیمے لب و لہجہ میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ ڈالا ان باتوں کے علاوہ بھی اور بہت سی باتیں اس نے کی تھیں مگر مجھے اب یاد نہیں۔

(باقی صفحہ پر)

احتشام حسین زیدی

”شکست“

زاہدہ نے حاجی شمس الدین سے طلاق لی تو تمام جان پہچان والے چیخ اٹھے۔ ”ارے یہ تو رنڈی ہے رنڈی۔“! دولتمندوں اور ادھیڑ عمر والوں نے کہا کیا کرتی بیچاری کہاں گلاب کا پھول اور کہاں حاجی شمس الدین سر تا پا موسم خزاں یہ بیس سال کی اور وہ ساٹھ سے اوپر۔ لیکن لوگوں کو نہ تو حاجی سے کچھ مطلب تھا اور نہ ان کی عمروں سے، وہ تو سب ان کی اس حسرت کا کرشمہ تھا کہ کاش زاہدہ کبھی ان کے دل کے دریچوں میں بھی جھانک لیتی، وہ زاہدہ کے ہرجائی پن کے شاکی نہیں تھے بس حاجی کے پہلو میں اسے دیکھ کر جلتے تھے۔ طلاق کی خبر پر سب سے زیادہ طعنہ زنی عورتوں نے کی۔ ”لے نوج اس کم بخت نصیبوں جلی نے یہ پانچویں طلاق لی، حرامزادی عورت نہ ہوئی رنڈی ہو گئی“ ، عورتوں کو زاہدہ کی جوانی اور خوبصورتی کے علاوہ اسکی دولت اور اسکے بڑھیا لباس سے بھی حسد تھی، نوجوان طبقہ البتہ خوش تھا کہ کچھ دنوں تک تو ضرور زاہدہ کی آغوش اپنے دلمیں بسائی جا سکتی ہے! اور زاہدہ ان تمام حالات کو جانتے ہوئے بھی انجان اور مگین نظر آتی تھی، اس کے چہرے پر وہی دائمی مسکراہٹ آنکھوں میں وہی جوانی کا خمار رچا ہوا تھا۔ بلکہ چال پہلے سے بھی زیادہ لچکدار ہو گئی تھی۔ کپڑے پہلے سے زیادہ چست اور باریک پہننے لگی تھی اور کبھی کبھی تو اسکرٹ بھی پہن لیتی تھی۔ اگر کسی بڑی پارٹی میں جانا ہوتا ۔ اور رات کے دس گیارہ بجے تک کالونی کے نکڑ پر اسلم پان شاپ پر ایک جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔ ولی محمد پہلوان سے لیکر سول سپلائیز کا انسپکٹر ڈاکخانے کا بابو امجد علی سب ہی اسلم کے پان اور اسکی دکان کی نفاست کے قائل تھے زاہدہ کے واپس ہوتے ہی سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ جاتیں۔ کالے کالے الجھے ہوئے گھنے بال، گداز جسم، شہابی رخسار، بڑی بڑی کاجل بھری آنکھیں تیلی کمر بھری بھری میدہ شہاب جیسی پنڈلیوں سے لیکر کالے فیتوں والی چپل تک بڑی تیزی بڑی حسرت اور بڑے اضطراب سے جائزہ لے لیا جاتا، وہ لچکتی ہوئی، مسکراتی ہوئی، ان کی نظروں سے نظریں ملائے بغیر اخلاقی ہوتی نکل جاتی اس کے نازک قدموں کی دھم اور ملائم چاپ ہر ایک کو اپنے سینے پر پڑتی ہوئی محسوس ہوتی اور پھر اسلم پان شاپ ویران ہو جاتی، اسلم اور محسن اکیلے رہ جاتے، اسلم بیڑہ تیار کرتے ہوئے کہتا ”چھوڑ یار چھوڑ“ اسی طرح دن میں چار بار گذر جاؤ تو مولا قسم اپنے تو پو بارہ ہیں ، محسن کش لگا کر کہتا اسلم ابھی ایک ڈبل چائے منگا دے یار ے“ ہاں ہاں پیو ابھی پیو، ڈبل کی ڈبل پیو، پر یار یہ زاہدہ ہے بڑی بجلی، آخر ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔

اماں اسلم چھوڑو بھی ان باتوں کو جب کوئی ملک انقلاب سے دوچار ہو جاتا ہے تو وہاں کے نوجوان اور بچے بوڑھے

سب کے اخلاق پستی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں "

دیکھو بھئی محسن اپنا موڈ اسوقت آف ہے بس انقلاب و نقلاب کی بات ختم "

اسلم تم تو ابھی تک بچے ہی ہو تمہیں اتنے لکھ دئے، اتنی کتابیں پڑھکر سنائیں مگر تم ابھی تک اپنے ماحول کی گرفت سے بھی نہ نکلے، چہ جائیکہ ذہن سے

بھیا محسن جب بھوک لگی ہو تو کھانے کو دل چاہتا ہے گانا سننے کو نہیں اب اگر بات کرو تو بس زاہدہ کی کرو۔۔۔"

اچھا بھئی تو چل دیئے، محسن ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔

اندر وہ ڈبل چائے ابھی واہ،

پھر پی لیں گے۔

برا مان گئے محسن صاحب، قرآن قسم چائے پی کر جاؤ ورنہ اسلم کی لاش ہی دیکھو گے تم۔

"اچھا بھئی یوں ہی سہی"

محسن بھائی ایک بات کہوں، برا تو نہ مانو گے"، اسلم کو جب کوئی نصیحت کرنی ہوتی تو وہ یوں ہی بولا کرتا تھا بڑے مسکین لہجے میں "

چائے کا گھونٹ اور سگریٹ کا تلخ دھواں ساتھ ساتھ حلق میں نگلتے ہوئے محسن بولا تمہاری بات کا برا ماننا تو پہلی سے روٹھنے کے برابر ہے، کہو

محسن بھائی یہ زاہدہ ہے نا ——— یہ تمہیں بہت غور سے دیکھتی ہے "

ضرور دیکھتی ہوگی، میرے اس پینٹ کو دیکھتی ہوگی جو مدت سے نہیں دھلی ہے۔ میری میلی قمیض کو جو سفید سے اب ہرنی ہوگئی ہے اور جو ہمیشہ پتلون سے باہر ہی رہتی ہے، میرے الجھے ہوئے بالوں کو میری غربت اور میری بوڑھی جوانی کو دیکھتی ہوگی،

نہیں محسن بھائی وہ ان میں سے کسی چیز کو نہیں دیکھتی،

"پھر"

"وہ تمہاری آنکھوں کو گھورتی ہے "

اسلم خدا کے لئے چپ رہو، محسن تلملاہٹ کے ساتھ بولا ———

——— بس اب اور کچھ نہ بولو، میں اپنی ہر چیز کا مذاق اڑوانا پسند کروں گا اپنی غربت اپنی مفلسی اپنے رہن سہن ہر چیز کی بات رائے زنی پسند کر لوں گا مگر خدا کے لئے یوں نہ کہو کہ کوئی میری آنکھوں کا مذاق اڑاتا ہے یہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں اس کو بھی مار دوں گا زاہدہ کو، یہ وہ آنکھیں ہیں جنہوں نے کالیداس، شکسپیر، انیس، ہومر، مارکس، نطشے، اقبال، برگساں، لینن، ٹالسٹائی اور گوئٹے کو پڑھا ہے، ان آنکھوں نے مجھے انسانیت کی راہ دکھائی ہے، ان آنکھوں نے میرے دل میں علم کی مشعل جلائی ہے میں ان آنکھوں کا مذاق نہیں برداشت کر سکتا کبھی نہیں کر سکتا یہ میری نہیں علم اور انسانیت کی توہین ہے،

مگر محسن بھائی میں نے جو دیکھا سو بتا دیا، اپنا کا اس میں کیا دوش "

"ٹھیک ہے بھائی اب میں یہاں بیٹھوں گا ہی نہیں !

محسن بھائی وہ تمہارے مضامین بھی پڑھتی ہے بڑے شوق سے ایک دن میں نے بس میں اگلی سیٹ پر بیٹھ کر دیکھا تھا وہ تمہاری وہ کتاب پڑھ رہی تھی وہ انسانیت"

اسلم کیا تمہارے پاس اور کوئی موضوع نہیں ہے "

اچھا بھائی اسلم نے اپنا موضوع ختم کرتے ہوئے کہا تم مجھے بھی وہ کتاب دینا اپنی والی، فرصت میں پڑھوں گا ـــــ

☆ ☆ ☆

زاہدہ نے جب حاجی کو طلاق دی یا ان سے طلاق حاصل کی تو بڑی مطمئن تھی، اس کے پاس کچھ روپئے جمع تھے جو پچھلے پانچ شوہروں سے اسکو ملے تھے اور اپنا ایک مکان بھی تھا جس میں وہ اپنی بچپن کی آیا کے ساتھ رہتی تھی اسے مستقبل کی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ وہ اپنے بارے میں کریہہ اور گھناؤنے الفاظ سنتی تھی لیکن خاموش ہو جاتی تھی وہ تڑپتی بھی تھی، جلاتی بھی تھی روتی بھی تھی مگر دوسروں سے چھپ کر پچھلے دس برسوں سے اسکی زندگی میں یہ موقعے برابر آ رہے تھے کہ جب وہ کہیں سے اپنا دامن وابستہ کر لیتی تھی تو طعنے کچھ دنوں کے لئے بند ہو جاتے تھے اور پھر شروع ہو جاتے تھے۔ آئینہ کے سامنے بیٹھ کر بارہا اس نے سوچا تھا کہ خدا نے مجھے یہ خوبصورت چہرہ کیوں دیا لیکن خدا اسے یہ کیسے بتاتا کہ وہ تو مخلوق کی بہتری ہی کے لئے سب کچھ دیتا ہے

صبح کی فرحت بخش ہوائیں پڑھتے پڑھتے زاہدہ کو اپنا ماضی پھر یاد آیا اب سے پندرہ سال پہلے کی بات جب اس نے پہلی بار محمود کے سینے پر سر رکھے ہوئے آنکھیں کھولی تھیں۔ محمود اسکا پہلا شوہر تھا ایک فلم ڈائرکٹر جس نے بڑے ارمانوں سے اسے اپنایا تھا ـــــ لیکن وہ اسکا پجاری بنکر رہ گیا محمود نے اپنی زندگی کے پچیس سال فلمی دنیا میں گزارے تھے اور ان پچیس برسوں میں لاکھوں روپئے کما کر ہزاروں کچی کلیوں کو مسل مسل کر اپنی متاع جوانی کھو چکا تھا ـــــ وہ زاہدہ کو صرف پوج سکتا تھا اسکی پرستش ہی کر سکتا تھا۔ زاہدہ جوانی کی آگ میں زیادہ دنوں تک نہ جل سکی۔ چڑھے ہوئے دریا کی خاصیت ہے کہ اسے روکا جائے تو وہ اپنے کناروں کو کاٹ کر بہنے لگتا ہے یہی حال زاہدہ کا ہوا، محمود کے اسسٹنٹ عسکری نے زاہدہ کو سہارا دیا اور اس سہارے نے بعد میں شادی کی صورت اختیار کر لی، عسکری بھی فلمی رنگ میں رنگا ہوا تھا کچھ عرصہ بعد وہ بھی زاہدہ سے دور ہو گیا حسن سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن رقابت اور بے عزتی نہیں، زاہدہ نے ہمدانی کا سہارا لے لیا چند سال بڑے خوشگوار گزرے ہمدانی سب کچھ بھول کر زاہدہ کے حسن و شباب اور نکھار میں ڈوبا رہا زاہدہ بھی مطمئن تھی اس زندگی سے جو پر سکون بھی تھی اور حیات پرور بھی، مگر ایک دن ہمدانی بھی اس سے چھن گیا موت کے بیرحم ہاتھوں نے زاہدہ سے زندگی اس کو چھین لیا۔ ہمدانی کے بعد اسکا شوہر قربان علی سیٹھ تھا لیکن قربان علی نہ تو زاہدہ کے حسن سے متاثر تھا نہ جوانی سے اسے تو اپنے ہی کھانے سے عشق تھا اور عورت بھی کھاتہ نہیں قربان علی ہزاروں اندراجات میں سے ایک ایک پائی کی غلطی بھی ڈھونڈ سکتا تھا لیکن جوانی کے الجھے ہوئے تار کو سلجھانے کی صلاحیت کھو کر اور سر کے کی نذر ہو چکی تھی اسے ایک بچہ چاہئے تھا جو کھاتوں کا وارث، اس کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ روپے پیسے اور مال و متاع کے علاوہ نوجوان نوکروں سے گھر بھرا ہوا تھا بچہ وہ بھی چاہتی تھی، لیکن ایسا بچہ جسکی رگوں میں شریف خون ہو ـــــــ، وہ گناہ کی سرد آنچ میں تمام عمر جلتے رہنے

سے بہتر سمجھتی تھی کہ آدمی ایک ہی بار جل کر خاک ہو جائے۔ اس کے علاوہ زاہدہ بہر حال تھی ایک عورت جو عورت اپنی مرضی سے جلتی اور بجھتی ہے دوسروں کی مرضی پر نہیں اس لئے قربان علی سیٹھ کو اپنا وارث نہ مل سکا۔ اور سیٹھ نے جبراً کر کے کسی دوسری تدبیر کے لئے اس سے گلو خلاصی کر لی۔

زاہدہ انسانیت سے قریب تھی اس نے قربان علی سیٹھ کی خواہش پر سر نہ جھکایا لیکن لوگ اسے غیرت مند شریف خاتون کہنے کے بجائے رنڈی تک کہہ بیٹھے اور وہ سوچتی تھی کہ اگر میں رنڈی ہوتی تو پھر ان میں سے کوئی بھی مجھے رنڈی نہ کہتا ایم صاحب، کیونکہ یہی لوگ میرے در پر جبہ سائی کرتے۔ لیکن اب جبکہ وہ صرف ایک عورت ہے اور جب کہیں کوئی سہارا نہیں تو اسے بیسوا کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ قربان علی سیٹھ کے بعد زاہدہ کی بھرپور جوانی کو حاجی شمس الدین کی بوڑھی آغوش نے تاکا۔ حاجی کی بیوی کو گزرے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا ان کا ایک بھتیجا تھا جس کو بچے کی طرح انہوں نے پالا تھا اور اب وہی ان کے کاروبار کو سنبھالے ہوئے تھا۔ زاہدہ کی ضرورت حاجی شمس الدین کو کیوں محسوس ہوئی یہ زاہدہ خود بھی نہ جان سکی، وہ اس گھر میں ایک بے معرف زندگی بسر کرتی رہی لیکن کب تک آخر بیزاری، بے دلی بے کیفی اتنی بڑھی کہ اگر جاوید کی نیکی، سادگی اور سعادت اور انسانیت بیچ میں نہ ہوتی تو نہ جانے وہ کب کی اس گھر کو آگ دکھا چکی ہوتی ۔۔۔ حاجی کے مزاج اور جاوید کی طبیعت میں آسمان زمین کا فرق تھا اسے یقین آتا تھا کہ یہ حاجی کا بیٹا ہو سکتا ہے۔ حاجی اسے خود غرض نظر آتا تھا اور جاوید اس کے برخلاف سیدھا سادا بے لوث، وہ اکثر سوچا کرتی کہ دنیا ساری ہی بری نہیں ہے اور دنیا ایسا ایک گھر کے اندر۔ سبھی سب برے نہیں ہوتے اگر ایسا ہوتا تو دنیا دوسرے ہی دن جہنم بن جاتی۔ جل بھن کے راکھ ہو جاتی یہ تصور اس کے دل کو سنبھالتا اور سینے کے اندر دہکنے والی غصہ اور انتقام کی آگ دھیمی پڑ جاتی اس غصے کی وجہ یہ تھی کہ حاجی نے آخر مجھ سے شادی کیوں کی۔ اتنا اصرار اسے کیوں تھا کہ محلے پڑوس اور بعض رشتہ داروں کو بھی بیچ میں ڈالا تھا۔ اور ان سب نے اپنی نیک دلی اور خیر خواہی کے جذبے سے مجھے مجبور کیا کہ منظور کر لوں اس مردار نے تو مجھی کو نہیں، ان سب کو بھی دھوکا دیا، اب اگر منہ سے کچھ کہوں تو نہ میں ہی ان لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل رہوں، نہ وہی مجھ سے کبھی آنکھیں چار کر سکیں۔ غرض زاہدہ عجب کشمکش کے عالم میں تھی۔ افسوس سے جو شادی کی تھی تو اس میں وہ تنہا ذمہ دار تھی، حاجی کے معاملے میں چار لوگ اور بھی تھے ۔۔۔ اس نے دل پر بہت جبر کیا بہت ضبط سے کام لیا اور اس بوجھ سے وہ روز بروز مرجھاتی چلی گئی۔ مگر حاجی کو ذرا فکر نہ تھی جاوید نہ ہوتا تو شاید ۔۔۔ کوئی ڈاکٹر کو بھی بار بار بلا کے نہ لاتا نہ دوا دارو کا انتظام ہوتا نہ تیمارداری ہوتی نہ کوئی کھلاتا پلاتا نہ دل بہلاتا۔ حاجی تو بس خیریت پوچھ کے یوں مطمئن ہو جاتے جیسے ان کا پوچھ لینا ہی سب سے بڑی دوا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شاید خود غرض آدمی کی نظر صرف اپنے ہی دل کی طرف ہوتی ہے ورنہ دوسروں کو ذبح کرنے کے لئے اس کے قدم کبھی آگے نہ بڑھیں۔ حاجی کو اپنے دل سے مطلب تھا اور زاہدہ کے دل کو دیکھنا تو ان کے بس کی بات نہ تھی۔ زاہدہ اچھی ہو گئی۔ جاوید پھر اپنے کاموں میں لگ گیا وہ سارا سارا دن باہر رہتا۔ دوپہر کو آتا کبھی دوپہر کو بھی نہ آتا۔ شام ہی کو آتا اور رات کو جلدی ہی بستر پر چلا جاتا۔

انسانی جذبات کا سمندر اتھاہ ہے، کوئی کچھ نہیں جانتا کہ کب کون سی موج اٹھ بیٹھے گی اور کیا سے کیا ہو جائے گا۔ زاہدہ اچھی ہو گئی تو پھر اسے گھر کاٹنے لگا ۔۔۔ آخر ایک رات ۔۔۔ اور نہ جانے وہ کیسی رات تھی ۔۔۔ زاہدہ اٹھی، جاوید کے

کمرے میں پہونچی اور جاوید کے اوپر گر پڑی، یہ ایک خاموش مگر انتہائی عملی قسم کی بے خطا سپردگی تھی،

جاوید تلملا کر اٹھا اور دوسرے ہی لمحے زاہدہ کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ گونج پڑا۔

وہ چیخ رہا تھا۔ ذلیل عورت تو نے یہ بھی سوچا کہ میں تیرا کون ہوں، تو نے مجھ کو بھی کمینہ سمجھا، تیرے لئے میرے دل میں صرف ایک ہی جذبہ تھا... احترام کا جذبہ

دروازے کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے حاجی کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ تھپڑ زاہدہ کے گال پر نہیں بلکہ خود انکے بوڑھے جبڑے پر پڑا۔ کم بخت، نامراد حاجی گھیٹے اور ایک بوڑھے شیر کی طرح لپک کر اندر پہونچے۔ زاہدہ سہم گئی - - - - حاجی نے جاوید پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ "شرم نہ آئی تجھے ہاتھ اٹھاتے" حرامی ناخلف ——— " جاوید ششدر کھڑا ہوا تھا وہ حیران تھا کہ ابو کو کیا ہو گیا (وہ حاجی کو ابو کہتا تھا) یہ سزا تو زاہدہ کو ملنا چاہیے تھی زاہدہ کے آنسو یک لخت تھم گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر حاجی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ خطا میری ہے، ان کی نہیں،

"تم چپ رہو بیگم حاجی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے تیزی سے کہا۔ میں آج اس حرامی کا جنازہ نکال دونگا اور یہ کہہ کر حاجی نے جوتا جاوید کی طرف پھینک کر مارا، زاہدہ بیچ میں آگئی اور جوتا اسکے کولہوں پر لگا۔ او ہو تم بیچ میں کیوں آگئیں حاجی نے پھرتی سے زاہدہ کی طرف بڑھ کے معافی مانگی چوٹ تو نہیں لگی اور اپنا ہاتھ یوں ملنے لگے جیسے جوتا ان کے ہاتھ پر ہی پڑا ہو "

بس اب معاف کر دیجئے جاوید کو زاہدہ نے کہا

"اچھا، معاف کیا، "ڈانٹ کی سی آواز میں حاجی نے کہا اور زاہدہ کو ساتھ لیکر کمرے سے باہر نکل گئے۔

جاوید کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا ہوا۔ اور ابو کو کیا ہو گیا وہ الٹا مجھی کو مجرم قرار دے رہے ہیں، وہ اپنے بستر پر گر پڑا اور دیر تک سسکتا رہا۔

دوسرے دن کھانے پر حاجی بار بار مسکرا رہے تھے مگر زاہدہ منہ پھلائے بیٹھی تھی، جاوید کے دل میں نفرت کا طوفان امڈ رہا تھا مگر، وہ سر جھکائے کھانا کھاتا رہا، حاجی نے جو تھا انڈا حلق سے اتارتے ہوئے بڑی محبت کے لہجے میں کہا جاوید بیٹے! بیگم کی صحت بہت خراب ہوتی جارہی ہے تم ان کے ساتھ دو ماہ کے لئے مری چلے جاؤ، تبدیل آب و ہوا ضروری ہے

"نہیں ابو"

میں جو کہہ رہا ہوں، حاجی نے فہمائش کے انداز میں کہا۔ یہ لو یہ چیک بک جو خرچ ہوں اسی میں سے کرنا۔

لیکن زاہدہ، جاوید کے ساتھ مری جانے کے بجائے اپنے گھر لوٹ آئی اس نے حاجی سے طلاق لے لی اور دن بھر تکیوں میں سر دیئے اداس بیٹھی سوچتی رہی ——— نہ جانے قسمت میں کیا ہے

شام کو آیا نے خبر دی کہ بی بی وہ جاوید صاحب آئے ہیں۔

"بلا لو"

کیسے تکلیف فرمائی جاوید صاحب! اس نے روکھے پن سے پوچھا

"معافی مانگنے۔"

معافی مانگنے ۔ زاہدہ نے غور سے اسکی صورت دیکھی، غلطی تو میں نے کی تھی،
نہیں میں نے کی اور اب پچھتا رہا ہوں،
بڑی جلدی بدل گیا خیال، زاہدہ نے طنز کی،
۔ بدل تو گیا تھا ـــــ
پھر تو نہیں مارو گے تھپڑ،
میں شرمندہ بہت ہوں پچھتا رہا ہوں ۔
گویا راضی ہو گئے مری کی سیر کو ؟
ہاں میں یہی کہنے آیا ہوں
کہ چلوں ؟
ہاں چلو،

لیکن وہ اپنے جواب کا مفہوم اپنے نگاہوں کی چمک اور لبوں کی پھڑک سے پورا ابھی نہ کر پایا تھا کہ زاہدہ کا ہاتھ بجلی کی طرح اس کے منہ پر پڑا۔ حرامزادے

زاہدہ بپھر گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حرامزادے نکل جا میرے گھر سے تو نے سمجھا کیا ہے، اتنی جوتی مارونگی کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے، سور کی اولاد ـــــ

جاوید ہکا بکا رہ گیا، اک لمحہ اس نے بپھری ہوئی شیرنی کو دیکھا اور گال سہلاتا چپ چاپ باہر نکل گیا۔ زاہدہ پلٹ کے بستر پر اوندھی گری اور سسکیاں بھرنے لگی اسے مردوں کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی، حاجی سے طلاق حاصل کرنے کے بعد اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب شادی کسی قیمت پر نہ کرے گی اس کے پانچ شوہروں نے اسکے دامن میں جو آگ بھر دی تھی وہ تمام عمر سلگتے رہنے کے لئے کافی تھی ـــــ نہ جانے وہ کتنی دیر تک بے بسی سے پڑی روتی رہی اسے رہ رہ کر اپنا باپ یاد آیا جو اس جنگل میں اسے اکیلا بے سہارا چھوڑ کر خود سکون کی نیند سو گیا تھا۔

وہ اپنے باپ کی اکلوتی لڑکی تھی، ماں کا مرنا تو اسے ٹھیک سے یاد بھی نہ تھا۔ البتہ باپ جب مرا تو وہ چند سال کی تھی، اور باپ کے بعد اسکی غم خوار صرف آیا تھی جسکی گود میں پل کر وہ جوان ہوئی تھی، اور آج بھی وہ اسی کے ساتھ تھی،

بی بی کب تک روتی رہو گی کوئی ملنے آیا ہے تم سے ـــــ آیا نے پھر آ کے خبر دی،
"میں کسی سے نہیں ملونگی بوا، پھر کوئی آیا ہوگا مجھے لگانے،
ہاں بٹیا صورت سے بھی وہ اشراف نہیں لگتا، نجانے کون ہے، میں کہہ دیتی ہوں کہ بٹیا نہیں ہیں،
" زاہدہ نے کچھ سوچ کر کہا، نہیں بوا تم اسے بلا ہی لو، جاؤ"،
"کیا میں آسکتا ہوں اندر محسن نے کمرے کے دروازے پر پہنچ کے اجازت چاہی۔

آپ ہیں انقلابی صاحب " آیئے تشریف رکھئے زاہدہ نے ڈوپٹہ اپنی آنکھوں پہ رگڑتے ہوئے طنز کی "

نہیں میں بیٹھوں گا نہیں محسن نے کہا میں کچھ مانگنے یا دینے نہیں آیا ہوں، پھر میرے بیٹھنے سے شاید آپ کے یہ صوفے گندے ہو جائیں گے ۔

محسن صاحب آپ کیسی بات کہتے ہیں تشریف تو رکھئے، ارے بوا ـــــ ذرا ایک پیالی چائے لانا ـــــ نہیں چائے نہیں بوا ۔ ہائے اللہ تم تو جلدی سے کافی بنا لاؤ اور ہاں دیکھو ایک پیکٹ گولڈ فلیک بھی ۔ ہاں دوڑ کے لے آؤ اسلم کی دکان سے، دیکھئے صاحب میں نے عرصے سے نہ کافی پی ہے نہ گولڈ فلیک کا ذائقہ پھر میں آپ سے کچھ دار باتیں بھی کرنے نہیں آیا میں آپکو تنبیہ کرنے آیا ہوں، کل مجھے معلوم ہوا کہ آپ مجھے دیکھکر ہنستی ہیں یوں میں آپ کی ہنسی پہ پابندی لگانے کا کوئی مجاز تو نہیں رکھتا ۔ اپنی دانست میں ایک دن مجھ پہ ہنستی ہے میں نے عیب اس کا برا نہیں مانا تو آپ ہی کی ہنسی کا برا کیوں مان لوں لیکن دیکھئے آپ کا طرز عمل آئندہ بھی اگر یہی رہا تو پھر میرے لئے بڑی دشواری ہوگی !

" میں سمجھی نہیں کچھ " زاہدہ نے کہا ۔ اسے شک ہو رہا تھا کہ کہیں اسکا دماغ تو نہیں چل گیا ! ۔

" دشواری یہ ہوگی کہ پھر میں اسلم کے یہاں نہیں بیٹھ سکونگا محسن نے وضاحت کی وہاں نہ بیٹھونگا تو مجھے ادھار سگریٹ اور چائے نہ مل سکے گی، میں اس سے ادھار لیتا ہوں اور جب میرے پاس پیسے ہوتے ہیں تب ادا کرتا ہوں نہ وہ پہلے تقاضہ کرتا ہے اور نہ مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ ایسا پر خلوص ساتھی اور اتنا بڑا دل رکھنے والا آدمی اس پورے محلے میں اور کوئی نہیں ہے ! وہ مجھ سے چھوٹ جائے گا ۔

" تو میں اس راستے سے نکلنا چھوڑ دوں آپ یہی چاہتے ہیں نہ ؟ زاہدہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا ۔ !

بخدا نہیں بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ اب سے آپ میری آنکھوں کی طرف نہ دیکھیں ؛

" کیا بگڑ جاتا ہے آپ کا اگر کوئی دیکھ لیتا ہے ان آنکھوں کو اس نے ہنس کر محسن کی آنکھوں کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

" تو پھر مجھی کو سوچنا پڑیگا کہ کیا کروں محسن نے گویا خود اپنے کو مشورہ دیا ۔ شاید کالے شیشے کی عینک خریدنی پڑے ۔

" زاہدہ یہ سنکر بے اختیار کھلکھلا کے ہنس پڑی ـــــ اسکا نقرئی قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا اور محسن ایک جھنجلاہٹ کے ساتھ کمرے سے نکل گیا " آپ دیکھ لیجیے گا میں یہی کرونگا " یہ اس کے آخری الفاظ تھے ۔ اور زاہدہ پر جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا ۔ وہ اسی عالم میں چلائی خدا کے لئے خدا کے لئے ایسا نہ کیجیے گا ، انقلابی صاحب، بہت سے لوگ مر جائیں گے ۔ لیکن ہنسی کا دورہ بدستور جاری رہا نہ جانے کب تک اسکی ہنسی کا سیلاب رکا پڑا تھا اب جو بند ٹوٹا تو ہنسی رکنے کا نام نہ لیتی تھی ہنستے ہنستے آنکھیں رواں ہو گئیں، آنسو بہنے لگے اور وہ مسلسل رو رہی تھی

پھر ایک دن تمام محلہ حیرت زدہ رہ گیا زاہدہ نے جھٹ پٹ ساہیانہ بیاہ کر لیا کس سے ؛ محسن سے ! ـــــ سب حیران تھے کہ یہ کیا ہوا ، اگر محلہ پہ کوئی بم گرتا تو زیادہ سے زیادہ لوگ ہفتہ بھر چیختے چلاتے اور پھر چپ ہو جاتے مگر یہاں ایک سال سے بھی اوپر ہو گیا پھر بھی زبانیں بند نہ ہوئیں ! بوڑھوں نے کہا اچھا دیوانہ ملا ہے وہ لاٹے اور دیوانہ

بنائے گی۔ نوجوانوں نے حسد کی طرح ٹھنڈی سانس بھری، کنواریاں زاہدہ کی دانشمندی پر دنگ رہیں اور بڑی بوڑھیوں نے تبصرے کئے۔ دیکھ لینا یہ اک دن محسن کو بھی چھوڑ دے گی "——— ارے وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی پھرتی ہے مردار ——— جانے محسن کی عقل کو کیا ہوا اتنا پڑھا لکھا شریف لڑکا اس حرامزادی کے چکر میں کیسے پڑ گیا ———" ایک اور بڑی بی نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا "لے بوا دولت کا چکر ہی برا ہوتا ہے اس نے پچھلے پانچ خصموں سے خوب بٹورا بھی تو ہے، تم بھی کیا بات کرتی ہو بہن، ایک اور نے کہا اس لڑکے کو دولت کی ہوس ہوتی تو اچھی اچھی نوکریاں کیوں ٹھکراتا اس میں تو کچھ جادو ٹونے کا کھیل لگتا ہے، خدا محفوظ رکھے۔" اس شادی پر اگر کسی نے رائے زنی نہیں کی تو وہ صرف اسلم تھا حالانکہ اس شادی سے اس کو بڑا نقصان پہنچا تھا جس دن پہلی بار زاہدہ محسن کے ساتھ برقعہ میں گزری اسکے بعد سے لوگوں نے اسکی دکان پر جھگڑنا اٹھنا چھوڑ دیا ——— پھر بھی وہ بہت خوش تھا محسن البتہ اسکی دکان پر آتا تھا اور پہلے کا سگریٹ اور ڈبل چائے حسب معمول فرمائش کرکے پیتا تھا، حالانکہ اب وہ خاصہ بڑا پبلشر بن گیا تھا صاف ستھرا بھی رہنے لگا تھا۔ لیکن اسلم کو لیکچر دینا اس نے نہیں چھوڑا ——— محسن کو سامنے سے گزرتے دیکھکر اسلم چلایا ارے محسن بھائی محسن بھائی ڈبل چائے تو پیتے جاؤ۔ محسن کی شادی کو دو سال گزر چکے تھے اب انکے ایک بچی بھی تھی محسن اسے گود میں لئے ہوئے تھا۔!

لاؤ بے بی کو مجھے دو محسن بھائی اسلم نے بچی کو اپنی گود میں محبت سے لیتے ہوئے کہا۔

ڈبل چائے آگئی اور سگریٹ بھی، اسلم بار بار منہ کھولتا تھا کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر خاموش رہ جاتا تھا! آخر اس نے کہا محسن بھائی ایک ڈبل کی ڈبل چائے اور پیو۔

"نہیں اسلم۔ بس۔"

"قرآن قسم محسن صاحب اگر چائے نہیں پی تو اسلم کی لاش ہی دیکھو گے۔"

"اچھا بھئی یوں ہی سہی، لا، جلدی لا، محسن ہنس پڑا۔

محسن بھائی ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے۔ اسلم کو جب کوئی نصیحت کرنی ہوتی تھی تو وہ یوں ہی بولا کرتا تھا بڑے مسکین لہجے میں۔"

چائے کا گھونٹ اور سگریٹ کا تلخ دھواں ساتھ ساتھ نگلتے ہوئے محسن بولا، کہو، کہو تمہاری بات کا برا ماننا بچوں سے روٹھنے کے برابر ہے۔"

محسن بھائی یہ زاہدہ ہے ——— نا ——— اوہو معاف کرنا میرا مطلب ہے زاہدہ بھابی، تو انہوں نے آخر تم سے شادی کیوں کی! محسن کافی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ صرف اسلئے کہ میں نے کبھی اس کی جھوٹی تعریف نہیں کی اس کے پیشے کی ہمیشہ داد دی اور غلطی پر ہمیشہ ٹوکا میں نے یہ بات بھی اس کے دل میں بٹھا دی کہ آدمی کوئی کھلونا نہیں بلکہ انسان ہے بس وہ میرے سامنے جھک گئی۔ اور اسکی یہ شکست زندگی کی حقیقت کو پہچاننے کی علامت ہے ———

حضرت احسن مارہروی
(جانشین داغ)

شہر چھوٹا پاؤں ٹوٹے خانہ ویرانی ہوئی
جستجوئے یار میں کیا کیا پریشانی ہوئی

ابتدائے عشق میں سوچا نہ کچھ انجام کار
اب ہوئے رسوا تو کہتے ہیں کہ نادانی ہوئی

چرخ پر لعنت غلط معشوق پر الزام جھوٹ
خود محبت عاشقوں کی دشمن جانی ہوئی

جو بخار اٹھا دل سوزاں سے آنسو بن گیا
سرد مہری سے تمہاری آگ تک پانی ہوئی

اک مری تصویر رکھ چھوڑو بطور یادداشت
بھول جاتے ہو تم اکثر شکل پہچانی ہوئی

تیری آہ بے محل سے ہائے اے بے صبر دل
اسکی بدنامی ہوئی مجھ کو پشیمانی ہوئی

جان دے کر منزل الفت کو احسن طے کیا
میری مشکل کی بڑی مشکل سے آسانی ہوئی

حضرت جلیل مانکپوری
(جانشین امیر)

کھو کے دل میرا تمہیں ناحق پشیمانی ہوئی
تم سے نادانی ہوئی یا مجھ سے دانائی ہوئی

اللہ اللہ پھوٹ نکلا رنگ چاہت کا مری
زہر کھایا میں نے پوشاک آپ کی دھانی ہوئی

ہم کو ہو سکتا نہیں دھوکا ہجوم حشر میں
تیری صورت ہے ازل سے جانی پہچانی ہوئی

اے صبا میں اور کیا دوں قبر مجنوں کے لئے
خاک تھوڑی سی چڑھا دینا مری چھانی ہوئی

یار کے ہاتھوں ہوا جو کچھ ہوا اے تیغ ناز
تیری عریانی ہوئی یا میری قربانی ہوئی

کر گئی دیوانگی ہم کو بری ہر جرم سے
چاک دامانی سے اپنی پاک دامانی ہوئی

باڑھ دی بانکی اداؤں نے جو خنجر کو جلیل
ذبح کرنے میں مرے قاتل کو آسانی ہوئی

ثاقب کانپوری

شکایتِ سحر و شام ہم بھی رکھتے ہیں — نظر میں گردشِ ایام ہم بھی رکھتے ہیں

دیا تھا دار پہ منصور نے جو دنیا کو — نفس نفس میں وہ پیغام ہم بھی رکھتے ہیں

کبھی جو ساغرِ خیام میں تھا رخشندہ — وہ کیفِ دردِ تہِ جام ہم بھی رکھتے ہیں

ابھی سے ترکِ ستم کا خیال ہے تجھ کو — ابھی تو حسرتِ انجام ہم بھی رکھتے ہیں

کبھی ہمارے لئے بھی نقاب رخ سے اٹھا — نظر تو حسنِ لبِ بام ! ہم بھی رکھتے ہیں

چمن کو دیکھ لیں آزاد ہو کے پھر اک بار — یہ آرزو تو تہِ دام ، ہم بھی رکھتے ہیں

زمانہ ہم کو بھلائے گا کس طرح ثاقب
سخن وروں میں تو کچھ نام ہم بھی رکھتے ہیں

ہادی مچھلی شہری

کیا یہی حاصل محبت ہے — زندگی ناشناسِ راحت ہے
اشک آنکھوں میں ہی رہیں گے وہی — پھر ٹپکنے کی کیا ضرورت ہے
آدمی۔ آدمی کا خون پیئے — کیا یہی شانِ آدمیت ہے
تم اگر جاتے ہو۔ خدا حافظ — میرے دل کا سکوں بھی رخصت ہے
یہ وہ دُر ہائے اشک ہیں میرے — جن سے دامانِ دل کی زینت ہے
اپنے جور و کرم وہی سمجھیں — مصلحت کوش ہر طبیعت ہے
کون سمجھے گا حسن کے انداز — دل کی وارفتگی قیامت ہے
کیا یہی ہیں رسائیاں اسکی — دل گرفتارِ رنگ و صورت ہے
خوابِ ہستی سے لطف اٹھانے کو — چشمِ بیدار کی ضرورت ہے
حسن کی موشگافیوں کے لئے — میری چشم و نظر کی حاجت ہے
ان کا دل ہے میری نگاہ میں — مجھکو معلوم ان کی نیت ہے
کیوں بگولے سمیٹ لیں نہ اسے — منتشر میری خاکِ تربت ہے
بے خودِ عشق ہو کے پوچھتا ہوں — کون ہوں کیا میری حقیقت ہے
عشق میں دل ہے سب سے بے پروا — مجھکو حاصل بڑی فراغت ہے
بارِ شبنم بھی ہے گراں اس پر — ورقِ گل کی یہ نزاکت ہے
جسکو میں خود نہ آج تک سمجھا — میری ہادی عجب طبیعت ہے

حمید عظیم آبادی

کیا طواف جو حشمت مآب جام آیا
پڑھا درود جو پیرِ مغاں کا نام آیا
غمِ فراق کا رونا بھی اپنے کام آیا
جو آیا اشک وہ رحمت کا لے کے جام آیا
لحد میں کیسی صدائے جرس، کہاں محمل
شبِ فراق میں ہمدم رہی تو آہِ حزیں
وگرنہ کون مصیبت میں کس کے کام آیا
کسی کے ناوکِ مژگاں سے دل بچے کیونکر
ستم تو یہ ہے محبت کا لے کے نام آیا
ہر ایک موج میں فردوسِ نور ہے پنہاں
بہار کوثر و تسنیم لے کے جام آیا
اسی نے کھینچ دی تصویرِ یار آنکھوں میں
ہمیشہ میرا تصور ہی میرے کام آیا
ابھی تو داغِ جگر کی نہ لو تھی اتنی تیز
جلے کو اور جلانے چراغِ شام آیا
حمید جلوۂ ساقی ہے اور دیدۂ شوق
شعورِ بادہ پرستی ہی اپنے کام آیا

سیف حسن پوری

مرے شعور پہ کرتے ہو طنزِ بے خبری
خزاں کا نام ہے کیا فصلِ گل کی جلوہ گری

بڑھا دیئے ہیں ترے غم نے حوصلے دل کے
نہ آہِ نیم شبی ہے، نہ گریۂ سحری

تمہاری ذات سے رسوا ہوئی مسیحائی
ہم اہلِ درد نے کھائے فریبِ چارہ گری

شبِ سیہ میں نہ دیکھیں وہ کیوں فروغِ سحر
یہی جمالِ نظر ہے تو ہے شانِ دیدہ وری!

زمانہ چاہیے تکمیلِ عشق کو اے دوست
ابھی تو چاک جگر ہے رہینِ بخیہ گری

بھٹک رہا ہے اندھیرے میں کاروانِ حیات
نقابِ راہزنی ہے کمالِ راہبری

بلاکشانِ وفا کا بھی حق ہے کچھ تجھ پر
ادھر بھی اک نگہِ لطف، محوِ خود نگری!

شاہ منظور الرحمٰن اخترؔ کاکوی

بحرِ الفت ہے، ذرا گرداب و ساحل دیکھکر　　کوششِ پیہم کا اپنی یعنی حاصل دیکھکر

معرکہ تھا، کاش ہمت خود لگا لیتی پتا　　کیا ہُوا کُودے اگر دریا میں ساحل دیکھکر

وادیٔ عشق و محبت کی ہیں راہیں پُر خطر　　رہروانِ شوق، ہاں! منزل بہ منزل دیکھکر

دیکھنے کو خاص مجنوں ہی کی آنکھیں چاہئیں　　غیرِ مجنوں کیا کریں گے رنگِ محمل دیکھکر

پردہ اٹھے یا نہ اٹھے دونوں شانیں ایک ہیں　　کیا کریں گے شاہدِ فطرت کو جاہل دیکھکر

بے خودی اپنی خدا جانے کہاں لے جائیگی　　گو چلے تو ہیں نشانِ راہِ منزل دیکھکر

نکتہ پرور کس قدر ہیں اور کتنے ناشناس
شعر پڑھنا ہو تو اخترؔ رنگِ محفل دیکھکر

نظر حیدرآبادی

دلوں کے راز نظر سے بتائے جاتے ہیں
کہاں کے تیر کہاں آزمائے جاتے ہیں

جفا کہوں کہ اسے وعدۂ وفا کی ادا
نظر ملاتے نہیں، مسکرائے جاتے ہیں

اسی خیال میں ہر شام انتظار کٹی
وہ آرہے ہیں، وہ آئے، وہ آئے جاتے ہیں

بھریں گے خونِ تمنا سے ان میں رنگ دوام
ابھی تو شوق کے خاکے بنائے جاتے ہیں

اب ایسے جرم کی تردید کس طرح کرتے
جفائے زیست کی تہمت اٹھائے جاتے ہیں

مثالِ شمع زمانے میں صاحبانِ ہنر
جلا جلا کے سحر تک جلائے جاتے ہیں

بتا دیا ہے یہ اربابِ گلستاں نے ہمیں
بہار آئے تو کیا گل کھلائے جاتے ہیں

یہی ہے وادیٔ غربت تو اے ہجومِ بلا
سنبھالنا کہ قدم ڈگمگاتے جاتے ہیں

مسافرانِ شبِ تار کچھ بتاتے چلو
کہیں سحر کے بھی آثار پائے جاتے ہیں

نظر یہیں کہیں انوارِ صبح بھی ہوں گے
چراغ آخرِ شب جھلملاتے جاتے ہیں

نیرنگ نیازی

جفائے دوست نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا
حجاب اہلِ وفا کو بھی آئے ہیں کیا کیا

بنے ہوئے ہیں یہ اہلِ خرد بھی دیوانے
تری نگاہ نے جادو جگائے ہیں کیا کیا

تری نظر کے تصور میں آج پیمانے
لبوں تک آتے ہوئے تھرتھرائے ہیں کیا کیا

پڑی ہوئی ہے ستاروں کی روشنی پھیکی
ہمارے اشکِ الم جھلملائے ہیں کیا کیا

یہ چارہ ساز کرشمہ ہے تیری نظروں کا
کہ زخمہائے جگر مسکرائے ہیں کیا کیا

کبھی پیامِ الم ہے کبھی پیامِ نشاط
تری نظر نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا

مری نگاہ میں ہیں رنگ ان کی محفل کے
چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

کسے بتائیں کہ نیرنگ نے محبت میں
دلِ غریب پہ صدمے اٹھائے ہیں کیا کیا

محمد علی نشتر ایم۔ اے

ماورائے امتیازِ کعبہ و بتخانہ ہوں
میں کمالِ سوز و سازِ عشق کا افسانہ ہوں

دل نے پی ہے تیری آنکھوں سے وہ مینائے ازل
تا ابد اب بے نیازِ بادہ و پیمانہ ہوں

بے قرار و بے سکون و بیخود و آتش بجاں
میں ازل سے تیری شمعِ حسن کا پروانہ ہوں

جس سے پیدا ہو فضائے دو جہاں میں ارتعاش
ہم صفیرو وہ جنوں آہنگیٔ مستانہ ہوں

چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں کے بہت
میں جنوں سرمایہ و آوارۂ کاشانہ ہوں

جس سے ہیں معمور نیستر دو جہاں کی وسعتیں
بیخودیٔ عشق کا وہ نالۂ مستانہ ہوں۔

وفاؔ امتنوی

مری ہستی کو مرہونِ تمنا دیکھنے والے ادھر آ سامنے آ جانِ شیدا دیکھنے والے

نکل جائے مبادا یاں کوئی قیدِ ارادت سے نہ چھپ کے بیٹھ او ہستیٔ اشیاء دیکھنے والے

سمینِ دردِ الفت ہوں خراب آباد میں کب سے ادھر بھی اک نظر پنہان و پیدا دیکھنے والے

مجھے تسلیم ہے نبضِ دو عالم ہاتھ میں تیرے رگِ مجروح کو میری بھی دیکھا؟ دیکھنے والے

تماشاگاہِ ہستی میں تماشا بن تماشائی محیطِ ہر تماشا ہیں، تماشا دیکھنے والے

بلند اپنا مقامِ زندگی ہے سطحِ عالم سے یہی ابتک نہیں سمجھے، یہ دنیا دیکھنے والے

تڑپ کر رہ گئے چشمِ وفا میں ٹوٹتے تارے
مگر تم دیکھ پائے کب وہ نقشہ دیکھنے والے

حضرت احسن مارہروی

کتاب چور

اس مندرجہ عنوان سے ناظرین کو یہ دھوکا نہ ہو کہ اس کے تحت اس معمولی حریف کا ذکر ہوگا جو کسی نہ کسی بہانے سے اپنے دیکھنے یا اپنے پاس رکھنے یا بیچ ڈالنے کے لئے پرائی کتابیں چرالے جاتا ہے۔ یہاں اس قسم کے بانی کارچور کا تاریخی واقعہ لکھا جاتا ہے جس کی انتہائی کمند فگنی کا نقشہ کسی پھنسے ہوئے شاعر نے یوں کھینچا ہے:۔

دزدے کہ گلیم را بدزدد ۔ در کعبہ حلیم را بدزدد
برقافلہ دست رس چو یابد ۔ رحمان ورحیم را بدزدد

نقب زنی، قفل شکنی، جیب تراشی، یہ سب عوام ورذائل کے طریقے وخصائل ہیں۔ عمائد وخواص میں بری خصلتیں ان صورتوں میں جلوہ گر نہیں ہوتیں۔ ڈاکو، اچکے، بٹ مار، رذالت اخلاق کے اثر سے اتنے دلیر نہیں ہوتے جس قدر یہ شیران قالین اپنی جسارت کی میخیں جمائے ہوئے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دزدان معروف کی وارداتیں رات کی خواب آور کہانی سے زیادہ دیرپا نہیں ہوتیں اور ان سارقان مجہول الحال کے واقعات نقش فی الحجر بنے رہتے ہیں۔ ایک علم دوست کو اپنے مرتب کتب خانہ کی سجی ہوئی کتابوں میں سے کسی کتاب کے ضائع ہو جانے کا ضرور رنج ہوتا ہے مگر نہ اتنا جتنا کہ ایک مصنف کو اپنے جیتے جی اپنی تصنیف کا دوسرے کے نام سے منسوب ہوتے ہوئے دیکھ کر ہوتا ہے۔ یہ دلیری وجسارت گذشتہ زمانہ کے لئے ہی مخصوص نہ تھی بلکہ اب بھی بکثرت ایسا ہو رہا ہے چنانچہ اس پیشے کی ترقی دیکھتے ہوئے نیز خود صاحب کے تقاضائے مضمون پر مجھے ہوش آیا کہ اگر موجودہ مصنفین اور غربائے تحریر کو ایک تاریخی واقعے کی خبر دے کر چونکا دیا جائے تو اس سے بہتر کوئی تحقیقی (RESEARCH) مضمون نہ ہوگا۔

حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نام نامی سے تمام اہل علم آگاہ ہیں۔ نیز ان کی تصانیف منثور سے بھی اکثر اہل نظر نا واقف نہیں ہیں۔ ان کی مصنفات میں متعدد مفید و نایاب کتابیں اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ انہیں میں ایک تذکرہ "ید بیضا" ہے جو فن تاریخ میں موصوف کی پہلی تالیف ہے اس کے متعلق جو واقعہ پیش آیا ہے تذکرے کی ترتیب دوم کے آخر میں خود جناب آزاد نے قلمبند کر دیا ہے۔

اگرچہ فارسی انشا پردازی کا لطف اردو ترجمے کی نقل میں نہیں آسکتا مگر فارسی کی کساد بازاری دیکھتے ہوئے عام ناظرین کی سہولت کے لئے مطلب خیز ترجمہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میر آزاد لکھتے ہیں:۔

"چار سال سے زیادہ قیام سیوستان کے زمانے میں اکثر اوقات کتب تواریخ اور دواوین شعراء کے مطالعے کا مشغلہ رہتا تھا۔ اسی مشغلہ میں خیال آیا کہ ایسا تذکرہ شعرا لکھا جائے جو متقدمین و متاخرین کے احوال واشعار پر حاوی ہو۔ چنانچہ منتخب دواوین معتبر کتب اور متعدد مجموعوں سے ۱۱۴۸ھ میں ایک تذکرہ شعرا مرتب ہو کر تمام ہو گیا۔ اہل سیوستان نے اس نسخہ کی متعدد نقلیں لے لیں اور ایک

شخص اس کی نقل دلّی بھی لے گیا اور جب کہ میں ہندوستان سے واپس ہوتے ہوئے فیروزآباد پہنچا تو محمد نصیر اللہ متخلص بہ آفریں لاہوری نے بخواہش تمام ایک نسخہ مجھ سے لے لیا۔ الہ آباد پہنچنے کے بعد اس تالیف کے لئے تازہ مواد بہم پہنچانا چاہا پہلے نسخے کو منسوخ کر کے دوسرا نسخہ مرتب کرنا پڑا اور ۱۲۳۰ھ میں یہ کام تمام ہوا جس کا قطعہ تاریخ اس طرح کہا گیا۔

این چہ سواد بیست کہ ہر حرف او ÷ لمعۂ اعجاز سخن وا نمود ÷ مصرع تاریخ رقم زد خرد ÷ طبع کلیم ید بیضا نمود (۱۲۳۰ھ)

ان دونوں نسخوں کی تالیف کا حال نسخۂ آخر کے دیباچہ میں لکھ دیا گیا ہے۔ الغرض اس نسخے کے تمام ہو جانے کے بعد تقریباً دو سال تک کبھی الہ آباد اور کبھی بلگرام میں میرا قیام رہا اور انہیں دنوں میں کم و بیش دس نقلیں عزیز دوستوں نے حاصل کیں اور جا بجا لے گئے۔ اس کے بعد میں نے حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔ بعد واپسی حرمین شریفین، زمانۂ قیام اورنگ آباد دکن میں میر محمد یوسف دکنی کا ذکر پہلے کے خاتمے پر ہے) کا خط ۲۴ رمضان المبارک ۱۲۳۰ھ کا لکھا ہوا بلگرام سے آیا جس میں تحریر تھا کہ "میرے حرمین شریفین جانے کے بعد ایک بنارسی شخص نے میدان خالی پاکر تذکرے کو اپنے نام سے موسوم کر دیا اور جہاں کہیں اس گمنام کا نام اور ذکر تھا اس کو نکال دیا اور اس طرح اس کی نقلیں جا بجا بھیج دیں۔ حدیث صحیح کا یہ مفہوم ہے کہ منافق تین علامتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک اس وقت جب کہ اس کا جھوٹ ظاہر ہو۔ دوسرے جب کہ وہ وعدہ خلافی کرے تیسرے اس حالت میں کہ خیانت اختیار کرے۔ نیز حدیث میں آیا ہے کہ علم کی خیانت، خیانت مال سے شدید تر ہے۔ بے شک خیانت مال کی سزا قطع ید ہے اور خیانت علم کی سزا قطع ایادی۔ یعنی خدا کی بے انتہا نعمتوں اور الطاف و نوازشوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ جو کام یہود و نصاریٰ نے بذریعہ تحریف ہمارے جد امجد کی کتاب کے ساتھ کیا وہی اس عزیز نے ہماری کتاب کے لئے عمل کیا۔ بے شک مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ معاذ اللہ دیدہ و دانستہ فرقۂ محرفین میں اپنے آپ کو داخل کیا اور ابدی طوق لعنت اپنے گلے میں ڈالا۔

عجیب تر یہ ہے کہ فقیر نے جو نقول و حکایات نادر اور نایاب تصنیفات و تالیفات سے نقل کی تھیں ان سب کو اپنی تحقیق قرار دیا۔ گویا ان کی سیر بچشم خود اس نے کی ہے۔ حالانکہ وہ بے بصر ان مصنفات سے باخبر نہیں اور بالفرض بعض نسخوں کو دیکھا بھی ہو تو بہت سی نادر کتابیں ایسی ہیں جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہوں گی اور پھر بعد تحصیل زیارت حرمین شریفین اور ہندوستان کی واپسی کے بعد بعض نیا مواد ہاتھ آیا۔ اور بہت سے فوائد چن چن کر بعض اعزۂ وطن کے پاس بھیجے گئے تاکہ وہ تذکرہ میں داخل کریں اور اس کے بعد بھی بشرط حیات بہت سے فوائد ہاتھ آئیں گے اور شامل ہوتے رہیں گے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ یہ ایک طریقہ منقول و مقبول ہے یعنی جب تک مصنف زندہ ہے تصنیف ناتمام ہے۔ چنانچہ مؤلف قاموس نے بتدریج وقتاً فوقتاً بہت سے اضافے مدتوں تک اپنے لغت میں کئے ہیں یہی سبب ہے کہ قاموس کے مختلف نسخوں میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ الحاصل اصول الحاقات سے قطع نظر کر کے سارق بنارسی سے تذکرے کے مجموعی اصول کی بابت اگر پوچھا جائے تو ساری قلعی کھل جائے اور اس کی فضیحت ظاہر ہو جائے خود اس کی زبان بفحوائے لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (ہم کو کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے سکھایا) اور بمقتضائے اَلْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ (اب تو ظاہر ہو ہی گئی حق بات) گویا ہو جائے۔ یہ عزیز قاطع الطریق نئی قسم کی جسارت رکھتا ہے کہ مصنف کے عین حیات بغاوت کرتا ہے اور باوجود شہرت مصنف اور اشاعت کتاب اپنی رسوائی کا خیال بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ ع چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد یقینی ہے کہ یہ عزیز بے تمیز لباس استعداد سے برہنہ ہے کیونکہ کسی کے مال کا چرا لینا چور کے لئے خود فراموشی کا سرمایہ ہوتا ہے۔

مہر نیمروز

نومبر ۱۹۶۰ء

جلد نمبر ۹ — شمارہ نمبر ۱۰، ۱۱

قیمت

سالانہ	چھ روپے
ششماہی	تین روپے بارہ آنے
فی پرچہ	آٹھ آنے (۸/)

پتہ

نمبر ۲۰۲ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی - ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی ۵

دفتر رسالہ مہر نیمروز [illegible]

اس شمارے میں

حسن علی معدی۔ ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے انجمن پریس میں چھپا کر [illegible] بہار ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵ سے شائع کیا

پیھائی کون

عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

چکبست نے کہا تھا ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب　　موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

لیکن اس سے بھی زیادہ سچی بات یہ ہے کہ زندگی اضطراب پیہم کا نام ہے، یہ اضطراب جب ختم ہو جاتا ہے ساکت و صامت ہو جاتا ہے، سکون پا لیتا ہے تو ہم اسے موت یا نیستی یا عدم سے تعبیر کرتے ہیں

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست　　ما زندہ از آنیم کہ آرام نگیریم

موج کی یہ بیقراری و بیتابی کسی محبوب کی تلاش و جستجو کا ایک عالم ہے، کوئی ہے جس کی طلب میں یہ موج، یہ ریگ صحرا، یہ غنچہ و گل، یہ ماہ و انجم، سب کے سب رواں دواں اور سرگرداں ہیں ——— وہ کون ہے جس کا ایک التفات پنہاں بھی آسودگی فراواں کی نعمت بخش دیتا ہے اور ساری بیقراریاں خاموش ہو جاتی ہیں سکوت و سکون کی انتہاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہیں، ساکت و صامت ہو جاتی ہیں۔ جگر "کوہ دوست" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

دل کو سکون روح کو آرام آ گیا　　موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا

دنیا میں کوئی موج ایسی نہیں جو ہمیشہ رہنے والی ہو۔ ایک نہ ایک دن ہر موج کو تھمنا ہے، اور ہر بیقراری کو قرار ضرور آتا ہے جب بھی آ جائے۔ بظاہر اسکی آمد کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ حضرت جگر بھی دریائے وجود کی ایک موج بیتاب تھے، پیمانہ روز و شب سے ناپئے تو یہ موج ستر سال بیقرار رہی، اور یہ خبر ۱۰ ستمبر سنہ ۶۰ء نے سنائی کہ جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر ؎

"عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا"

ہم بیقراری سے مانوس تھے اور "قرار" سے کم آشنا۔ اس لئے قطرۃً اس خبر سے ایک دھچکا لگا اور دل بیٹھ سا گیا کہ بیقراروں کی محفل تغزل سے فرقہ عشق و عاشقی کا امام اٹھ گیا۔ قریبی دور میں مولانا حسرت موہانی، اصغر، فانی اور جگر کے تغزل نے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی تھی۔ حسرت، اصغر اور فانی پہلے ہی اٹھ چکے تھے اب جگر نے بھی کوچ کیا۔

شور برپا ہے غزل خوانوں میں

اہل نظر جانتے ہیں کہ اردو شاعری میں غزل کا مرتبہ کیا ہے، غزل اگرچہ بہت سے لوگ کہتے ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بہت سے شعراء اچھی غزلیں بھی کہہ لیتے ہیں لیکن غزل کہنا بظاہر جتنا آسان کام نظر آتا ہے اتنا آسان ہے نہیں، اردو شاعری کی ابتدا بھی غزل ہی سے ہوتی ہے اور انتہائے کمال کے جوہر بھی غزل ہی میں کھلتے ہیں جہاں خیالات و افکار کے بے پایاں طوفان اور بے پناہ [illegible] کے لئے صرف دو مصرعوں یعنی چند لفظوں کی وسعت ملتی ہو۔ وہ بھی علم حساب کے نازک قواعد [illegible] عروض اور ردیف و قوافی کا پابند ——— تو وہاں کسی مکمل بات کو بھرپور [illegible] اور [illegible] کی [illegible] پہنچا دینے [illegible] سے کہہ جاتا، واقعی بڑا مشکل کام ہے۔

جگر ہمارے دور کے بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے غزلگو تھے بلکہ حسرت کے بعد غالباً سب سے بڑے ان کو خدا نے یہ ملکہ عطا کیا تھا کہ چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں سادگی سلاست اور روانی کے ساتھ وہ سب کچھ کہہ جاتے تھے جو اوروں سے پورے پورے صفحات میں بھی اتنی خوش اسلوبی سے ادا نہ ہو سکیں۔ دریا کو حسن کے ساتھ کوزے میں بند کرنے ہی کا نام غزلگوئی ہے،

پھر ایسے شعراء بھی شاذ و نادر ہی نکلیں گے جو اپنے کلام کے علاوہ اپنے اعمال میں بھی دوسروں کے لئے اچھا نمونہ ہو سکیں جیسے مولانا حسرت کہ ان کی گفتار بھی نمونۂ تقلید ہے اور کردار بھی۔ یہ صفت۔ آخری دور میں جگر میں بھی پیدا ہو گئی تھی،

وہ بحیثیت دوست بڑے شریف دوست اور بحیثیت مسلمان بڑے اچھے مسلمان تھے اور اس طرح صحیح معنوں میں انسان تھے سراپا اخلاص و محبت بلکہ (خود انہیں کی زبان میں) سراپا عشق، اور عشق کے بارے میں ان کو بھی پورا پورا احساس تھا کہ وہ لازوال ہے، اسی لئے کہا تھا کہ

زندہ ہی رہے گی ہستئ عشق　　　مر کے یہ بھی مر نہ جائیں گے ہم

انہوں نے اردو زبان کو اچھے اچھے اشعار، مترنم آہنگ، خوشنما ترکیبیں اور دلنشیں اسالیب بیان عطا کئے ہیں، وہ مایہ دار فن تھے اور لیلائے غزل کے دیوانے ؎

قیس و فرہاد ہوں یا سرمد منصور جگر
ہم نے بے مایہ نہ دیکھا کسی دیوانے کو

ان کے فن میں فکر کی بڑی لطیف آمیزش تھی، ان کے اشعار میں بڑے زندہ اور جیتے جاگتے نکتے ملتے ہیں، ان کی قلب و روح میں ایک عجیب ہمواری ایک لطیف ہم آہنگی پائی جاتی ہے [illegible] آتا ہی اثر بھی ظاہر ہے کہ وہ ایک مدت دراز کی مشق و ریاضت اور محنت و جاں فشانی کے بعد اس منزل تک [illegible] ہم سے ہمیشہ کے لئے ہم بیقراروں سے بچھڑ گئے۔ باور نہیں آتا کہ وہ سچ مچ چل بسے، ان کی موت بھی اپنے اندر زندگی کی ایک ادا رکھتی ہے

چندریگر

زخم جگر ابھی ہرا ہی تھا کہ ایک اور زخم لگا۔ علمی اور ملی حلقے کا ایک اور نامور اٹھ گیا، پاکستان کی قانونی اور سیاسی مجلس کا ایک ممتاز و محبوب فرد ——— اسمٰعیل ابراہیم چندریگر۔

عجب اتفاق ہے کہ آزادی کی تحریک میں اسمٰعیل نام کی متعدد شخصیتیں مختلف گوشوں سے ابھر رہی تھیں قریب قریب ایک سرسری نگاہ ڈالئے: نواب محمد اسمٰعیل خاں (یوپی) نواب محمد اسماعیل حسین (بہار) اسمٰعیل ابراہیم چندریگر (بمبئی) مسٹر محمد اسمٰعیل (مدراس) اور محمد اسمٰعیل تابش (بنگلور) وغیرہ کئی نام ایک ساتھ سامنے آجاتے ہیں، یہ سب اپنے اپنے امتیازی مناصب اور خدمات کے علاوہ مجلس ملی (آل انڈیا مسلم لیگ کونسل) کے سرگرم ارکان تھے۔

نواب محمد اسمٰعیل خاں اور نواب محمد اسمٰعیل حسین پہلے رخصت ہو چکے تھے اب اسمٰعیل ابراہیم چندریگر نے بھی الوداع کہی۔

چندریگر بمبئی کے نامی گرامی بیرسٹر اور ایک تجارت کار خاندان کے ممتاز فرد تھے نہایت خاموش، سنجیدہ، متین اور مفکر آدمی ——— قائداعظم کی رہنمائی میں برعظیم کی جو سرگرم عمل شخصیتیں ایک مرکز پر تھیں، سیاسی پلیٹ فارم پر ان کے جوہر کھلے، اور واقعی جن لوگوں نے قومی زندگی کے نازک ترین مرحلوں پر گتھیاں سلجھائیں اور خدمات جلیلہ انجام دیں، ان میں ایک نام چندریگر کا بھی ہے اور اپنی حیثیت سے بہت نمایاں رہے۔ ایک مرتبہ کانگرس اور مسلم لیگ کی سیاسی زور آزمائی ریاست راجکوٹ کے محاذ پر بھی ہوئی تھی، اور اس محاذ کو سر کرنے کے لئے گاندھی جی نے اپنی تمام تر قوتیں ایک ساتھ استعمال کر لی تھیں، بہ نفس نفیس راجکوٹ جا کر بیٹھ گئے تھے۔ اس موقع پر مسلم لیگ کی طرف سے لڑنے کے لئے قائداعظم نے چندریگر کو منتخب کیا تھا ——— اور تاریخ سیاست بتاتی ہے کہ جب معرکہ ختم ہوا تو اس میں جیتنے والے کا نام اسمٰعیل ابراہیم چندریگر تھا۔

تقسیم سے پہلے جب عارضی حکومت قائم ہوئی تھی تو اس میں چندریگر کامرس کے وزیر بنائے گئے تھے اور جب پاکستان قائم ہوا تو اسکی مرکزی کابینہ میں بھی شامل ہوئے۔ انہوں نے تجارت اور قانون کی وزارت کے علاوہ گورنری کی خدمات بھی انجام دیں اور سفارت کی خدمات بھی اور پھر وزارت عظمیٰ کے منصب پر بھی فائز ہوئے وہ مسلم لیگ کے رکن رکین تھے اور اپنے اصول میں پختہ تھے۔ تحریک پاکستان کے ابتدائی کارکنوں میں سے تھے، اور تحریک کے نشیب و فراز پر ان کی نظر گہری تھی، اب ان کے وسیع النظر ساتھیوں میں گنتی کے چند ہی افراد باقی رہ گئے ہیں، ان کی وفات سے تحریک پاکستان کے سربرآوردہ معتمدانِ قوم کا ایک اور فرد اٹھ گیا، انا للہ۔

چندریگر مشہور و معروف شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ انتقال لندن میں ہوا۔ اور شہر کراچی میں آسودۂ خاک ہوئے ——— ع

زندگی ہے خواب اجل تعبیر خواب

مدیر

تاریخ ساز

قائد اعظم کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمانانِ برِ عظیم کے منتشر مسلمانوں کی تنظیم، مسلم قومیت کی خصوصیت و امتیاز پر اصرار اور قیام پاکستان ہے۔ ایک مرتبہ جب کہ بنگلور کے اسٹیشن پر جب وہاں کے زعما ان کو رخصت کرنے کے لئے جمع تھے ایک صاحب نے ان سے یہ سوال کیا کہ "سنا ہے آپ کلم انڈیا کی تاریخ لکھ رہے ہیں؟" ــــ تو انہوں نے بہت مختصر لیکن بہت اہم جواب دیا تھا۔ "ہم تاریخ بنا رہے ہیں، آپ تاریخ بنا رہے ہیں، آنے والے لکھیں گے۔" واقعی انہوں نے اور ان کی قیادت میں برِ عظیم کے مسلمانوں نے اپنی قومیت کے شعور اور اتحاد و تنظیم کی قوت سے ایک تاریخ بنا کے رکھ دی اب لکھی جانے والی تاریخ آنے والے مؤرخ ہی لکھیں گے۔

تاریخ بنانے کی اس مہم میں قائد اعظم کے ذہن و فکر کا رخ کیا تھا؟ وہ کس انداز سے سوچتے تھے؟ انہوں نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی کہ ہم کتاب اٹھا کر دیکھ لیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ نہ چھوڑا ہو ان کی لمبی لمبی تقریریں ہیں، بیانات ہیں، پیغامات ہیں جن میں ان کے ذہن و فکر کی جھلکیاں صاف نظر آ سکتی ہیں اور ان کو آسانی سے سمیٹا جا سکتا ہے۔

قائد اعظم کی ایک بڑی خصوصیت اور غالباً سب سے بڑی یہ تھی کہ وہ اپنے نقطے سے کبھی نہیں ہٹے۔ انہوں نے جب بڑے آدمی بننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو ان کے سامنے گوکھلے کا نمونہ تھا لیکن ان کی یہ شرط بھی قابلِ توجہ ہے کہ "مسلم گوکھلے بنوں گا"۔ وہ اس دور میں گوکھلے کے خلوص، وسعت قلب اور صاف گوئی سے بہت متأثر تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں گوکھلے اور تلک ہندوؤں میں بہت مقبول اور مشہور لیڈر تھے تلک کا اثر ان کے دل پر بالکل نہیں تھا کہ [illegible]

قائد اعظم کی تقریروں میں شروع سے آخر دم تک ایک چیز پوری وضاحت کے ساتھ نظر آتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر پکے مسلم تھے۔ اقبال کی تمام صفات میں بھی جو چیز ان کو سب سے زیادہ پسند آئی اور جس کی وہ خصوصیت کے ساتھ تحسین کرتے تھے وہ یہی ہے کہ "اقبال اول مسلم اور آخر مسلم تھے وہ صرف تحسین ہی نہیں کرتے بلکہ فلسفی دوست اور رہبر بھی ان کو کہتے ہیں۔ یہ غالباً تحسین کی انتہا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا مظہر الحق اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ ان کے ہمعصروں میں ہیں اور ان سے اختلاف بھی بہت ہوا لیکن یہ اختلاف پالیسی ہی پر ہوا، مقصد پر کبھی نہ ہوا۔ اس کے برخلاف گاندھی جی سے ان کا اختلاف پالیسی کا نہیں مقصد اور نصب العین کا تھا اور یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم چونکہ اپنے نصب العین کو نصب العین سمجھتے تھے اس لئے فطرتاً ان میں لچک نہیں تھی اور اسی کو ان کے مخالفین ضد اور ہٹ دھرمی کا نام دیتے تھے۔ قائد اعظم کی رائے میں جو شخص ہر معاملے میں مفاہمت پر آمادہ ہو جاتا ہے وہ حقیقت کسی نصب العین کا قائل نہیں ہوتا اور قابلِ اعتماد بھی نہیں ہوتا۔

قائد اعظم کا نصب العین اور اس کا تجزیہ ایک مستقل اور دلکش عنوان ہے لیکن اس عنوان پر قلم اٹھانے کے لئے بہت ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے برِ عظیم کی حکومت میں ان کو وزیر اعظم بنا لینے کی پیش کش کچھ معمولی نہ تھی مگر وہ اس کو ٹھکرا چکے تھے ملت اسلامیہ کے شملہ بے کلاہ وہ پہلے ہی تھے پاکستان بنا تو اس کے گورنر جنرل بھی ہوئے جو نئے ملک کا سب سے بڑا عہدہ تھا لیکن وہ اس پر بھی قانع نہیں تھے گورنر جنرل بن چکنے کے بعد انہوں نے مکتوب شکستہ میں

لیکن میکالے کو یہ بات سوجھی، اور میکالے سے لے کر پروفیسر لاسکی تک ذہن۔ کے جانشین بھیر ایطلی ہیں۔ اس بنیادی طریق کار کا سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹا۔ ان کی تحریریں شاہد ہیں، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ بھیر ایطلی اپنی قومی پالیسی کی بنیادی لائن سے ہٹ جاتے۔

یہ طویل جملہ معترضہ زبان قلم پر آہی گیا تو ہم نے بھی اسے روکا نہیں کیونکہ یہ بات بہرحال قابل توجہ ہے، یہ بات قائداعظم کے تذکرے میں نہ آتی، کسی دوسرے موقع پر آتی مگر آتی ضرور، اور اسے سامنے آنا چاہیئے، قائداعظم سے بھی مغرب کو وہی اندیشہ لاحق تھا جو اقبال سے تھا یا ان جیسی دوسری شخصیتوں سے رہا ہے اس لئے قائداعظم کے بیانات وخیالات یا ان کی شخصیت کو اور ان کے غیر معمولی اثر کو جراحت پہنچانے کی "ضرورت" بالکل واضح ہے۔

آپ ذیل میں قائداعظم کی تقریروں کی چند جھلکیاں اپنے سامنے رکھئے۔ غور کیجئے اور اس تسلسل کو بھی دیکھئے کہ ایک ہی بات کس کس طرح ان کی زبان پر جاری ہوتی۔

اسلام

"اہل برطانیہ ہیں تو مسیحی لیکن بعض اوقات خود اپنی تاریخ کی مذہبی جنگوں کو بھول جاتے ہیں اور اب یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک نجی اور شخصی معاملہ ہے۔ یہ صورت ہندوازم اور اسلام میں کبھی نہیں ہوسکتی، کیونکہ یہ دونوں مذاہب قطعاً واضح قسم کے نظام اجتماعی (سوشیل آرڈر) ہیں۔ اور بندے اور خدا کے روابط کا اتنا انتظام نہیں کرتے جتنا بندے اور بندے کے تعلقات کا نظم کرتے ہیں یہ دونوں نہ صرف انسانی قانون اور تہذیب کا نظم کرتے ہیں بلکہ سماجی زندگی کے ایک ایک پہلو پر حاوی ہیں" (سنہ ۱۹۴۱ء)

نظام اجتماعی

"اس کا اندازہ لگانا بڑا دشوار ہے کہ ہمارے ہندو دوست اسلام اور ہندوازم کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہیں۔ اسلام اور ہندوازم لفظ مذہب کے محدود معنوں میں "ریلیجن" نہیں ہیں، بلکہ حق تو یہ ہے کہ یہ دونوں بالکل مختلف اور جداگانہ نظام اجتماعی ہیں" (اجلاس لاہور سنہ ۱۹۴۰ء)

اسلام اور جمہوریت

"جہاں تک میں نے اسلام کو سمجھا ہے، وہ کسی ایسی جمہوریت کی وکالت نہیں کرتا جو غیر مسلمانوں کی اکثریت کو مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی اجازت دیتی ہو۔ مجموعی طور پر دیکھئے تو خود جمہوریت کے بھی مختلف نمونے مغربی ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔" (علیگڑھ سنہ ۱۹۴۱ء)

جمہوریت کی حقیقت

"آیئے دیکھیں کہ خود یورپ میں جمہوریت کا مفہوم کیا ہے تب ہی ہم سمجھ سکیں گے کہ ہندوستان میں اس کا مطلب کیا ہوگا (بقول ایچ جی ویلز اور سالوبیڈ ڈی میڈریگا) جمہوریت کے پردے میں دراصل ارسٹوکریسی قائم ہے۔ وہ تمام طالب طبقے حکمرانی کر رہے ہیں۔ پھر بھی جمہوریت اگر مغربی ممالک میں یا بالخصوص انگلستان میں کسی قابل التفات حد تک کامیاب ہے تو اس کا سبب کچھ خصوصی حالات ہیں جمہوریت اسی ملک میں چل سکتی ہے جہاں ایک نیشن اور ایک سوسائٹی ہو۔ اہل انگلستان صحیح معنوں میں ایک نیشن ہیں۔ زندگی کے بنیادی مسائل اور معاملات کے بارے میں ان کے تصورات ایک ہیں۔ مگر اس قسم کی محلول جمہوریت بھی جو ہم انگلستان میں پاتے ہیں دنیا کے ہر اس ملک میں نامانوس ہے جہاں دو قومیں اور دو سوسائٹیاں آباد ہوں۔" (علیگڑھ سنہ ۱۹۴۳ء)

ایک فریب

"برطانوی مدبرین جانتے ہیں کہ نام نہاد جمہوریت اور حکومت کا پارلیمانی نظام اس ملک میں ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں، بات یہ نہیں ہے جیساکہ بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مسلمان گویا کسی ایسی حکومت کے قیام کا راستہ روک رہے ہیں جس کی بنیاد انسانی برادری پر ہو۔ یہ تو الزام ہے اور اس قسم کا الزام وہی لوگ رکھتے ہیں جو اسلام یا جمہوریت کی گفتگو تو کرتے ہیں مگر یہ بالکل نہیں جانتے کہ وہ کس چیز کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں، جمہوریت کا پہلا مطلب اکثریت کی حکمرانی ہے، اکثریت کی حکمرانی کسی واحد قوم (نیشن) اور واحد معاشرے ہی میں قابل فہم ہے، اگرچہ وہاں بھی وہ ناکام ہی رہی" (اجلاس مدراس سنہ ۱۹۴۱ء)

ہمارا مذہب

مسٹر کے ایم منشی کا شاید یہ خیال ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ چھوت چھات کے تصور سے تو صرف انہیں کا مذہب اور انہیں کا فلسفہ آشنا ہے، ہمارا نہیں۔ اسلام علمبردار ہے انصاف کا، عدل کا، مساوات کا، رواداری کا، بلکہ اُن غیر مسلموں کے ساتھ وسیع القلبی اور فیاضی کا جو اس کی حفاظت اور ذمہ داری میں آگئے ہوں۔ یہ لوگ ہمارے بھائیوں کی طرح ہیں اور اسٹیٹ کے شہری ہوں گے۔" (علی گڑھ نومبر ۱۹۴۱ء)

سب سے بڑی اتھارٹی

اسلام نے ہم پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ بنی نوع انسان کو مساوی سمجھیں، اس لئے ہندو اور دوسری قوموں کے ساتھ پاکستان میں عدل و انصاف کا سلوک کیا جائے گا۔ بلکہ فیاضی کا۔ اور یہی تصور ہر ذمہ دار مسلمان کا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ یہی حکم ہے ہم کو سب سے بڑی اتھارٹی، یعنی قرآن مجید اور رسول خدا کا۔ (بنام گاندھی جی ۱۹۴۲ء)

عدل و انصاف کا حکم

ان قوموں کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ اُن احکام کے مطابق جو سب سے بڑی اتھارٹی یعنی قرآن مجید کے ہیں کہ اقلیت کے ساتھ لازمی طور پر عدل و انصاف کا سلوک کیا جائے۔ (پنجاب لیگ کانفرنس ۱۹۴۳ء)

ہماری قومیت

ہم دس کروڑ کی ایک قوم ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے کہ ہم ایسی قوم ہیں جس کی تہذیب و تمدن، زبان و ادب، آرٹ اور آرکیٹکچر، نام اور اصول تسمیہ، اقدار و تناسب کا شعور، ضوابط قانونی اور نظام اخلاقی، رواج اور تقویم، تاریخ اور روایات، صلاحیت و استعداد اور اولوالعزمی کی منزل و مراد، غرض ایک ایک چیز امتیازی ہے اور مختصر یہ ہے کہ زندگی کے بارے میں ہمارا زاویۂ نظر قطعاً جداگانہ ہے، اس کو دیکھنے کا بھی اور برتنے کا بھی۔ ـــ بین الاقوامی قانون کے جس معیار سے بھی دیکھا جائے ہم واقعی ایک علیحدہ قوم ہیں

نشاۃ ثانیہ

ہم لوگ دس کروڑ کی ایک قوم ہیں جو اس برعظیم میں آباد ہیں۔ ہماری ایک عظیم تاریخ اور شاندار ماضی ہے، ہمیں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنا ہے اور صحیح معنوں میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو بروئے عمل لانا ہے اس کی عظمت و شوکت کو از سر نو تازہ کرنا ہے۔

(پیغام عید ۱۹۴۳ء)

بنیادی پتھر

وہ کیا چیز تھی جس نے مسلمانوں کو فرد واحد کی صورت میں متحد کر رکھا تھا؟ وہ کونسی شے ہے جس کی حیثیت قوم کے لئے بنیادی پتھر کی ہے۔ صرف اسلام اور یہ عظیم کتاب قرآن مجید جو اسلامیان برعظیم کے سفینے کا لنگر ہے مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہماری وحدت اور زیادہ مستحکم ہوتی جائے گی ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک قوم۔ (اجلاس کراچی ۱۹۴۳ء)

ہمارا عہد

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم اس عہد کا اعلان کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمہاری اقلیتوں کے ساتھ صرف وہی سلوک نہیں کریں گے۔ جو کسی مہذب حکومت کو کرنا چاہیئے۔ ہمارا سلوک تو اس سے بھی بہتر ہوگا۔ اس لئے کہ قرآن مجید نے ہم کو یہی حکم دیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔ (اسلامیہ کالج بمبئی [illegible])

اپنے آپ کو سمجھو

ہمارا اپنے آپ کو مضبوط کرنا، یعنی پورے تو پاکستان کی سرحد کو مستحکم کرنا ہے۔ یہ بات ہمیں اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے قابل بھی بنائے گی۔ اور اسی سے ہم اس قابل بھی ہوں گے کہ حصول کے بعد اپنی آزادی، عزت، وقار اور اس شوکت اسلامی کو قائم رکھیں جس کی خاطر آج مصروف جنگ ہیں۔ آپ مجھ سے پیغام مانگتے ہیں۔ میں آپ کو اور کیا پیغام دوں۔ وہ عظیم ترین پیغام ہماری رہنمائی اور ہدایت کے لئے ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے ـــ قرآن! اب ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ اپنے آپ کو سمجھیں اور ان عظیم خوبیوں اور صلاحیتوں اور قوتوں کو پہچانیں جو ہمارے اندر چھپی ہوئی ہیں۔" (مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن صوبہ سرحد ۱۹۴۳ء)

ہمارے عزائم

سیاسی طور پر پاکستان ایک جمہوریہ ہوگا، اس میں بڑے بڑے صنعتی ادارے اور وہ تمام "سروسز" جن کا تعلق مفادِ عامہ سے ہے "سوشیلائزڈ" ہوں گی۔ پاکستان کی ریاستوں یا صوبوں کو آٹانومی حاصل ہوگی۔ معاشی طور پر پاکستان دو منطقوں میں منقسم ہوگا اور اتنا ہی مستحکم ہوگا جتنا وہ ملک جس کی ریاستیں یا صوبے ایک ہی بلاک کی صورت میں واقع ہوں۔ پاکستان کے قدرتی وسائل اور آبادی اس کو ایک بڑی عالمی قوت بنانے کے لئے کافی ہیں۔

اگر انگلستان اپنی ۴۵ ملین آبادی کے باوجود عالمی قوت بن گیا تو پاکستان تو معاشی اعتبار سے دنیا کے سب سے بڑے اور قوی ملکوں میں سے ایک ثابت ہو سکتا ہے۔

آج بھی مسلم لیگ کی ایک کمیٹی پاکستان کو ترقی یافتہ نیشن بنانے کے تمام پہلوؤں کی چھان بین میں مصروف ہے۔ پاکستان کا مستقبل عظیم ہے یہاں لوہا، پٹرول، گندھک، کوئلہ اور دوسرے معدنی ذخائر کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا، ان میں سے بہتوں کا نقشہ بھی ہم مرتب کر چکے ہیں۔

(نومبر ۱۹۴۵ء)

وسیلہ منزل

جس پاکستان کے قیام کے لئے ہم دس برسوں سے مصروف جنگ تھے وہ خدا کے فضل و کرم سے آج ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ اپنی ایک ریاست کا قیام ایک منزل تک پہونچنے کا ذریعہ تھا۔ بذاتِ خود منزل نہیں۔ تصور یہ تھا کہ ہماری اپنی ایک ریاست ہو جس میں ہم خود اپنی روایات و کلچر اور تہذیب کے مطابق نشو و نما کر سکیں اور جہاں اسلامک سوشل جسٹس کے اصولوں کو پھولنے پھلنے کا موقع نصیب ہو۔

(کراچی اکتوبر ۱۹۴۷ء افسرانِ حکومت پاکستان کو خطاب)

ہمارا نصب العین

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ہر قسم کے خوف و احتیاج کو صرف دور نہ کریں بلکہ حریت، اخوت اور مساوات قائم کریں جیسا کہ اسلام نے ہم پر عائد کیا ہے۔

(کراچی کارپوریشن ۱۹۴۷ء)

ہماری روایات

تمہیں اپنے اسلاف کی طرح وہ روح اپنے اندر پیدا کرنی ہے جس کو "مجاہد کا جذبہ" کہتے ہیں، تمہاری ملت وہ ہے جس کی تاریخ حیرت انگیز عزم و حزم، کردار و شجاعت کے کارناموں سے بھری پڑی ہے، تمہیں اپنی روایات کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھال کر اپنی عظمت و شوکت کے باب میں مزید اضافہ کرنا ہے۔

(تقریر لاہور ۱۹۴۷ء)

اسلام کا آہنی قلعہ

اب میں تم سے جس چیز کا طالب ہوں وہ یہ ہے کہ تم میں سے ہر وہ شخص جس کے کانوں تک میرا یہ پیغام پہونچے۔ قلبی طور پر یہ عہد کرلے اور پوری طرح آمادہ رہے کہ ضرورت پڑی تو وہ پاکستان کو اسلام کا قلعۂ آہنی بنانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دے گا اور اسے دنیا کی سب سے بڑی قوموں میں سے ایک ایسی بڑی قوم بنا کے دم لے گا جس کا نصب العین داخلی امن اور خارجی امن ہوگا ایک مسلمان کے لئے اس سے بہتر اور کوئی موت نہیں جو حق کی راہ میں آتی ہے۔

(تقریر لاہور ۱۹۴۷ء)

میرا ایمان

میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اور فوز و فلاح مضمر ہے انھیں زریں اصولِ حیات کی پیروی میں، جو ہمارے شارع اعظم —— پیغمبر اسلام —— کے عطا کردہ ہیں۔ ہمیں اپنی جمہوریت کی بنیاد سچے اسلامی تصورات و اصولوں کی اساس پر رکھنی چاہیئے۔

(شاہی دربار سبی فروری ۱۹۴۸ء)

اسلامی جمہوریت

تم نے بہت سی جنگیں اس کرۂ ارض کے دور دراز محاذوں پر لڑی ہیں تاکہ دنیا کو فاشزم کے خطرات سے نجات دلا کر جمہوریت کی خاطر اسے محفوظ کر دو۔ لیکن اب تمہیں اسلامی جمہوریت، اسلامی عدلِ اجتماعی اور مساواتِ انسانی کی نشر و اشاعت

قیام و بقا کی نگہبانی خود اپنی سرزمین میں کر رہے ہیں۔ ہمیں چوکس رہنا ہوگا بے حد چوکنا۔ ابھی آرام کی ساعت نہیں آئی۔ ایمان و یقین، ضبط و تنظیم اور اپنے فریضے کے ساتھ بے لوث انہماک پیدا کرو تو پھر کوئی چیز بھی قابل قدر مرتبہ ایسا نہیں جو تم حاصل نہ کر سکو۔ (فرنٹیئر افواج پاکستان کو خطاب ۱۹۴۸ء)

اسلامی سوشلزم

آپ جب کہتے ہیں کہ پاکستان کی تعمیر عدل اجتماعی اور اسلامی سوشلزم کی اس واضح بنیاد و اساس پر ہونی چاہیئے جو انسانی مساوات و اخوت پر زور دیتی ہے، تو در اصل آپ میرے جذبات کی ہمنوائی کرتے ہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے جذبات کی، اسی طرح جب آپ مساوی مواقع و حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ بھی خود میرے خیالات کی ترجمانی ہے تا کہ یہ تمام مقاصد و منازل پاکستان میں ہرگز اختلافی نہیں ہیں کیونکہ ہم نے جو پاکستان کا مطالبہ کیا، جد و جہد کی، اور بالآخر سے حاصل کیا، تو اس کی غرض یہی تھی کہ ظاہری اور باطنی طور پر ہم اپنے معاملات کو اپنی روایات کے مطابق ڈھالنے میں آزاد ہوں، اخوت، مساوات اور برادری، ہمارے مذہب کلچر اور تمدن کی بنیاد ہیں، ہم نے حصول پاکستان کے لئے جنگ اسی وجہ سے کی تھی کہ اس برعظیم میں ہمارے انسانی حقوق کے غصب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ (چاٹگام مارچ ۱۹۴۸ء خطاب عام)

بدترین جرائم

سب سے بڑی لعنتوں میں سے ایک جس میں ہندوستان مبتلا ہے ــــ لیکن میرا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے ممالک اس سے محفوظ ہیں بلکہ میرے خیال میں تو ہمارا حال اور بدتر ہے ــــ رشوت کی لعنت ہے اور بدعنوانیوں کی، ہمیں اس لعنت کو فولادی پنجوں سے زیر کر لینا چاہیئے مجھے امید ہے کہ جونہی اسمبلی موقع پائے گی آپ کوئی معقول تدبیر ضرور اختیار کریں گے۔ چور بازاری دوسری لعنت ہے اس عفریت سے بھی آپ کو نمٹنا ہے جو سوسائٹی کے خلاف ایک بدترین اور ہولناک جرم ہے۔ ہماری اس پریشان حالی میں جبکہ ہم غذا اور ضروریات زندگی کی قلت سے دو چار ہیں کوئی شہری اگر چور بازاری کرتا ہے تو میری رائے میں اسکا یہ جرم مخدوش ترین جرائم سے بھی بڑا جرم ہے ان بے شمار اچھی بری چیزوں کے ساتھ ایک بڑی خرابی یہ بھی در آئی ہے جس کو اقربا نوازی اور بدعنوانی کہتے ہیں اس بدی کی جڑ بھی پوری بیدردی کے ساتھ کاٹ دینی ضروری ہے۔ میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کی حرکت کبھی گوارا نہیں کروں گا۔ اقربا نوازی ہو یا بدعنوانی یا اثر و رسوخ استعمال کرنے کی براہ راست یا بالواسطہ کوشش، جہاں میں نے پایا کہ ایسا ہوا ہے یا کہیں ہو رہا ہے تو نیچے ہو یا اوپر، میں قطعی معاف نہیں کروں گا۔

(خطبۂ صدارت مجلس دستور ساز ۱۹۴۷ء)

سبزی کا راستہ

پاکستان کی اس عظیم مملکت کو اگر ہم خوشحال اور سرسبز دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تمام تر توجہ تمام اور بالخصوص عوام اور غریب لوگوں کی بہتری اور خیر و فلاح پر مرکوز رکھنی ہوگی۔ (دستور ساز اسمبلی ۱۹۴۷ء)

پریکٹیکل نظام

میری سمجھ میں وہ طبقہ نہیں آتا جو عمداً شرانگیزی کرتا ہے اور پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول آج بھی زندگی میں اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح تیرہ سو برس پہلے تھے اسلام صرف روایات اور روحانی تعلیمات ہی کا مجموعہ نہیں ہے اسلام ایک ضابطۂ حیات بھی ہے جو ہر مسلمان کی زندگی کا نظم کرتا ہے اور سیاست و معیشت وغیرہ میں اسکے طرز عمل کا راہ نما ہے۔

ہمارا مشن

نصف صدی کے اندر اندر دو عالمگیر جنگیں جو برپا ہوئیں اس کا بڑا سبب معاشی ناہمواری ہے۔ مغربی نظام معیشت کے اصول منصفانہ نہیں ہیں۔ ہمارا فرض ہے اور یہ ہمارا مشن ہونا چاہیئے کہ خود اپنی خوشحالی اور بہتری کے لئے نیز دنیا کو امن سکون کا پیغام پہنچانے کے لئے ایک مستقل و ہموار نظام معیشت تو پیش کریں، ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمارے پاس خود اپنا ایک نظام معیشت بھی موجود ہے۔ (اسٹیٹ بنک کی افتتاحی تقریب ۱۹۴۸ء)

مرتبہ: سلطان جمیل نسیم

صبا اکبرآبادی
کا
ایک شعر

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز　　آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

سلطان جمیل نسیم کے استصواب پر صبا اکبرآبادی صاحب کے اس شعر پر اب تک عبدالماجد دریابادی، نیاز فتحپوری، خواجہ غلام السیدین، ضیا احمد بدایونی، ڈاکٹر اعجاز حسین، فراق گورکھپوری، اثر لکھنوی، میکش اکبرآبادی، ڈاکٹر ظاہر فاروقی، آل احمد سرور، جمیل مظہری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر ضیا احمد، مسعود حسن رضوی ادیب، تلوک چند محروم، انجم آفندی، صالحہ عابد حسین، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد عزیز، غلام ربانی تاباں، سلیم جعفر (مرحوم)، شان الحق حقی، فضل کریم فضلی، شکیل بدایونی، امتیاز علی عرشی، نورالحسن علی بخاری، ہاشم رضا، آل رضا، خواجہ صولت، جعفر، سرفراز تسکین، تمنا عمادی، سعید اکبرآبادی، شور علیگ، شاہد احمد دہلوی، حسن امام وارثی، شاہ عارفی وغیرہ کی آرا ہم شائع کر چکے ہیں۔ اب چند اور ممتاز ناقدوں اور شعراء کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری رہے گا۔

فیض احمد فیض

مکرمی، تسلیم

آپ کا خط بہت دن ہوئے ملا تھا۔ مصروفیت کے سبب سے جواب میں تاخیر ہوئی۔

جو شعر آپ نے تحریر کیا ہے۔ اس کے بارے میں قطعی رائے تو شاعر کے جملہ کلام کی روشنی ہی میں قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آئینے میں عکس ابھرنے کے تاثر کو عکس کی آواز سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ مضمون کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے کہ آئینہ ساز کو اپنی ایجاد یعنی آئینہ کی ماہیت کا پورا اندازہ نہ تھا۔ جب آئینے میں پہلا پہلا عکس نمودار ہوا (آئینہ ساز کی اپنی شکل اور صورت کا) تو آئینہ ساز اس حیرت ناک عکس کے غیر متوقع تقابل سے چونک اٹھا۔ پھر آئینہ ساز اور عکس بھی استعارے [illegible]

[illegible]

ہزہبروز کراچی

ڈاکٹر سید عبداللہ

مکرمی تسلیم

معلوم ہوا کہ صبا کے شعر کے متعلق آپ کا استفسار کیا ہے۔ از راہ کرم اپنے استفسار کو زیادہ واضح طور پر لکھئے جہاں تک میں دیکھتا ہوں۔ پہلا مصرعہ خوب ہے۔ آئینے کی بھی ایک آواز ہو سکتی ہے یعنی آئینے میں جو جلوے عکس ریز ہوتے ہیں وہی گویا زبان رکھتے ہیں، آئینہ بنانے والا جو ہر آئینہ کے اس کمال کا شناسا تھا۔ اس نے آئینہ بنایا ——— ورنہ محض آئینہ سازی تو ایک معمولی صنعت ہے۔ اصل شے تو جوہر تک پہنچنا ہے۔ آئینہ ساز جو ایک فنکار بھی ہے۔ آئینے کے اس ہی کو دیکھ کے چونک اٹھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنا مطلب واضح کر سکا یا نہیں۔ مگر شعر کا رعب مجھ پہ ہے اور میں اس سے محظوظ بھی ہوا ہوں ——— باقی آپکے جواب کے بعد ——— والسلام

نسیم صاحب۔ آپ کا عنایت نامہ محررہ ۲۸ رجون موصول ہوا۔

صبا کے شعر کے متعلق آپ کی پریشانی عکس کی آواز کی وجہ سے ہے یہ استعارہ کوئی نیا نہیں۔ غالب نے کہا ؎

جلوۂ آئینہ بھی چاہیے ہے مژگاں ہونا

اگر عکس میں بینائی ہونے کی صلاحیت ہو سکتی ہے تو عکس میں آواز یعنی گویائی کی صلاحیت کیوں نہیں ہو سکتی اور ظاہر ہے کہ گویائی سے مراد EXPRESSION یعنی اظہار وابلاغ ہے آئینہ میں اظہار وابلاغ کی صلاحیت پائی جاتی ہے مطلب یہ ہوا کہ آئینہ ساز نے جب آئینہ بنایا تو وہ آئینہ کی اس صلاحیت اظہار کو دیکھ کر چونک اٹھا۔

یہ تو ہوا شعر کا مطلب ——— مگر میں کہتا ہوں مومن کے یہ انداز ہمارے زمانے کے حسب حال نہیں۔ یہ پرانے زمانے میں بڑی مرغوب چیز تھی۔ ان میں ذرا دماغی کاوش بھی کرنی پڑتی تھی۔ اور پھر معنی حاصل ہوتا تھا۔ یہی چیز معنی یابی کہلاتی تھی۔ اب استعارے کی بہار دوسری صورتوں میں جلوہ دکھاتی ہے۔ ——— والسلام

خلیق نقوی :-

عزیز گرامی قدر۔ سلام مسنون

مراسلہ پہنچا شعر کا مفہوم جو کچھ میں سمجھا ہوں اسے بیان کرنے سے پہلے چند ضروری باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں بعض اشعار کا طرز ادا ایسا حکیمانہ ہوتا ہے کہ ان کا اطلاق مجاز اور حقیقت دونوں پر ہو سکتا ہے۔ اس شعر کو پڑھنے یا سننے کے بعد سب سے پہلے خیال حقیقت کی طرف جاتا ہے لیکن آگے چل کر ایک زبردست قباحت پیش آتی ہے۔ صفاتِ الٰہیہ کے بارے میں قول مجرد ہے (حیرت وغیرہ)۔ لہٰذا کسی صفتِ الٰہی پر کسی لمحے بھی انفعال (PASSIVITY) طاری نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ہی ہر صفت کامل بھی ہے ——— چونکہ انفعالات کسی صورت استعجاب کا پہلو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جب ہر چیز علم الٰہی میں پہلے سے موجود تھی تو حیرت واستعجاب کا کیا کام پس اگر شعر کو حقیقت کا ترجمان سمجھا جائے تو ہزار حیلہ وحجت کے باوجود علم الٰہی پر نقص ہی وارد ہوتا ہے۔

اب مجاز کی طرف آئیے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ اسمیں جزواً یا ظلاً بہت سی ایسی صفات بھی پائی جاتی ہیں جو دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات سے مختص ہیں۔ چنانچہ ایک مصور جو تصویر بناتا ہے وہ اس کی صناعانہ تخلیق ہی ہوتی ہے

ان صناعیوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جنھیں خارجی عالم کی عکاسی ہو دوسری وہ جو خود فنکار کے باطنی عالم کی آئینہ دار ہو۔ پہلی قسم کی صناعی پر بھی فن کار کی اپنی چھاپ کسی نہ کسی حد تک موجود ہی رہتی ہے کیونکہ خارجی عالم کی تصویر کشی بھی فنکار اپنے شخصی تاثرات یا نقطۂ نظر ہی کے مطابق کرتا ہے۔ ہر فنکار کی برابر یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ کوئی ایسی تصویر بنائے جو اس کے باطن کی کامل طور پر آئینہ دار ہو۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ فنکار سے بھی ایسی تصویر غیر متوقع طور پر ہی تیار ہو جایا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے فنکارانہ فکر کو الہامی کہا ہے۔

ان مقدمات کے بعد شعر کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ فنکار نے ایک تصویر بنائی جو نہ صرف حسین و دلکش ہی تھی بلکہ اس کے باطن کی کامل طور پر ترجمان بھی تھی۔ لہٰذا وہ اسے حیرت و مسرت سے دیکھتا رہا۔ "دیکھتا تھا" کا مفہوم "مگر دیکھتا رہا" یا "بار بار دیکھتا تھا" ہے تو نفسیاتی طور پر بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ وہ اس تصویر کو اسلئے دیر تک دیکھتا رہا کہ اس میں فنکار کو خود اپنے باطن کا عکس نظر آ رہا تھا عکس کی آواز کی توجیہات شاید بھی ممکن ہیں لیکن تصویر کو بولتا ہوا کہنا تو عام بات ہے صناعانہ تخلیق کو آئینہ کہنا نہایت نوعی فکری کی دلیل ہے جس طرح انسان آئینے میں اپنی صورت کے خد و خال دیکھتا ہے اسی طرح شعر، تصویر، تراشیدہ بت یا موسیقی کی دھن سے ایک فنکار کے باطنی نقش و نگار ابھرتے ہوئے معلوم دیتے ہیں حقیقتاً شعر میں ہے کسی قسم کا کوئی سقم بھی نہیں پایا جاتا۔ بجز اس کے کہ شعر سننے کے بعد سامع کا ذہن یکایک حقیقت کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور یہ بات "آئینہ" اور "آئینہ ساز" سے پیدا ہوئی ہے۔

ہاں یہ بات رہی جاتی ہے کہ آپ سے ابوظفر صہبا نے جو میری تعریف و توصیف کی ہے۔ یہ محض ان کی اپنی محبت ہے یقین جانئے ؎

میں نہ اچھا ہوں نہ ہرگز مرا حال اچھا ہے
پہ مرے باب میں اچھوں کا خیال اچھا ہے

احمد ندیم قاسمی:۔

محترمی نسیم صاحب، سلام مسنون

گرامی نامہ کا ممنون ہوں۔ میں ان دنوں ایک خاندانی حادثے کے سلسلہ میں گاؤں چلا گیا تھا۔ ہفتہ عشرہ قبل واپس آیا ہوں۔ اسی لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔ عفو خواہ ہوں۔

"نقوش" میں مندرجہ غزل کی داد پا کر خوشی ہوئی۔ تحسینِ سخن شناس سے کسکو خوشی نہیں ہو گی۔

صبا اکبرآبادی صاحب کا یہ شعر ایہام کے حسن سے آراستہ ہے مگر ایہام اتنا شدید ہو گیا ہے کہ ابہام کا دھوکا ہونے لگتا ہے آپ کو شاید اسی لئے الجھن محسوس ہوئی۔ میری رائے میں اس شعر کا مفہوم یہ ہے:۔

آئینہ ساز جب آئینہ بناتا ہے تو ایک خالق کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ مادے کے ایک بے معنی ٹکڑے کو صیقل کر کے بعض جمیل خوبیوں سے آراستہ کرتا ہے اور جب اپنی اس تخلیق پر نظر دوڑاتا ہے تو اس کی "انا" محظوظ ہوتی ہے۔ تخلیق، خالق کی نگاہ میں اسکی اپنی ذات سے فروتر ہوتی ہے۔ اس لئے آئینہ ساز یہ سوچ تک نہیں سکتا کہ بعض اوقات تخلیق بھی خالق کا کردار ادا کرنے لگتی ہے۔ آئینہ ساز نے اپنا ہی تخلیق کیا ہوا آئینہ دیکھا تو چونک اٹھا اسلئے کہ یہی آئینہ خود خالق کا عکس تخلیق کر چکا تھا آئینہ ساز نے اپنے ہی آئینے میں جو ہو بہو اپنی ہی شخصیت کی تخلیق دیکھی اور یہ انکشاف ایک آواز کی طرح اس کی حیات میں گونج گیا آئینہ

آئینہ ساز اور عکس کے پردے ہٹا کر دیکھئے تو آپ کو اس شعر میں، خدا، انسان اور انسان کے ارتقائی دونوں کے نقوش نظر آئیں گے۔

میری ایک نظم "انسان عظیم ہے" کا آخری بند ہے ؎

تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے
وہ حسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے
وہ ایک مسلسل ارتقاء ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا

میرے خیال میں اب صبا صاحب کا شعر واضح ہو گیا ہوگا۔

اسلوب احمد انصاری :-

مکرمی تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۱۲ جولائی کل ملا

چونک اٹھا ہے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

اس شعر پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔

(۱) عکس کی آواز نہیں ہوتی۔ اسلئے اس پر چونک پڑنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

(۲) اگر آئینہ ساز سے مراد خدا ہے اور آئینہ سے کائنات یا ماسوا جسمیں خدا نے اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے تو اس آئینہ کو دیکھکر خدا کا چونک پڑنا اسلامی تصوف کے مطابق غلط ہے کیونکہ ماسوا کی تخلیق، خدا کے شعور میں پہلے سے موجود تھی۔

ان دو اعتراضات کا جواب یہ ہو سکتا ہے۔

(۱) اول تو شعری اعتبار سے عکس کی آواز ہونا غلط نہیں دوسرے عکس کو LITERAL طور پر سمجھنا صحیح نہیں۔ عکس سے مراد موجودات ہیں اور عکس کی آواز سے مراد وہ حرکت ہے جو تخلیق کے عمل کے بعد کائنات میں ظاہر ہوئی۔

(۲) آئینہ کو دیکھکر آئینہ ساز کا استعجاب کا اظہار کرنا، اسلامی عقیدہ کے مطابق چاہے صحیح نہ ہو لیکن غالباً (مجھے صحیح یاد نہیں) بائبل میں اس قسم کا ذکر موجود ہے کہ جب چھ روز میں خدا تعالیٰ کائنات کی تخلیق کر چکا تو اسے کائنات کو دیکھکر ایک طرح کی مسرت حاصل ہوئی لہٰذا میرا خیال ہے کہ۔

(۳) اگر اس شعر پر کسی مخصوص عقیدے کے منطقی تقاضوں سے الگ رہ کر غور کریں تو یہ شعر بامعنی بھی ہے اور اچھا بھی امید ہے آپ بخیر ہونگے

ابوظفر صہبا :-

عزیزی نسیم دعائیں۔

تم بھی ضیا صاحب کے شعر کا مطلب پوچھ رہے ہو۔ ایک استادِ مدرسہ رہا ہوں ہزاروں طلبائے علم کو اساتذہ متقدمین و متاخرین کی غزلیں اور قصائد پڑھائے ہیں۔ سوچتا ہوں اب استاد شعراء و ادبا بھی بن ہی جاؤں۔ جانتے ہو شعر مدرسہ کتنی بڑی بات ہے عرفی نے سچ ہی کہا ہوگا شعر کا سمجھنا آسان ہے سمجھانا بہت مشکل ہے۔ مگر چونکہ تمہاری فرمائش ہے اس لئے کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑے گا شعر سادگی و پرکاری کا آئینہ ہے۔ مفہوم صاف اور واضح ہے۔

آئینہ ساز آئینہ بنا کر دیکھ رہا تھا۔ صناع کو اپنی صنعت پر ناز تھا حسن کاری و جمال آفرینی کا بہترین نمونہ اسکے سامنے موجود تھا اسے یقین تھا کہ آئینہ میں اپنا عکس نظر آئے گا لیکن اسمیں جمالیاتی عنصر اتنا وافر تھا کہ اسے عالم تحیر میں اپنا عکس بولتا ہوا نظر آیا۔ اور چونک اٹھا کہ میں۔ عکس میں آواز پیدا ہو ہی ممکن ہے کہ فنکار کو اپنے کمالِ فن پر اسقدر حیرت ہوئی کہ زبان سے بے ساختہ کلماتِ تحسین و آفرین نکل گئے ــــ اسے محسوس ہوا کہ عکس بول رہا ہے۔ ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ عکس میں آواز نہیں ہوتی۔

اس شعر میں شاعر نے عملِ پیہم کا درس دیا ہے کہ اگر فنکار اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین چاہتا ہے تو میدانِ عمل میں مستقل و مسلسل گامزن رہے اس طرح یک دن وہ اس نقطۂ عروج پر پہنچ جائے گا جب اسے اپنے کمالِ فن پر حیرت ہونے لگے گی۔

پروفیسر ارشد کاکوی :-

محب مکرم ـ

اس شعر کے سلسلے میں موافق اور مخالف اتنی باتیں دیکھیں ــ اتنی دور دور کی کوڑیاں لائی گئیں اتنے نکتے پیدا کئے گئے اتنی گرہیں ڈالی گئیں کہ میں بالکل CONFUSE ہوگیا تھا۔ آپ کی فرمائش پر ان تمام بلند آہنگ رایوں سے ذہن کو صاف کر کے شعر کو سوچا لوگوں کو سارا فتور۔ عکس کی آواز میں نظر آتا ہے۔ اگر بات صرف یہ ہوتی کہ آئینہ ساز آئینے میں عکس کو دیکھکر چونک اٹھا تو بات تو صاف ہوتی لیکن بات کیا ہوتی ــــ شاعر نے ایک خاص تہہ پیدا کی ہے۔ اور عکس کی آواز کہکر اس عکس کی حیات سامانیوں کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی عکس اور ایسا عکس کہ بول اٹھا تصویر کی انتہائی تعریف یہ ہے کہ بول اٹھے۔ یہاں بھی یہی صورت حال ہے۔ آئینہ ساز نے آئینہ اٹھایا کہ اپنی تخلیق کو دیکھے اور وہ اس عکس کو دیکھکر حیران رہ گیا۔ اس حیرانی کو چونک اٹھنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آواز ہی پر انسان چونک اٹھتا ہے

میرے نزدیک مطلع اچھا ہے۔ اور یہ شاعرانہ جذب کا حامل ہے۔ شادانی صاحب سے بھی ذکر کروں گا ــ والسلام

جسٹس ایس اے رحمان ـ

مکرمی ـ السّلام علیکم ـ

آپ کا خط لاہور سے ہوتا ہوا مجھے یہاں ملا۔ میں آجکل تعطیلات کی وجہ سے مری میں قیام پذیر ہوں آپ نے صبا کے ایک شعر کے متعلق استفسار کیا ہے میری ناقص رائے میں شعر فہمی کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ اور ہر قاری اپنی استعداد کے مطابق شعر کے معنی اخذ کرتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جو مفہوم قاری کے ذہن میں آئے شاعر خود اس سے اختلاف رکھتا ہو لہٰذا جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے عرض کئے دیتا ہوں۔ علم اس سے کہ شاعر نے کیا کہنا چاہا ــ شعر ہے

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز   آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز ـ

نہر نیروز کراچی

مجھے اس میں صوفیانہ بیانے خیال کی جھلک نظر آتی ہے کہ خلاقِ عالم نے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا تو انسان کی تخلیق کی — انسان گویا وہ آئینہ ہے جس میں حسنِ ازلی نے اپنا عکس دیکھا۔ عام طور پر عکس آواز سے عاری ہوتا ہے لیکن اس مخصوص عکس میں انفرادیت بھی ہے اور اسکی ایک آواز ہے۔ یہاں مجھے کچھ ابہام شعر میں نظر آتا ہے۔ آیا شاعر محض عکس کو آواز کی صفت سے متصف کرتا ہے یا آواز کے ساتھ اسکی نوعیت میں بھی کوئی انوکھا پن ہے جسکی وجہ سے آئینہ ساز آواز سن کر چونک اٹھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آواز کی موجودگی ہی اسے چونکا دینے کے لئے کافی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آواز کی نوعیت چونکا دینے والی ہو۔ بہر حال عکس میں عام عکس کے مقابلے میں یہ ایک نرالی بات ضرور ہے جس نے آئینہ ساز کی توقعات کے خلاف وجود پایا ہے۔ اس پہ اعتراض یہ وارد ہو سکتا ہے کہ اس خیال سے خلاقِ عالم کے علم کامل پر حرف آتا ہے۔ امید ہے آپ مع الخیر ہونگے

ارتضیٰ عزمی :—

برادرم، وعلیکم السّلام۔

بعض اشعار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ پڑھتے ہی یا سنتے ہی دل میں اتر جانے کے بجائے وہ اپنے قاری یا سامع کو چونکا دیتے ہیں۔ اور اسکی زبان سے بے اختیار داد نکل جاتی ہے۔ اس قسم کے اشعار عام طور پر بڑے تہہ دار ہوتے ہیں، اسی وجہ سے شاعر کے مافی الضمیر کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور قاری کو ان کی معنوی تہہ تک پہنچنے کے لئے فکر و خیال کے کتنے ہی پیچ در پیچ مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے اور ہر شخص اپنے ذوق و نظر اور وجدان و شعور کے مطابق مطلب اخذ کرتا ہے — غالب کے بیشتر کلام میں اسی قسم کی صوری و معنوی پرکاری پائی جاتی ہے —

صبا صاحب کا زیرِ بحث شعر ؎

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

مجھے تو اسی قبیل کے اشعار میں سے معلوم ہوتا ہے جن پر غور و فکر کی راہیں ہمیشہ کھلی رہیں گی — دراصل اس شعر میں "چونک اٹھا"، اور "عکس کی آواز" پر لوگ چونکتے ہیں جس کا باعث وہ استعارے ہیں جو اس شعر میں محض حسنِ کلام کے طور پر نہیں بلکہ معنی آفرینی کے لئے صرف ہوئے ہیں — آئینہ ساز، آئینہ اور عکس کی آواز کے استعارے قاری کے ذہن کو یک بیک حقیقت کی حدود میں دور تک لے جاتے ہیں اور وہ شعر کے مجازی پہلو پر نظر بھی نہیں کرتا۔ آئینہ ساز سے خدا، آئینہ سے کائنات اور عکس کی آواز سے انسان اور اس کا جذبۂ سرکشی یا انانیت مراد لے کر شعر کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جب اس طرح شعر کے مفہوم کے منطقی نتائج سے عالم الغیب کے علم کامل پر حرف آتا ہے تو فیا [illegible] بکھر جاتا ہے اور شعر حقیقت سے بعید اور بے معنی سا معلوم ہونے لگتا ہے مگر اس کے برعکس جب شعر کے مجازی پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے تو اس کے جوہر کھلتے ہیں اور ماننا پڑتا ہے کہ فکرِ عظیم ہے خدایا —

میں اس شعر کی توضیح و تشریح کرنے سے پہلے عکس کی آواز کے بارے میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں — عکس کی آواز شاعری کے لئے کوئی نئی یا اجنبی نہیں ہے۔ اساتذۂ فارسی و اردو کے کلام سے اس قسم کی آواز دوں

کی مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں البتہ صبا صاحب کے شعر میں عکس کی آواز منفرد بھی ہے اور اپنے مخصوص معنی میں نئی بھی۔ شاعر خارجی عوامل و کوائف کو داخلی تجربات و احساسات کی بھٹی میں تپا کر حسین معنی خیز اور زیادہ مؤثر بنا دیتا ہے۔
اب ذرا فیض صاحب کی نظم کا ایک شعر سنئے جس میں انہوں نے کس کمال فن کے ساتھ چاندنی سے آواز پیدا کی ہے اور پھر اسے انتظار کے تھکے ہوئے احساس میں سمو کر خاموش کر دیا ہے یا گھنے درختوں کے فرش پر سلا دیا ہے۔

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

ہر تخلیق اپنے خالق کی شخصیت کا عکس ہوتی ہے، جو تخلیق اس صفت سے جسقدر متصف ہوگی اسی قدر بلند پایہ اور مکمل ہوگی اس لئے ہر فنکار کی خواہ وہ شاعر ہو یا مصور، بت تراش ہو یا موسیقار یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا فن حیات و کائنات کی وسعتیں اپنے اندر جذب کر لے اور اسکی شخصیت کا آئینہ بن جائے اور آئینہ بھی منہ سے بولتا ہوا لیکن اس مقام فن کا حصول کوئی آسان بات نہیں اس کے لئے عمل پیہم اور بڑے فنکارانہ درک کی ضرورت ہوتی ہے۔ فنکار اپنا خون جگر صرف کر کے بھی اپنی تخلیق کو اس وقت تک شاہکار کا درجہ نہیں دیتا جب تک صحیح وجدانی محرکات اسکی رہنمائی و معاونت نہ کریں لیکن ان وجدانی تحریکات و کیفیات کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا بلکہ یہ وقتاً فوقتاً فنکار پر طاری ہوتی رہتی ہے اس لحاظ سے قطعی غیر متوقع ہوتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ خالق اپنی ایسی تخلیق پر جو خاص درجہ حسین و لطیف ہونے کی وجہ سے خود اپنے شاہکار ہونے کا اعلان کرتی ہے تو وہ چونک اٹھتا ہے یہ حیرت بڑی مسرت آمیز ہوتی ہے۔

کھینچکر خامۂ قدرت نے کہا واہ رے میں
اور تصویر یہ بول اٹھی کہ اللہ رے میں

ان مسلمات کی روشنی میں صبا صاحب کے شعر پر (جس میں فنکار کے اسی بے پناہ جذبہ کا شاعرانہ اظہار کیا گیا ہے) اگر غور کیا جائے تو شعر کا مفہوم آئینہ کی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ گوئٹے نے کہا ہے "انسانی طلب کی انتہا تحیر ہے اگر کسی فن سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمال فن ہے۔ چنانچہ صبا صاحب کے شعر کا ماحصل مطلب یہ ہوا کہ جب آئینہ ساز یعنی فنکار نے آئینہ یعنی اپنی شاہکار تخلیق کو دیکھا جس میں اسے اپنی شخصیت کا بولتا ہوا عکس نظر آیا تو وہ اک گونہ حیرت آمیز مسرت کے احساس سے چونک اٹھا کیونکہ وہ غیر متوقع طور پر کمال فن کی منزل تک پہنچ گیا تھا۔
جب تک کوئی فنکار کمال فن کی منزل تک نہیں پہنچتا تو وہ برابر اپنی رفتار سے اپنی ترقی کا اندازہ کرتا رہتا ہے کیونکہ یہی اقتضائے کمال ہے صبا صاحب ہی کا ایک شعر ہے۔

مڑ مڑ کے رہگذار کو سہم دیکھتے ہوئے
چلتے ہیں اپنے نقش قدم دیکھتے ہوئے

احمد رفاعی

کرمی جمیل صاحب۔ تسلیم

صبا صاحب کے شعر کے متعلق آپ نے میری رائے دریافت فرمائی ہے جواباً عرض ہے کہ کسی شعر کی معنوی اور صوری اہمیت کی بابت کوئی بھی حکم لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ چیز کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ اصل چیز شعر کا لب و لہجہ اور اس سے بڑھ کر اسکا خصوصی تاثراتی آہنگ ہوا کرتا ہے جس سے متعلق بحث کرنے کے لئے کمال درجہ سلیقہ اور ذوق شعری کی فطری استعداد کا ہونا شرط ہے۔

صبا صاحب کے شعر کے متعلق جس انداز سے تجزیاتی محاکمہ کیا گیا ہے۔ اسکی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بیشتر ارباب نقد و نظر کے نزدیک اس کے پس پردہ ایک خاص قسم کا تصوفانہ رجحان کارفرما ہے اور یہ خیال یقیناً غلط بھی نہیں، یہ ماننا ہوگا کہ صبا صاحب کوئی صوفی شاعر نہیں ہیں اور اس لحاظ سے شعر کے معنوی پہلو سے بحث کرتے وقت تصوف اور معرفت کی دور از کار توجیہات و تاویلات کا سہارا لینا کچھ درست معلوم نہیں ہوتا ——— میرے خیال میں یہ شعر اپنے خصوصی اور تہہ دار آہنگ شعری کے سبب اس نوع کی جملہ موشگافیوں سے بالاتر ہے۔ یہ اپنے معنوی دروبست کے اعتبار سے ایک ڈرامائی شان کا حامل ہے جو دراصل اس تحیر آفریں وقار سے عبارت ہے جو اپنی جگہ بیک وقت دلآویز بھی ہے اور دلپذیر بھی۔ متعلقہ شعر کو صرف اسی نقد و نظر سے پرکھنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی :-

برادرم۔ السّلام علیکم :-

"عکس کی آواز" سے کوئی "چونک اٹھا" ہو، نہ ہو لیکن یقین کیجئے آپ کی اس غیر متوقع فرمائش پر میں ضرور چونک پڑا۔ ممنون ہوں کہ آپ (اپنی محبت سے) مجھے بھی "ممتاز" ناقدین اور شعراء کی صف میں دیکھنا چاہتے ہیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ لنگوٹ باندھ کر اس اکھاڑے میں اترنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ جب داؤں پیچ سے پوری طرح واقف حضرات صبا صاحب کو چت پٹ نہ کر سکے تو میں اُن کا کیا بنا بگاڑ لوں گا ——— ہاں، اگر آپ اس آئینہ :-

چونک اٹھا اس کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

میں، میرا بھی تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں تو عرض کروں گا کہ میں رشید احمد صدیقی کا شاگرد ہوں اور اس شاگردی پر مجھے ناز بھی ہے :-

"سایہ" سے بھی مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ وہ چاہے "عجز بیان" ہی کا کیوں نہ ہو۔ "دل" کے بارے میں کیا کہوں اور کیوں کہوں، جان مجھے بےحد عزیز ہے اسلئے

اس گلی میں آؤں کیوں

پروفیسر یوسف جمال انصاری :-

مکرمی تسلیم

کالج میں تعطیلات کی وجہ سے آپ کا ۴ ر اگست کا نوازش نامہ آج ۱۱ ر اگست کو ملا۔

صبا صاحب کا یہ شعر ؎

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

میرے خیال میں نادرست نہیں ہے۔ عکس کی آواز میں کوئی قباحت نہیں نظر آتی۔ جدت بھی نہیں ہے۔ غالباً سننے کو محسوس کرنے کا رتبہ دینے کی کوشش کوئی عجیب غریب نہیں ہے۔ تصوف کے نقطۂ نظر سے صانع مطلق نے اپنی تخلیق (آئینہ) میں اپنی صورت دیکھی تو اپنے مثنیٰ (عکس) کو جیتا جاگتا اور نغمہ زن دیکھکر حیرانی (اور خوشی) کے سبب سے چونک اٹھا۔
داخلی اور فنکارانہ نقطۂ نظر سے صبا صاحب نے فنکار کی اس حیرانی کو نظم کیا ہے جو اسے اپنے شہ پارے کو دیکھکر ہوئی ہے
علاوہ ازیں یہ شعر "آئینہ دیکھتا تھا" کے ٹکڑے کی وجہ سے اس بلند سطح سے گر گیا ہے جس کی پہلے مصرعہ سے توقع ہوئی تھی۔
بہرحال یہ معاملہ میری ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کا ہے۔ صحیح اور غلط کے متعلق اظہار رائے کر چکا ہوں۔ زیادہ یہ کہ ادب اور ادبی تنقید میں کوئی رائے قطعی نہیں کہی جا سکتی۔ ممکن ہے کہ جس طرح میں سوچتا ہوں، دوسروں کے نزدیک ناقابل قبول ہو۔

ممتاز حسین :۔

مکرمی۔ سلام مسنون۔ آپ کا نوازش نامہ مورخہ ۸ راگست ۱۹۶۰ء ملا۔
آپ نے جس شعر کی وضاحت مجھ سے طلب کی ہے۔ اس سے متعلق میں نے ایک آدھ مراسلہ حیدرآباد کے رسالے "نئی قدریں" میں دیکھا تھا۔
شاعری کی مختلف قسمیں ہیں۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے اسکی زبان تخئیلی کنائے کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسکا مخاطب بھی تخئیلی ہی ہوتا ہے جو بہت کچھ اشعار کے ابہام کو خود سے دور کرتا ہے یا اسکے کھانچوں کو پورا کرتا ہے۔ بہرحال اب میں میرکے دو اشعار پڑھتا ہوں ؎

کہاں آتے ہیں میسر تجھ سے مجھکو خودنما اتنے
یہ حسنِ اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

+ + +

داغِ محجوبی ہوں اس کا میں کہ میرے روبرو
عکس اپنا آرسی میں دیکھکر شرما گیا

اب آپ مذکورہ شعر پر غور کیجئے ؎

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

آپ اس حدیث قدسی سے تو واقف ہی ہونگے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اس شعر میں اسی افسانے کی طرف اشارہ ہے۔

عکس خواہ کتنا ہی مکمل ہو بہرصورت عکس ہے۔ لیکن اگر عکس یا تصویر بول اٹھے تو وہ کمال تخلیق اور باعث استعجاب خالق ہے کہ جسے وہ اپنا نقش سمجھ رہا تھا وہ اسکا ہم وجود ذات نکلا یہی اسکے چونکنے کا سبب ہے

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا
خدائی صدقے کی انسان پر سے

امید ہے کہ اب آپ اس شعر کا مفہوم سمجھ گئے ہونگے اور اب کسی اور کو زحمت نہ دینگے

مولانا غلام رسول مہر:-

مکرمی ۔ میرا احساس تو یہ ہے کہ یہ کسی مثنوی کا شعر ہے اور اس کے معانی کا تعین سیاق و سباق ہی کی بنا پر ٹھیک ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ خود میں نے نہ صرف یہ شعر ہی کبھی نہیں دیکھا بلکہ ضیا صاحب کے کلام سے بھی کبھی مستفید نہیں ہوا جس حالت میں آپ نے یہ شعر لکھ کر بھیجا ہے اس حالت میں مجھ کم فہم کے لئے تو اسکے معنی سمجھنا مشکل ہے اپنے فہم کی نارسائی کا اعتراف کرلینا چاہئے۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔

حامد اللہ افسر:-

چونک اٹھا حسن کے عکس کی آواز ... آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

یہ شعر مہمل ہے۔ عکس کی آواز نہیں ہوتی۔ اس بیان سے کوئی تصور قائم نہیں ہوتا۔ عکس کی آواز فطرت کے خلاف ہے

ڈاکٹر شوکت سبزواری:

چونک اٹھا حسن کے عکس کی آواز ... آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

آئینہ ساز = خالق ، باری تعالی ... عکس = عالم ناسوت ، مخلوقات

غالب کا شعر ہے ؎

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ ممکنات واجب الوجود کی ہستی کا پرتو ہیں۔ شاعر کا منشا یہ ہے کہ خالق کائنات اپنے عکس (کائنات) کو دیکھکر خود محو حیرت ہے ۔

احتشام حسین :-

محترمی تسلیم

اس شعر کے متعلق اس سے پہلے بھی آپ کا خط ملا تھا۔ اس کو مدت ہوئی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بعض مصروفیتوں کی وجہ سے میں نے بالکل مختصر سا جواب لکھ دیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط نہیں پہونچا۔ غالباً ایک بار "مہرنیمروز" میں اس شعر کے متعلق بہت سے خطوط شائع ہوئے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ آپ نے بہت سے لوگوں کو اس شعر سے دلچسپی لینے پر مجبور کیا ہے۔ جو کچھ میں سمجھتا ہوں عرض کرتا ہوں۔

صبا صاحب کا کلام میں نے زیادہ نہیں دیکھا ہے۔ تاہم یہ تاثر موجود ہے کہ موصوف ایک خوش فکر غزل گو ہیں انکی شاعری میں محض تغزل اور جذباتی رنگ نہیں ہوتا بلکہ تخیلی عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ اس شعر کی بھی یہی صورت ہے۔ اگر یہ شعر کسی عام جذبے کا اظہار کرتا تو شاید کوئی بحث نہ ہوتی لیکن تخیلی عنصر نے اسے کسی قدر مبہم بنا دیا ہے۔ تصوف سے دلچسپی لینے والے اسکا ایک مطلب بیان کرینگے۔ سائنس کا مذاق رکھنے والے دوسرا۔۔۔ یہ غزل کا تنہا شعر ہے کسی اور خیال سے اسکو سہارا نہیں ملتا۔ اب جبتک یہ نہ معلوم ہو کہ شاعر کے ذہن میں کیا تھا اسوقت تک اس کا یقینی مطلب بیان کرنا مشکل ہے شعر میں الفاظ اپنے لغوی معنی میں کم استعمال ہوتے ہیں۔ لفظوں کے جذباتی تخیلی اور نفسیاتی پس منظر ہوتے ہیں۔ بات منطقی حیثیت سے بہت زیادہ صحیح نہ ہو پھر بھی مفہوم کا تاثر قائم ہوجاتا ہے۔ اگر تاثر جذباتی یا عمومی ہوتا ہے تو ابہام کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ اگر فکری اور تخیلی ہو تو یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کس خیال کی ترسیل کرنا چاہتا ہے۔ جذبے میں شریک ہوجانا آسان ہوتا ہے تخیل میں ہم نوائی منطقی عمل ہے ان باتوں کو ذہن میں رکھکر صبا صاحب کے شعر ؎

چونک اٹھا حسن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

پر غور کرنا چاہئے کیونکہ ساری گفتگو اشاروں اور علامتوں کی زبان میں ہے۔

اس شعر میں آئینہ ساز، آئینہ اور عکس کی آواز کے مفہوم توجہ طلب ہیں۔ ان کا تعین کہنے والے کے علم، مزاج، ذوق اور خیال کی روشنی ہی میں کیا جاسکے گا۔ اگر آئینہ ساز خدا ہے تو آئینہ اسکی مخلوق یا کائنات ہوئی۔ خدا نے کائنات کی تخلیق کی اور اس تخلیق کو پرمسرت انداز میں دیکھ رہا تھا کہ اس میں ایک ایسی صفت پیدا ہوئی جسکی اسے امید نہ تھی (ورنہ وہ چونک کیوں پڑتا!) اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ یہ خدا کیسا تھا جس نے آئینہ تخلیق میں اپنا عکس دیکھا اور جب اس عکس نے زندگی کی قوت اختیار کرلی تو یہ بات اسے عجیب معلوم ہوئی ۔۔۔ یہ وہی تو تھا جو پردۂ کائنات میں گویا تھا۔ بہرحال چونک اٹھنا الجھن پیدا کرتا ہے۔ ان لفظوں میں نہ بھی تصوف دوست شعراء نے اس قسم کے خیالات کا اظہار برابر کیا ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ خود شاعر نے بھی اسی ہمہ اوستی صوفیانہ تصور کو پیش نظر رکھا ہے یا نہیں، کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہر طرح کی تاویل فضول ہوگی۔

ذہن سائنس میں تحقیقات کرنے والوں کی طرف بھی جاسکتا ہے ایک سائنس داں نے کوئی نئی چیز بنائی۔ اس نے جو بات پہلے سے نہیں سوچی تھی اچانک اسمیں وہ بھی نمودار ہوگئی اور یہ بات اسکے لئے حیرت ناک تھی لیکن اس مفہوم میں عکس کی معنویت ختم ہوجاتی ہے۔ بولتی ہوئی فلموں کے زمانے میں بھی عکس کی آواز بہت سے لوگوں کے لئے دشواری کا سبب بن سکتی ہے کیونکہ یہ شعر غالباً غزل کا ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئی اور خیال وابستہ نہیں، صرف آئینہ کی وجہ سے عکس کا لفظ معنی پیدا کرتا ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں کھینچ تان کر یہی تصوف والے معنی سے کام چلایا جاسکتا ہے کوئی دوسرا مفہوم ذہن نشین نہیں ہوتا الفاظ اور تراکیب بھی صوفیانہ روایات ہی کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ صبا صاحب نے اچھے اچھے شعر کہے ہیں۔ اس شعر کو اس قدر اہمیت دینے کی کیا ضرورت ہے جس پر اتنی بحث ہو۔ اسکے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ اسمیں کوئی ایسا ابہام ضرور موجود ہے جسے بہت سے لوگ سمجھ نہیں سکتے۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین

ضربِ کلیمی

کلیم الدین احمد اردو ادب کے ان خوش نصیب مصنفین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں جن کی ناموری کا سبب ان کی نیکو نامی سے زیادہ بدنامی ہے۔ دشت ادب کے "صید ہائے زبوں" پر انہوں نے نشانہ باندھ باندھ کر بڑی بے دردی سے تیر پہ تیر چلائے ہیں۔ ترقی پسند ہوں یا قدامت پرست، غزل گو ہوں یا نظم نگار، ناقد ہوں یا محقق اردو کا کوئی ممتاز و مقبول شاعر و ادیب باقی نہیں رہا جس کی قلم کاری ضرب کلیمی سے پارہ پارہ نہ ہوئی ہے۔

سخنہائے گفتنی کلیم الدین احمد کا تازہ تخلیقی کارنامہ ہے۔ اس کتاب کے قابل توجہ نکات شائقین ادب و فن کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ ان اقتباسات کے پیچھے جو گہرے تاثرات ہیں ان سے کلیم الدین احمد کے ادبی مزاج کا کچھ اندازہ لگانا ممکن ہے۔

اقتباسات کی سرخیاں راقم کی قائم کردہ ہیں۔

پیروی مغربی:- کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اردو انشاپرداز مغربی ادب سے واقف ہو گئے ہیں اور وہ مغربی خیالات اور اصول تنقید سے استفادہ کرتے ہیں لیکن تاسف اس پر ہے کہ وہ واقفیت محض سطحی ہے ص۱۱

سائنس اور تہذیب۔ سائنس ہمارے لئے نئی نئی چیزیں مہیا کرتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ ہم ان معلومات اور ان چیزوں سے کیا مصرف لیں۔ سائنس کو قدروں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا مقصد تو محض جستجو ہے .... قدروں کی میزان .... ہمیں مذہب اور اخلاق اور فلسفہ کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ سائنس کو ان میزان سے کوئی سروکار نہیں آج سائنس نے ہمیں نئی نئی چیزیں اس فیاضی سے بخشی ہیں کہ ہم کچھ بدحواس سے ہو گئے ہیں۔ ہماری ترازو اس نئے بوجھ کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ تو ٹوٹ گئی اور ابھی ہم نے کوئی نئی ترازو نہیں بنائی ہے۔ اس لئے حالت گم کردہ راہی کی ہوگئی ہے [illegible]

ریڈیو پروگرام۔ کسی ذکی الحس شخص کے لئے سب سے زیادہ سخت سزا یہی ہو سکتی ہے کہ اسے حکم دیا جائے کہ وہ صبح سے رات تک ریڈیو پروگرام سنا کرے، اس مشقت کو وہ برداشت کر لے، اور اس امتحان کے بعد اس کے ہوش و حواس قائم رہیں تو وہ جانور ہے یا فرشتہ، انسان تو وہ ہو نہیں سکتا ...." ص۳۷

روٹی اور شاعری .... اگر ہمیں روٹی نہ ملے تو ہم شعر نہیں کہہ سکتے ہیں۔ شعر کہنا تو بڑی بات ہے۔ ہم زندہ بھی

نہیں رہ سکتے۔ لیکن ہمیں بہت سی ردیفیں مل جائیں تو بھی ہم شعر نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ۱۷

تنقید اور تخلیق ..... تنقید اور تخلیق دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ ان دونوں میں نہایت گہرا اور اہم تعلق ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تخلیق اور تنقید ایک ہی دماغی عمل کے دو رخ ہیں جس وقت شاعر تخلیق کی کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے تو تنقید ہی اس کی امداد کرتی ہے .....؟ ۳۲

تمثیلیہ:۔ تمثیلیہ ایک مشکل فن ہے اور اس میں کامیابی نہایت دشوار ہے۔ اس میں کامیابی کے لئے طاقتور تخیل، زبردست شخصیت اور حساس دل اور زندہ یقین کی ضرورت ہے ... یہ آرٹ نہایت دشوار ہے اور بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس آرٹ کے جاننے اور برتنے والے اردو میں موجود نہیں ہیں۔" ۲۲۲

شاعری اور پیمبری "..... وہ (شاعر) انسانیت کا ایک فرد، اہم ترین فرد ہے۔ اپنی کبھی نہ ختم نہ ہونے والی جستجو اپنی شعلہ زن آرزو کی وجہ سے وہ گویا ایک دل ہے جو اپنی موزوں دھڑکن سے ہمیں زندہ رکھتا ہے۔ مردہ ہے وہ قوم جس میں کوئی شاعر نہیں۔ شاعر آفرینش ہے، مردوں کی آفرینش۔ ایسے مرد نہیں جن کی زندگی کا صرف سانس برقرار ہے، بلکہ وہ مرد جو حقیقی معنوں میں زندہ ہیں۔ جن کی نبضوں میں حرکات کی موزوں رفتار ہے جو شاعر ایسے فرزند رکھتے وہ پیمبر سے کم نہیں" ۸۷

شعری اصناف۔ اردو ادب اور خصوصاً اردو شاعری کی مختلف صنفیں روز ازل سے مقرر کر دی گئی تھیں ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ کسی صنف کی خامی کا خیال عقل کا فتور ہے۔ ان صنفوں سے بہتر صنفیں کسی دوسرے ادب میں نہیں ملیں ...."

شعرائے متغزلین - ہندوستان میں شعر کہنے والے تو بہت ہیں لیکن شاعروں کی تعداد بہت کم ہے ہر پڑھا لکھا جو عروض سے واقف ہے موزوں طبع شعر کہہ سکتا ہے۔ اس آسانی کی وجہ سے ہندوستان میں شعرائے متغزلین کی تعداد بے شمار ہے ......"

نظم اور غزل ..... نظم ایک ہی پھول ہے غزل میں کتنے پھول ہیں کوئی سرخ ہے تو کوئی سبز کوئی زرد ہے تو کوئی سفید۔ کوئی ارغوانی۔ نظم پھول ہے تو غزل گلدستہ ہے گلدستہ غزل موتیوں کی مالا ہے۔ غزل ہیروں کا ہار ہے غزل ریل ہے جو ایک ہی رفتار سے رواں ہے۔ ہوائی جہاز ہے جو ہمیں آزادی کے ساتھ ہر سمت لے جا سکتا ہے غزل بندوق ہے۔ غزل توپ ہے۔ غزل بم کا گولا ہے۔ ابھی دلی کی سڑکوں پر گرا تو ابھی لکھنؤ کی چھتوں پر۔ ابھی پٹنہ میں گرا تو ابھی کلکتہ میں ۵

ہجو گو شعرا .. اردو میں صرف چار شعرا ایسے ہیں جن کی ہجویات قابل ذکر ہیں یعنی سودا، جوش، اقبال ۱۹۷

غالب :..... اس وقت تک بھی کوئی انشاپرداز بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان، غالب کی تحریر کا مثال نہیں پیش کر سکا... ابھی تک اردو میں جو خالص ظرافت کے نمونے ملے ہیں جو ادبی معیار پر بھی پورے اترتے ہیں، نظر آتے ہیں وہ غالب کے معیار سے بہتر کہاں۔ اس معیار کی گرد کو بھی نہیں پاتے ۲۱۳

اگر اردو انشاپرداز چاہتے ہیں کہ وہ میدان ظرافت میں آگے بڑھیں۔ اگر ان کی خواہش ہے کہ وہ زندگی کے

[illegible]

نہر بیرونڈ کراچی
مختلف پہلوؤں کی ہنستی بولتی تصویریں مرتب کر سکیں اگر ان کی تمنا ہے کہ وہ ظرافت کے ایسے نمونے پیش کریں جنہیں شائقین
ہو تو پھر وہ اپنی راتیں اور اپنے دن غالب کے مطالعہ میں صرف کریں ۔ ۲۱۶

ابوالکلام آزاد ..... یہ (ابوالکلام آزاد مرحوم کی تحریر) ایک کھنچی ہوئی تلوار، ایک بڑھتا ہوا سیلاب ایک اٹھتا ہوا طوفان اور ایک دنیا کو ہلا دینے والا بھونچال ہے ۔ یہ ایسا عصائے موسوی ہے ۔ جو افعی بن کر ہر شئے کو نگل جاتا ہے ...... یہ تحریر زندہ ہے اور اس کا ہر لفظ زندگی کا حامل ہے اور ہر لفظ بولتا چالتا متحرک نظر آتا ہے ۔ یہ طرز تحریر مولانا ابوالکلام کے ساتھ وابستہ ہے اور ان کی شخصیت کا نتیجہ ہے ۔ یہ اپنے طور پر بالکل منفرد ہے ۲۳۷

اقبال ..... ان کا فلسفہ چند ہیجان آور خیالات کا مجموعہ نہیں ۔ اسے انہوں نے اپنی رگ رگ میں محسوس کیا ہے ۔ انہوں نے جوش کے ساتھ محسوس کیا ہے اور وہ امید کرتے ہیں کہ دوسرے بھی اسی طرح محسوس کریں گے ان کی نظمیں گویا ایک مہین شفاف لباس ہے جس میں سے عشق صاف جھلکتا ہوا نظر آتا ہے ... اقبال اتنی عشق کے گیت گاتے ہیں ۔ لیکن وہ بات صاف صاف نہیں کرتے ۔ ان کا طریقہ استعارہ کا رنگ لئے ہوئے ہے ۔ وہ رنگین نقوش استعمال کرتے ہیں ۔ ان کی معانی ننگی تلوار نہیں ، چھپا ہوا خنجر ہے ۔ ۹۰

تین شاعر تغزل ..... وہ تین شاعر ایسے جنہیں میں حقیقی معنی میں شاعر سمجھتا ہوں حسرت ، فانی اور فراق یہ غزل کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور غزل کے محدود میدان میں خوش و قانع ہیں ..... موجودہ زمانے میں غزل اپنے محدود محاسن کھو چکی تھی ۔ یہ محض رسمی اور تقلیدی چیز ہو کر رہ گئی تھی ان شعرا نے غزل کے لکھتے ہوئے محاسن کو پھر حاصل کیا فرسودگی ، ابتذال ، تقلید سے نجات دلا کر اسے اصلیت حقیقت تاثیر سے مزین کیا ..... یہ شعرا اپنے دل کی ترجمانی کرتے ہیں ، اسی لئے ان شعروں میں تاثیر ہے ...... ان کے دل درد آشنا ہیں ، اس لئے جو شیون و فریاد ان کے شعروں میں ہے وہ رسمی نہیں ۔ اس کی بنا حقیقت پہ ہے ۔ لیکن ان کی قوت حاسہ بیسویں صدی کے ماحول سے متاثر نہیں ہوئی ہے ۱۳ (اشارہ)

میرے لئے

اف وہ روئے تابناک و چشم تر میرے لئے
ہائے وہ زلف پریشاں تا کمر میرے لئے

ہر نفس میں ایک دنیائے محبت نو بہ نو
ہر نظر میں اک پیام تازہ تر میرے لئے

حیف وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم میری طرف
ہائے وہ دزدیدہ دزدیدہ نظر میرے لئے

وہ رُخِ رنگیں پہ انوار محبت نو بہ نو
ہر نظر میں اک پیام تازہ تر میرے لئے

مرحبا یک آہ وہ اک پیکر حزیں
چار جانب دیدۂ حسرت نگر میرے لئے

سرد سرد آہوں میں تاثیر محبت گرم گرم
خشک خشک آنکھوں میں جوش اشک تر میرے لئے

جوش غم جوش حیا آغاز عشق احساس حسن
کشمکش سی کشمکش آٹھوں پہر میرے لئے

سامنے آتے ہی آتے وہ تنفس تیز تیز
سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لئے

وہ سرک جانا یکایک روئے تاباں سے نقاب
حیرت افزا رونق دیوار و در میرے لئے

ہر ادائے جاں نوازی حسن خیز و عشق بیں
پھر بھی ہر اک سعی پیہم بے اثر میرے لئے

اُف وہ آغوش تہی بیتاب آغوش دگر
اف وہ درد شوق محتاج اثر میرے لئے

ہائے وہ رنگیں رخ و سیمیں تن و نازک کمر
ہائے وہ لعلیں لب و سلک گہر میرے لئے

شبنم آلودہ وہ آنکھیں وہ گلاب افشاں جبیں
وہ دھڑکتا دل وہ گھبرائی نظر میرے لئے

اس نگاہ ناز میں وہ ہلکی ہلکی جنبشیں
معنی بے لفظ و شرح مختصر میرے لئے

میں سراپا بے نیاز ربط و ضبط حسن عشق
وہ مجسم حسن و عشق معتبر میرے لئے

وہ مری آزاد فطرت وہ مری تمکین ہوش
وہ شکست حسن وہ نیچی نظر میرے لئے

اول اول آہ وہ دل میں مرے احساس عشق
آخر [illegible] وہ نوک نشتر میرے لئے

لحظہ لحظہ وہ مرا پیہم سکوت مضطرب
لحظہ عالم نوع دگر میرے لئے

اف وہ کہنا اس کا پھر یا ہم نہیں یا ہیں مگر
میں جگر کیوں اسلئے چھوڑوں جگر میرے لئے

غمِ انتظار

نظر ہے وقفِ غمِ انتظار، کیا کہنا
کھنچی ہے سامنے تصویرِ یار، کیا کہنا

یہ چشمِ مست، یہ ابرو، یہ زلف، یہ خد و خال
یہ لب، یہ رخ، یہ جبیں، یہ عذار، کیا کہنا

شباب اور مکمل شباب، ارے توبہ
بہار اور مجسم بہار، کیا کہنا

تصادمِ نگہ و شوق، اے معاذ اللہ
تبسمِ نگہِ فتنہ کار، کیا کہنا

فروغِ حسن و تولائے سرو طرفِ چمن
شبابِ عشق و لبِ جوئے یار کیا کہنا

گل و بنفشہ و نسرین و نسترن کیا خوب
بہار و سایۂ ابرِ بہار کیا کہنا

بیانِ دعوٰی بانِ خموشش و عرضِ نیاز
جبینِ شوق و کفِ پائے یار کیا کہنا

گذارشِ دلِ عدو آفریں، معاذ اللہ
نگارشِ غمِ ہمت شکار، کیا کہنا

تمام شوق و شکایت تمام مہر و وفا
فسانۂ دلِ بے اختیار، کیا کہنا

فسونِ نیم نگاہی، و سحرِ استغنا
سکوتِ حسن و لبِ نغمہ بار کیا کہنا

وفورِ بیخودی، ضبطِ غم، جزاک اللہ
سرودِ بادۂ ناخوشگوار کیا کہنا

شراب ریز نشیلی نگہ، ارے توبہ
پیالہ گیر کفِ رعشہ دار کیا کہنا

سبک روانیٔ اشک و خنک نسیمِ کرم
نشاطِ دردِ دلِ بے قرار کیا کہنا

کرم نما ستمِ نازِ حسن ارے توبہ
ستم نما کرمِ خاصِ یار، کیا کہنا

نگاہِ ناز کے پیہم اشارہ ہائے لطیف
شکستِ شیشۂ دل بار بار کیا کہنا

حریمِ حسن کے پردے اٹھے ہوئے ہیں جگر
یہی اثر ہے غمِ انتظار کیا کہنا

[illegible]

حبِّ وطن

حبّ الوطن ز ملک سلیمان نکوتر است   خار وطن ز سنبل و ریحاں نکوتر است
سلطان دل کا گرچہ یہی حکم عام ہے   اور متفق اسی پہ زمانہ تمام ہے
پر ملک مصلحت کا کچھ انتظام اور   اس سلطنت کو چاہئے طرز نظام اور
حبّ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے   نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے
حبّ وطن نہیں ہے کہ پانی میں گر نہ ہو   [illegible] کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو
حبّ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہل ہوش   یاد وطن میں ہووے گہے جوش و گہ خروش
حبّ وطن اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں   بچوں کے منہ کو چومتے آٹھوں پہر رہیں
اے دوست یہ تو دوستی سنگ و خشت ہے
یہ دوستی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے

ماضی و حال

(مدرسۃ العلوم علی گڑھ)

مسلم یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں ہر سال تقسیم انعامات کا جلسہ ہوا کرتا ہے ۱۹۲۶ء میں یہ نظم اسی موقع پر پڑھی گئی تھی۔ فی زمانہ اس قسم کی نظمیں بہت پسند کی جاتی ہیں اور بحر اوزان و بحور کے لحاظ سے اس انداز میں مختلف النوع اختراعات پیدا کئے جا رہے ہیں مگر میرے خیال میں اس قسم کی سخن آرائیاں ایک ہنگامی الفاظ سے زیادہ وقیع نہیں جن کو بہت معمولی فکر سے نظم کیا جا سکتا ہے۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ ایسے ہنگامہ الفاظ میں معنوی نباضی بھی کی گئی ہے یا نہیں۔ بحالت اثبات یہ اجتہاد قابل داد ہے اور بصورت نفی یہ ارتداد سزاوار بیداد ہے۔

راقم - احسن مارہروی (مرحوم)

(یہ مسمّط انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے
جلسہ تقسیم انعامات ۱۹۲۶ء
میں پڑھا گیا تھا)

اے نونہالان چمن   اے سرو بستان چمن
اے زیب شان انجمن   اے طالبان علم و فن
سمجھو نہ ہم کو لاف زن
ہے یہ حقیقت بے سخن
ملک عجم - ارض عرب - اہل حبش - اہل حلب
چین کو ملی تھی یہ طلب   تعلیم سے پہلے وہ سب
ہر شعبۂ صنعِ کہن
فیض اس کا ہے سرِ خلق

اے عزیزانِ جوان — عزت طلب رفعت نشان
مفتاحِ گنجِ شائیگان — سرمایۂ نقدِ گران
کیا غم نہ ہو کچھ جس میں دمن
تم روح ہو وہ شکلِ تن

چھوڑو نہ علم یا عمل — بھولو نہ اوقاتِ عمل
بن جاؤ زنبورِ عسل — ہر پھول سے لو تازہ پھل
بن کر شمیمِ یاسمن
کر دو معطر یہ چمن

یہ باغ اور یہ سبزہ زمیں — یہ ہال اور یہ مسند نشیں
دانا کہیں خوب اور حسیں — لیکن ہیں ویران بے مکیں
یہ جنبشِ کام و دہن
کرتی ہے تحریکِ سخن

تم نورِ صبحِ عید ہو — تم عیش کی تمہید ہو
تم مطلعِ خورشید ہو — تم مرکزِ امید ہو
ہو گے تمہیں فخرِ زمن
سچے جانیں یہ حسنِ ظن

ہے آج جس کی ابتدا — ہوگی کل اس کی انتہا
جب تک نفس ہے ہم نوا — چلتی رہے گی یہ ہوا
گزرے ہزاروں ہی قرن
لیکن نہ بدلا یہ چلن

دنیا کی تغیرات پر — دن رات کے حالات پر
مستقبل و مافات پر — رکھو نظر اس بات پر
کل تک بجا رہے کیا بھجن
گاتے ہیں اب کیا کیا بھجن

جس کی بری افتاد ہے — اس کی بنا برباد ہے
لیکن جو خوش بنیاد ہے — انجام تک وہ شاد ہے
دنیا میں بے رنج و محن

پانے کا عیش جان و تن

تدبیر عیش جاوداں　　تعبیر خواب خوش نشاں
تقدیر اسرار نہاں　　تعلیم سے ہوگی عیاں
ہمت اگر ہے گام زن
منزل نہیں کوئی کٹھن

ڈالو نظر اسلاف پر　　دیکھو تواریخ و سیر
خاور سے لے تا باختر　　پھیلی تھی ظلمت سربسر
وہ یوں ہوئے پرتو فگن
جس طرح سورج کی کرن

یونان تھا باطل پرست　　ایران تھا ساغر پرست
ہر قوم کی حالت تھی پست　　تھا منتشر کل بند و بست
سب کو بنایا خوش چلن
سب کو سکھایا علم و فن

ہیں آج جو کرسی نشیں　　تھے کل وہ ذرات زمیں
چمکا جب اپنا مہر دیں　　دنیا کو دیکھا خوشہ چیں
بے درج - بے دُر عدن
ہے بے زباں - گویا دہن

یہ دُرج، تم گوہر فشاں　　یہ ہے دہن تم ہو زباں
تم ہو مکیں یہ ہے مکاں　　یہ باغ تم سرو رواں
تم صدر ہو یہ انجمن
تم شمع ہو یہ ہے لگن

روشن کرو نام سلف　　تاکہ رہو نازِ خلف
حاصل کرو ایسا شرف　　چھا جاؤ تم چاروں طرف
پورب پچھاں - اُتر دکن
ہر سو تمہیں ہو ضو فگن

ہے علم وہ کسب و ہنر　　اشرف ہوا جس سے بشر
رُکتا نہیں - گو بال و پر　　پہنچا ہے لیکن عرش پر

ہوتا جو لے فہم و فطن
پاتا نہ یہ اوج پرن
اے حاضرین محترم　　ہے اب یہ قول مختتم
بے شوق و بے سعیٔ اتم　　ہوگا نہ یہ کار اہم
ہمت کریں اہلِ وطن
حامی ہے رب ذوالمنن
جلسہ ہے یہ کس بات کا　　تقسیم انعامات کا
تعلیم کی خدمات کا　　آئندہ تحریکات کا
ایسی ہی باتیں قدرۃً
ہوتی ہیں وجہ شوق و فن
یہ اتحادِ باہمی　　یہ ایک جگہ کی زندگی
یہ ہم سنی یہ ہم فنی　　کرتی ہے پیدا ایک دلی
سب ممبران یونین
باہم ہیں یک جان و دو تن
جتنا یہ لالہ زار ہے　　سب قوم کی پھلوار ہے
ہر پھول نکہت بار ہے　　ہر نخل برخور دار ہے
دولہا کی ہے ان میں پھبن
تعلیم ہے ان کی دلہن
کہتا ہوں سچا واقعہ　　ہے طول غیر نافعہ
ہوتا ہے بار سامعہ　　سن لیں یہ شیخ الجامعہ[1]
ہے آپ کا خلق حسن
گردن میں سب کی حلقہ زن
یہ جامعیت آپ کی　　یہ شان و عزت آپ کی
کتنی ہے امرت آپ کی　　ہے سب کرامت آپ کی
دے کر دعائے علم و فن
کرتا ہوں اب ختم سخن

---

[1] پروفیسر عبدالمجید قریشی

محمد عبدالقیوم
(انگریزی سے)

جمّی

میں دروازہ کھول کر باغ میں چلی گئی۔ دھوپ میں دوپہر کی تپش تھی۔ میری آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ سیڑھیوں کی دونوں جانب ننھے ننھے بنفشی پھولدار پودوں کی باڑ لگی ہوئی تھی اور قریب ہی زرد چمکدار پروں والی ایک خوبصورت تتلی اسکے اوپر منڈلا رہی تھی۔

میں نے پھولوں پر نظر ڈالی لیکن مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ میری آنکھیں تو صرف جمی ہی کو دیکھ سکتی تھیں ـــ جمی موت کے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ بے ہوش پڑا تھا اسکا سانس مشکل سے چل رہا تھا۔ اسکی کھال بلکہ سیاہ ہو چکی تھی۔ اسکی بھنویں پلکیں اور سر کے بال سب ختم ہو چکے تھے۔ جمی! ـــ میرا بیٹا جمی!! اگر وہ کل تک زندہ رہتا تو پورے انیس سال کا ہوتا۔ ہائے! ـــ میرا بیٹا!!

میں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور میری انگلیاں بنفشی پھولوں کی پتیوں کو چھونے لگیں۔ ان خوبصورت پھولوں کو جمی نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ پھول اسے بے انتہا پسند تھے ـــ اسے ہر خوبصورت شے سے محبت تھی۔

میں تپتی ہوئی دھوپ میں بیٹھی تھی لیکن مجھے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ جس سے میں اتنا زیادہ سوچتی رہی تھی کہ احساس کی حد سے بھی گذر چکی تھی شاید اب میں کبھی کچھ محسوس نہ کر سکوں۔

اتنے میں کوئی نرم اور گرم چیز میرے پاؤں کے پیچھے محسوس ہوئی یہ جمی کی بلی پال تھی۔ اس نے بڑی التجا سے مجھ کو دیکھا اور سر ہلانے لگی۔ وہ دیر تک سر ہلاتی رہی۔ دیر تک اسکی مونچھوں کے بال ہلتے رہے اور اسکے خرخراہٹ سے میں نے اسکے سکون کا اندازہ لگایا۔

میں نے ایک ہاتھ آہستہ آہستہ اسکے بالوں پر پھیرنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا سر میرے ہاتھ سے رگڑنے لگی اسکی دم پرچم کی مانند لہرا رہی تھی۔

میں نے اسے گود میں اٹھا لیا وہ ہنستی تھی۔ وہ میری گود میں چپٹ سی گئی اور ناخن اندر کر کے اپنے ایک پنجے سے میری انگلی پکڑ لی۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ جمی کے ساتھ کیا کرتی تھی۔

"جمی!! ـــ جمی!!" میرا دل چیخ اٹھا ـــ جمی جو ہمیشہ بیمار اور زخمی جانوروں کو گھر لے آتا تھا ـــ جمی جو ہمیشہ بے مال و پر پرندوں کی پرورش کرتا تھا ـــ جمی جو ہمیشہ بلی کے لاوارث بچوں کو پالتا تھا اور نہایت محبت سے انکی نگہداشت کرتا تھا۔

پال کے پنجوں کی گرفت آہستہ آہستہ میری انگلی کے گرد تنگ ہوتی گئی اور میں نے اسکے جسم پر گوشت کی تہیں محسوس کیں۔ اب سے کچھ عرصہ قبل اسکے جسم پر اتنا گوشت نہیں تھا۔ اسکی لٹکی ہوئی کھال میں پسلیاں جھلکتی تھیں اور اسکے چمکیلے زرد بال کمزور اور گندے رہا کرتے تھے۔ اسکی عنبری آنکھوں میں بے اعتمادی کی چمک ہوتی تھی ـــــ اور اسے دنیا پر بھروسہ نہ کرنے کا پورا حق پہنچتا تھا۔ دنیا نے اسکے ساتھ کبھی ہمدردی نہیں کی تھی۔ اسکا ایک پاؤں کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ زخم کاری لگا تھا اس کا پنجہ بیکار ہو گیا تھا۔ جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا مجھے یقین تھا کہ اسکا وہ پاؤں کبھی ٹھیک نہ ہو سکے گا مگر اب میں اسی پاؤں کو دیکھ رہی تھی اب بالکل ٹھیک تھا اور گوشت بھی چڑھ گیا تھا۔ یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی زخمی پاؤں ہے لیکن یقین کرنا پڑتا تھا۔ اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ جی نے اس کی نگہداشت کی تھی۔ یہ جی کی محبت تھی جسنے اس جنگلی اکیلے یا مددگار جانور کو خوبصورت پال بنا دیا تھا۔ جو اب سکون سے بیٹھی دم ہلا رہی تھی۔

ہائے! جی!! ـــــ میرا ہاتھ پال کے جسم سے مس ہوا تو اسکے بالوں میں وہ خوشبو آئی تھی جو جی نے آج ہی صبح ناشتے کے وقت اسے لگایا تھا۔ وہ جی کے علاوہ اور کسی کو اس بات کا حق نہ دیتی تھی کہ اس سے قریب تر ہو۔ میری اس جرأت پر اس نے احتجاج کیا اور میری گود سے اچھل کر دور جا کھڑی ہوئی۔ اور غصے میں دم ہلاتی رہی۔ پھر بلی بڑی شان سے کمرے کے باہر نکل گئی۔ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا ـــــ جی ـــــ! جی ـــــ!!

میں نے اپنے پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز سنی لیکن پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ورنا تو تیزی سے سب سے [illegible] کی پرانی پیچیدہ [illegible] پر بیٹھ گئی۔ اسنے دونوں ہاتھ اپنے پاؤں کے گرد باندھ لئے اور سر کو گھٹنوں کے اوپر اس طرح جھکا لیا کہ اسکے الجھے ہوئے بالوں سے اس کا خوبصورت چہرہ کسی قدر چھپ گیا تھا۔

میں مڑ کر ورنا کی طرف دیکھتی رہی۔ میں اسکے قریب رہنا نہ چاہتی تھی۔ میں اسے دیکھنا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ میرا خیال تھا وہ اس وقت موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا اس کا باعث یہی تھی۔ وہ ابھی صرف [illegible] برس کی تھی لیکن مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک سیڑھی پر خاموش بیٹھی رہی پھر اسی طرح خاموشی سے اٹھی اور واپس چلی گئی۔

سورج رفتہ رفتہ ڈھلنے لگا تھا۔ گرمی کی وجہ سے میرا سر چکرا رہا تھا لیکن میں نے اسکی قطعی پرواہ نہیں کی میں سوچ رہی تھی کہ اگر خدانخواستہ جی مر گیا تو ـــــ!! اور یہ تصور بھی کسی جسمانی تکلیف سے کم نہیں تھا۔ اتنی ہی تکلیف تھی جتنی آج سے انیس سال قبل میں نے جی کی پیدائش کے وقت محسوس کی تھی۔

دور ـــــ کہیں سے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور ایک لمحہ کے لئے میں نے اپنا سانس رکتا محسوس کیا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جی روشنی کے کمرے [illegible] لیکن یہ جی نہیں تھا ـــــ! یہ جی نہیں تھا ـــــ!!

میں نے کمرے کے باہر نظر ڈالی [illegible] کے [illegible]

[illegible]

[illegible] لیکن جی اسے دیکھ کر [illegible]

رحمت نے ہماری توبہ قبول کر لی ہوگی

بل ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔ ہمیں اپنے کئے کی سزا تو اسی وقت مل چکی تھی جب ہم نے اپنی حرارت قاہرہ گنوائی تھی ہم خدا کو بھول گئے تھے۔ اس ایک لغزش کی وجہ سے ہم دونوں کو اپنی تعلیم چھوڑنی پڑی۔ جمی کی قبل از وقت پیدائش برداشت کرنا پڑی اور پھر اکیس سال تک اپنے اس گناہ کے بار کو اٹھائے پھرے۔ بل نے ٹھیک کہا خدا ہمیں اس سے زیادہ سزا نہیں دیگا ـــــ لیکن اگر اس نے ایسا کیا۔ اگر اس نے جمی کو ہم سے چھین لیا تو پھر میں ایسے خدا سے کوئی واسطہ نہ رکھونگی

تپتی ہوئی دھوپ میں میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور بڑبڑائی۔ اے خدا اگر جمی مر گیا تو میں پھر کبھی تیری عبادت نہیں کرونگی

میں نے اپنی پشت کی طرف ننگے پاؤں کی چاپ سنی ورنا لوبیز تھی میں نے مڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکی مستقل تیز دھوپ میں بیٹھے بیٹھے میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں اور انمیں جلن ہو رہی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ سب کچھ صاف نظر آنے لگا۔

ورنا ویز میرے پیچھے کھڑی تھی۔ اسکے ایک ہاتھ میں سینڈوچ کا ٹکڑا اور دوسرے میں سیاہ کافی کی پیالی تھی۔ وہ شرمیلے مگر خوشامدانہ انداز میں مسکرائی

" مجھے نہیں چاہئے" میں نے کہا۔

وہ بدستور کھڑی رہی اور بے معنی مسکراہٹ چہرہ پہ لئے مجھے دیکھتی رہی۔ یہ تصور کہ یہ ـــــ یہ لاوارث بھی وہی ہے جو میرے بیٹے کو موت کے خطرناک حد تک قریب پہنچانے کی ذمہ دار تھی مجھے پاگل بنا دینے کے لئے کافی تھا۔ میں شدید غصہ اور نفرت کے عالم میں اس پر گرج پڑی۔ "مجھے نہیں چاہئے ـــــ!! کیا تو سیدھی زبان بھی نہیں سمجھ سکتی حرامزادی"

اس نے مجھے دیکھا اور اسکے چہرہ پہ مسکراہٹ کی جگہ پژمردگی چھا گئی۔ اسکے ہونٹ لرزنے لگے اور کرب سے اسکی آنکھیں سیاہی مائل ہوگئیں لیکن اسنے اف تک نہ کی۔ وہ مڑی اور آہستگی سے گھر میں واپس چلی گئی۔

میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا مجھے اپنے غصے پہ ندامت تھی کہ اگر یہ حرامزادی بھی تھی تو اس میں اس بیچاری کا کیا قصور اسکی ماں ایوینز ایڈورڈز کسی طوائف سے واقعی کم نہ تھی مگر اسمیں اسکا کوئی قصور نہیں۔ جمی کے بنے ہوئے میں بھی اسکا کوئی قصور نہ تھا جلتے ہوئے گھر میں جمی کو اسنے کب بلایا تھا۔ جمی خود گیا تھا کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔ اسے ابھی دنیا میں بہت کچھ دیکھنا تھا ـــــ کھیت اور زمین جن سے وہ محبت کرتا تھا شادی بچے، خوشیاں اور محبت کرنے والی ذلیل اور یہ بھی ہے ـــــ یہ ذلیل بچی، بڑی ہو کر یقیناً اپنی ماں کی جگہ لے گی۔

اسکی ماں آگ لگنے کی رات تک گھر پہ نہیں تھی، وہ تو ایک رات قبل بھی گھر پہ نہ تھی اور جہاں تک ہمیں معلوم ہوسکا ہے آگ خود ورنا ویز کی وجہ سے لگی تھی جب وہ خراب اسٹوو کو جلانے میں کامیاب نہ ہوئی تو ناامید ہو کر بستر پہ جا کر لیٹ رہی اور اسکی آنکھ لگ گئی۔ ادھر آگ نے زور پکڑا۔ جھونپڑی سی جھونپڑی تو تھی لپیٹ میں آگئی اور وہ اسکے اندر جلتی رہی۔ جمی نے جھونپڑی کو جلتے دیکھا تو ورنا ویز کو بچانے کے لئے دوڑ پڑا۔

اور جب ہم جمی کو لے گئے تو وہ بھی ٹرک میں چھپ کر ہمارے ساتھ چلی آئی۔ اور تب سے ہر وقت سایہ کی طرح

ہمارے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ میرا اپنا غم اتنا شدید نہ ہوتا تو شاید مجھے اس سے ہمدردی ہو جاتی۔ اسکا سب کچھ چل با تھا۔ اس نے میرے گھر میں پناہ لے رکھی ہے۔ لہو سکے لئے اور کوئی جگہ پناہ کی نہیں۔

لیکن پھر بھی میرا خیال تھا جمی کے جلنے کا سبب وہی تھی۔ اگر جمی اس کے پیچھے نہ گیا ہوتا تو اس وقت وہ کھیت میں ہل چلا رہا ہوتا یا روئی کے لہلہاتے سنہرے کھیتوں میں ٹریکٹر چلا رہا ہوتا اور ٹریکٹر کی چمکدار دھات پر سے دھوپ منعکس ہو کر اسکے پسینے میں شرابور جسم پر پڑ رہی ہوتی۔

جمی ——— ! جمی ——— !! جمی ——— !!! میرا دل اندر سے چیخ اٹھا۔

میں اٹھی اور واپس کمرے میں چلی گئی اور جمی کے بستر کے برابر بیٹھ گئی۔ میں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بس دعا کر سکتی تھی۔ کتنا ہیبت ناک منظر تھا۔ سر سے پیر تک اسکے جسم کا تقریباً ہر حصہ چھپا ہوا تھا۔ اسکا سانس اتنا آہستہ چل رہا تھا جیسے وہ سانس لے ہی نہ رہا ہو۔

ڈاکٹر ولبرس آہستہ آہستہ چل رہا تھا لیکن جمی کی مرہم پٹی میں اسکے ہاتھ بے حد تیز اور یقین کے ساتھ چل رہے تھے۔ دھوپ دریچہ کی راہ سے کمرے میں آ رہی تھی اور جب ڈاکٹر ولبرس کمرے میں چلتا تو دھوپ میں اسکے بال یوں چمکتے جیسے کرمیں کھیلیاں۔ ڈاکٹر ولبرس تجربہ کار تھا اور بیس میل کے اندر وہ واحد ڈاکٹر تھا۔

وہ جمی کے پاس سے ہٹ گیا اور کھڑکی پر کھڑے ہو کر دھوپ کا منظر دیکھنے لگا۔ وہ کتنا بوڑھا لگ رہا تھا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور اسکے شانے ڈھلے ہوئے تھے۔

کیا وہ جمی کے لئے دعا کر رہا ہے! میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ مڑا اور مجھ سے مخاطب ہوا، "میں جو کچھ کر سکتا تھا وہ تو میں نے کر دیا۔ باقی خدا کے ہاتھ ہے" وہ لڑکھڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا "میں دھوپ میں اپنے تھکے ہوئے جسم کو سینکتا ہوں ضرورت پڑے تو مجھے بلا لینا"

دروازہ آہستہ سے بند ہو گیا اور میں اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی "بل اچھا ہوتا اگر ہم جمی کو بڑے اسپتال لے چلتے" بل نے نفی میں سر ہلایا "مائی ڈیئر! یہ ناممکن ہے اسپتال یہاں سے پچاس میل سے زیادہ دور ہے اور راستہ بھی لمبا ہے ہم تو شاید وہاں تک پہنچ بھی نہیں سکتے —!"

"ہاں!" میں نے کہا "سچ ہی کہتے ہو" ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ صرف دیکھ ہی سکتے ہیں اور دعا —

میں نے بستر کے سرہانے کی میز پر سے بائبل اٹھائی۔ یہ چھوٹی اور خوبصورت تھی۔ میں نے اسے کھولا تو سرورق پر لکھا تھا —

"جمی کے لئے —— دسویں سالگرہ پر محبت کا تحفہ۔ تمہیں ایسے بے انتہا سال دیکھنے نصیب ہوں — اور ہر سال خوشی اور مسرت سے معمور ہو —— والد و والدہ"

میری آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند چھا گئی میں نے اپنے حلق میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی محسوس کی۔ کل ہی جمی کی سالگرہ تھی — اسکی انیسویں سالگرہ اور آج میرا ارادہ اسکے لئے کیک پکانے کا تھا۔ بڑے کمرے میں اسکے تحائف رکھے تھے۔

—— بائیبل پر ایک کتاب اور اسکے چھوٹے سے گراموفون کے کچھ نئے ریکارڈ۔ تحائف چھوٹے اور معمولی تھے لیکن اسے یہی چیزیں بے حد پسند تھیں۔ اسے ہر چیز پسند تھی۔

میں نے بائیبل کھولی اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے پڑھنے لگی :- اگر تیرے اندر رائی کے دانے کی برابر بھی ایمان و اعتماد ہو تو اس پہاڑ سے کہے کہ ہٹ جا تو وہ ہٹ جائے گا اور تیرے لئے کچھ ناممکن نہ رہے۔

"آہ !" میں خاموشی سے چیخ اٹھی۔ کاش ایسا ہو جائے۔

میں نے اپنے شانے پر بل کا ہاتھ محسوس کیا —— خاموش اور بے سکون لمس میں نے بائیبل میز پر رکھ دی اور ادھر اُدھر دیکھا۔ پال سامنے کھڑی تھی اور مجھے اور بل کو تیز نظروں سے گھور رہی تھی۔ وہ بستر تک گئی۔ اسکے پنجے لوہے کی کانٹوں کی مانند حرکت کر رہے تھے۔ وہ جمی کو دیکھتی رہی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا جمی ہی ہے تو وہ بیٹھ گئی اور اپنے نازک پنجے سے منہ کھجانے لگی۔ پھر وہ جمی کے پاؤں تلے لیٹ گئی۔ ایک زرد فر کی گیند کی مانند۔ اسنے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یوں سانس لینے لگی کہ اسکا پیٹ موزوں انداز سے دبنے اور ابھرنے لگا۔

میری آنکھوں میں آنسو منڈلانے لگے میں نے بیجی کے ساتھ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا کمرہ میں جمی کی تمام چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ ایک طرف شیلف میں کھیتی باڑی کے کھلونوں کا سیٹ رکھا تھا جو ہم نے اسکی چھٹی سالگرہ پر دیا تھا۔ وہ اس سے بہت کھیلا تھا۔ مگر اپنی چیزوں کو بڑی احتیاط سے رکھتا تھا۔ اسکی تمام چیزیں نئی معلوم ہوتی تھیں۔

کھیتی باڑی کے کھلونوں کے برابر اسکے پتھروں کا ڈھیر بھی رکھا تھا اور ایک کمزور سی کرسی پر اسکا گراموفون اور ریکارڈ بھی رکھے تھے۔ اسکو ہمیشہ معمولی چیزیں ملتی تھیں لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ خوش رہتا تھا۔

آنکھوں میں آنسو لئے میں وہاں سے ہٹ گئی۔ دروازے سے باہر گیلری میں میں نے ورنا لوتھر کو کھڑے دیکھا۔ وہ پاؤں پھیلائے کھڑی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں اسکے پاؤں سوکھی لکڑیوں کی طرح لگ رہے تھے۔ اسکے بال جو پہلے سنہرے تھے اب اسقدر بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے سوائے آنکھوں کے اسکا سارا چہرہ چھپا لیا تھا۔ وہ انہیں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اسنے محسوس کیا کہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے تو وہ مڑی اور خاموشی سے چلی گئی۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور اسکے خلاف میرے دلمیں نفرت کا شدید جذبہ ابھرتا چلا گیا میرے بیٹے کو اس حال تک پہنچانے والی وہی تھی۔

بل کی گھبرائی ہوئی آواز سنکر میں چونک پڑی :- "ماؤڈی ! ماؤڈی !!" وہ چیخا اور جمی کے بستر پر جھکا ہوا تھا میں دوڑکر اسکے قریب پہنچ گئی اور جمی کو دیکھنے لگی۔ اسکی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ خدایا تیرا شکر ہے۔! اسنے آنکھیں کھول دیں جمی نے ہم دونوں کو دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ درد بہت شدید تھا "ممی ——! پاپا ——!" وہ بڑبڑایا اور اسکی آواز کمرے کے بھیانک سناٹے میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر کے رہ گئی۔

"جمی" میرے اور بل کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ وہ اسطرح تیز تیز سانس لے رہا تھا جیسے بہت زیادہ تکلیف میں ہو۔ لیکن اس کی آنکھیں بڑے دلیرانہ انداز میں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ "ممی —— بائیبل —— !" بڑی آہستگی

سے وہ کہہ سکا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ "تئیسواں باب"۔

میں نے بائبل اٹھائی۔ میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔ بائبل میرے ہاتھ سے گر گئی اور خود بخود تئیسواں ۲۳ باب کھل گیا۔ شاید وہ اسے اکثر پڑھتا تھا۔

"خدا میرا رکھوالا ہے۔ مجھے کسی چیز کے مانگنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کانپتی ہوئی آواز سے پڑھنا شروع کیا جو ہر لفظ کے ساتھ پر زور اور یقینی ہوتی گئی۔ "وہی مجھے سرسبز اور لہلہاتے میدانوں تک لے جاتا ہے۔ وہی پانی کے پرسکون چشموں کی جانب میری رہنمائی کرتا ہے۔ وہی میری روح کی حفاظت کرتا ہے۔ . . . . . !"

میں نے بائبل ختم کی اور آہستہ سے بند کر کے رکھ دی اور جمی کو دیکھنے لگی۔ وہ کتنے سکون سے لیٹا ہوا تھا۔ اسکی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ نیند میں مسکرا رہا تھا۔ شکر ہے خدایا! شکر ہے ——! میرے دل سے دعا نکلی۔

پھر اسکے بعد میں نے بل کے چہرہ کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ جمی سو نہیں رہا بلکہ مر چکا ہے۔ "آہ ——! نہیں ——! نہیں ——!!" میں کراہی۔ "وہ مرا نہیں —— میرا بیٹا مر نہیں سکتا —— وہ نہیں مر سکتا ——" بل کے بازوؤں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اس کے بازو مجھے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ میرے اندر بھی اپنی ہی جیسی قوت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میری ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ میں جمی کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ "آہ ——! نہیں ——! نہیں ——! میرا بیٹا —— نہیں ——! میرا اکلوتا بیٹا —— ! نہیں نہیں ——!!"

"ماؤڈی! ماؤڈی!" بل نے کہا "خدا کی مرضی یہی تھی کہ وہ زندہ نہ رہے۔ اگر اسکی مرضی نہ ہوتی تو جمی نہ مرتا۔"

"یہی تھی خدا کی مرضی تو میں ایسے خدا کو نہیں مانتی۔ وہ ایسی ہی باتوں کو روا رکھتا ہے تو مجھے ایسے خدا سے انکار ہے۔ وہ ظالم ہے۔ وہ کینہ پرور ہے۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں! میں تمہارے محبوب خدا سے نفرت کرتی ہوں ——! میں دیوانہ وار چیخی

"ماؤڈی ——!" بل کو صدمہ پہنچا لیکن اسکے بازو میرے گرد جمے رہے۔ وہ مجھے سنبھالے ہوئے تھا۔ میں نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دو تین مکے بھی مارے۔ مجھے اسوقت اس سے نفرت سی معلوم ہوئی۔ واقعی اسوقت مجھے اس سے۔ اپنے آپ سے۔ ہر زندہ شے سے نفرت ہو گئی تھی کیونکہ میرا بیٹا —— میرا اچھا بیٹا مر چکا تھا۔

میں نے سر اٹھایا تو ورنا لونز سامنے کھڑی تھی۔ اسکی بڑی بڑی گول آنکھیں اسکے سفید چہرہ پر چمک رہی تھیں۔ وہ ڈاکٹر ولیریس کے آگے کھڑی تھی۔ میں نے اس ناپاک اور منحوس ہستی کو دیکھا۔ اس کے خلاف میرے قلب و روح کی گہرائیوں میں نفرت بھری تھی۔ جمی کی موت کا باعث وہی تھی۔

میں نے جد و جہد کی اور بل کے قوی بازوؤں کی گرفت سے آزاد ہو کر ورنا لونز پر جھپٹ پڑی۔ "کمبخت مجھے تجھ سے نفرت ہے ——" میں گلوگیر آواز میں چلائی۔ "مجھے تجھ سے نفرت ہے۔ میرا بیٹا مر گیا اور تو ابتک زندہ بیٹھی ہے —— ذلیل ناکارہ تو ہی اس کی ذمہ دار ہے تو نے اسکو مارا —— تو نے میرے جمی کو مارا ——!" میں نے اس کے شانوں کو پکڑ لیا۔

اس کی [illegible] میرے ہاتھوں میں [illegible] میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا [illegible] زور سے جھنجھوڑ کر اسکا سر [illegible] سفید چہرہ [illegible]

گول، سیاہ آنکھوں سے مجھے تکتی رہی۔ اسکے لمبے گرد آلود بال اڑ اڑ کر میرے ہاتھ پر لوٹ رہے تھے میں نے پھر لیتے گرد بل کے ہاتھوں کو محسوس کیا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ نیچے گرا دئے۔

میں نے ڈاکٹر ولبرس کے ہاتھ میں سوئی دیکھی تو بیچی۔ نہیں ۔۔۔۔! " مجھے اس کی ضرورت نہیں مجھے . . . . . مگر سوئی میرے جسم میں چبھ چکی تھی، میں نے ایک جھرجھری سی لی

"میرے بیٹے ۔۔۔!" میں نے روتے ہوئے کہا "میرے بیٹے، میرے بیٹے، میرے بیٹے۔ !" اور پھر اسکے بعد آہستہ آہستہ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔

آخری شئے جو میں نے دیکھی وہ ورنا لوتھر تھی جو برابر کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اسکے چہرہ پر موت کا سکوت تھا اور بڑی بڑی گول آنکھیں جو اس کے جسم کی مناسبت سے کبھی کچھ بڑی تھیں۔ اس کے مرجھائے ہوئے رنجیدہ چہرہ پر سے رات کے خیالات سے پریشان ہو کر میری آنکھ کھل گئی۔ میرے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی۔۔۔ تاریکی دور ہو گئی مگر میں مسلسل چیختی رہی میری چیخیں کم نہ ہوئیں یہاں تک کہ پھر میں نے اپنے گوشت میں سوئی کی چبھن محسوس کی اور میں دوبارہ سو گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو دوپہر تھی اور سورج کی کرنیں گرم کمبل کی مانند مجھے اپنے جسم پر محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے چادر کے اوپر ہاتھ پھیلا تو لسے پسینہ سے تر پایا ۔۔۔ جیسے میرا سارا جسم روتا رہا ہو۔

میں بستر سے اٹھی اور ممی کے کمرہ سے کترا کر باورچی خانہ کی . . . . طرف چلی گئی اپنے لئے کافی بنائی کچھ بسکٹ کے ٹکڑے ایک پین میں چو لہے کے اوپر رکھے ہوئے تھے اور بھنا ہوا گوشت اور انڈے ایک پیالے میں میز پر دھرے تھے۔

"بے چارہ بل" میں نے بے دلی سے اسے ناشتہ تیار کرتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک گھونٹ کافی کا پیا۔ یہ ٹھنڈی اور کڑوی تھی۔ بل یقیناً اس سے بہتر کافی بنا سکتا تھا۔ میری نظر برتن دھونے کی جگہ پڑی۔ اسمیں دو جھوٹی پلیٹیں پڑی تھیں اچھا تو ورنا لوتھر ابھی یہیں ہے

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اسے بڑے دروازے کے پیچھے کھڑے پایا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں انڈے لئے کھڑی تھی۔ اور وہ بڑا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی مگر دروازہ اس سے کھلتا نہ تھا میں نے دروازہ کھول دیا اور وہ بدحواسی کے ساتھ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی اور بے اعتمادی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی تو میں نے ریفریجریٹر کھول دیا اور اسوقت تک کھولے رہی جب تک اس نے تمام انڈے اندر نہ رکھ دئے۔

وہ دوبارہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر اپنی نگاہوں سے میز پر رکھے ہوئے گوشت اور انڈوں کو دیکھا مجھے اسوقت پتہ چلا کہ ناشتہ اسی نے تیار کیا تھا ۔۔۔ میں نے طنز سے کہا "ناشتہ تیار کرنے کا شکریہ۔"

اچانک اسکے چہرہ پر خوشی کی مسکراہٹ پھیل گئی "کوئی بات نہیں ۔۔۔!" اسنے بڑی عاجزی سے جواب دیا میں نے بل کے آنے کی آہٹ تو سنی مگر میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا چپ چاپ بیٹھی سرخ و سفید میز پوش پر سورج کی سنہری کرنوں کی چمک دیکھتی رہی۔ بل میرے برابر سے گذر ۔ تو میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں خنے ہوئے ہیں

ے سویٹر پر بھی مٹی کے دھبے تھے۔ مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اور میں نے پوچھ ہی لیا۔ "کیا سب تیار ہے۔؟"
ل میرے برابر ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور گلوگیر آواز میں کہا: "سب کچھ تیار ہے۔" میں نے تمہارے والدین کی بڑی
ند کی ہے۔ مقدس لیف رسم انجام دینگے۔ اگر تمہاری حالت درست رہی تو دو بجے تک تدفین ہو جائے گی۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔
ل نے بے یقینی کے انداز میں اپنے مٹی سے سنے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا اور بولا: "میرا خیال ہے میں ہاتھ دھو لوں؟"
"ہاں" میں نے کہا۔ "اور مجھے بھی کچھ کام کرنے ہیں" لیکن میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بیٹھی ہوئی [illegible] گھونٹ حلق
رتی رہی۔ میرا دماغ بالکل خالی تھا۔ میں تلخ یادوں سے دور ہو جانا چاہتی تھی اس اثنا میں ورنا لوئیز نے فرست
م شروع کر دیا۔ اس نے پلیٹیں صاف کیں۔ لیکن ان کو خشک کرنے کا اسے خیال نہ رہا اور ان کو غلط جگہ پر بھی رکھ دیا
ے فرش کو جھاڑو تو دی لیکن گرد کے دھبے اب بھی باقی رہ گئے تھے۔ اور میں جو عام حالات میں اپنے گھر میں ایک دھبہ
ہیں برداشت کر سکتی تھی۔ خاموش تھی۔
میں میز پر بیٹھ گئی اور سورج کی سنہری کرنوں کی آگ مجھے گرمی تو پہنچانے لگی۔ لیکن میرے دل کو نہ گرما سکی نہ تو یخ
ند منجمد کیفیت کو دور کر سکی نہ بیکسی اور تنہائی کو۔
لی دروازہ کی طرف بڑھی تو ورنا لوئیز نے اسے روکا نہیں۔ وہ دبے پاؤں کمرے کے وسط میں آئی اور متجسس
ں سے ہر چیز کا جائزہ لینے لگی۔ ورنا لوئیز اس کا کان سہلاتی رہی مگر وہ چپ تھی۔ وہ قطعی کوئی دلچسپی نہیں لے رہی
پھر وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتی رہی۔ پھر مجھے مڑ کر اسٹو اور کرسیوں کی طرف دیکھا۔ اسکی نگاہیں مجھ پر ٹھہر گئیں
ن حال سے پوچھ رہی ہو کہ جمی کہاں ہے۔؟ آہ وہ جمی کو کھو چکی تھی۔
وہ میاؤں میاؤں کرتی میری گود میں آ بیٹھی۔ اس کی دُم میری ٹھوڑی سے مَس ہوتی رہی میں نے اسے کھینچ کر سینے
بالیا۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ جمی مر چکا۔ اور وہ بھی اب میری طرح بے سہارا رہ گئی تھی۔ میں نے اپنی جلتی ہوئی خشک آنکھیں
نرم بالوں میں جذب کر دیں اور اسے پیار کرنے لگی۔ جمی بھی اسے پیار کرتا تھا۔ میں اسے ہمیشہ پیار کرتی رہوں گی
ے پاس وہی جمی کی آخری نشانی تھی جسے جمی چاہتا تھا۔ وہی میری کائنات تھی۔
میں اس کو گود میں لئے بے پرواہی سے ورنا لوئیز کو کھانا چنتے دیکھتی رہی۔ آلو گلے نہ تھے۔ روٹیاں بھی جل گئیں
باغ میں سے جو سیم توڑ کر اس نے پکائی تھیں وہ لعاب دار تھیں۔ لیکن پل نے اور میں نے انہیں مشین کی طرح کھایا
کھانے سے کیا دلچسپی تھی۔ ہماری محبوب چیز تو صرف ایک تھی۔ جو ایک کمرے میں پڑی تھی۔ لیکن اس کمرے میں جانے
ہم میں ہمت نہ تھی۔ مجھ میں تو اس موضوع پر بات کرنے کی بھی جرأت نہ تھی۔
ہم ابھی بے حس و حرکت بیٹھے تھے کہ تابوت آگیا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے بالوں میں کنگھی کی۔
وہ جمی کی میت کو لئے جا رہے تھے میں کھڑی دیکھتی رہی۔ مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ سوائے ایک مبہم
ف وہ خلا کے جو میرے سارے وجود میں پھیل چکا تھا۔ ہم باہر جا کر گاڑی میں بیٹھے اور آخری آواز جو میں نے سنی

وہ باورچی خانہ سے آرہی تھی جہاں وہ نالو مسز پلیٹیں صاف کر رہی تھی۔

ہمارا گرجا کوئی آدھ میل کی طویل پیچ در پیچ پگڈنڈیوں۔ اونچی۔ نیچی پہاڑیوں، تیز بہتے ہوئے آبشار اور لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں کے بعد واقع تھا۔ سواری آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور راستہ کا نظارہ نہایت ہی خوبصورت تھا فضا زرد رنگ کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر تھی۔ نیلے آسمان کے پس منظر میں چنار کی صاف اور خوبصورت شاخیں جھول رہی تھیں۔ میدانی چڑیوں کے ملے جلے نغمے کھڑکی سے مجھ تک پہنچ رہے تھے اور گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

لیکن میں نے اس خوبصورتی کو ذرا محسوس نہیں کیا، میری نگاہیں صرف ایک چیز پر جمی ہوئی تھیں، تابوت پر جو میرے آگے تھا اور مجھ سے میرے بیٹے کو دور لئے جا رہا تھا۔

ہم گرجا پہنچ گئے جہاں پہلے ہی کچھ دوست اپنی اپنی کاروں میں میرے جمی کی تدفین میں شریک ہونے کے لئے جمع تھے میں بل کے برابر بیٹھ گئی پادری لیف کو پڑھتے سنکر میرے دل میں چھریاں سی چل رہی تھیں مجھے سوائے ایک خیال کے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سُنا ”اس انسان سے عظیم محبت کرنے والا کون شخص تھا۔ جسنے اپنے دوستوں کی خاطر جان دیدی،“ مجھ پر پھر بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔

میرے برابر بھاری بھرکم بل بیٹھا تھا۔ میں نے ایک مضبوط انسان کی دلدوز آہیں اور جگر خراش چیخیں سنیں پھر بھی بے حس بیٹھی رہی۔ میرا دل برف کا ایک تودہ بن گیا تھا۔

میں نے مقدس لیف کو دعا کرتے سُنا مگر محسوس کیا کہ یہ سب بیکار ہے وہ ایک ایسے خدا سے استدعا کر رہا ہے جسکا وجود ہی نہیں ہے —— یا جسے اپنے بندوں کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ بالکل خیال نہیں کرتا اور میں اب کبھی عبادت نہیں کرونگی۔ اور نہ اس پر کوئی عقیدہ رکھونگی عقیدہ حماقت ہے —— صرف ایک دھوکہ

انہوں نے جمی کو سُرخ مٹی کے نیچے دبا دیا۔ مٹی جو مٹھی مٹھی بھر اسکے تابوت پر ڈالی جا رہی تھی۔ اسکی چوٹ میرے دل پر لگتی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن یہ بھی میرے دل کی برف کو نہ پگھلا سکی۔

ہم اسے وہاں چھوڑ آئے۔ اپنے چہیتے بیٹے کو اور چند پھول جنہیں وہ بے انتہا پسند کرتا تھا اسکی قبر پر بکھرے ہوئے تھے تمام راستے ہم خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ خاموشی جو سنسان تھی افسردہ تھی۔ بل کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور ہونٹ پر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن پھر بھی وہ مجھے پیار سے دیکھتے ہوئے بولا ”اوڈی! کتنا اچھا تھا جمی۔“

”ہاں!“ میں نے کھوئے ہوئے انداز سے کہا۔

”جیسا کہ مقدس لیف نے کہا تھا وہ اسوقت جنت میں ہوگا“ بل نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔ اسکے چہرہ پر اعتماد چمک رہا تھا۔

عقیدہ! مجھے نفرت ہے عقیدہ سے، میں کانپ اٹھی۔ میری بے حسی ختم ہو چکی تھی۔ اسکی جگہ میرے اندر خطرناک قسم کی آتش غضب بھڑک اٹھی تھی ”جنت! “ میں چیخی ”جنت ونت کچھ نہیں ہے خدا بھی نہیں ہے کچھ بھی نہیں ہے!“ مجھے معلوم تھا کہ میری اس بات سے بل کو تکلیف پہونچیگی لیکن میں اپنے آپ کو روک بھی نہ سکی تھی۔ اگر واقعی خدا کا وجود ہوتا تو کیا وہ جمی کو

... طرح مصیبت اٹھاتے دیکھ سکتا تھا؟ کیا وہ جی کو ہم سے جدا کر سکتا تھا؟ کیا وہ اتنا بےانصاف ہو سکتا تھا؟ پھر بھی اسکا وجود رہے تو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔"

بل ششدر رہ گیا۔ میں نے اسکی آنکھوں سے اندازہ لگایا کہ اسے سخت تکلیف پہنچی۔ اس نے بڑی نرمی سے کہا، ماؤڈی! اسکا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ یہی اسکی عظمت کی دلیل ہے۔ ہمارا اس پر ایمان ہونا چاہئے۔ ہمیں اس پر اعتماد رکھنا چاہئے۔ اس اعتماد کے بغیر زندگی بےکار ہے۔"

"میں اب کبھی اس پر اعتماد نہیں رکھوں گی۔" میں نے کہا۔

بل نے کہا: "موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے ماؤڈی!"

موت درحقیقت دوسری زندگی کا نام ہے۔ نئی زندگی اور نئی دنیا یہاں سے افضل ہے۔ ایک نئی زندگی جہاں خدا کا دیدار ہوگا۔

میں نے کہا: "میں نہیں مانتی ـــ اب مجھے کسی پر بھی یقین نہیں رہا۔"

بل کے ہاتھ اسٹیرنگ پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اس کی نگاہیں بل کھاتی پگڈنڈیوں کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"ماؤڈی! وہ ایک طویل خاموشی کے بعد بولا۔ تم ایک کسان کی بیوی ہو۔ تم نے اپنی ساری زندگی کھیتوں میں گزاری ہے۔ تم جانتی ہو کہ بیج زمین سے اُگتا ہے، پھل دیتا ہے۔ اور فنا ہو جاتا ہے۔ جو کچھ بچتا ہے وہ اناج کی مردہ بالیاں ہوتی ہیں لیکن مردہ اناج کے دانے کو دوبارہ جب زمین میں بویا جاتا ہے تو وہ پھر اُگ جاتے ہیں۔ اور بہت پھل دیتا ہے۔ صرف ایک دانے سے کتنا اناج پیدا ہوتا ہے! اس دانے کی دوبارہ زندگی کہاں ممکن تھی اگر وہ پہلی مرتبہ فنا نہ ہوا ہوتا۔ ماؤڈی! موت کا بھی یہی مطلب ہے یہ دوسری زندگی ہے ایک بہتر اور بلند زندگی، ایک نئی اور زیادہ تر دلچسپ زندگی۔ میں سمجھیں!"

"میں نہیں جانتی مجھے کچھ نہیں معلوم" میں نے پریشانی سے کہا۔

"تمہیں خوب معلوم ہے جانِ من۔" اس نے پیار سے کہا۔ "تم ایک اچھی کسان ہو۔"

ہم خاموشی سے دور تک سفر کرتے رہے۔ پھر بل نے کہا۔ "میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

میں اسے دیکھتی رہی۔ اس وقت میں کسی کی بھی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھی مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ خود ہی کہنے لگا۔ "ایڈورڈز کی بیوی ـ ونا لوئیز کی ماں ـ شاید کہیں بھاگ گئی۔"

"بھاگ گئی! میں کچھ نہ سمجھی لیکن اس سے فرق بھی کیا پڑتا تھا۔"

ہاں ـــ وہ یہاں سے کہیں چلی گئی اور کوئی نہیں جانتا وہ کہاں گئی ـــ ونا لوئیز سے معلوم ہوا کہ وہ کئی روز پہلے سے غائب ہے۔ اور جب آگ لگی تو یہ بچی تنہا تھی جھونپڑی میں۔

"اکیلی تھی! مگر اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اور اب اس کو کسی یتیم خانے بھیج دیا جائے گا۔" اسنے کہا۔ "اگر" وہ رک گیا۔"

"اگر کیا!" میں نے کچھ وقفہ کے بعد پوچھا۔

اگر ہم اسے اپنے پاس نہ رکھیں، اسنے کہا۔

اور یہ جو اسنے کہا تو اس سے واقعی فرق پڑتا تھا۔ میرے اعصاب کھنچ گئے اور میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ہرگز نہیں "! میں اکدم چیخ پڑی "تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے میں کبھی ایسا نہ ہونے دوں گی وہ جمی کی تو ہین ہے منحوس نالائق طوائف زادی — میری آواز بلند ہوگئی "تم نے ایسا سوچا ہی کیوں ؟ "

بل نے اسٹیرنگ چھوڑ کر جلدی سے میرے دونوں ہاتھ تھام لئے "اچھا اچھا ! اسنے شکست خوردہ انداز میں کہا مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے پورا احساس ہے میں تو یونہی کہہ رہا تھا — ہماری بلا سے اب وہ کہیں بھی جائے اس کا کچھ بھی حشر ہو ،

پرانی کار ایک موڑ پر کھڑکھڑاتی ہوئی گھوم گئی اور ہمارے مکان کے سامنے والے شاہ بلوط کے درخت کے نیچے ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ میں آہستہ سے اتری اور مکان میں داخل ہوگئی۔ ایک جمی کی غیر موجودگی کا تصور ایک طمانچے کی طرح میرے منہ پہ لگا اور میرا سارا وجود جھنجھنا کر رہ گیا۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی شے اسکی یاد دلاتی تھی — پھول جو گلدان میں مہک رہے تھے بالشد کے فیروزی پردے جو اس نے میری پچھلی سالگرہ پر مجھکو دئے تھے اور تصاویر جو اسنے گذشتہ کرسمس پر پیش کی تھیں سب اسکی یاد دلا رہی تھیں۔

اور آتشدان پر رکھی ہوئی خود اسکی تصویر — گریجویشن کے وقت کی — گون میں وہ کسقدر سنجیدہ اور بردبار لگ رہا تھا۔ میں اپنے بیٹے پہ نازاں تھا۔ بل اور میں اپنی اسکول کی تعلیم بھی پوری نہ کر سکے تھے لیکن جمی نے گریجویشن کرلیا تھا۔ کتنا ہونہار تھا وہ — وہ سب کچھ کرسکتا تھا لیکن جمی اب تھا کہاں — ؟ ہائے وہ تو سدھار گیا۔

میں ان تلخ یادوں سے نجات پانے کیلئے باورچی خانے میں چلی گئی اور پہلی چیز جس پہ نظر پڑی وہ ڈوروتھی تھی۔

وہ میز کے سہارے کھڑی تھی۔ اور اسکے میلے کچیلے بھورے بال اسکے چہرے کے علاوہ سارے منہ پہ بکھرے ہوئے تھے نارنجی رنگ کے سوسن کے پھول اسکے ہاتھ میں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اسنے جمی کے پھول توڑ لئے تھے یہ تو نے کیا کیا ؟ "میں چیختی ہوئی اسکی طرف بڑھی" جمی کے پھول تو نے کیوں توڑے — یہ جرات تو نے کیسے کی ؟ ...

وہ لڑکی کانپ اٹھی اسکی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ گلدان اسکے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہوگیا پانی اور کانچ کے ذرات ہر طرف بکھر گئے ... میں نے خوفناک نگاہوں سے گلدان کی طرف دیکھا۔ میرا سب سے پیارا گلدان جو مجھے جمی اور بل نے اسوقت پیش کیا تھا جب جمی اسکول جانے کے قابل بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے گلدان بے حد عزیز تھا۔ میں نے اسکو سینے سے لگا کے رکھا تھا محنت نے اسے بھی توڑ دیا میں اسے جان سے مار ڈالوں گی حرامزادی حرام اصل تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے اسے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا مگر وہ اپنی سیاہ آنکھوں سے مجھے تکتی رہی — آنکھیں جن میں خوف تھا — دہشت تھی۔

میں اسکی طرف بڑھی تو وہ لڑکھڑا کے پیچھے کی طرف گری اور پیچھے ہٹی تو اسکا پاؤں شیشے کی ایک پلیٹ پر جا پڑا میں نے اسکے ٹوٹنے کی آواز سنی اور اسکے منہ سے خوف کی ایک چیخ نکل گئی جس میں تکلیف کا احساس بھی شامل تھا۔ اسکی پیشانی

پسینہ کے قطرے ابھر آئے اور بہہ کر اسکے ہونٹوں پر شبنم کے قطروں کی طرح جم گئے

میری نظر خون پر پڑی - سرخ خون پوری رفتار سے نکل کر فرش پر بہہ رہا تھا۔ اور اسکے گرد ایک سرخ جھلملاتا ہوا بھنور بن رہا تھا جو آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا —— سرخ دریا —— خون کا !!

ورنا لوئیز ایک پاؤں پر کھڑی تھی اپنا زخمی پیر اس نے اٹھا لیا تھا جیسے بہتے خون میں شیشہ صاف چمک رہا تھا ۔ یہ ٹکڑا تھا اور تقریباً ایک تہائی گوشت میں داخل ہو گیا تھا۔

میں نے ورنا لوئیز کے ستے ہوئے زرد چہرہ کی طرف دیکھا اسکی آنسو بھری آنکھوں میں درد کی جھلک تھی آنسو گرنے کے لئے بے چین تھے لیکن اس نے آنکھیں کشادہ کر رکھی تھیں اور انہیں گرنے سے روک رکھا تھا اسکے سب زرد ہو گئے تھے، اور نچلا ہونٹ کانپ رہا تھا لیکن اس نے اسے اپنے دانتوں سے دبا رکھا تھا۔

ورنا لوئیز کے پیچھے ایک سایہ سا حرکت کرتا نظر آیا، بل آ گیا، اور اسکی نگاہیں ورنا لوئیز کے پاؤں پر جم گئیں - او میرے خدا! بدحواسی کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا اور یوں سکون ٹوٹ گیا اور میں بھی سکتہ کے عالم سے واپس آ گئی

میں نے خون پر سے نگاہیں ہٹا لیں اور مجھے اپنے اندر انتشار محسوس ہونے لگا —— انتشار، شرم اور ندامت، یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں اس پر گرج پڑی اور گلدان اسکے ہاتھ سے چھوٹ گیا میں نے اسے مارنے کی کوشش بھی کی تھی - ایک بیکس بچی کو وہ میری ہی وجہ سے زخمی ہوئی اور کتنا گہرا زخم لگا تھا مجھے شاید اسکا اندازہ نہیں تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اسکی کمر پکڑ لی تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی اور میں نے اپنے ہاتھوں میں اسکے دہشت زدہ جسم کی سختی محسوس کی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا - اسمیں کچھ بھی وزن نہیں تھا ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھی! آخر ایسا کیوں تھا، میں سوچنے لگی اور اسے اپنے گھٹنوں پر بٹھا لیا۔ زخم پر جھک گئی - زخم گہرا تھا —— بہت زیادہ گہرا - بل بھی ہمارے ساتھ جھکا ہوا تھا لیکن میں نے بل کو چھونے نہ دیا اسے پٹی اور آیوڈین لینے بھیج دیا پھر میں نے شیشہ کے ٹکڑے کو پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچ لیا اور اسکے ساتھ ہی گرم گرم خون کا دھارا بہہ نکلا۔ میرے کپڑے خون میں تر ہونے لگے لیکن میں نے کچھ خیال نہ کیا -

میں نے جلدی سے اپنے کپڑوں میں سے ایک دھجی پھاڑی - بل پٹی لیکر واپس نہیں آیا تھا اور یہاں انتظار کا موقع نہ تھا۔ میں نے کپڑے کی پٹیاں بنائیں اور زخم کو باندھا لیکن خون رکا نہیں، پٹی سے بھی رس رس کر بہنے لگا خدایا! کیسے رکے گا یہ خون؟ یہ اسکی زندگی تھی جو بہہ رہی تھی۔ کیا میں نے اسے مار ڈالا؟ میں نے جلدی جلدی اور پٹیاں پھاڑیں اور کانپتے ہاتھوں سے زخم کو باندھتی رہی اور بے اختیارانہ دعائیں میرے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی رہیں - خون اب بھی نکل رہا تھا البتہ اسکی رفتار میں کچھ کمی ہو گئی تھی -

ورنا لوئیز کو اپنی گود میں لئے میں نے نظر اوپر اٹھائی تو پال نظر آئی چند قدم کے فاصلے پر کھڑی وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اسکا سر اٹھا ہوا تھا اور آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور روشنی میں چمک رہی تھیں۔ ان کی چمک اتنی تیز تھی کہ مجھے اپنے دماغ میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی - یوں لگتا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو - شاید کچھ یاد دلا رہی تھی -

پھر مجھے یاد آیا کسی زمانہ میں وہ بھی اتنی ہی گندی، ناتوندہ، کمزور اور زخمی تھی جتنی یہ بچی جسے میں گود میں لئے بیٹھی تھی اور جمی نے اسکی دیکھ بھال کی تھی اور وہ صحت مند ہوگئی تھی ــــــ محبت نے اسے اچھا کر دیا تھا۔

جمی کا دل محبت سے سرشار تھا ــــ زخمیوں اور بے کسوں کے لئے اس میں بڑا درد بھرا تھا۔ اور محبت ہی کی خاطر اس نے ہنستے کھیلتے ورنا لوئیز کے لئے اپنی جان دیدی۔

اور اب اس سے نفرت کر کے میں نے گویا جمی کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی۔ اسکے بے بہا تحفہ کی نا قدری کی میں نے اس خدا کی بھی خلاف ورزی کی جس نے جمی کے دل میں ایسی محبت بھر دی تھی۔ میں نے اسکی قربانی کو رائیگاں کیا۔

جب مجھے محسوس ہوا کہ خون رک گیا تو میں نے آہستہ سے پٹی کھولی۔ زخم کو صاف کیا اور آئیوڈین زخم میں لگائی میں نے ورنا لوئیز کے جسم کو درد کی شدت سے سکڑتا ہوا محسوس کیا لیکن اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا اور نہ منہ بسورا۔

میں نے بل کی لائی ہوئی پٹی اور مرہم لیکر زخم پر لگایا اور صفائی سے پٹی باندھی ــــ پھر میں نے ورنا لوئیز کا دوسرا آلودہ پاؤں دھونے لگی تو وہ میری گود سے یہ کہتی ہوئی اتر گئی کہ "رہنے دیجئے میں خود دھو لوں گی"۔

"نہیں" میں نے اسے اس کرسی کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا جس پر میں خود بیٹھی ہوئی تھی" میں دھوئے دیتی ہوں تم چلوگی تو خون پھر نکلنے لگے گا" میں نے گلدان کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کیا پانی کو سمیٹا۔ پھول ایک دوسرے برتن میں سجا کر میز پر رکھے۔ جمی کو پھول بہت پسند تھے۔ ظاہر ہے کہ ورنا لوئیز کو بھی پسند تھے۔ اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ چیزیں خوبصورت رہیں یہ تو میری غلطی تھی جسکی وجہ سے گلدان ٹوٹا۔ اگر میں اسپر نہ چلاتی تو نہ ٹوٹتا۔ اور اگر میں اسے مارنے کے لئے نہ دوڑتی تو اس کا پاؤں بھی شیشے سے زخمی نہ ہوتا۔ یہ تو میری غلطی تھی ــــ میری نفرت نے یہ گل کھلائے میں بہت شرمندہ تھی۔

میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو ورنا لوئیز میز پر کھانا لگا رہی تھی۔ "جاؤ بیٹھ جاؤ۔ ورنہ تمہارا پاؤں پھر ــــ ارے خون پھر نکلنے لگا۔" میں نے کہا اور آلو کا پیالہ اسکے ہاتھ سے چھین کر اسے کرسی پر بٹھا دیا۔

میں نے پھلیاں اور ٹھنڈی جلی ہوئی روٹیاں میز پر رکھ دیں۔ اور ایک چیز اور جو نہایت خراب اور جھلسی ہوئی سی لگ رہی تھی ــــ شاید وہ پوڈنگ تھی۔

بل میز پر بیٹھ گیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہاں صرف دو کرسیاں ہیں میں نے کہا "ورنا لوئیز کرسیاں تم نے لگائی ہیں نہ؟ تو تم کیوں لگائیں؟"

ورنا لوئیز نے میری طرف دیکھا اسکا ننھا سا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ "دو کرسیاں لگائی ہیں۔؟"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "لیکن ہم تو تین ہیں تم نے بھی تو کھانا ابھی نہیں کھایا ــــ!"

"اسنے بے چین ہو کر سامنے گرے ہوئے بالوں کو جھٹکے سے اٹھا" میں برتن صاف کرنے کے بعد کھاؤں گی" اپنے صفائی سے مجھے یاد ہے کہ اسنے دوپہر کو بھی ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ اسنے شاید اسلئے نہیں کھایا کہ وہ اپنے آپکو اس قابل نہیں سمجھتی تھی۔ اسکے چہرہ پر بکھرے ہوئے مشتبہ تبسم میں احترام اور محبت کی دبی دبی جھلک بھی موجود تھی مجھے اپنے کئے پر سخت ندامت تھی۔ وہ ہم سے محبت کرتی تھی البتہ جواب میں محبت کی توقع اسکو نہیں تھی۔ وہ ہماری خدمت کرنا چاہتی تھی یہی اسکی محبت کا تقاضا تھا۔ اسکی محبت میری محبت سے کہیں زیادہ تھی۔

میرے ہاتھ کانپ اٹھے اور آنسو ڈھلکنے لگے۔ گرم اور سکون آنسو جنہوں نے میرے دل کی برف پگھلا دی میرے دل کی بے حسی ختم ہو گئی ——— مجھے پھر سے جذبات کا احساس ہونے لگا۔ میں نے اپنے آنسو صاف کئے اور کانپتے ہوئے کہا۔ میں ایک اور کرسی لگا دونگی ما نیٹی سال سے اس میز پر تین انسان بیٹھا کرتے تھے۔ ورنا لوئیز آج رات تم ہمارے ساتھ کھانا کھا کر ہماری مدد کرو گی۔ اسطرح میز ویران نہیں رہے گی ——— اور ہم پر مزید احسان ہوگا۔ اگر تم ہمارے ساتھ رہنا پسند کرو۔ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو ——— دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ میری آواز میں التجا کا انداز ہے۔ بولو ہماری بات مانو گی ——— ؟"

ورنا لوئیز کے چہرے پر اس کے تبسم کا رنگ بدل گیا۔ اسکی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی جیسے ان میں دیئے جھلملانے لگے ہوں۔ اس نے بڑی بے صبری سے کہا۔

ہاں ! ہاں ! ——— میں رہونگی آپ کے ساتھ رہونگی ؛

میں دم بخود رہ گئی۔ میں نے ندامت سے بل کی طرف دیکھا مجھے خیال آیا صرف ایک گھنٹہ قبل میں نے کتنی بے رحمی سے انکار کیا تھا۔ اسکی آنکھیں پرنم تھیں اور محبت اور شکر گذاری اسکے چہرے سے عیاں تھی اچانک میں نے محسوس کیا کہ جی کے غم کا بوجھ ہلکا ہونا شروع ہو گیا۔ یہی حال بل کا بھی تھا اس کا تو مجھے احساس ہے کہ یہ غم مکمل طور پر ہم سے جدا نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنے بیٹے کے لئے ہمیشہ روتے رہیں گے ہمارے دل اسکی جدائی میں ہمیشہ تڑپتے رہیں گے لیکن ہم اگر کسی اور کو بھی چاہنے لگیں تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ——— اور پیر اسکو، جسکے لئے جمی نے جان دی جمی اگر ہوتا تو اسکی بھی یہی خواہش ہوتی۔

میں نے ورنا لوئیز کی طرف دیکھا۔ بال پھر اسکے چہرے پر آ گئے تھے جن کو اس نے اپنے ننھے سے ہاتھ سے پیچھے کی طرف پلٹ دیا میں اسے خوب اچھے اچھے کھانے کھلاؤنگی لیکن اس سے پہلے میں اسکے بالوں میں کنگھی کرونگی پھر بل اور میں اس کے لئے کپڑے لائیں گے۔ میں نے اپنے ایک ہاتھ میں بل کا ہاتھ لیا اور دوسرے میں ورنا لوئیز کا اور بل دعا مانگنے لگا۔

میرے مالک تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ہمیں رزق دیا۔ اور یہ زمین دی جس کے ذریعے ہم اپنے پسینے کی کمائی سے روزی حاصل کرتے ہیں۔ اے خدا تجھے معلوم ہے آج ہمارے دل کتنے ٹوٹے ہوئے ہیں لیکن شکر ہے کہ تو نے ہمیں صبر عطا کیا اور مالک تو نے اس بچی کو ہمیں دیکر ہماری تنہائی کا بھی علاج کر دیا۔ یہ ہمارے دلوں کا سہارا بنے گی۔ تو نے ہماری دعا سن لی اے رب العالمین شکر ہے تو نے ہمیں ایمان دیا جو رنج و الم میں ہمارا سہارا بنتا ہے۔ خدایا کبھی کبھی ہم بھٹک جاتے ہیں اور ہمیں راستہ نظر نہیں آتا حالانکہ راستہ ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ایمان ہی کی روشنی ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اور ہم آگے بڑھتے ہیں۔ ہمارے ایمان کی روشنیوں کو تیز کر مالک تاکہ یہ دوسروں کیلئے بھی مشعل راہ بن سکیں خدایا ہمارے ایمان کو مضبوط کر۔ آمین

" آمین " ورنا لوئیز کی باریک سی آواز بلند ہوئی۔

اور میں نے بھی بلند آواز سے کہا " آمین میرے مالک " آمین ،

خالد حسن قادری

نائلہ

ایک نشری تمثیل

کردار : امجد ٭ ناصر ٭ نائلہ

ناصر (باوقار اور پر اعتماد آواز) یہ صابن آپ بیگ میں رکھ لیں بیگم مجید تو اچھا ہے۔ کہیں رہ نہ جائے۔ چھوٹا سا تو ہے ہی۔

بیگم مجید :۔ ضرور ضرور آپ نے اچھا کیا یاد دلا دیا ۔ ناصر صاحب اگر آپ نہوں تو ہمیں کتنی دقت ہو۔

ناصر :۔ اپنے پرانے خریداروں کی خدمت ہمارے لئے باعثِ فخر ہے۔ ننھا کیسا ہے؟

بیگم مجید :۔ اچھا ہے ۔ ہر روز اس کی شرارتوں میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔

ناصر :۔ ماشاءاللہ۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ چند ہی دن کی بات ہے پھر تو گلیوں میں دوڑا دوڑا پھریگا

بیگم مجید :۔ جی ہاں ۔ اچھا ناصر صاحب صابن کا بہت بہت شکریہ ۔ خدا حافظ ۔

ناصر :۔ آپ کی آمد کا شکریہ بیگم مجید۔ خدا حافظ ۔

(بیگم مجید دروازے سے باہر نکلتی ہیں تو گھنٹی بجتی ہے)

ناصر :۔ (ذرا بلند آواز سے) امجد۔ ابھی تک تم نے چائے ختم نہیں کی ۔

امجد :۔ (قدرے نرم آواز لیکن جوابی انداز میں بلند، برابر کے کمرے سے) ابھی آیا ۔ ایک منٹ میں ۔ ذرا سگریٹ کے دو کش لگاؤں۔

ناصر :۔ ذرا جلدی کرو ساڑھے چار ۔ ہو رہے ہیں ۔ میں آج شام ذرا جلد جانا چاہتا ہوں

امجد :۔ اچھا بھئی اچھا۔ ابھی آیا ——————

(جس وقت دکان میں داخل ہوتا ہے تو آواز اور لہجہ دھیما ہو جاتا ہے) تمہاری چائے میز پر رکھی ہے

ناصر :۔ تم چاہو تو آج رات دکان بند کر سکتے ہو۔ میں تو چائے پیتے ہی چلا جاؤں گا ۔

امجد :۔ کیوں ناصر تمہیں آج بہت جلدی ہے ۔ کیا کسی سے ملنا ہے ۔

ناصر :۔ تمہیں کیا۔ اپنا کام کرو۔

(دروازہ بند ہونے کی آواز۔ امجد ایک لمحہ بڑبڑاتا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی گھنٹی کی آواز آتی ہے)

امجد :- خوش آمدید- فرمایئے- کیا خدمت کرسکتا ہوں میں آپ کی۔

خریدار :- مجھے گولیوں کی ایک شیشی چاہیئے۔

امجد :- چھوٹی- بڑی ؟

خریدار :- میرے خیال میں چھوٹی شیشی کافی ہوگی۔

امجد :- (خود بخود) گولیوں کی چھوٹی شیشی- لے- یہ حاضر ہے- شکریہ- (دراز میں پیسے رکھنے کے لئے کھولنے اور بند کرنے کی آواز) موسم غنیمت ہے- آج-

خریدار : خاصہ حبس ہے میرے خیال میں۔

امجد :- بے شک- بے شک- ہے کچھ حبس کی سی کیفیت- شکریہ جناب کا- خدا حافظ۔

خریدار :- خدا حافظ۔

(خریدار جانے کے لئے دروازہ کھولتا ہے- ساتھ ہی گھنٹی کی آواز آتی ہے- امجد ایک لمحہ کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہے)

امجد :- (پکارتے ہوئے) ناصر

ناصر :- کیا ہے-

امجد :- چائے ٹھیک ہے-

ناصر :- ہاں ٹھیک ہے۔

امجد :- کچھ عجیب سا مزہ تو نہیں ہے- کیوں۔

ناصر :- نہیں تو- عجیب سا مزہ- کیوں- کیا بات ہے-

امجد :- نہیں کوئی بات نہیں- چائے دیر سے رکھی تھی- اس لئے میں نے خیال کیا کہ شاید بدمزہ ہوگئی ہو- (معمول کے مطابق آواز اور لب ولہجہ میں) میرا خیال ہے ناصر میں یہ دروازہ کھول لوں- اوں- ہاں- اب بہتر ہے- میں یہاں دروازے پر کھڑے ہوکر تم سے باتیں بھی کرتا رہوں گا اور تم اپنی چائے بھی پیتے رہو گے-

ناصر :- خدا کی پناہ! سارا دن مجھسے باتیں کرنے کے لئے کافی نہیں تھا- مجھے چائے بھی سکون سے نہیں پینے دو گے-

امجد :- ارے نہیں- میں تو چاہتا ہوں کہ تم چائے مزے لے لے کر پیو- چائے نوشی سے زیادہ اہم تو دنیا میں کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا (وقفے کے بعد کچھ سوچتے ہوئے) تمہیں یاد ہے ناصر جب ہم نے پہلی دفعہ ایک ساتھ چائے پی تھی-

ناصر :- تمہیں کیا ہوگیا ہے- امجد- نہیں مجھے یاد نہیں-

امجد :- مگر مجھے یاد ہے جیسے کل کی بات ہو- حالانکہ اسے کم و بیش ۳۵ سال کا عرصہ ہوگیا-

ناصر :- تم سچ ہی کہتے ہوگے-

امجد :- ہاں تقریباً اتنا ہی عرصہ گذر گیا- ان دنوں یہاں دکان میں ہم دونوں کے والد کام کیا کرتے تھے- شانہ بہ شانہ جیسے ہم دونوں آج یہاں کام کرتے ہیں- ہم دونوں تو بچے ہی تھے- میں تم سے عمر میں ذرا بڑا تھا- لیکن تم مجھ سے زیادہ طاقتور اور بڑے معلوم ہوتے تھے

ہم دکان کے اوپر رہا کرتے تھے۔ اور تم اسی مکان میں تھے جہاں آج کل تم نائلہ کے ساتھ رہتے ہو۔ ایک دن تمہاری اماں تمہیں اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ ہم دونوں نے اوپر کمرے میں بیٹھ کر چائے پی۔ اس کمرے میں جہاں میں اب تنہا راتیں گذارتا ہوں۔ اور ناصر تمہیں پتہ ہے آج بھی میرے احساسات اور میرے خیالات بالکل ویسے ہی ہیں۔ جیسے اس روز تھے آج سے ۲۵ سال پہلے۔

ناصر :۔ احمد آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اِن بے نتیجہ باتوں سے کیا حاصل۔

امجد :۔ تم انہیں فضول سمجھتے ہو؟ خیر۔۔ کیا حُسنِ اتفاق ہے۔ چائے۔ میں نے اِس پر آج سے پہلے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس روز بھی چائے ہی تھی ۔۔۔۔۔۔ مگر ـــــ تم اکتا تو نہیں گئے میری گفتگو سے ناصر۔

ناصر :۔ اگر سچ پوچھو تو میں واقعی اکتا گیا ہوں تمہاری بے سروپا گفتگو سے۔

امجد :۔ خیر ـــ تمہیں بھی اِن باتوں میں لطف آنے لگے گا۔ ہاں تو اُس روز تمہاری اماں تمہیں لے کر آئی تھیں چائے کے لئے۔ چائے کے بعد ہم دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے تھے۔ تم اور میں اور میری پیاری مانو بلّی ـــــ پوسی ـــــ جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی۔ ہم دونوں کھیل رہے تھے تم اور میں۔ سیاہ بلّی دری پر بیٹھی ہمیں کھیلتے دیکھ رہی تھی۔ تم مہمان تھے۔ پہلی ملاقات تھی۔ اس لئے کچھ تکلف باقی تھا۔ کھیلتے کھیلتے یکایک تم نے کہا . . . . .

(آواز فیڈ آؤٹ اور فلیشس بیک)

ناصر :۔ (چھوٹی عمر کا بچہ) اچھا اب ہم سرکس سرکس کھیلیں گے۔ تمہاری بلّی شیر بنے گی اور میں شیر سدھانے والا۔

امجد :۔ (چھوٹی عمر کا بچہ) مگر پوسی نہیں کھیلے گی۔

ناصر :۔ کیوں نہیں کھیلے گی۔ اچھی بلّی ہے وہ تو۔۔ تم اپنا یہ چکر اٹھالو۔ ہم اس کو اس میں سے کدائیں گے

امجد :۔ نہیں ناصر۔ پوسی ایسے کھیل نہیں کھیلتی۔ آؤ ہم کوئی اور کھیل کھیلتے ہیں۔

ناصر :۔ یہ لکڑی میرے ہنٹر کا کام دے گی۔ لے یہ دیکھو ـــــ چلو ـــــ مانو بلّی ـــ آنکھیں کھولو ـــ اٹھو ـــ اب تم شیر ہو۔

امجد :۔ (منّت کرتے ہوئے) نہیں ناصر ــــــ وہ بیچاری ڈر گئی ہے ـــــ اسے لیٹا رہنے دو۔ ہم کچھ اور کھیل کھیلتے ہیں۔ اگر تم کوئی اور کھیل کھیلو تو میں تمہیں اپنا قلعہ دیدونگا۔

ناصر :۔ کسی کو تمہارا یہ بھدّا قلعہ نہیں چاہیئے۔

امجد :۔ میں تمہیں اس کے ساتھ سپاہی بھی دونگا۔

ناصر :۔ فضول بکواس بند کرو۔

(ناصر لکڑی ہنٹر کی طرح فرش پر زور سے چٹخاتا ہے بلّی کی چیخ۔)

ناصر :۔ چلو ــــــ مانو بلّی ـــــ کود و اس پر سے۔

امجد :۔ اچھے ناصر مان جاؤ۔ دیکھو بیچاری کتنی ڈر گئی ہے۔

ناصر :۔ جب میں کہتا ہوں تو وہ کودتی کیوں نہیں (لکڑی چٹخانے کی آواز) کود و۔ اس پر سے کو . .

امجد :- (پریشان ہوکر) اچھے ناصر۔ رہنے دو۔ چھوڑدو بچاری کو۔

ناصر :- (غضبناک ہوکر) کود ـــــ بدتمیز ـــــ مارتے مارتے ـــ کود ـــــ (لکڑی کی آواز) کود بدتمیز۔

امجد :- رہنے دو ـــ رہنے دو۔ نہیں مانوگے تم۔ ناصر ـــ (ایک زور کی چیخ) اوہ ـــ بچاری کھڑکی سے کود گئی ـــ اوہ

(بازار کا غل نیچے کار کے زور سے بریک لگانے کی آواز)

ناصر :- بدتمیز جنگلی۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔

امجد :- (رنج اور غصہ میں پاگلوں کی طرح) تمہارا قصور ہے۔ تم ـــ جنگلی ـــ تم نے اسے مارا ـــ تم نے پوسی کی جان لی ـــ میں تمہیں مارڈالوں گا ـــ جنگلی . . . . بدتمیز . . . .

(اس کی آواز ایک چیخ بن کر فیڈ آوٹ ہوجاتی ہے۔ تبدیلی)

امجد :- تمہیں یاد ہے ناصر۔

ناصر :- (جلدی سے) نہیں۔

امجد :- عجیب بات ہے ـــ مگر میری یاد سے وہ شام کبھی نہ نکل سکی ـــ وہ دن میرے لئے بہت اہم تھا۔ سچ پوچھو تو اسی دن سے میرے دل میں نفرت کی چنگاری سلگنی شروع ہوئی تمہارے خلاف (دروازہ کھلنے اور گھنٹی کی آواز) معاف کرنا ـــ آئیے آئیے خوش آمدید مسز انجم ـــ میں کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی۔

مسز انجم :- مسٹر امجد کھانسی کا مکسچر چاہیئے

امجد :- ہوں ـــ ہوں ـــ پہلے شاید آپ لنکٹس لے گئی تھیں نا۔ اوں ـــ یہ رہا ـــ اب کھانسی پہلے سے کم معلوم ہوتی ہے۔

مسز انجم :- رات کو بہت اٹھتی ہے۔ سونا مشکل ہوجاتا ہے۔

امجد :- اس سے آپ کو کافی افاقہ ہوگا۔ ایک روپیہ ۹ آنے۔ شکریہ (پیسے رکھنے کی آواز) اگر کھانسی زیادہ پریشان کرے تو رات کو ایک خوراک مزید پی لیجئے۔

مسز انجم :- بہتر ـــ شکریہ ـــ خدا حافظ۔

امجد :- خدا حافظ مسز انجم۔

(مسز انجم کے جانے۔ دروازہ کھلنے اور گھنٹی بجنے کی آواز ـــــ ایک لمحہ امجد کی بڑبڑانے کی آواز پھر وقفہ کے بعد)

امجد :- ہاں تو کیا کہہ رہا تھا۔ میں

ناصر :- مجھے پتہ نہیں۔ میں اخبار پڑھتا ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے کرتے رہو۔ شام کا اخبار کہاں ہے۔

امجد :- ہاں تو میں نے کہاں سے چھوڑا تھا ـــــ ٹھیک ـــــ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس دن سے میری نفرت کا آغاز ہوا اور یہ روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے جان بوجھ کر اس آگ کو ہوا دی ـــ ہاں ـــ تو ـــ تمہیں یاد ہے ہم دونوں گرامر اسکول میں داخل کردیئے گئے۔ اگرچہ میں عمر میں تم سے بڑا تھا لیکن تم تن و توش کے اعتبار سے

مجھ سے زیادہ قوی اور طاقتور لگتے تھے۔ تم نے اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر مجھے تنگ کرنا شروع کیا۔ میری زندگی عذاب بنادی۔

(امجد کی آواز فیڈ آؤٹ ہوجاتی ہے اور سکول کے لڑکوں کی آوازیں ابھرتی ہیں تبدیلی منظر)

امجد :۔ (خوشامدانہ) ناصر۔ پلیز میری عینک دے دو۔

ناصر :۔ (چڑھانے کے انداز میں) کیوں عینک چاہیئے ہے۔ آؤ۔ آکر لیتے کیوں نہیں۔

امجد :۔ پلیز —— ناصر —— تم جانتے ہو تم جانتے ہو مجھے عینک کے بغیر دکھائی نہیں دیتا۔

(لڑکوں کے قہقہے)

ناصر :۔ بیچارا۔ اندھا بھینسا —— عینک چاہیئے ہے تو لے کیوں نہیں لیتے —— بیچارا —— ہا —— چلو —— لو لے۔

(لڑکوں کے تضحیک آمیز قہقہے)

امجد :۔ ناصر۔ خدا کے لئے۔ اتنا تنگ نہ کرو۔

ناصر :۔ رونہیں رہے نہیں۔ اگر عینک چاہیئے ہے تو تو —— اور کشتی لڑو —— مجھے چیلنج دو۔ اور عینک لے لو۔

امجد :۔ ناصر میں تم سے نہیں لڑسکتا۔ خدا کے لئے۔

ناصر :۔ کمزور مار کھانے کی نشانی۔ ڈر کے مارے جان کیوں نکلی جاتی ہے —— تم ڈرپوک انسان۔ تم کو اب عینک نہیں ملے گی سمجھے ——

امجد :۔ (گاتے ہوئے) امجد بھائی کس کے مار کھائی کھسکے۔

(سب لڑکے مل کر چڑھانے کے لئے گاتے ہیں۔ امجد بھائی کس کے مار کھائی کھسکے آواز فیڈ آؤٹ تبدیلی منظر)

امجد :۔ یاد ہے ناصر۔

ناصر :۔ (قدرے مسرور ہو کر) ہاں مجھے یہ بات یاد ہے۔ تم اس زمانے میں کمزور۔ ڈرپوک۔ اور شیطان تھے۔

امجد :۔ ہاں۔ دن گذرتے گئے۔ ہم بڑے ہوتے گئے مگر ان باتوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ تم بڑے تیز اور ہونہار تھے۔ ہر بات میں پیش پیش رہتے تھے۔ لیکن ہر بات میں تم مجھے ذلیل کرتے تھے۔ مجھے چڑھاتے تھے۔ دوسرے لڑکوں کو بھی تم نے سکھا دیا تھا۔ وہ بھی تمہارا ساتھ دیتے تھے۔ روز بروز میری نفرت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ تم اسکول کے میچوں میں کرکٹ کھیلتے اور میں نہیں دیکھا کرتا تھا۔

(تبدیلی منظر۔ میچ کے تاثرات۔ تالیوں کا شور۔ لڑکوں کی آوازیں۔ شاباش ناصر۔ گڈلک۔ ویل ڈن۔ آواز فیڈ آؤٹ)

امجد :۔ یا خدا اب کے یہ عجیب کھا جائے۔ خدا کرے صاف وکٹ آؤٹ ہوجائے۔

(ایک لمحہ کے بعد پرزور تالیاں لڑکوں کی آوازیں کیا چھکا مارا ہے —— ویل ڈن ناصر۔ شاباش۔ آوازیں فیڈ آؤٹ منظر تبدیل)

ناصر :۔ دیکھو جی۔ میں ساری رات یہاں بیٹھ کر تمہاری بکواس نہیں سن سکتا۔ سمجھے۔

امجد :۔ صبر کرو —— ذرا صبر سے کام لو۔ ناصر۔ ذرا دیر میں تمہاری سمجھ میں سب کچھ آجائے گا۔ تم یقین کرو۔ لو۔ ایک پیالی چائے اور پی لو۔ جتنے میں باتیں کروں اتنے تم چائے پیتے رہو —— لے —— یہ لو —— دوسری پیالی۔

ناصر :- اچھا جیسے تمہاری مرضی - مگر خدا کے لئے جلد ختم کرو اسے۔

امجد :- ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ پھر دونوں نے اسکول چھوڑ دیا تم نے اور میں نے - اب ہم دونوں جوان آدمی بن گئے تھے۔ ہم دونوں نے اسکول کے امتحان پاس کئے - تم نے مجھ سے آدھی محنت بھی نہیں کی تھی لیکن تم نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ پھر ہم دونوں کاروبار میں مدد دینے اور سیکھنے کے لئے دکان پر آنے لگے اس وقت تک میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ مگر دکان اب تک شرکت میں چل رہی تھی۔ ہم دونوں آگے چل کر اس کے مالک بننے والے تھے۔ مگر ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنے مختلف تھے۔

ناصر :- مجھے تم سے اتفاق ہے -

امجد :- تم ہر مجلس کی رونق اور ہر محفل کی جان تھے۔ تم کتنے ہردلعزیز تھے . . . . ہر جگہ۔

(فیڈ آوٹ منظر کی تبدیلی)

لڑکی کی آواز :- (فیڈ ان) ہمیں احمد ناصر کو ضرور بتلانا چاہیئے پارٹی میں ـــ وہ کتنا اچھا لگتا ہے رقص کتنا اچھا کرتا ہے۔

مرد کی آواز :- ہلو مسٹر احمد ناصر سب کیا ادھر ہے ہیں۔

اناؤنسر کی آواز :- (مائیکروفون پر اعلان) پاکستان ٹینس ٹورنامنٹ مردوں کے تنہا مقابلے کا پہلا انعام ـــ مسٹر احمد ناصر۔

(پرزور تالیاں)

(فیڈ آوٹ فلیش بیک ختم منظر کی تبدیلی)

امجد :- احمد ناصر مجھے اس نام سے نفرت تھی کیونکہ میں اتنا مقبول نہیں تھا - مجھے کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا - کوئی مجھے کبھی کہیں نہیں بلاتا تھا۔

ناصر :- (قدرے محظوظ ہو کر) خدا کی پناہ ! کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم مجھ سے حسد کرتے تھے امجد -

امجد :- ہاں - شاید ایسا بھی ہو - شاید میری فطرت ایسی ہی ہو گی -

ناصر :- لیکن برخوردار ! احمق آدمی - تم کہیں جانا ہی کب چاہتے تھے - تم تو یہ چاہتے تھے کہ سارا دن گھر میں بیٹھے رہو - اور عالم خیال میں کراچی شہر کی تاریخ تصنیف کرتے رہو -

امجد :- ہاں یہ درست ہے - بیشک میں یہی چاہتا تھا میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ میں شہر کراچی کی ایک تاریخ لکھوں عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے اب - شاید کوئی نفسیاتی ماہر یہ کہے گا کہ میں یہ تاریخ لکھ کر تم پر اپنی برتری ثابت کرنا چاہتا تھا اپنا احساس کمتری دبانے کے لئے یہ تاریخ عالم وجود میں لانا چاہتا تھا ـــ لیکن یہ تاریخ کبھی نہ لکھی جا سکی ـــ اسے بھی تم نے دفن کر دیا۔

ناصر :- (تعجب سے) میں نے

امجد :- ہاں تم نے - شاید تم اس سے بے خبر ہو - لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم نے میرا خواب کبھی پورا نہ ہونے دیا - ایک دن جب میں تنہا اپنے مسودے اور تحریریں دیکھ رہا تھا تو تم آئے -

(منظر کی تبدیلی ۔ امجد کی آواز فیڈ آؤٹ دروازے پر دستک)

امجد :۔ اندر آجاؤ ـــــ کون ہے ـــــ ارے ـــــ ناصر ۔

ناصر :۔ ہلو ۔ ہو ۔ ہلو ۔ بڑے مصروف دکھائی دے رہے ہو ۔ علم برس رہا ہے چہرے پر ۔ کیا بات ہے ۔

امجد :۔ کچھ نہیں صرف ذرا پڑھ رہا تھا ۔

ناصر :۔ کچھ ذرا ثقیل چیز معلوم ہوتی ہے ۔ دیکھیں ـــــ کیا ہے ۔

امجد :۔ میرے ذاتی کاغذات دیکھنے کی جرأت مت کرو ۔ ناصر

ناصر :۔ خیر ـــــ ہوں ـــــ جہنم میں جاؤ ـــــ وہی ہوگا مسودہ جناب حسن امجد کی معرکۃ آلارا عظیم تاریخ شہر کراچی کا ـــــ (زبردست قہقہہ) میں ضرور دوستوں سے اس کا تذکرہ کردوں گا ۔

امجد :۔ (غصّے سے) تمہاری زبان پر اس کا تذکرہ نہ آنے پائے ـــــ سمجھے ـــــ میں کیوں نہ لکھوں یہ کتاب ۔

ناصر :۔ (ہنستے ہوئے) کیوں نہیں ۔ کیوں نہیں ۔ ہمارے حسن امجد صاحب مصنّف کیوں نہ بنیں ۔ امجد ۔ اور ـــــ کتاب ۔ (قہقہہ) بہت دن بعد ایسا لطیفہ سننے میں آیا (قہقہہ)

(فیڈ آؤٹ)

(تبدیلیٔ منظر فلیش بیک ـــــ)

ناصر (نوجوان) :۔ اگر تمہیں اپنی عینک چاہیئے ہے تو عزیز از جان میاں امجد سلمہٗ آپ مجھے آن کرکے جلیئے (گانے کے انداز میں) امجد بھائی کس کے ، مار کھائی کھسکے ۔

چند لڑکیاں (گاتے ہوئے) عزیز از جان میاں امجد بودم بے وال ہو ـــــ امجد کھائی کس کے مار کھائی کھسکے ۔

(تبدیلی منظر)

ناصر :۔ (تالی بجاتے ہوئے) اچھا اب ہم سرکس سرکس کھیلیں گے ۔ میں تمہاری بلّی کو چکر میں سے کودواؤں گا ۔

لڑکیوں کی آوازیں :۔ احمد ناصر کتنا مذاقیہ ہے ۔ سنا ہے وہ امجد کی بلّی کو کودوائے گا ۔ سنا کچھ ۔ امجد کی بلّی ـــــ (قہقہہ)

(تبدیلیٔ منظر)

ناصر :۔ (مخاطب کرتے ہوئے) میں نے کہا آپ حضرات نے تازہ ترین لطیفہ سنا ہے ۔ ہمارے حسن امجد صاحب ایک کتاب تصنیف فرما رہے ہیں ۔

(زبردست قہقہے لڑکیوں اور لڑکوں کے)

(منظر کی تبدیلی)

امجد :۔ میں تمہیں مار ڈالوں گا ۔ جان سے مار ڈالوں گا ۔ تمہیں ـــــ جنگلی ـــــ

(امجد کی آواز فیڈ آؤٹ

(تبدیلی منظر)

امجد (نوجوان) : ۔کیسا عجیب خواب تھا ۔خوابوں کی دنیا میں ہم اپنی ان مرادوں کو پا لیتے ہیں جنہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا ہو ۔ ہم سو جاتے ہیں تو ہمارا تحت الشعور بیدار ہو جاتا ہے ۔اپنی نامکمل خواہشوں اور دبی ہوئی آرزوؤں کو عالم خواب میں پورا ہوتے دیکھ لیتے ہیں ——— ایک نظریہ تو یہ ہے لیکن اس کی ایک اور تعبیر بھی ہے ——— ایک دوسرے نظریئے کے مطابق خواب میں ہم آنے والے واقعات کی پرچھائیں دیکھ لیتے ہیں

ناصر : ۔(چونک کر) کیا ——— کیا کہا ——— تم نے

امجد : ۔نہیں ——— کچھ نہیں ——— میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ یہ نظریے اور تعبیریں کتنی دلچسپ ہوتی ہیں ۔کتنی عجیب ہوتی ہیں۔

ناصر : ۔(قدرے اطمینان سے) اوہ ——— میں سمجھا ——— خدا جانے ———

امجد : ۔تم کچھ گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے ہو ناصر ۔ مگر تمہیں میری باتوں سے پریشانی ہوتی ہو تو میں ختم کروں ———

ناصر : ۔(زبردستی کا قہقہہ لگاتے ہوئے) پریشانی ——— خیر ——— یہ تمہاری اور بکواس سے بہتر ہے

امجد : ۔یہ سنکر مجھے خوشی ہوئی ——— کیونکہ اس کہانی کا آخری حصہ واقعیٔ دلچسپ ہے ۔کم سے کم مجھے تو دلچسپ لگا مجھے یقین ہے تم بھی پسند کروگے ۔اب ہم اس کہانی کے ایک اہم مقام پر آگئے ہیں ——— ہم اب نائلہ تک پہونچ گئے ہیں۔

ناصر : ۔مہربانی فرماکر آپ میری بیوی کا تو تذکرہ نہ کریں ۔اُس کو اس جھگڑے سے دور ہی رہنے دیں

امجد : ۔لیکن ——— بُرا مت ماننا ۔یہ قطعی طور پر ممکن نہیں ۔ نائلہ میری کہانی کا ایک اہم کردار ہے ——— تمہیں یاد ہے کہ اسی زمانے میں جنگِ عظیم شروع ہوگئی تھی ۔تم فوج میں بھرتی ہوگئے ۔میری آنکھیں کمزور تھیں ۔پھر تمہارے والد بوڑھے ہوگئے تھے ۔دکان ان کا ہاتھ بٹانے کی بھی ضرورت تھی تو تم فوج میں بھرتی ہوکر کراچی سے چلے گئے ۔تمہیں سنکر تعجب ہوگا ۔عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے ——— میں نے پہلی مرتبہ اطمینان کا سانس لیا ۔تمہارے جانے کے بعد میں نے گویا زندگی میں پہلی مرتبہ آزادی محسوس کی ——— تمہارا وجود گویا ایک بوجھ تھا جس کے نیچے میں دبا چلا جاتا تھا ——— تمہارے وجود کے بوجھ نے میری روح کو میری مسرتوں کو میری زندگی کو کچل کر رکھ دیا تھا ——— تمہارے کراچی چھوڑنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سینہ پر سے بوجھل پتھر ہٹ گیا ۔اب میں خود کو ہلکا ہلکا محسوس کرنے لگا ۔مگر کیوں ——— ایسا کیوں ہوا ——— صرف اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ کراچی کا ماحول تمہارے وجود سے بوجھل نہیں ہے ۔اگرچہ تم چھٹیوں میں کبھی کبھی گھر آتے رہتے تھے ۔مگر میں نے اس کی کچھ زیادہ پروا نہیں کی ۔کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تم زیادہ دن شہر میں نہیں رہوگے ۔فوجی وردی میں تم کتنے چست ——— چالاک اور خوبصورت لگتے تھے ———

اور پھر ۱۹۴۲ء کے اس خوبصورت اور پُربہار موسم گرما میں ایک دن . . . .

(اس کی آواز فیڈ آؤٹ ——— ہلکا سا وقفہ ۔ دکان کی گھنٹی کی آواز)

امجد : ۔صبح بخیر۔

نائلہ : ۔صبح بخیر ——— مجھے اس نسخہ کی دوا بنوانی ہے۔

امجد : ۔بڑی خوشی سے ۔مگر اس میں ذرا دیر لگے گی ۔آپ کو جلدی تو نہیں ہے ۔دیکھئے نا میں تنہا کام کر رہا ہوں ۔آجکل۔

نائلہ :- نہیں کوئی ایسی خاص جلدی تو نہیں ہے۔ میں واپسی میں لیتی جاؤں گی۔

امجد :- آپ کیوں زحمت کرتی ہیں۔ شاید میں یہ آپ کے گھر بھجوادوں۔

نائلہ :- بہت بہت شکریہ۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

امجد :- جی نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ جناب کا نام ——— اور پتہ۔

نائلہ :- نائلہ علی۔ نمبر ۳۵ جمشید روڈ۔

امجد :- بہتر ——— کیا آپ مسز گل جان کے گھر میں رہتی ہیں۔

نائلہ :- جی۔ ہاں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ میں کراچی حال ہی میں آئی ہوں۔ اسکول کے دوسرے طالب علموں کے ساتھ۔

امجد :- اچھا۔ بہت خوب ——— مجھے یقین ہے کہ آپ اس جگہ کو پسند کریں گی۔

نائلہ :- مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ میں ایسے اچھے شہر میں پڑھنے آئی ہوں۔

امجد :- جی ہاں کراچی کی ایک اپنی تاریخ ہے۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو۔ اس طرح کی چیزوں سے میرا مطلب ہے تاریخ وغیرہ سے

نائلہ :- میں یہاں کی ہر چیز دیکھنا چاہتی ہوں مجھے اس طرح کے مقامات سے بڑی دلچسپی ہے۔ یہ دیکھئے میں نے یہ گائڈ بک بھی خریدلی ہے۔

امجد :- اوہ ——— بالکل سطحی باتیں ہوتی ہیں اس طرح کی کتابوں میں ——— اور وہ بھی اکثر غلط سلط۔

نائلہ :- معلوم ہوتا ہے آپ کو بڑا عبور ہے یہاں کی تاریخ پر۔

امجد :- (ہنستے ہوئے) جی۔ نہیں۔ مگر۔ ہاں۔ مجھے اس سے دلچسپی ہے۔

نائلہ :- اوہ ——— میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ باتوں میں ——— اب مجھے جانا چاہیئے۔ خدا حافظ۔

امجد :- خدا حافظ ——— موسم خاصہ گرم ہے۔

نائلہ :- ہوں ——— اچھا خوشگوار ہے۔

امجد :- ہاں کراچی کا موسم تو خوشگوار ہی رہتا ہے۔

نائلہ :- اچھا۔ خدا حافظ۔

امجد :- خدا حافظ ——— (دروازہ کھلنے اور بند ہونے پر گھنٹی کی آواز۔ امجد بہت نرم اور مدھم لہجے میں دہراتا ہے بس نائلہ علی اس کی آواز فیڈ آؤٹ ——— ہلکا سا وقفہ ——— پھر دکان کی گھنٹی کی آواز)

امجد :- ارے آپ تشریف لے آئیں ——— خوش آمدید ———

نائلہ :- معاف کیجئے گا۔ آپ کو پریشانی ہوئی۔ ننھے گڈو نے اپنا گھٹنا زخمی کرلیا ——— یہ دیکھیئے۔

امجد :- اوہ ——— ہو ——— دیکھوں ——— شاباش ——— بیٹے دیکھیں تمہارا گھٹنا ——— کیسے زخمی ہوگیا یہ ———

بچہ :- گر پڑا۔

امجد : - کافی چوٹ آئی ہے — بچارا — میں زخم صاف کرتا ہوں — بیٹے — ہلنا نہیں بس - ایسے ہی بیٹھے رہو - تمہیں تکلیف نہیں ہوگی — بالکل — تم تو بہادر بیٹے ہو نا - اگر تم ایسے ہی چپ بیٹھے رہے تو پھر ہم تم کو مٹھائی دیں گے - مٹھائی تمہیں اچھی لگتی ہے نا -

گڈو : - ہاں -

نائلہ : - ہاں نہیں کہتے اچھے بچے — جی کہو

گڈو : - جی

امجد : - اچھا - بیٹے - شاباش — جی — تو مس علی آپ نے کچھ سیر کی -

نائلہ : - ابھی تک کہیں نہیں جا سکی - مجھے پتہ نہیں کہ کہاں جاؤں پہلے -

امجد : - (ذرا ندوش) میں سوچ رہا تھا — مس علی آپ تو جانتی ہیں کہ میں — جی — یہاں کے مقامات اور تاریخ سے کافی میرا مطلب ہے کہ واقف ہوں — اور اگر آپ — پسند کریں تو — وہ — کسی دن میں آپ کو شہر کی مشہور عمارتیں دکھا لاؤں -

نائلہ : - آپ کا شکریہ - بہت اچھا رہے گا -

(گڈو تکلیف سے چیختا ہے)

امجد : - اوہ معاف کرنا — کیا میرا ہاتھ لگ گیا — ہاں تو مس علی ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی واقف کار شخص ساتھ ہو تو .. تاریخی مقامات کی سیر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے -

نائلہ : - یقینی — بے شک -

امجد : کسی سنیچر کی شام کو مناسب رہے گا -

نائلہ : - ضرور - بڑی خوشی سے

امجد : - اسی سنیچر کو کیوں نہ چلیں -

نائلہ : - ضرور — مجھے بڑی خوشی ہوگی

امجد : - واقعی -

(گڈو تکلیف سے چیختا ہے)

امجد : - اس دفعہ تمہارا قصور ہے - گڈو - ٹانگیں اتنی زور سے مت ہلاؤ . . . . . تو پھر یہ طے ہے مس علی - سنیچر کو شاید ۳ بجے کے قریب آپ کے ہاں آؤں گا

(امجد کی آواز فیڈ آؤٹ - منظر کی تبدیلی)

نائلہ : - (ہنستے ہوئے) ہمارا وقت بہت ہی اچھا گزرا - مسٹر امجد آپ نے اس ساری سیر کو ایسا دلکش بنا دیا -

امجد : - شکریہ — مجھے اس بات سے خوشی ہوئی - جو لوگ سمجھ سکتے ہیں وہ اس کی قدر کر سکیں - انہیں باتیں بنانے میں

آدمی کو بڑا لطف آتا ہے آپ کو معلوم ہے جب میں ان کھنڈروں کو دیکھتا ہوں تو مجھے کیسا لگتا ہے ۔

نائلہ : ۔ نہیں ۔ مجھے بتلایئے آپ ۔ کیسا لگتا ہے

امجد : ۔ میری نظروں کے سامنے پانچ ہزار سال کی قدیم تہذیب دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے ۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ دنیا پھر پیچھے کی طرف لوٹ گئی ہے ۔ جب بابل اور نینوا کی تہذیبیں زندہ تھیں ۔ موہن جو دارو ایک آبادی ایک بستی یا ایک شہر ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب ایک ثقافت ایک تمدن کا نام ہے ۔ بلکہ یہ ایک پورے عصر اور ایک پورے دور کا نام ہے ۔ مجھے یہ انسانی عظمت کا حامل نظر آتا ہے یہ صرف سنگ و خشت کی ایک تعمیر ہی نہیں ہے ۔ یہ ایک علامت ہے انسانی عظمت کی انتہائی بلندی کی ۔ اِک وقار ـــ ایک دبدبہ ـــ اک دلکشی ـــ اور مذہب کا تقدس بھی اس میں ہے ۔ اور یہ چیزیں زمانے کی گرفت سے ماورا ہیں اس تہذیب کا مادی پیکر گچ اور چونے کی . . . . تہوں میں پنہاں ہے ۔ لیکن اس کا روحانی سفر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تہذیبیں دب دب کر ابھرتی ہیں اور ابھر ابھر کر دبتی رہتی ہیں لیکن تہذیبوں کا روحانی عنصر کبھی نہیں مرتا . . . ۔ کیا یہ باتیں آپ کو عجیب سی لگتی ہیں ۔ مس نائلہ ۔

نائلہ : ۔ نہیں ـــ آپ کی باتوں میں وزن ہے ۔ ان میں صداقت ہے ۔

امجد : ۔ واقعی ؟ ـــ میں نے آج تک کسی سے یہ باتیں نہیں کہیں ـــ اور یہاں کراچی کے مضافات میں اور کتنے ہی قابل دید مقامات ہیں ۔ بھنبھور ہے ـــ تاریخی اعتبار سے ٹھٹھہ ہے ۔ ٹھٹھہ کی عمارتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔

نائلہ : کیا ہم کسی روز وہاں بھی چل سکتے ہیں ۔

امجد : ۔ یقیناً ـــ کیوں نہیں ـــ لیکن پہلے ایک بات ۔ مس نائلہ اگر آپ کو اس وقت میری باتیں پسند آئی ہوں تو کیا آپ میری ایک درخواست قبول فرمائیں گی ؟

نائلہ : ۔ ضرور ـــ شوق سے ـــ فرمایئے ۔

امجد : ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ چائے پئیں ۔

نائلہ : ۔ (ہنستے ہوئے) اوفو ـــ ضرور ـــ مجھے خود اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی ۔

امجد : ۔ واقعی ۔ ذرا تھکن بھی دور ہو جائے گی ۔ ماحول بھی خوشگوار ہو رہا ہے ۔

(فیڈ آؤٹ)

(منظر کی تبدیلی)

امجد : ۔ اپنی آنکھیں بند رکھو ۔ بس ایک منٹ کے لئے میں چاہتا ہوں سارا منظر یکلخت تمہاری نظروں کے سامنے آجائے ۔ ہم بس بالکل چوٹی پر پہنچ گئے ہیں ۔ ہاں اب کھولو ۔

نائلہ : ۔ آہا ـــ کتنا شاندار !

امجد : ۔ واقعی ـــ بے حد شاندار ہے ۔ وہ ہے . . . ۔ اسے وہ ادھر دیکھو ۔ وہ ۔ ٹاور وہ ہے . . . پیچھے . . . اور وہ جو لمبی لکیر سی دکھائی دے رہی . . . وہ ہے مینار

نائلہ : ۔ وہ تو سنہرے بادلوں میں گھرا ہوا بالکل پریوں کا شہر معلوم ہوتا ہے ۔

امجد : ۔ ہاں بعض دفعہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ـــ پرستان ـــ لیکن اس کا نظارہ مختلف اوقات میں مختلف تاثرات پیدا کرتا ہے۔ کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے انسانوں کی طرح اس کی کیفیات اور تاثرات بھی بدلتے رہتے ہیں ۔ مجھے اس جگہ سے گویا عشق ہے ۔ تمہیں معلوم ہے ۔ میں جب چھوٹا سا تھا تو اکثر یہاں آ جاتا تھا ـــ تنہا ـــ اور بعض دفعہ انتہائی مغموم اور اداس . . . میں یہاں اوپر آکر پتھر پر بیٹھ جاتا اور شہر کے وسیع اور بسیط ماحول کو تکا کرتا ۔ اس کے نظارے سے ہمیشہ میری روح کو ایک سکون ملا ۔ سچ پوچھو تو حسن کی سب سے پہلی جھلک میں نے ان نظاروں کے سہارے ہی دیکھی ۔

نائلہ : ۔ شاید اس سے زیادہ دلکش چیز تم نے نہیں دیکھی تھی ۔

امجد : ۔ نہیں ـــ اس زمانے میں نہیں . . . . اس وقت نہیں . . . . .

(امجد کی آواز فیڈ آؤٹ ہلکا سا وقفہ)

(منظر کی تبدیلی)

نائلہ : ۔ تمہیں پتہ ہے مجھے کراچی آئے ہوئے تین مہینے ہو گئے ۔

امجد : ۔ سچ ۔ وقت گذرتے پتہ بھی نہیں لگتا وقت کے گویا پر لگ گئے ہوں (ذرا جھجکتے ہوئے) شام کی یہ ملاقاتیں . . . میرے لئے بہت کچھ ہیں ۔ نائلہ !

نائلہ : ۔ میرے لئے بھی ۔ تم نے اس شہر کی تاریخ کو میرے لئے گویا دوبارہ زندہ کر دیا . . . ۔ تمہاری باتیں کتنی دلچسپ ہوتی ہیں

امجد : ۔ نہیں یہ تو میری اپنی دلچسپی اور اپنے شوق کی بات ہے تمہیں یہاں ۔ میرے گھر پر میرے ساتھ چائے پینے میں کوئی تامل کچھ اجنبیت ۔ غیریت . . . . . .

نائلہ : ۔ نہیں تو نہیں تو ـــ مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے ۔

امجد : ۔ سچ ـــ ارے چائے کا پانی کھولنے لگا ۔

نائلہ : ۔ ٹھیرو ـــ میں چائے بناتی ہوں ۔

امجد : ۔ اچھا ـــ پتیاں اس ڈبے میں ہوں گی ـــ تمہیں پتہ ہے نائلہ ! آج پہلی مرتبہ مجھے کسی خاتون کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے ۔

نائلہ : ۔ (مزاح سے) "بڑے" افسوس کی بات ہے ۔ کیا تم ہمیشہ سے اکیلے ہی رہتے ہو ۔

امجد : ۔ پہلے میری والدہ میرے ساتھ رہتی تھیں ۔ ان کے انتقال کے بعد سے بس میں اکیلا ہی رہتا ہوں ۔

نائلہ : ۔ لیکن ہر چیز بہت صاف ستھری اور قرینے سے رکھی ہے ۔

امجد : ۔ یہ سب مجیدن بوا کی مہربانی ہے ۔ وہ ہماری پرانی ماما ہیں ۔ دکان صاف کرنے کے بعد وہ روزانہ آکر گھر کی صفائی کرتی ہیں ۔ اچھے خاصے بڑے کمرے ہیں ۔ کیوں . . . ہیں نا . . .

نائلہ : ۔ ہاں اچھا گھر ہے ۔ خوب بڑے اور ہوادار کمرے ہیں ۔

امجد :- ہاں مجھ اکیلے دم کے لئے بہت بڑے ہیں ——— مگر ——— تمہیں پتہ ہے ——— میں سوچتا ہوں کہ ایک دِن، ایک دن . . . .

نائلہ :- (بات کاٹ کر) چائے تیار ہو گئی امجد۔

امجد :- ارے اتنی جلدی ——— آؤ میں اسے دوسرے کمرے میں لے چلتا ہوں۔ ویسے تو میں عام طور پہ کھانا باورچی خانے میں ہی کھا لیتا ہوں ——— آسانی کے خیال سے ——— لیکن آج ——— مجھے ایک معزز خاتون کی میزبانی کا شرف حاصل ہے۔ اس لئے باضابطہ میز پہ چائے لگاؤں گا میں نے مجیدن بوا سے کہدیا تھا۔ کہ آج ایک خاتون چائے پر آئیں گی۔ انھوں نے سمو سے بھی بنا دیئے تھے ناشتہ کے لئے ——— یہیں کہیں رکھے ہوں گے ——— اے لو یہ رہے۔ ہاں پیالیوں میں انڈیلو

نائلہ :- اچھّا ——— صاحب اچّھا۔ شکر ایک چمچہ۔ مجھے پتہ ہے۔ دودھ تم خود ڈال لو۔

امجد :- شکریہ ——— نائلہ ——— یہاں تمہارے ساتھ چائے پیتے کتنا اچّھا لگ رہا ہے۔ تم کسی ہوٹل میں چائے پینا پسند کرتیں ——— یا یہاں ———

نائلہ :- مجھے تو یہاں اچّھا لگ رہا ہے۔

امجد :- مجھے بھی یہاں تمہارے ساتھ بیٹھ کر چائے پینا اچّھا لگتا ہے۔ تم چائے بناتی ہو تو مزہ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔

نائلہ :- سچ ——— امجد۔

امجد :- بالکل سچ کہتا ہوں ——— نائلہ ——— میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ . . .

(دروازے پہ زور سے کھٹکھٹانے کی آواز)

امجد :- کون ہے ———

ناصر :- ہیلو ——— ہیلو۔

امجد :- (قدرے بڑبڑا کر) نل ——— ناصر۔

ناصر :- کہو امجد کیسے ہو۔ کیا حال چال ہے۔ میرا تعارف نہیں کراؤ گے۔

امجد :- ضرور ——— ضرور ——— نائلہ اِن سے ملو، یہ ہیں احمد ناصر اور یہ ہیں مِس نائلہ علی۔

ناصر :- (خوش اخلاقی سے) آداب۔ کیسے مزاج ہیں۔

نائلہ :- (ناصر کی وجاہت سے متاثر ہو کر) شکریہ۔ آپ کا مزاج۔

امجد :- تم چھٹی پر آئے ہو۔

ناصر :- ہاں۔ میں نے بڑی ترکیب سے تین ہفتے کی چھٹّی لی ہے بیماری کے بہانے۔ تمہارے کیا حال ہیں۔ اپنی سناؤ۔

امجد :- (روکھے پن سے) تین ہفتے۔

ناصر :- میڈیکل آفیسر اپنا یار ہے۔ اس نے چھٹّی دلا دی۔ کیا میں چائے میں شریک ہو سکتا ہوں۔

امجد :- (بے اعتنائی سے) ضرور۔ بڑی خوشی سے۔

ناصر : - میں مخل تو نہیں ہوا گفتگو میں
امجد : - نہیں ــــ بالکل نہیں - کیوں نائلہ -
نائلہ : - نہیں - بالکل نہیں -
ناصر : - شکریہ - ارے تم تکلف مت کرو امجد -
میں خود اپنی پیالی بنالوں گا . . . .

اس کی آواز فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

(فلیش بیک ختم)

(منظر کی تبدیلی)

امجد : - مجھے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا - میں نے پہلے ہی بھانپ لیا تھا -
ناصر : - یہ بھی گویا میرا ہی قصور تھا - کہ نائلہ نے مجھے تم پر ترجیح دی -
امجد : - تم نے اسے پرچانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا . . . آخر کوشش کر کے اس کو مجھ سے چھین لیا - یہاں بھی تم جیت گئے جیسے تم ہمیشہ جیتتے رہے - تم نے میری مسرتوں پر ڈاکہ ڈالا -
ناصر : - اسقدر ڈرامائی گفتگو مت کرو - گدھے پن کی باتوں سے کیا حاصل -
امجد : - میں نائلہ کو الزام نہیں دیتا - اس بیچاری کا اتنا قصور نہیں ہے - تم پرچانا اور لبھانا خوب جانتے ہو -
ناصر : - شکریہ - شکریہ -
امجد : - یہ بھی دلچسپ بات ہے - تمہاری ہر حرکت سے میری نفرت میں اضافہ ہوتا تھا - اور ہر مرتبہ میں سوچتا تھا کہ یہ نفرت کی انتہا ہے - اب اس سے زیادہ اور کیا نفرت کی جا سکتی ہے - مگر ہر اضافہ شدید سے شدید تر ہوتا گیا - اور جس دن تم نے اور نائلہ نے مجھے خبر سنائی . . . .

(آواز فیڈ آؤٹ)

(منظر کی تبدیلی)

ناصر : - ہمیں مبارکباد دو امجد - ہم دونوں کی نسبت طے ہو گئی ہے -
امجد : - نسبت ؟ - تمہاری اور نائلہ کی ؟ -
ناصر : - ہاں - نائلہ نے کچھ دیر پہلے ہی مجھ سے یہ بات کہی ہے - کیوں ڈارلنگ . . . .
نائلہ : - ہاں ــــ اور ہم نے سوچا کہ سب سے پہلے تمہیں اس کی خبر ہونی چاہیئے - ہمارے بعد تم پہلے انسان ہو جسے اس کی اطلاع ہے -
امجد : - (بمشکل تمام) مبارک ہو - خدا کرے تم دونوں خوش رہو -
ناصر : - شکریہ - مجھے یقین تھا کہ تم بھی اس خبر سے خوش ہو گے - ہماری جلد ہی شادی ہو جائے گی - بس جیسے ہی میں دوسری بار جنگ

کا بندوبست کرسکا ویسے ہی ہم تاریخ مقرر کردیں گے۔ اور امجد تم سارا بندوبست کروگے۔ سمجھے۔

امجد : ۔میں ؟

نائلہ : ۔ہاں ــــ تم ــــ کیوں تم کیوں نہیں کروگے ۔ امجد۔ تم ہی ناصر کے عزیز ترین دوست ہو۔ اور سچ پوچھو تو میں تمہارے ہی ذریعہ سے متعارف ہوئی

امجد : ۔ہاں ــــ شاید ــــ تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔

(امجد کی آواز فیڈ آؤٹ۔ شادی کے شادیانے ذرا دیر کے لئے ابھرتے ہیں۔ پھر لوگوں کا ہجوم اور ملی جلی آوازیں۔ تو میز پر ہاتھ کی تھپکی کے ساتھ بند ہو جاتی ہیں)

امجد : ۔معزز خواتین وحضرات! مجھے اس موقع پر آپ کو مخاطب کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے۔ یہ میرے لئے بڑے فخر ومباہات کا موقع ہے۔ کہ میں دولہا اور دلہن مسٹر اور مسز احمد ناصر کی شادی کے موقع پر آپ حضرات کو خوش آمدید کہتا ہوں

(درمیان میں مبارکباد اور خوشی کی آوازیں)

میں اس موقع پر کسی طویل تقریر کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ آپ سب احمد ناصر کو جانتے ہیں۔ (زندہ باد احمد ناصر کی آوازیں) کراچی میں وہ ہم سب کا محبوب رہا ہے۔ مسز ناصر اس شہر میں نو وارد ہیں لیکن تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے ذاتی اوصاف کی بناء پر ہر دل عزیزی حاصل کرلی ہے۔ اب میں دولہا اور دلہن مسٹر اور مسز احمد ناصر کو اپنی طرف سے دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(تالیوں کی زوردار آوازیں۔ بیچ بیچ میں مبارک وغیرہ کا شور جس وقت ختم ہوتا ہے۔ اور امجد کی آہستہ مگر صاف آواز سنائی دیتی ہے)

امجد : ۔خدایا۔ احمد ناصر میدانِ جنگ میں جاتے ہی بم کا شکار ہو گئے۔ اے خدا۔ احمد ناصر کو اب زندہ سلامت لوٹنا نصیب نہیں ــــ اے ــــ خدا۔

(آواز فیڈ آؤٹ)

(فلیش بیک ختم)

(منظر کی تبدیلی)

امجد : ۔ یاد ہے تمہیں ناصر۔ اس طرح تم نے مجھ سے نائلہ کو چھین لیا ــــ ارے کیا بات ہے۔ طبیعت خراب ہو گئی۔

ناصر : ۔(ذرا تامل سے) نہیں کوئی بات نہیں۔ ذرا چکر سے آرہے تھے۔ اور بس۔

امجد : ۔ارے ــــ ذرا سستا لو ــــ نہیں ــــ اچھا میں اپنی کہانی جلدی جلدی ختم کرتا ہوں

احمد ناصر : ۔(تامل سے) نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ ذرا سر چکرانے لگا تھا۔ ! ــــ خیر ــــ

امجد : ۔تم ذرا آرام کرلو ــــ اچھا ــــ میں جلدی جلدی کہانی ختم کرتا ہوں ــــ تو ــــ

پھر جنگ ہو گئی۔ تم گھر لوٹ آئے۔ تمہارے والد اب کافی ضعیف ہو گئے تھے۔ وہ دکان پر کام کرنے کے لائق نہ رہے

تھے۔ ان کی جگہ تم نے لے لی۔ اب ہم تم دونوں اسی جگہ کھڑے ہو کر کام کرنے لگے جہاں ہمارے اور تمہارے والد کھڑے ہوا کرتے تھے۔ لیکن میری نفرت مری نہیں تھی۔ یہ روز بروز قوی ہوتی گئی۔ جب شام کو دکان بند کر کے جاتا تو سوچتا کہ تمہارے گھر نائلہ ہو گی۔ اور میں اوپر کے خالی کمروں میں تنہا رات رات بھر بیٹھا رہتا —— میری بے خواب آنکھیں اب بھی ڈراؤنے خواب دیکھا کرتیں

(فلیش بیک)

لڑکیوں کی آوازیں: ۔ احمد ناصر کس قدر خوبصورت ہے۔ اس نے امجد کو محبت کے میدان میں بھی ہرا دیا۔ بے چارہ امجد۔ ۔ ۔ ہا ۔ ۔ ۔ بیچارہ ۔ صنف،

(قہقہے)

(فلیش بیک ختم)

امجد: ۔ تم خیال کرتے ہو گے کہ شاید اب کوئی ایسی بات نہ ہو سکے گی جس سے میری نفرت میں اضافہ ہو۔ لیکن ایک بات ایسی ہوئی۔ اور ابھی کل رات ہی ہوئی۔

احمد ناصر: ۔ (تیزی سے) ہوں۔ کیا

امجد: ۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ اب تمہارے سر کے چکر کا کیا حال ہے۔

احمد ناصر: ۔ ٹھیک ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔

امجد: ۔ کل رات تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم دکان بند کر دو گے۔ میں وقت ہونے کے بعد اوپر چلا گیا حسب معمول لیکن تم نے دکان بند کرنے میں ذرا دیر لگا دی۔ مجھے کچھ شبہ ہو گیا۔ بلاشبہ یہ غیر شریفانہ حرکت تھی۔ لیکن جب آدمی نفرت کرتا ہے تو اسے اس طرح کی حرکتوں میں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ میں آہستہ آہستہ دبے پاؤں سیڑھیوں تک آیا۔ تم کسی کو ٹیلیفون کر رہے تھے۔

(امجد کی آواز فیڈ آؤٹ)

احمد ناصر: ۔ (فون پر) سنو۔ نرگس۔ میری جان میں نے سب کچھ ٹھیک کر لیا ہے۔ ارے تمہارا احمد بہت چالاک ہے —— کل رات کو ۔ ۔ ۔ میری جان ۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا —— تم فکر مت کرو —— میں نے نائلہ سے کہہ دیا ہے۔ کہ ایک پارٹی میں چند دوستوں کے ساتھ جانا ہے —— اور شاید رات کو وہیں رہنا پڑے اس لئے کہ دیر ہو جائے گی —— ہاں —— بس سب ٹھیک ہے۔

(آواز فیڈ آؤٹ)

(فلیش بیک ختم)

امجد: ۔ یہ تم تھے۔

ناصر: ۔ بیہودہ —— بدمعاش

امجد: ۔ تم نائلہ تک سے وفا نہ کر سکے۔

ناصر: ۔ (غضبناک ہو کر) امجد —— یاد رکھو۔

امجد : تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نائلہ سے کچھ نہیں کہونگا۔ وہ تمہیں ہمیشہ ہمیشہ ایک وفا شعار شوہر سمجھ کر یاد رکھے گی۔

ناصر : ۔(حیرت اور خوف سے) یاد رکھے گی؟

امجد : ۔ہاں یاد رکھے گی۔ کیونکہ عنقریب نائلہ بیوہ ہونے والی ہے۔

ناصر : ۔امجد ۔کیا کہا؟

امجد : ۔تم اب تک کئی پیالیاں چائے کی پی چکے ہو۔ جب سے میں باتیں کر رہا ہوں —— کم سے کم چار —— ٹھیک ہے نا —— اور میرا مقصد پورا کرنے کے لئے صرف ایک پیالی کافی تھی۔

ناصر : ۔(حقیقت کا احساس کرتے ہوئے) امجد ۔ یہ بھی تمہارا کوئی بیہودہ مذاق ہے۔

امجد : ۔مذاق —— بیچاری نائلہ . . . . .

: ۔مجھے نکل جانے دو یہاں سے —— جلدی ہے میں کوئی دوا پی سکوں۔

امجد : ۔ایسا نہیں ہو سکتا مسٹر احمد ناصر۔

(دروازہ زور سے بند کرنے، تالہ لگانے کی آواز)

ناصر : ۔امجد ۔امجد۔ دروازہ کھولو۔

امجد : ۔بے وقوفی کی حرکت مت کرو۔ ناصر سر کے چکر کا کیا حال ہے —— کچھ —— تشنج —— خیر —— وہ بھی شروع ہو جائیگا —— برداشت کرو۔

ناصر : ۔ امجد —— خدا کے لئے۔

(دروازہ بے تحاشا پیٹتا ہے)

امجد : ۔اپنے ہاتھ تھکانے سے کوئی فائدہ نہیں ۔کسی کو تمہاری آواز نہیں پہنچ سکتی ۔ میں دکان گھنٹہ بھر پہلے ہی بند کر چکا ہوں ۔ میں جب تک دروازہ نہ کھولوں تم باہر نہیں نکل سکتے ۔ اور میں کل صبح سے پہلے دروازہ کھولنے والا نہیں ہاں کل صبح سات بجے حسب معمول اوپر سے اتر کر آؤں گا۔ اور مجیدن بوا کے لئے دروازہ کھولوں گا۔ کھڑکیاں کھولوں گا۔ اس کے بعد یہ دروازہ کھلے گا۔ مجیدن بوا آئیں گی تو میں خوف سے کانپ رہا ہوں گا —— تشنج اور کرب سے تمہارا چہرہ بھیانک ہو چکا ہوگا۔

ناصر : ۔ امجد ۔ خدا کے لئے —— یہ قتل ہے

امجد : ۔ہاں یہ قتل ہے۔ اگر کسی شخص نے خود اپنی موت کو دعوت دی تو وہ تم ہو ۔اچھا عزیزمن ناصر خدا حافظ۔

: ۔ امجد ۔امجد۔

(اس کی آواز ایک چیخ میں غائب ہو جاتی ہے)

(وقفہ)

(گھنٹہ سات بجاتا ہے۔ امجد کے خود بخود بولنے کی آواز، پھر کھڑکیاں کھولنے کی آواز)

امجد: ۔ اہا۔ کیسی اچھی صبح ہے۔

(پھر کچھ بولنے کی آواز۔ چابی لگانے اور تالہ کھولنے کی آواز)

امجد: ۔ مسٹر احمد ناصر اب تم باہر آسکتے ہو۔

ناصر: ۔ (بدحواسی کے عالم میں) امجد۔

امجد: ۔ السلام علیکم۔ ارے تم کو کیا ہوا ۔۔۔۔ ناصر ۔۔ کیا تم بیمار تھے۔ مجھے خیال تھا کہ خواب آور دوا کا کم سے کم اتنا ضرور اثر تم پر ہوگا۔

ناصر: ۔ یہ تمہارا مذاق تھا۔ مجھ پر یہ ظاہر کرنا کہ مجھے . . . . . .

امجد: ۔ لیکن تمہیں یقین نہیں ہوا کہ میں تمہاری جان لے رہا ہوں۔

ناصر: ۔ نہیں ۔۔۔۔ مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔ تم مجھے پوری طرح دھوکہ دینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

امجد: ۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے تمہیں جان سے مارنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ سب کچھ تیار تھا لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ مجھے تم سے اتنی نفرت ہے کہ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔

ناصر: ۔ لیکن مجھے یقین ہے امجد کہ تم سب باتیں یوں ہی کہہ رہے تھے۔

امجد: ۔ تم سے نفرت کے بارے میں؟ ۔ نہیں ۔۔۔ تم یقین کرو ۔۔۔ میں تم سے انتہائی نفرت کرتا ہوں یہ میرا جزو زندگی بن چکی ہے۔ اسی لئے میں تمہیں جان سے مار نہ سکا

ناصر: ۔ خدایا ۔۔۔۔ تم پاگل ہو گئے ہو۔

امجد: ۔ تم یہ کیوں کہتے ہو۔ اگر کوئی شخص کسی سے انتہائی محبت کرے تو تم اسے پاگل تو نہیں کہتے۔ پھر مجھے پاگل کیوں کہتے ہو۔ تم نے محبت کرنے کا آخری موقع بھی مجھ سے چھین لیا۔ تو پھر تم مجھ سے نفرت کرنے کا حق بھی چھین لینا چاہتے ہو۔ میں اگر نفرت نہ کروں تو کیا کروں۔ میری زندگی میں اب اس کے سوا اور رہ کیا گیا ہے۔ ہم تم دونوں اس دکان میں اسی جگہ کھڑے ہو کر کام کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ہم تم دونوں بوڑھے ہو جائیں گے۔ اور میں برابر تم سے نفرت کرتا رہوں گا۔ اپنی انتہائی قوت اور شدت کے ساتھ تم سے نفرت کرتا رہوں گا۔ نفرت کرتا رہوں گا تم سے ۔۔۔ نفرت کرتا رہوں گا ۔۔۔۔ اپنے آخری سانس تک نفرت کرتا رہوں گا۔

دروازے پر کھٹکھٹ کی آواز

دروازہ کھلنے کی آواز

جگر مراد آبادی

ذرّہ ذرّہ دیدۂ دل ہے، گوشہ گوشہ بستی ہے

عشق ہے جب تک سلسلہ جنباں دل کی ہستی ہستی ہے

جینے تک ہیں ہوش کے جلوے، آگے ہوش کی مستی ہے

موت سے ڈرنا کیا معنی، موت بھی جزوِ ہستی ہے

معنیٔ صورت، صورتِ معنی فکر و نظر کے دھوکے ہیں

فکر و نظر تک رہ جانا فکر و نظر کی پستی ہے

چشمکِ حسن و عشق مبارک، دیدہ و دل ہیں خرّم و شاد

حشر تک اب یہ بحث سلامت کس کی کہاں تک پہنچی ہے

جگر مرادآبادی

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں، مری ملکیت یہی چار پر

انہیں کہیے عشق کی وسعتیں جو ہیں خاص حسن کی عظمتیں
یہ اسی کے قلب سے پوچھیے جسے فخر ہو غمِ یار پر

یہ اشکِ خوں کی بہار ہے کہ مرقعِ غمِ یار ہے
مری شاعری بھی نثار ہے مری چشمِ سحر نگار پر

عجب انقلابِ زمانہ ہے، مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر، یہی سر تھا زانوئے یار پر

یہ کمالِ عشق کی سازشیں، یہ جمالِ حسن کی نازشیں
یہ عنایتیں یہ نوازشیں مری ایک مشتِ غبار پر

مری سمت سے اسے اے صبا! یہ پیامِ آخرِ غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر

یہ فریبِ جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر یہ ہے دلِ بے خبر
کہیں جم نہ جائے تری نظر انہیں چند نقش و نگار پر

میں رہینِ درد سہی مگر مجھے اور چاہیے کیا جگرؔ
غمِ یار ہے مرا شیفتہ میں فریفتہ غمِ یار پر

جگر مرادآبادی

نغمہ ترا نفس نفس، جلوہ ترا نظر نظر — اے مرے شاہدِ حیات، اور ابھی قریب تر

بن گئی مستقل عذاب جانِ خرابِ شوق پر — خود مری کاوشِ نگاہ خود میری فکر پردہ در

تیرا خلوص دلبری جاں نہ ڈال دے اگر — نالہ بھی میرا مضمحل، نغمہ بھی میرا بے اثر

عرضِ نیازِ شوق کا چاہیے اور کیا صلہ — میں نے کہا بچشمِ نم اُس نے سنا بچشمِ تر

لاکھ بیانِ دردِ دل اک وہ ستم حزیں — لاکھ فسانہائے شوق اک وہ نگاہ مختصر

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمتِ شب جہاں جہاں — ایک طلوعِ آفتاب دشت و چمن سحر سحر

دیکھا ہے اک جہانِ خاص میں نے کبھی کبھی جگر
حسن سے بھی بلند تر عشق سے بھی لطیف تر

مولانا تمنا عمادی

نگاہِ ناز سے مست شراب کرکے مجھے
سنوار تو نے دیا ہے خراب کرکے مجھے

تجلیوں کے تو پردے پڑے ہیں جلوے پر
دکھائیے تو کبھی بے نقاب کرکے مجھے

ہوئے وہ حشر کے ساماں میں اِدھر سرگرم
اُدھر ہی چھوڑ دیا محوِ خواب کرکے مجھے

لٹا دیا تری رحمت نے تو حساب کے وقت
شہیدِ مغفرتِ بے حساب کرکے مجھے

امید و بیم کی ہے کشمکش میں جان اپنی
ملا یہ فکرِ ثواب و عذاب کرکے مجھے

کوئی مرا غمِ پنہاں بھلا نہیں سکتا
شریکِ محفلِ چنگ و رباب کرکے مجھے

گناہِ عشق گناہِ کبیرہ ہو، لیکن
بڑا ثواب ملا ارتکاب کرکے مجھے

گناہِ عشق کسی اور سے جو ہو سرزد
سزا سناؤ تم اس کو خطاب کرکے مجھے

وہ بعدِ ذبح تماشا تو دیکھنے کو رکے
بڑا یہ نفع ہوا اضطراب کرکے مجھے

مجھے جو نزع میں پایا، تو کیا خیال آیا
کہ دیکھنے لگے آنکھیں پرآب کرکے مجھے

یہی ہے زیست، اسی شکل کی حیات بھی ہے
دکھا رہے ہیں نمائش حباب کرکے مجھے

یہ کس نے پھیر کے دریا سے میرا منہ یارب
رکھا ہے محوِ نمودِ سراب کرکے مجھے

تمہارے چاہنے والے تو سب ہیں ایک سے ایک
کرو ذلیل نہ تم انتخاب کرکے مجھے

کچھ اس تقدسِ نسبت کا بھی خیال کرو
رکھا جب اپنی طرف انتساب کرکے مجھے

سوالِ وصل پہ ترچھی نظر سے ٹال گئے
دیا جواب مگر لاجواب کرکے مجھے

وہ بے شراب کی مستی، وہ بے جنوں کا جنوں
دلاؤ یاد نہ ذکرِ شباب کرکے مجھے

وہ آئے بھی جو تمنا! تو دو منٹ کے بعد
چلے شہیدِ نگاہِ عتاب کرکے مجھے

ہادی مچھلی شہری

جہاں تیرہ و تاریک میں سحر نہ ملی
میں ڈھونڈھتا ہی رہا روشنی مگر نہ ملی

سکون کو اپنی حقیقت کی کچھ خبر نہ ملی
کمال حسن تو پایا مگر نظر نہ ملی

وہ سامنے رہے جب تک میں اپنے ہوش میں تھا
وہ ہٹ گئے تو مجھے اپنی کچھ خبر نہ ملی

کسی سے چارہ گری کی امید کیا رکھئے
ہوں جسمیں رحم کے انداز وہ نظر نہ ملی

قفس میں موت سے بدتر نہ کیوں اسے سمجھوں
جو زندگی بہ تقاضائے بال و پر نہ ملی

نہ کھل سکی دل کی میرے کوئی کلی
میں جس سحر کا تلاشی تھا وہ سحر نہ ملی

وہ راز ہستی موہوم ہوں جو کھل نہ سکا
وہ بے خبر ہوں جسے اپنی کچھ خبر نہ ملی

نظر نظر سے ملی بھی تو کیا نتیجہ ہے
مجھے گلہ ہے کہ دل سے تری نظر نہ ملی

ہے انتظار کا ہر لمحہ بیش از مہ و سال
یہ طول ہے تو مجھے عمر مختصر نہ ملی

ہمیشہ مجھکو گلہ بے بضاعتی کا رہا
ہٹی نقاب اگر فرصتِ نظر نہ ملی

قدم اٹھے تو ہیں میرے تلاش منزل میں
یہ ڈر بھی ہے کہ اگر راہ بے خطر نہ ملی

سمجھ سکا نہ میں خود اپنا راز غم ہادی
خود اپنے کھوئے ہوئے دل کی رہگزر نہ ملی

سیف حسن پوری

نگاہِ شوق نہ بھولے گی وہ بہار کے دن
وہ اضطراب کے لمحے، وہ انتظار کے دن

یہ مسکرانا، لجانا، سمٹنا، چل دینا
قریب ہیں دلِ بیتاب اب قرار کے دن

بہار آئی، کہ پل بھر کو برق لہرائی
چمن میں پھر وہی لوٹ آئے انتشار کے دن

کیٹں تو کیسے کٹیں نامراد کے اوقات
نہ زلفِ یار کی راتیں، نہ روئے یار کے دن

نہ تیرا غم، نہ زمانے کا غم، نہ اپنا غم
گراں ہیں دل پہ بہت عیش بے لُتار کے دن

ہوائے شام چلی، اور جگر میں آگ سی لگی
نہ پوچھ کیسے گزرتے ہیں سوگوار کے دن

چٹکنے لگتی ہیں دل میں نشاط کی کلیاں
کبھی جو سیف کو آتے ہیں یاد پیار کے دن!

جسونت رائے رعنا ملسوی

اگر کم ہو گئی رنگینیٔ محفل تو کیا ہوگا
جلا اور بجھ گیا جل کر چراغ دل تو کیا ہوگا

یہ باتیں آزمانے کی نہیں ہیں سوچنے کی ہیں
بغیر ان کے جو دنیا میں نہ بہلا دل تو کیا ہوگا

سرِ جادہ نہیں منزل پہ رہبر کی ضرورت ہے
ہجومِ شوق میں خود چھپ گئی منزل تو کیا ہوگا

تلاطم میں نظر ساحل پہ ہے اور دل میں یہ الجھن
سفینہ ڈوب کر ابھرا سرِ ساحل تو کیا ہوگا

ہزاروں خوبصورت سیرگاہیں راستے میں ہیں
سمجھ بیٹھا انہیں کو میں اگر منزل تو کیا ہوگا

یہ کس نے چھیڑ دی ہے درد میں ڈوبی غزل رعنا
مرے نغموں سے برہم ہو گئی محفل تو کیا ہوگا

رعنا اکبرآبادی

احکام صبر و ضبط جو حد سے گذر گئے　　　اہل وفا نے آہ نہ کی اور مر گئے
ناکام زندگی میں بڑا کام کر گئے　　　جو خوش نصیب تیری تمنا میں مر گئے
ہم ضبطِ غم میں ہوش کی حد سے گذر گئے　　　تسکین دے کے وہ ہمیں دیوانہ کر گئے
شایانِ اشکِ حسن نہیں اہل دل کی موت　　　تم کیوں ہو نوحہ گر جنہیں مرنا تھا مر گئے
ارشاد ہو تو دل کا جنازہ اٹھائیں ہم　　　فرمائیے حضور کے گیسو سنور گئے
غم کیا ہے آشیانہ کے تنکوں کی آگ کا　　　تاریکیٔ چمن میں اجالا تو کر گئے
کیا منزلِ حیات میں کچھ دلکشی نہ تھی　　　بیگانہ وار کتنے مسافر گذر گئے
ایک اک حسین آئینہ حسن ازل کا ہے　　　لاکھوں میں انکی شکل کے چہرے اتر گئے
انجام تھا شگفتِ گل تر کا سامنے　　　ہم نے کلیکو ہنستے جو دیکھا تو رو گئے
اس ملتفت نگاہ کا اعجاز کیا کہوں　　　جتنے تھے دل میں زخم شکایت وہ بھر گئے

رعنا پیامِ حسن قضا لے کے آئی تھی
اربابِ عشق، عشق میں خوش ہو کے مر گئے

اطہر نادر

وہ ہیں اور انجمن آرائی ہے — ہم ہیں اور گوشۂ تنہائی ہے

کچھ ہمیں پر تو نہیں ہے موقوف — اک جہاں آپ کا شیدائی ہے

التفاتِ نگہِ یار نہ پوچھ — دل کی ہر چوٹ ابھر آئی ہے

کوچہ در کوچہ ترا چرچا ہے — شہر کا شہر شناسائی ہے

اللہ اللہ یہ شفاف بدن — چاندنی جیسے سمٹ آئی ہے

آسماں پہ ہے کوئی قوسِ قزح — یا کسی شوخ کی انگڑائی ہے

اب نہ وہ ہیں نہ تصور ان کا — کتنی بے کیف یہ تنہائی ہے

ہم تو اظہار محبت کرتے — ہاں مگر آپ کی رسوائی ہے

اتنے چپ چاپ ہو نادرؔ کیسے

آج کیوں آنکھ یہ بھر آئی ہے

رسالوں میں

پچھلے دنوں رسالوں نے مختلف نمبر شائع کئے ہیں میں ماہنامہ ثقافت لاہور کا خلیفہ عبدالحکیم نمبر، ماہنامہ ندیم ڈھاکہ کا نذرالاسلام نمبر، ادبی دنیا لاہور کا خاص نمبر اور ماہنامہ ادیب علیگڑھ کا شبلی نمبر خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔

ثقافت لاہور: ـــــ عبدالحکیم نمبر ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے پہلا مضمون خود ڈاکٹر عبدالحکیم مرحوم کا ہے "ایمان کیا ہے" یہ مضمون انہوں نے انتقال سے ایک ہفتہ پہلے لکھا تھا یہ ان کا آخری مضمون ہے اور یوں ان کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔ (الحمد اللہ علی ذلک) افسوس ہے کہ یہ مضمون مکمل نہ ہو سکا لیکن بڑا مفید مضمون تھا اس میں ایمان کی طرح اور آدم و ابلیس کا واقعہ بڑے دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابلیس اس مادیت کا نمائندہ ہے جس کو مادے کی ترکیبات میں مادی عناصر سے زیادہ کوئی مستقل جوہر نظر نہیں آتا۔ یہ مظاہر پرستی ہے اور مظاہر پرست جبری بھی ہوتا ہے۔ آدم نے اپنی لغزش کا اقرار کر کے معافی چاہی کیونکہ اپنے اختیار کو غلط برتا۔ لیکن مادیت اور اس نے وابستہ عقلیت نے اپنے عدول حکمی کا الزام خود خدا پر رکھا۔ انسان صاحب ایمان ہوتا ہے۔ اس نمبر میں خلیفہ صاحب پر چودھری ظفر اللہ خان، ڈاکٹر امین حزین، الدعظمیٰ، پیر و فیسر کریم احمد شریف، قاضی محمد اسلم، عبدالرحمن چغتائی، ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ اور رفقائے ادارہ ثقافت اسلامیہ نے اچھے اچھے مضامین سپرد قلم کئے ہیں جن سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ابھرتی ہے اور محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت جید پر تھا اور ان کا انداز بیان بھی بہت دلکش ہے۔

ماہنامہ ندیم ڈھاکہ: ـــــ قاضی نذرالاسلام کی شخصیت پر یونس احمر، وقار عظیمی، الیاس شبلی، سید حسن، اے آر قاضی، اسد اللہ رشیدی، ابوالکلام شمس الدین اور ابراہیم صوفیہ کمال وغیرہ نے مختلف پہلو سے روشنی ڈالی ہے عربی فارسی اور [illegible] قاضی کی شخصیت و [illegible] کا تجزیہ اس نمبر میں قاضی کے افسانے اور نظموں کے ترجمے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ عبدالحق، جوہر، سلیم اللہ فہمی، ندا القادری، حامد رضا، یونس احمر، احسان اللہ، اور ڈاکٹر اختر حسین جیسے مشہور اہل قلم نے ترجمے کئے ہیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہوئے بعد زبان میں عربی فارسی اور اردو کے الفاظ [illegible] کے ساتھ [illegible] لکھے ہیں۔

ادبی دنیا لاہور ــــــــــ خاص نمبر ۲۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد کے ساتھ جواں
عمر و جواں ہمت صاحب قلم ڈاکٹر وزیر آغا کا نام بھی ادارے میں شریک ہے وہ "شریک مدیر" ہیں۔ اور خاص
نمبر کی ظاہری و باطنی حیثیت اور ضخامت میں شریک مدیر کی جد و جہد نمایاں ہے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی
کا مقالہ "اقبال کے استاد" ڈاکٹر صابر علی خاں کا مقالہ "قائم چاندپوری" اور مولانا صلاح الدین کا مقالہ "نظم و نثر آزاد
کے عناصر اربعہ" ڈاکٹر طاہر فاروقی کا مقالہ "ظفر کا دور آخر" سید علی عباس جلالپوری کا مقالہ فلسفہ اور ادبیات، اور پروفیسر
غلام حسینی ذوالفقار کا مقالہ شاعر اور معاشرہ، خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں، اس نمبر میں گوشۂ سالک کے عنوان
سے مولانا عبدالمجید سالک کی یاد میں بھی چند علمی صفحات درج ہیں۔ چند صفحات "کلچر اور اس کے مظاہر" کے عنوان سے
الگ ہیں جس میں پاکستانی کلچر نیشنل کلچر اور کلچر اور ادب کی بحث ہے، ادبی دنیا چند سالوں کے بعد از سر نو تازہ دم ہو کر
نکلا ہے اور اس کا دامن ہمیشہ کی طرح اچھے اچھے موتیوں سے مالا مال ہے، لیکن آج کی دنیا تا بہ جھوٹے موتیوں کی ظاہری
چمک سے زیادہ متاثر ہوتی ہے اصلی سونے میں بھی وہ چمک کہاں ہوتی ہے جو نقلی میں ہوتی ہے، ادبی دنیا، ہمایوں
عالمگیر، اور اس جیسے دوسرے علمی و ادبی رسالوں نے ساری عمر نگاہ جوہر شناس پیدا کرنے ہی میں صرف
کی ہے، یہ خاص نمبر بھی اپنی روایت کے مطابق شاندار ہے

ادیب علیگڑھ: ــــــــــ ۴۰۴ صفحات کا ضخیم شبلی نمبر اگرچہ مرتبین کے بیان کے مطابق،
"خاطر خواہ" نہیں، لیکن جو مقالات اور مضامین اس میں درج ہوئے ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بھی بہت اہم
ہیں، اور لکھنے والوں کی شخصیت کے اعتبار سے بھی، اس نمبر کے مضامین پانچ حصوں میں تقسیم کر دیئے گئے
ہیں۔ (۱) شبلی بحیثیت عالم، مفکر اور مورخ، (۲) شبلی بحیثیت مصنف نقاد اور شاعر (۳) شبلی بحیثیت ادیب
انشا پرداز اور صاحب قلم، (۴) جلوۂ صد رنگ (۵) مخطوطات،

شبلی کی شخصیت اتنی ہمہ گیر ہے کہ کسی ایک نمبر میں ان پر جامع روشنی پڑ ہی نہیں سکتی، ایک نمبر تو الگ رہا کسی
ایک کتاب میں بھی دشوار ہے۔ ورنہ سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی کافی ہوتی، شبلی نمبر کے مرتبین نے اچھا کیا کہ موافق
اور مخالف تمام مضامین بلا کم و کاست درج کر دیئے شبلی کی عظمت کو اس سے جراحت نہیں پہونچتی بلکہ وہ ابھرتی
ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان مرحوم، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم، ڈاکٹر اقبال اور صدیق احمد صدیقی مرحوم کی تحریریں
بھی اس نمبر میں درج ہیں، ــ اور بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کا ایک لمبا مکتوب بھی شریک اشاعت ہے، یہ مکتوب
۹ جولائی ۱۹۶۱ء کا ہے، اس خط میں بابائے اردو نے لکھا ہے کہ لوگوں کا یہ کہنا کہ میں مولانا کا مخالف ہوں اس کا سبب
میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ صریحاً غلط ہے، شبلی نمبر کا پیش لفظ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے۔ اس نمبر کے بعد
مرتبین شبلی نمبر کو دوسرا نمبر نکالنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے، اس نمبر کو پڑھنے کے بعد بے شمار چیزیں تشنہ نظر کی
صورت میں سامنے آئیں گی۔ اس نمبر میں ذہن و فکر کو جھنجھوڑنے والا مواد بھی کافی موجود ہے "شبلی اور علم الکلام"
(مولانا سعید انصاری) "شبلی بحیثیت محقق و نقاد" (مرزا احسان احمد بی اے ایل ایل بی علیگ) "شبلی کی سوانح نگاری"

(مولانا مجیب اللہ ندوی) موازنۂ انیس و دبیر (پروفیسر سید احتشام حسین) شعر العجم ایک مطالعہ (مولانا ماہر القادری) اور علامہ اقبال) مثنوی صبح امید (ڈاکٹر گیان چند) شبلی کا طرز تحریر (مولانا عبدالسلام ندوی) عالمی ادیب و شاعر (مولانا سعید انصاری) شبلی کا اسلوب بیان (ڈاکٹر سید عبداللہ) علمی ادبی اور فکری اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہیں ۔۔۔۔ اس نمبر میں جس طرح ایک مضمون شبلی افادی کی نظر میں ″ موجود ہے اسی طرح کچھ مضامین اکبر الہ آبادی اور محمد علی جوہر وغیرہ کی نظر میں اور اپنے معاصرین کی نظر میں بھی مرتب کئے جاسکتے تھے۔ اس نمبر میں مولانا شبلی کی ایک نہایت ستھری تصویر اور عکس تحریر بھی شامل ہے ۔ اور غیر مطبوعہ خطوط بھی ۔

JAMIA LIBRARY
3 SEP 1961
مہر نیمروز
ستمبر ۱۹۶۱ء
جلد نمبر ۶
شمارہ نمبر ۲
قیمت
سالانہ چھ سو پیسے (نئے)
ششماہی تین سو ۲۵ پچیس پیسے (نئے)
فی پرچہ پچاس پیسے (نئے)
پتہ
نمبر ۲۰۔ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی۔ ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی ۵
دفتر رسالہ "مہر نیمروز" ک۔ کوی روڈ۔ صدر۔ کراچی ۳

اس شمارے میں

حسن مثنیٰ ندوی اڈیٹر، پرنٹر پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر ۲۴۳ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵ سے شائع کیا

پہلی کرن

اک زخم تازہ روز نیا زخم کہن کے ساتھ

پچھلے چند مہینوں میں علمی و ادبی دنیا کے بہت اچھے اچھے لوگ ہم سے بچھڑ گئے۔ پروفیسر سید نواب علی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، سید حسن امام، تمکین کاظمی، مولانا ابوالحسنات احمد قادری، خواجہ دل محمد اور ڈاکٹر حمید قاضی ـــــ ان میں سے ہر ایک کو اس مقام تک پہونچانے میں جہاں تک یہ لوگ پہونچے تھے گردش کی ایک دنیا شب و روز مصروف عمل رہی تھی، ذرے سے لے کر آفتاب تک، ہر ایک نے مسلسل اور پیہم خدمت کی تھی۔

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے جہاں برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

پروفیسر سید نواب علی پچھلی بزم دین و دانش کی ان آخری یادگاروں میں سے تھے جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال مولانا عبدالرؤف دانا پوری، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے اہل قلم کے نام آتے ہیں۔

پروفیسر نواب علی قدیم اور جدید علوم پر یکساں نظر رکھتے تھے اور بڑے محقق تھے، سیرت میں تذکرۃ المصطفیٰ، مسئلہ ارتقاء پر معارج الدین، پھر موازنہ سائنس و اسلام، تاریخ صحف سماوی اور سیرۃ رسول اللہ جیسی کتابیں لکھیں، لکھنؤ کی خاک سے اٹھے تھے اب کراچی کی خاک میں آسودہ ہیں، ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے، ۱۹۶۱ء میں وفات پائی، عالم تھے، ایم اے اور بی ٹی تھے۔ کچھ عرصہ مدرستہ العلما علیگڑھ میں مدرس رہتے رہے پھر بڑودہ کالج کے پروفیسر ہوئے جہاں کمپریٹیو اسٹڈی آف ریلیجن پر تقریباً دو جگ تحقیق و تدقیق کے صرف کئے۔ تحریک علیگڑھ اور تحریک ندوہ نے جس نوعیت کا سرسبز و شاداب ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اس کا بہترین نمونہ تھے، ان کی کتاب تذکرۃ المصطفیٰ علیگڑھ کے نصاب میں اور تاریخ صحف سماوی ندوۃ العلماء کے درس میں داخل تھی، اسی طرح ایک رسالہ "ہمارے نبی" جامعہ ملیہ دہلی نے اپنے نصاب میں داخل کیا تھا اور اب کراچی یونیورسٹی نے تاریخ صحف سماوی کو اپنے نئے نصاب میں درج کر لیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۹ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی اور مشہور مستشرق ڈاکٹر منگانا کی خامہ فرسائیوں کے جواب میں بڑی عرقریزی کے ساتھ لکھی گئی تھی، رشید صاحب نے بعض رسالے اور کتابیں انگریزی زبان میں بھی لکھی ہیں ضرورت تھی کہ تاریخ صحف سماوی جیسی کتابیں بھی انگریزی زبان میں شائع ہوتیں۔ یہ کتاب جہاں بین خورد و فکر، نظم و ترتیب اور تحقیق و تدقیق کے لحاظ سے ان کی گرانقدر پیشکش ہے۔

پروفیسر رشید نواب علی اس عہد کے بزرگ تھے جس میں تہذیب نفس اور تربیت فکر و نگاہ کی حیثیت ہر چیز سے زیادہ تھی کیونکہ

آدمی اسی کی بدولت آدمی بنتا ہے۔ چنانچہ وہ انسانوں میں انسان تھے!

ڈاکٹر سید عبدالعلی

انسانوں میں فرشتہ اور فرشتوں میں انسان، اگر واقعی کوئی ہوسکتا تھا تو وہ ڈاکٹر سید عبدالعلی تھے چھوٹا قد، دوہرا بدن، روشن چہرہ اور بڑی بڑی آنکھوں میں یقین کی چمک، اس یقین کی جو ایمان کی پختگی سے پیدا ہوتا ہے ان کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ ان کے نامور مورث اعلیٰ سید احمد شہید بریلوی کیسے ہوں گے، ڈاکٹر صاحب اسی خانوادے کے فرد تھے۔ انسان کی متضاد اور متصادم جبلتیں غیر معمولی توجہ اور سلیقے کے ساتھ تربیت پاتی ہیں تب ہی اتنی معتدل طبیعت اور ایسے متوازن مزاج کا آدمی ابھرتا ہے، حرص و ہوس، کبر و غرور اور طمع و طلب کی تو جیسے ہوا تک ان کو نہ لگی تھی، اتنا نیک اور اتنا مستعد، ایسا بڑا آدمی، اور ایسا فرض شناس، ایسا طبیب شہر اور ایسا بے نفس، اتنا معروف اور اتنا کم سخن —— اور جتنا کم سخن اتنا ہی عملی —— شاید ہی کوئی اور ہو تو ہو، ان کی بے طمعی و بے طلبی بے نفسی و بے لوثی اور خاموشی کا سبب علم و دانش کی کمی نہیں بلکہ فراوانی تھی، انہوں نے تعلیم ندوۃ العلماء میں پائی تھی اور عربی کے اچھے ادیب تھے۔ حدیث دیوبند جاکر پڑھی تھی اور علوم الحدیث پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے، انہوں نے بی ایس سی کی ڈگری بھی لی تھی اور لکھنؤ میڈیکل کالج کا نصاب بھی پورا کیا تھا اور طب یونانی بھی اپنے والد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (ناظم ندوہ) سے حاصل کی تھی، غرض وہ مجموعہ علوم تھے، اور جو کچھ پڑھا تھا سب مستحضر تھا، زمانے کی رفتار سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔ اور عالم اسلام کے درد سے تو ان کا دل پیمانے کی طرح لبریز رہتا تھا۔

وہ لکھنؤ کے نامور طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ایک نامور اور مقبول معالج تھے، مطب کرتے تھے اور غالباً عبادت ہی سمجھ کے کرتے تھے کسی علاج میں اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی یا مریض کو مطمئن نہ پاتے تو بے تکلف کسی دوسرے معالج کی طرف اسے متوجہ کر دیتے، سادگی کا یہ عالم تھا کہ کوئی مریض اگر ان سے پوچھتا کہ امرود کھاؤں تو کہتے کھا لیجئے اور پھر وہی پوچھ لیتا کہ امرود نہ کھاؤں تو کہتے نہ کھائیے۔ ان کی یہ سادگی سادہ لوحی معلوم ہوتی حالانکہ وہ پرہیز خود بھی بتلاتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں متصرف وہ صرف خدا کی ذات کو سمجھتے تھے اسی کو نافع اور اسی کو ضار مانتے تھے۔ اس پر انکا پختہ یقین تھا، اور ان کے اس یقین میں بڑا اثر تھا، وہ دست شفا تھے،

ندوۃ العلماء کی نظامت کا بار بھی ان کے کندھوں پر تھا اور وہ اس خدمت کو بھی اسی اخلاص اور اسی مستعدی سے انجام دیتے تھے مجلس ندوۃ العلماء کی بنیاد ۱۸۹۳ء میں پڑی تھی اس کے پہلے ناظم مولانا شاہ محمد علی مونگیری تھے، دوسرے ناظم مولانا حکیم سید عبدالحیؒ منتخب ہوئے، ان کے بعد نواب سید علی حسن خاں اور پھر ڈاکٹر سید عبدالعلی۔

زمانہ اگرچہ ملی و مذہبی اداروں کے لئے سخت نامساعد رہا مگر اسکے باوجود ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں ندوہ نے خاصی ترقی کی ہے، ندوہ کی عمارت اور طلبہ کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا ہے ۱۹۰۲ء میں ندوے کے معتمد تعلیمات مولانا شاہ سلیمان پھلواروی تھے پھر مولانا شبلی نعمانی ہوئے پھر علامہ سید سلیمان ندوی، اور سید صاحب کی ہجرت کے بعد یہ ذمہ داری مولانا سید ابوالحسن علی کے سر عائد ہوئی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی اور مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کے دوسرے صاحبزادے ہیں جن کے علم و فضل مجاہدانہ حیثیات و خدمات کی شہرت ہندوستان پاکستان عرب، افریقا اور شرق اوسط تمام پھیلی ہوئی ہے۔ وہ عربی زبان کے بڑے ادیب و خطیب ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف۔

دیوبند اور علی گڑھ کی موجودگی میں ندوۃ العلماء کا قیام اصل میں قدیم و جدید کے ان دونوں مرکزوں کو ایک نقطے پر لانے کی

غرض سے ہوا تھا ندوہ ایک تحریک تھا اور اس تحریک نے دورِ غلامی میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور اس تحریک کے بانیوں کی روح کم و بیش اس کے خدمتگزاروں میں اور اس کے تربیت کردہ علماء میں ہمیشہ کارفرما رہی ہے۔ اس تحریک نے علم و ادب ہی کے میدان میں نہیں پورے معاشرے میں زندگی دوڑا دی تھی، اور ایک مخصوص ذہن پیدا کیا تھا آج اس تحریک کی ضرورت پاکستان و ہندوستان ہی کو نہیں شرق اوسط بلکہ سارے عالم اسلام کو بھی ہے، جو اس کے ذہن کو زمانے کی محکومی و مرعوبیت سے نجات دلوائے۔

سید حسن امام وارثی

ادیبوں میں ادیب، شاعروں میں شاعر، خطیبوں میں خطیب اور سیاستدانوں میں سیاستدان عالموں میں عالم، صوفیوں میں صوفی، امیروں میں امیر اور فقیروں میں فقیر۔ ان کے اندر بہت سی خوبیاں ایک ساتھ جمع تھیں، فارسی اور اردو شعراء کی جو غزل اور جو قصیدہ جہاں سے پوچھ لیجئے ان کی نوک زبان پر۔ اتنا غیر معمولی حافظہ کم ہی لوگوں کو ارزانی ہوا ہے۔ آخری دور میں ان کا محبوب مشغلہ کتابیں پڑھنا، رسالے دیکھنا، مضامین اور غزلیں لکھنا یا پھر ان مریضوں کیلئے دوائیں تیار کرنا جو علاج کے لئے ان کے پاس آتے تھے انہوں نے غرباء کو فائدہ پہونچانے کے لئے باقاعدہ ہومیوپیتھک طریق علاج کا مطالعہ بھی کیا تھا اور پچیس تیس سال سے ان کا یہ فیض مسلسل جاری تھا، کہا کرتے تھے کہ غریبوں کے ملک میں یونانی اور ہومیوپیتھک طریق علاج کو زیادہ سے زیادہ رواج دینا چاہئے۔ ایلوپیتھک غریب کش ہے، اور یونانی و ہومیوپیتھک غریب نواز۔ کراچی میں بھی بہت سے مریض ان کے پاس روز آتے تھے اور اکثر ان کو اپنے گھر بھی بلاتے تھے اور وہ انتہائی توجہ کے ساتھ علاج کا فریضہ ادا کرتے تھے۔

ادھر پٹنہ والے امام برادران یعنی علی امام حسن امام نے قانون دانی اور بیرسٹری میں غیر معمولی شہرت سارے برعظیم میں حاصل کی، ادھر گیا والے امام برادران یعنی سید حسن امام حسین امام نے سیاست اور قومیات میں شہرت حاصل کی عجیب اتفاق ہے کہ سر علی امام کے بھائی حسن امام بیرسٹر اور آنریبل حسین امام کے بھائی حسن امام وارثی، دونوں حصول آزادی کے مقابلے میں انتہا پسند تھے، یہی سبب ہے کہ ہوم رول لیگ کانگرس کمیٹی، اجلاس کانگرس اور سبجکٹس کمیٹی اور تحریک خلافت میں دونوں ہمنام ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ عزیزداری و قرابت تو تھی ہی یارانہ بھی تھا اور ہمخیالی بھی ادھر سر علی امام اور سید حسین امام کی پالیسی ایک تھی وہ اس برعظیم کی آزادی کو ملت اسلامیہ کی حریت و آزادی کے ساتھ مربوط و شیرازہ رکھنے کے قائل تھے، سر علی امام بھی حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے پر پہونچے اور سید حسین امام بھی کونسل آف اسٹیٹ کے رکن اور پھر اس کے پریسیڈنٹ ہوئے۔ یہ دونوں انتہا پسند نہ تھے۔ سر علی امام اور حسن امام بیرسٹر نے تو ۳۲ء میں انتقال کیا سید حسن امام وارثی نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ مگر سید حسین امام قومی جد و جہد میں برابر لگے رہے ان کا نام آل پارٹیز کانفرنس، مسلم کانفرنس، مسلم لیگ، اور تحریک پاکستان کے ممتاز قائدین میں ہے۔

سید حسن امام وارثی پر عہد خلافت کے بعد ہی سے فقیرانہ کیفیت غالب آتی چلی گئی۔ یہانتک کہ ہوم رول اور عہد خلافت کا وہ جامہ زیب و صاحب ذوق اور جمیل و وجیہ شخص جو بلحاظ سر تا پا طوفان و طغیان تھا ایک معمولی تہمد اور سفید کرتے کے سوا پھر اور کسی روپ میں نہ دیکھا گیا کبھی ننگے سر، کبھی سر میں ہرا رومال بندھا ہوا، ناک پر عینک، پاؤں میں چپل، وہ خاصی لمبی داڑھی رکھتے تھے۔ ان کی داڑھی حسین امام کی مونچھ کا جواب تھی، ان کے چھوٹے چھوٹے نواسے ان کو "داڑھی نانا" اور "مونچھ نانا" کہہ کر امتیاز پیدا کرتے تھے۔

اس گوشہ نشینی کے عالم میں بھی سید حسن امام کا تعلق خط و کتابت کے ذریعے برعظیم کے بے شمار علماء، شعراء اور اہل قلم

حضرات سے قائم تھا، سیاست میں، صحافت میں، تصوف، علم و ادب اور شعر و سخن میں کوئی بڑا آدمی ایسا نہیں تھا جس سے ان کے دوستانہ روابط نہ رہے ہوں، باقی تو سب ان کے سامنے کے بچے تھے، جوان کی نظروں کے سامنے بڑھے اور بڑے ہوئے سنہ ۱۹۱۲ء کے الہلال سے لیکر سنہ ۱۹۶۱ء کے رسائل تک ان کے مراسلات و مضامین مختلف رسائل پر ہمیشہ چھپتے رہے۔ برعظیم کا کوئی وقیع رسالہ ایسا نہیں ہے جو ان کے پاس نہ آتا ہو، اور شخصی لائبریریوں میں غالباً انہیں کی لائبریری ایسی نکلیگی جہاں زمانہ کا نپور، الناظر لکھنؤ، ادیب الہ آباد، الہلال، تہذیب الاخلاق اور معارف، جامعہ اور نگار سے لیکر آج تک کے رسائل باقاعدہ فائلوں کی صورت میں موجود و محفوظ ہیں کتابوں اور رسالوں کا ان کو بیحد شوق تھا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں فسادات دہلی کے وقت وہ دہلی میں تھے اور وہیں سے اٹھ کر کراچی آ گئے تھے۔ یہاں کراچی میں ہر دوسرے تیسرے صدر کا چکر کاٹتے تھے اور فٹ پاتھ پر پھیلی ہوئی کتابوں میں سے چن چن کر ڈھائی سیر اور تین سیر کتابیں تلوا کر رومال میں باندھتے اور ہاتھ میں لٹکائے گھر پہنچتے، کتابوں کی یہ بے قدری اور یہ حشر دیکھ کر ان کا دل بھی دکھتا تھا اور ڈھائی تین سیر کے حساب سے ہر بار کچھ کتابیں لا کے محفوظ کر دینے پر خوشی بھی ان کو بہت ہوتی تھی، اس طرح انہوں نے بہت سی قیمتی اور کمیاب کتابیں حاصل کی ہیں، ان کے مضامین جمع کئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ایک عرصہ تک گیا کا مشہور رسالہ ندیم مرتب کرتے رہے ان کی تحریر کا ایک مخصوص اسٹائل تھا، ان کے اکثر جملے کسی مصرعے یا شعر یا محاورے اور کہاوت سے مکمل ہوتے تھے۔ خود شاعر تھے اور غالب اسکول سے تعلق رکھتے تھے، کلیات کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے، اور غالباً شاہ ظہور حاتم کے دیوان کے بعد صرف سید حسن امام ہی کا دیوان ہوگا جس میں ہر غزل تاریخوار محفوظ ہے۔

طبیعت میں قلندری تھی، دوسروں کے دیوان تو شائع کرا دیئے لیکن کوئی مجموعۂ کلام اپنا شائع نہ کیا۔ کسی مشاعرے میں نہ جاتے تھے، لیکن لکھنؤ اور دلی، بہار شریف کے مشاعروں میں اپنی غزلیں برابر بھیجتے تھے۔ گھر پر جب کوئی غزل ہو جاتی تو اعزہ کو سناتے اور کہتے، میاں دیکھنا مولانا روم نے کہا ہے،

من نہ دانم فاعلاتُ فاعلات — شعر گویم بہتر از قند و نبات

ذرا اسکی تقطیع تو کرو، کہیں کوئی حرف ادھر سے ادھر تو نہیں نکل گیا۔ ہو تو بتا دینا — وہ بنفس نفیس شعر و ادب کی ایک تاریخ تھے۔ افسوس ہے کہ انہوں نے بھی رخت سفر باندھا۔ انا للہ۔

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا تیرے بعد؟

ستر سال تک بوڑھا ملاح مجھ بانو کے لئے زمانے، وقت، اور سیاست کی موجوں سے لڑتا رہا۔ ۱/ جمعہ سنہ ۱۹۶۱ء کو پتوار اس کے ہاتھ سے گر گئے، اب موجیں ہیں اور مجھ بانو ہے — اور مجھ بانو ہمیشہ کی نیند سو جانے والے ملاح سے پوچھ رہی ہے — ع کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا تیرے بعد۔

مولوی عبدالحق اپنی زندگی میں فنا فی الاردو تھے۔ مرکر انہوں نے بقا بالاردو کا درجہ حاصل کر لیا

باقی صفحہ پر

مشہود مرزا گورگانی
ایم۔اے۔بی۔ایس سی

"فانی کا مرتبہ اردو شاعری میں"

فانی کے ہم عصر شعراء کے کلام کے مطالعہ کے بعد فانی کے کلام کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ فانی میں اپنے معاصروں کے مقابلہ میں ایک نمایاں انفرادیت موجود ہے لیکن اثبات انفرادیت سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فانی کی بنیادی خصوصیات پر جدید تنقید کے بعض اہم اصولوں کی روشنی میں ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔ تنقیدِ جدید کی قید محض اس وجہ سے لگائی گئی ہے کہ فانی دراصل دورِ جدید ہی کے ذہن و فکر کے ترجمان ہیں

فانی کا غم میر کے غم سے مختلف ہے۔ ان کے یہاں تصوف کے مضامین میر و درد کا چربہ نہیں ہیں۔ تقاضوں کے پیش نظر انہوں نے غزل میں عہدِ جدید کے ذہنی، فکری، اور معاشرتی پہلوؤں کو بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا۔ غزل بقول مولانا حالی "دائرہ و سائرہ" صنف رہی ہے۔ اس نے ہمارے ذہنی شعور کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے۔ غزل نے زبان اور ذوقِ ادب کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا ہے لیکن خود غزل کی جان پر جتنے ستم ہوئے ہیں اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ اگرچہ غزل نہ جانے کتنے فن کاروں کا ذریعۂ اظہار رہی ہے لیکن مشکل ہی سے پندرہ بیس شاعروں کو صفِ اول کا غزل گو کہا جا سکے گا۔ ایسا غزل گو جس کا لہجہ شاعروں کے اس انبوہ میں پہچانا جا سکے جس کی ذات روایت کے بہترین عناصر کو جذب کر سکی ہو۔ جو غزل کی رمزیت مہاد کے بجائے متحرک سمجھتا ہو۔ اور جو غزل کے اشاروں میں۔ "روحِ عصر" اور "روایت" بیک وقت سمو سکا ہو۔

ان کے علاوہ غزل گو شعراء کے علاوہ ایسے شاعر بھی کچھ زیادہ نہیں جو اپنی کسی ممتاز خصوصیت کی وجہ سے یاد رکھے گئے ہوں۔ یا کسی اہم رجحان کی ترجمانی کرتے ہوں۔ یا جن کے نظریات سے انکار نہ کیا جا سکے۔ اور جو خود زمانے کے ہاتھوں یا موت کا شکار ہو کر اپنے نظریات کو دلائل و براہین سے ثابت نہ کر سکے ہوں۔

تیسرا گروہ ان شعراء متغزلین کا ہے جو اپنی خوش گوئی اور رنگینی کی وجہ سے یاد رکھے جاتے ہیں اور جنہوں نے کسی اہم تاریخی موقف پر غزل سے اصلاح کا کام لیا ہو۔ چاہے وہ بڑے شاعر نہ ہوں۔ یہ تقسیم میں نے دامانِ غزل کی وسعتوں کو سمیٹتے ہوئے کی ہے۔ اس لئے کہ فکری اعتبار سے ایسے شعراء کی تعداد محدود سے محدود تر ہو جائیگی۔

اردو غزل کا تاریخی مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ بعض ادوار غزل کے لئے خاص طور پر سازگار ثابت ہوئے ہیں مثلاً میر کے عہد میں ہمیں خواجہ میر درد، سودا، یقین اور تاباں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح غالب کا دور بھی غزل کے بہت اچھے اساتذہ کا دور تھا کیونکہ بدلتے ہوئے سماجی حالات، جدید ذہنی تقاضے اور مغربی ادب کے اثرات غزل کے لئے ایک بڑا چیلنج تھے۔ فانی کی زندگی ہی میں غزل کو

"گردن زدنی" قرار دیا جا چکا تھا۔

فضا میں اقبال اور جوش کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ خاص طور پر جوش کے یہاں بغاوت کا جلال اور آگ ہے وہ تو نوجوانوں کی آگ کو اور بھڑکا رہا تھا۔ اور انکے شاعرانہ جوش و خروش سے باغیانہ رجحانات فروغ پا رہے تھے۔ اور نئے تجربات ادب کے افق پر ہویدا ہو رہے تھے۔

ان حالات میں جن لوگوں نے غزل کو زندگی کا آئینہ دار بنایا وہ حسرت اور فانی ہیں۔

حالی سے لے کر عہدِ فانی تک اردو غزل اپنے دامن میں جن اکابر شعراء کو لئے ہوئے ہے۔ اور جن میں جلال لکھنوی اور شاد عظیم آبادی جیسی پر عظمت شخصیتیں بھی شامل ہیں ان کی اہمیت صرف تاریخی ہے۔

فانی کی شاعرانہ عظمت انکے اسلوب کے حسن اور انکے اندازِ بیان کی نزاکت میں پنہاں ہے۔ اور قدروں کا تعین کرنے والے کو یہ دیکھنا پڑیگا کہ فانی نے کس طرح لکھنوی غم کی سطحیت سے اردو غزل کو نجات دلائی۔ اور انہوں نے اسی غزل کی پرانی علامتوں میں کس طرح اپنے تجربات اور اپنے دور کے ذہنی غم کو پیش کیا ہے،

عبوری عہد کے دوسرے شعراء کے یہاں ان دونوں عناصر کی ہم آہنگی نہیں ملتی۔ فانی کے ہم عصروں میں یگانہ اور جگر نے اپنے راستے نئے بنائے لیکن ان دونوں کی شاعری میں وہ قوت نہیں جو حسرت اور فانی کے یہاں ہے۔ یہ دونوں نئی اردو غزل کا مزاج بنانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ غزل کے ساتھ یگانہ کے امتزاج نے تو صنفِ غزل ہی کو بدمزاج کر دیا۔

فانی کی شاعری کی عظمت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے حدود میں رہتے ہوئے ایک خاص نقطۂ نظر کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس اعتبار سے "شہنشاہِ متغزلین" اور اپنی زندگی میں کلاسیکل حیثیت حاصل کرنے والے حسرت موہانی بھی فانی کے حریف نہیں ہیں۔

اردو غزل کی پوری تاریخِ شاعری میں ایسا شاعر میر کے علاوہ شاید ہی کوئی اور نظر آئے۔ غالب کے یہاں فانی سے زیادہ گہرائی ہے غالب کا ادراک زیادہ تیز ہے۔ غالب کائنات کی مختلف اشیاء کے ربطِ پنہاں کو دیکھ اور دکھا سکتے ہیں۔ وہ قطرے میں دریا دیکھتے ہیں۔ ہر رنگ میں بہار کا اثبات کرنا انکا ایمان ہے لیکن غالب نے بھی کسی ایک نقطۂ نظر اور اندازِ زیست کو مسلسل اور وفاداری کے ساتھ اس انداز سے نہیں اپنایا جیسے فانی نے اپنایا ہے۔

فانی تاریک رات کے مسافر ہیں لیکن وہ ظلمتوں کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کی اپنی حدیں (LIMITATIONS) ہیں لیکن ان حدوں میں وہ صرف اچھے شاعر نہیں بلکہ بڑے شاعر ہیں بڑے شاعر کی طرح وہ زندگی کی بنیادی باتوں کے بارے میں ایک نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

فلسفیانہ افتادِ طبع کی وجہ سے وہ اپنی تلاش جستجو اور بے تابی سے حقیقی کو کلی یا ابدی صداقت نہیں کہتے۔ انسان کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ صداقت کی تلاش کرتا رہے۔ فانی کے یہاں ادبیات عالم کے دوسرے بڑے شاعروں کی طرح اپنی ذات کا احترام اور اپنے قلب کو توڑنے کا حوصلہ بیک وقت نظر آتا ہے اور اپنی ذات کے نمائندے بھی ہیں اور دوسرے افراد کے نمائندے بھی لیکن وہ افراد کی ذہنی زندگی اور الجھنوں کے نمائندے نہیں۔

فانی کے دور میں اقبال اور جوش کے اثر سے ہمارے بیشتر شاعر "اجتماعیت" کے ترانے گا رہے تھے۔ ادب "فرد" کو بھول چکا تھا۔

"اجتماعیت کے سب سے بڑے علمبردار مارکس نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ادب کا بنیادی موضوع "فرد" ہے۔ فانی نے "فرد" کے لئے شعر کہے ہیں لیکن یوں کہ اجتماعی اور سماجی پس منظر ہر جگہ ملتا ہے۔ یہی فانی کا بڑا کارنامہ ہے۔ اور اس سے ان کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

فانی نے جذبۂ غم میں جو فلسفیانہ عمق پیدا کیا ہے اسے ہم انکا اجتہاد یا اضافہ قرار دے سکتے ہیں۔ میر کا غم اتنا حقیقی ہے جیسے درخت پر شگوفوں کا کھلنا اور سوتے میں بچے کا مسکرانا فانی کے غم میں یہ بے اختیاری نہیں یہاں تو کچھ اپنا ہی اختیار نظر آتا ہے، بہرحال فانی کے غم میں ہمیں "المیہ" کی عظمت کسی حد تک (جہانتک غزل اجازت دے سکتی تھی) نظر آتی ہے۔ فانی زندگی سے بھاگتے نہیں۔ وہ زندگی سے نبرد آزما ہوئے ہیں۔ انکا غم محض شکستِ حوصلہ کی تفسیر نہیں، زندہ رہنے کی آرزو بھی پیدا کرتا ہے۔ فانی کی شاعری تقدیر کے خلاف فرد کی جدوجہد کو پیش کرتی ہے۔ خواہ آپ اس تقدیر کو کہیں محبت کہہ لیں اور کہیں خلافِ ادعائے خودداری و بے نیازی۔

ع ہم جان دیکے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

اور ؎

جیے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

مذکورہ بالا مصرع و شعر میں، تقدیر کے مقابلہ میں انکی قوت آزمائی نمایاں ہوگئی ہے اسی طرح فانی کے یہاں ہمیں کہیں شدید احساس تنہائی اور کہیں اپنے نصب العین کے مقابلے میں اپنی "فتوحات" کے چھوٹے ہونے کا خیال ملتا ہے۔ یہ ان کے غم کے سرچشمے ہیں اور غم کی اس نوعیت نے فانی کو بیسویں صدی کے نوجوانوں کا شاعر بنا دیا۔ یہ بات محل غور ہے کہ اقبال اور جوش کے پیغام سے متاثر ہوکر قومی زندگی میں سرفروشانہ کام کرنے والے نوجوانوں کی تنہائیوں کا شاعر فانی ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ فانی کی مقبولیت کبھی کم نہ ہوگی۔ انکی عظمت عارضی نہیں ہے

احتشام صاحب کے خیال کے مطابق جب تک انسان کا دل دھڑکتا رہے گا۔ کوئی میر، کوئی غالب، کوئی آتش، کوئی حسرت، کوئی جگر، کوئی فانی، کوئی فراق ہمارے وجود کے اندر جھانکتا ہے۔ اور وہ نغمہ چھیڑتا ہے جسے ہماری روح قبول کرنے پر تیار ہو جاتی ہے ---- انکی آواز پیچھا کرتی ہے (خواہ ہم اس سے کتنا ہی دور بھاگیں)" احتشام صاحب نے اپنے دلکش انداز بیان میں کیسے لطیف انداز سے جریدۂ عالم پر ان اصحاب کے دوام کا فیصلہ دیا ہے جن میں ہمارا فانی اپنی خصوصیت کی بنا پر سب میں نمایاں ہے۔

فانی کی شاعری محض اسکے جذبات و تجربات کا اظہار ہی نہیں ہے (یہ بڑی پیش پا افتادہ بات ہے) بلکہ وہ اپنے اشعار میں "زندگی کے کسی اچھے یا برے پہلو کو قبول کرتا ہوا اپنے جذبات یا اپنے اسالیب بیان سے کش مکش کرتا ہوا نظر آتا ہے" انمیں اتنی سکت ہے کہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی اپنے "تخلیقی عمل" میں شریک کر لیتا ہے، اس کے اشعار پڑھکر ہم کچھ کھوتے اور کچھ پاتے ہیں۔

یہ خیقہ شاعری کی بڑی کسوٹی ہے۔ فانی کے یہاں یہ بات اپنے تجربات سے خلوص رکھنے اور اردو زبان کی عظیم روایت سے پوری طرح فیض حاصل کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ محمد حسن عسکری نے فنی شخصیت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تخلیقی عمل میں تین چیزوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ایک تو ادیب کی ذاتی شخصیت دوسرے معاشرے کی اجتماعی شخصیت، تیسرے زبان کی شخصیت" اور یہ ایک حقیقت ہے کہ میر، آتش، غالب اور حسرت کی طرح فانی کی غزل میں ہمیں یہ تینوں عناصر مجتمع ملتے ہیں۔ فانی کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

* * *

چشم بد دور دلہن بن کے شباب آتا ہے
اب انہیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے

"جان سے دور" اور "چشم بد دور" ہمیں لکھنوی زبان و اسلوب کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن فانی کے یہاں یہی ترکیبیں جن میں نسائیت کا پہلو اس درجہ غالب ہے اسکی تخلیقی قوت کے سہارے ماضی کی زندہ روایات بن گئی ہیں۔ روایاتِ شعر کو اس تخلیقی انداز میں جذب کر لینا ہی فانی کی عظمت کے لئے کافی تھا۔

فانی کی عظمت کی ایک بنیاد یہ حقیقت بھی ہے کہ اس نے اردو غزل کو جذبات سے نجات دلا کر جذبہ کی ترجمانی کی EMOTION سے SENTIMENTALISM تک یہ سفر شاعری کی دنیا میں کم ہی روحیں طے کر سکی ہیں۔

گہرا جذبہ ہی شاعری میں تفکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ عام طور پر اس بات کو یوں کہا جاتا ہے کہ اگر تفکر میں جذبہ کا آب ورنگ نہ ہو تو محض فلسفہ ہی فلسفہ رہ جائیگا شاعری نہ ہوگی۔ یہ بات درست ہے لیکن قدرے اصلاح طلب ہے اور وہ اصلاح یہ ہے کہ گہرا اور ہمہ گیر جذبہ ہی شعری تفکر ہوتا ہے۔ میر، غالب، اقبال اور فانی کو مفکر شعراء میں شامل کیا جاتا ہے۔ جرأت، داغ اور اسی قبیل کے دوسرے شعراء کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری سوچتی نہیں۔ اس انداز تعبیر سے دراصل ہماری مراد جذبہ کی گہرائی اور تجربے کی وسعت سے ہوتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے (T.S.Eliot) اس بارے میں لکھا ہے کہ۔

" We say, in a vague way, that Shakespeare or Dante, or Lucritius, is a poet who thinks, and that Swin burne is a poet who does not think, even that Tennyson is a poet who dose not think. But what we really mean is not a difference in quality of thoughts, but a difference in quality of emotions. The poet who thinks is merely the poet who can express the emotional equivalent of thought ".

(Selected Essays by T.S Eliot)

فانی کے یہاں جذبہ کی وہ بلند سطح ہے جسے ہم فکر کے مترادف قرار دے سکتے ہیں۔ فانی کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے فلسفہ کے جن دبستانوں یا فلسفیوں کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا مقصد فانی کو سمجھنے کی ایک کوشش کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن فانی کی عظمت کی وجوہ

نہیں جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے کہ انہوں نے فلسفیانہ مضامین اپنی غزلوں میں پیش کئے (ویسے یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے) بلکہ ان کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے جذبہ کو فکر کی سطح تک پہنچا دیا۔

اس تجربے کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فانی ہمارے ادب کے ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ بڑے شاعر ہیں۔ انکی مقبولیت میں سیاسی نعروں کو دخل نہیں ہے اور نہ ہی فانی نے بیسویں صدی کی کسی تحریک کو ادبی فیشن کے طور پر قبول کیا (ہمارے دور میں ایسی مثالیں بہت ہیں) فانی نے سب سے کٹر صنفِ سخن یعنی غزل کو رام کر دیا۔ آج اردو غزل کو جو نشاۃ ثانیہ حاصل ہو رہا ہے اسکے اسباب میں سے ایک سبب فانی کی شاعری بھی ہے۔ فانی محض غزل کے قابلِ ذکر شاعر نہیں بلکہ وہ اردو غزل کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔

جدید دور سائنسی ترقی کا دور ہے۔ لیکن انسانیت پستی کی طرف جا رہی ہے۔ یہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم انسانیت کو تباہ کرنے کے لئے ایجاد ہوئے ہیں۔ اقوام وممالک ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے میں پیش پیش نظر آ رہے ہیں۔ دنیا میں افراتفری (افراط وتفریط) ہے۔ طمانیت کسی فرد کو حاصل نہیں ہے۔ ذہنی پراگندگی کے ساتھ تہذیبی انتشار بھی ہے۔ ایسے یاس انگیز حالات میں دنیا کا مستقبل بہت ہی تاریک ہے اور ایسے پُر آشوب دور میں لوگ یقیناً قنوطیت کی طرف مائل ہوں گے۔ سماجی کشمکش، معاشرتی بحران اور اقتصادی مشکلات کے اس عہدِ تاریک میں فانی کی شاعری لوگوں کے دلوں میں اتر کر انہیں سکون بخشیگی اور آفاقیت حاصل کرے گی۔ اس لئے کہ فانی کی آواز خود اسی کی شکست کی آواز نہیں ہے بلکہ شکستِ عالم کی آواز ہے۔

سید مظفر حسین رزمی ایم اے

اردو افسانے کا سماجی رجحان

اردو ادب میں افسانے کا سماجی رجحان ترقی پسند تحریک کے بعد سے شروع ہوتا ہے اس سے پہلے ہمارے ادب میں فن اور تکنک کے اعتبار سے افسانے کی کوئی مستقل حیثیت نہیں تھی ہمارے افسانے زندگی کی عکاسی اور حقیقت نگاری سے دور تھے۔ کہانیاں لکھی جاتی تھیں لیکن انمیں افسانویت مطلق نہ ہوتی تھی خود پریم چند جو ہمارے افسانے کی روایت کے امام کہے جاسکتے ہیں اور جن کے ہاتھوں ہمارا افسانہ مختلف النوع جدتوں اور تجربوں سے مالا مال ہوا اپنے ابتدائی افسانوں میں افسانوی تکنک کے گر سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں قصے کی ترتیب تو ملتی ہے لیکن ان قصوں کی ترتیب میں خوش سلیقگی اور نفاست مفقود نظر آتی ہے انمیں افسانوی فضا، رمزیت اور ایمائیت کی پرچھائیاں نہیں ملتیں۔ انکے یہاں مقصدیت کی چھاپ ہر جگہ نمایاں ہے۔ سوز وطن کے سارے افسانے ایک گہری مقصدیت کے تحت لکھے گئے ہیں ان افسانوں میں مقصد اور اصلاح افسانہ نگار کے اعصاب پر سوار نظر آتا ہے کہ ان کے کردار وں کے نامون تک ہیں۔ یہی رنگ غالب ہے پریم پچیسی، پریم بتیسی اور پریم چالیسی کے افسانوں میں بھی قدیم اور فرسودہ داستانوی رنگ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ انمیں جذبات اور مادرائی فضاؤں کی عکاسی ملتی ہے لیکن ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد پریم چند کے افسانے زندگی سے قریب آگئے ہیں ان افسانوں میں زندگی کو سمجھنے اور اسکو بہتر بنانے کا خیال ملتا ہے ان میں سماجی شعور کا احساس بھی نمایاں ہے پریم چند کے ہمعصر اور اس دور کے لکھنے والوں میں سدرشن، اعظم کریوی، سلطان حیدر جوش، علی عباس حسینی کے نام قابل ذکر ہیں، ان بزرگوں کے یہاں بھی خالص رومانیت اور جذباتیت کا دخل ہے ان کے یہاں بھی افسانے کا موضوع حسن و عشق کی بھول بھلیوں اور اصلاحی اور مقصدی گورکھ دھندوں سے آگے نہیں بڑھا انہوں نے بلاشبہ گاؤں کی زندگی، وہاں کے رہنے بسنے والوں کی عسرت زدگی۔۔ اور ان کے سماجی مسائل کی تصویر کشی کی ہے لیکن اس سلسلے میں انہوں نے کوئی انقلابی کیفیت نہیں پیدا کی۔

اسی دور میں اردو افسانے کے اندر ایک خاص قسم کا رجحان ہمیں ملتا ہے جسے ہم انشائیہ رجحان سے تعبیر کرسکتے ہیں یہ رجحان ادب لطیف کی تحریک کے زیر اثر افسانے میں رونما ہوا۔ نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، یلدرم اور آل احمد اس گروہ کی ترجمانی کرتے ہیں انکے یہاں جذباتیت اور رومانیت کا ایک ریلا ہے۔ جو زندگی کی حقیقتوں سے بہت دور ہے انکے یہاں سماجی شعور کا فقدان ہے۔ یہ افسانے شاعری اور انشا پردازی کے نمونے تو کہے جاسکتے ہیں افسانے نہیں، اسلئے کہ ان افسانوں میں زندگی کے متعلقہ مسائل نہیں ملتے انمیں سماجی مسائل کی تصویر نہیں ملتی نقاد آگرہ اور نگار میں افسانوں کی اشاعت ہوتی تھی۔

پھر مغربی افسانوں کے اثر اور بیسویں صدی کے سیاسی انقلابات نے ہمارے افسانوں میں ایک نئی روح پیدا کی ایک ایسی روح

بیدار کی ایک ایسی روح جسکے اندر زندگی کی تلخیوں کا احساس تھا ملک کی سیاسی اور سماجی ابتری کا احساس تھا، ایک اُگھرتی ہوئی بورژوا سوسائٹی کی پستیوں کا احساس تھا ملک کے سماجی حالات کو سنوارنے کا جذبہ تھا جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت تھی اور اسی نفرت اور بغاوت کے جذبے نے "انگارے" کو جنم دیا۔ اس کتاب میں جن افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہوئے وہ نقطۂ نظر کے اعتبار سے اشتراکی تھے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کی داغ بیل ڈالی اس ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو افسانوں کی رَو اور رفتار بدلی انمیں انقلابی کیفیت جاگی ہمارے افسانے سماجی شعور سے ہمکنار ہوتے۔ یہ دور دراصل پچھلے دور کے خلاف ردعمل کی حیثیت سے وجود میں آیا تھا اسلئے اس دور کے افسانوں میں ہمیں جذباتیت شدت اور مبالغہ آمیزی کے عناصر نمایاں طور پہ ملتے ہیں۔ سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی وغیرہ اس دور کے ترجمان تھے۔ ان لوگوں نے "انگارے" کے ذریعہ ملک کے در و بام میں اک آگ سی لگادی، انہوں نے سماج کی بے راہ روی کو ملعون کیا حکومت پر بے لاگ تنقید کی ۔ ۔ ۔ ۔ حکومت نے انگارے کو ضبط کرلیا۔ انگارے کے لکھنے والوں نے جہاں اپنی جذباتیت اور شدت پسندی کی وجہ سے افسانے کے فن کو ٹھیس پہنچائی وہاں انکی شدت پسندی کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ انہوں نے اردو کے افسانہ نگاروں کو بے جھجک نشتر زنی کا انداز سکھایا نتیجے کے طور پر ہمیں بعد کے افسانہ نگاروں میں بے باکی اور نشتر زنی کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے اس سلسلے میں بیدی، منٹو اور عصمت کا نام لیا جاسکتا ہے۔

منٹو ہمارے افسانوی ادب کا ایک انمول موتی تھا جو فطری طور پر افسانہ نگار پیدا ہوا تھا۔ اس کے اندر بلا کی ذہانت تھی اسنے انسانی فطرت کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا اسی لئے اسے کردار نگاری کا ایک خاص سلیقہ حاصل تھا زمانے نے اسے فحش نگار اور ذہنی مریض کے نام سے نوازا مگر یہ حقیقت کسی کو نہ معلوم ہوسکی کہ منٹو سماج کی گندگیوں اور عریانیت کو اس کے صحیح روپ میں پیش کرتا ہے۔ اسکی نیت میں طہارت اور پاکیزگی ہوتی ہے۔ وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے بھی دشنہ و خنجر سے کام لیتا ہے "ٹھنڈا گوشت"، "کالی شلوار"، "دھواں" اور "کھول دو"، پڑھتے ہوئے ہم جنسی تلذذ نہیں حاصل کرتے بلکہ ہم ان افسانوں کے آئینے میں اپنے گرے ہوئے اخلاق کی تصویر دیکھتے ہیں اور شرم سے ہماری گردنیں جھک جاتی ہیں "ایشر سنگھ" کے کردار میں ہمیں اسکی تمامتر آوارگیوں بداخلاقیوں اور گندگیوں کے باوجود انسانیت کی وہ رمق بھی دکھائی دیتی ہے جو مرتے وقت اسکے تاریک قلب میں جلوہ گر تھی منٹو کی طرح عصمت بھی انداز تحریر کے اعتبار سے بے جھجک نشتر زنی اور بے لاگ تنقید کی قائل ہیں انہوں نے اپنے افسانے کا موضوع ہندوستان کے متوسط طبقے سے تلاش کیا ہے۔

انہیں افسانے کے موضوع آنکھ بند کرکے سوچنے سے نہیں بلکہ آنکھ کھول کر دیکھنے سے ملے ہیں۔ ان کے چند افسانوں کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں جنہیں "چوٹیں"، اور "ایک بات" اردو افسانوں میں ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں تقسیم کے بعد عصمت گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل آئی ہیں اور انہوں نے اپنے افسانوں کی بنیاد سماجی تحریکات پر رکھی ہے "کیڈل کورٹ" اسکی ایک اچھی مثال ہے اور ان کی ایک کامیاب کوشش کہی جاسکتی ہے بیدی افسانوں کے لئے اچھا پلاٹ تلاش کرتے ہیں زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احساس ان کے یہاں صاف جھلکتا ہے۔

کرشن چندر کی شخصیت اردو افسانوں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کرشن چندر نے اردو افسانے کو جو عظمت اور انقلابی کیفیت بخشی ہے۔ وہ اسی کا حصہ ہے کرشن نے اردو افسانوں میں فنی اور ادبی دونوں نقطۂ نظر سے بیش بہا اضافے کئے ہیں اسکے افسانوں میں جمالیاتی عناصر بھی ہیں، زندگی کی رنگینی بھی ہے اور سیاست کی جھلک بھی اسنے صحیح معنوں میں ترقی پسندانہ قدروں کو اپنے

افسانوں میں جگہ دی ہے یہی وجہ ہے کہ کرشن کے افسانے آج دنیا کے کسی بھی بڑے ادیب کے افسانوں کے دوش بدوش رکھے جا سکتے ہیں ان کے افسانوں کے مجموعوں میں "ٹوٹے ہوئے تارے" "ہم وحشی ہیں" "سمندر دور ہے" "زندگی کے موڑ پر" خاص طور پر قابل ذکر ہیں

تقسیم ہند کے بعد برِ صغیر ہند و پاک ایک خونی ڈرامے سے دوچار ہوا ملک تقسیم ہوا کتنے بے گناہوں کی معصوم زندگیاں چند مفاد پرستوں کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ گئیں آزادی کے نام پر خاک و خون کا کھیل کھیلا گیا۔ اس ظلم و تشدد کا احساس بھلا ادیبوں کو کیونکر نہ ہوتا۔ چنانچہ ہمارے اردو کے افسانہ نگاروں نے بھی فسادات کے موضوع پر تیزی سے لکھنا شروع کیا۔ ان افسانوں کے موضوع وہی سوغات تھے جو آزادی اپنے ساتھ لائی تھی یعنی قتل و غارتگری، خون، چیخیں، آہ و بکا اور زندگی کی روتی بسورتی ہوئی تصویریں ان افسانہ نگاروں نے فسادات کے خلاف جو انگریز سامراجیوں کی خوفناک سازشوں کا نتیجہ تھے علم بغاوت بلند کیا انہوں نے امن اور انسانیت دوستی پر افسانے کی بنیاد رکھی فسادات پر جن افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے ان میں کرشن چندر، شوکت صدیقی، ابراہیم جلیس، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، منٹو، قدرت اللہ شہاب، حیات اللہ انصاری، احمد عباس، عصمت، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد کچھ سال تک ادب میں جمود کی کیفیت طاری رہی ترقی پسند تحریک کے علمبردار گروہوں میں بٹ گئے بعض ترقی پسند ادیب اور افسانہ نگار جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اس سے کٹ کر علیحدہ ہو گئے۔

بعض ایسے ادیب جو تقسیم سے پہلے غیر جانبدار تھے تقسیم کے بعد ترقی پسند تحریک سے عملی طور پر وابستہ ہو گئے۔ ان افسانہ نگاروں میں ذکی انور، انور عظیم، بلونت سنگھ، مہندر ناتھ اور رام لعل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بلونت سنگھ کی کہانی "لمحے" ہاجرہ مسرور کی کہانی "امت مرحوم" اور "پرانا مسیحا"، ذکی انور کی "شاہراہ"، احمد ندیم کا "سناٹا"، جلیس کا افسانہ "پرمٹ"، السعید کا افسانہ "سرد گلاب"، تسنیم سلیم چھتاری کا افسانہ "اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا" اور عزیز احمد کی کہانی "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" قدر اول کی چیزیں کہی جا سکتی ہیں۔ اردو کے افسانوں کا ذخیرہ بہت ہی طویل ہے۔ آج کا اردو افسانہ ہماری تہذیب، معاشرت، سماج اور کلچر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ان افسانوں میں رومان بھی ہے اور شعریت بھی زندگی کی رعنائیاں بھی ہیں اور دلکشی بھی کائنات کا حسن بھی ہے اور بدصورتی بھی۔ پاکستان سے اب افراتفری اور انتشار کا دور ختم ہو رہا ہے۔ اب پھر یہاں ایک نئی زندگی جنم لے رہی ہے ادب سے جمود کا غلاف اتر رہا ہے حکومت ادیبوں شاعروں اور افسانہ نگاروں کی قدردان ہے ادیبوں اور آرٹسٹوں کی اہمیت حکومت کی نظروں میں بڑھ گئی ہے۔ رائٹرز گلڈ کے قیام نے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کو کچھ سوچنے کا موقع عطا کیا ہے۔ ان حالات کی روشنی میں ہم اردو ادب اور اردو افسانوں کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں جب دیکھتے ہی دیکھتے اردو کا افسانوی ادب کیا سے کیا ہو جائیگا

حسنین کاظمی

ایرانی موسیقی

ایران کی سرزمین گل و بلبل کی سرزمیں کہلاتی ہے۔ یہاں کے چمنستان میں رنگا رنگ پھول کھلتے ہیں جنکی خوشبو سے فضا مہک اٹھتی ہے۔ ہوائیں ان خوشبوؤں کو اپنے دوش پر اڑا کر لے جاتی ہیں۔ اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں بکھیر دیتی ہیں۔ مشام تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں کی بیمار نرگسوں میں گلابی گلابی ڈورے نظر آنے لگتے ہیں اور بجھے ہوئے دلوں کے کنول کھل اٹھتے ہیں۔

ایران کے دبستان موسیقی میں بھی ایسے رنگا رنگ پھولوں کی کمی نہیں۔ لیکن ہر پھول کا رنگ جدا ہے۔ خوشبو جدا ہے۔ کائنات رنگینیوں سے بھری پڑی ہے۔ رنگ و بو سے بھرپور یہ گلستان ہزاروں برس سے یونہی کھلتے رہتے ہیں مرجھاتے رہتے ہیں اور پھر کھل اٹھتے ہیں ان کی طراوت سے زندگی انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ کائنات کے دل میں امنگیں مچلتی ہیں۔

اور ان سمن زاروں سے لطف اندوز ہونے والی، ان کو دیکھ دیکھ کر چہچہانے والی بلبلوں کے قافلے بھی ہزاروں برس سے یونہی رواں دواں ہیں۔

حسن اور حسن پرستوں کی یہ رنگیں محفلیں سجتی اور اجڑتی رہیں گی لیکن گل و بلبل کا چولی دامن کا ساتھ، رہتی دنیا تک ہمیشہ برقرار رہے گا گل و بلبل یعنی نغمہ و مغنی۔

ہزاروں برس سے ان کا ساتھ ہے ایسا مضبوط بندھن جسے کوئی نہ توڑ سکا جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے ہزاروں برس پیچھے چلے جاتے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہخامنشیوں کے دور شہنشاہی میں اگرچہ موسیقی آج کی موسیقی نہ تھی لیکن موسیقی کے شیدائی اسے معبدوں اور کلیساؤں میں سنتے تھے۔ یہ ناقوسوں میں پوشیدہ ہوتی تھی۔ دعاؤں میں اثر بنکر چھپی رہتی تھی۔ دیوتاؤں کے سامنے رقص و سرود کی محفلوں میں عبادت خانے گونج اٹھتے تھے۔ یہ عابدوں اور زاہدوں کے کانوں میں امرت رس گھولتی تھی۔ یہ گاتھا کی جان اور اوستا کی روح تھی۔ یا پھر میدان جنگ میں ڈھالوں کے سائے میں تلواروں کی جھنکار کے ساتھ گاتی تھی۔ وطن کی خاطر جان دینے والوں کو بڑھ بڑھ کر جام محبت پلاتی تھی۔ قربانی کی دیوی کا متوالا بناتی تھی اور مرنے والے، موت کو شربت کا پیالہ سمجھ کر پی جاتے تھے۔ اور یہ قاتل محبوبہ اپنے عاشقوں کو یا تو دیوتاؤں پہ قربان کرادیتی تھی یا پھر انہیں میدان جنگ میں خون کی ہولی کھیلنے پر آمادہ کرتی تھی۔ پھر ایسا زمانہ آیا جب تاریکی کے خوفناک اور ڈراونے بھوت پریتوں کو آفتاب عالمتاب کی پہلی کرنیں تلوار بنکر کاٹ رہی تھیں۔ کفر کی ظلمت کے چہروں کو اسلام کا نور بے نقاب کر رہا تھا۔

ساسانیوں کا دور تھا۔ حکمراں موسیقی کے متوالے تھے۔ اور شیریں نے موسیقی اور موسیقی دانوں کو گلے لگایا۔ اور موسیقی کا آفتاب ابھرنے لگا۔

ہزاروں گویئے پیدا ہونے لگے یہانتک کہ فنکاروں کی ایک جماعت وجود میں آگئی۔ سوسائٹی میں انہیں ایک مقام حاصل ہوا انکو تحسین کی نظروں سے دیکھا جانے لگا اور یہانتک کہا جاتا ہے کہ بہرام نے تو اپنی زندگی ہی موسیقی کے لئے وقف کردی تھی اس نے نو سو پاس کے مغنیوں کو اپنے دربار میں جمع کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے زمانہ کے ہندوستان سے اس نے چار ہزار بہترین موسیقی داں بلوائے تھے۔

خسرو پرویز کے دور حکومت میں ایران نے دو بہترین مغنی پیدا کئے۔ جن کا نام آج بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔ اور ان کے نام پر موسیقی کی انجمنیں قائم کی جاتی ہیں۔ باربد اور نکیسا ایسے دو نام ہیں جو آسمان موسیقی پر درخشندہ ستاروں کی طرح روشن ہیں۔

باربد کے متعلق مشہور ہے کہ وہ تین سو ساٹھ (۳۶۰) راگ جانتا تھا اور شاہی دربار میں اس نے ایک راگ کبھی دوبارہ نہ گایا۔ نظامی گنجوی نے اپنی مشہور نظم خسرو شیریں میں ان راگوں میں سے تیس کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانہ کے سازوں میں بانسری کافی مشہور تھی۔ تاروں والے ساز بھی تھے جو ہمارے آجکل کے چنگ و رباب اور بربط سے ملتے جلتے تھے۔

ان باتوں کا تاریخی ثبوت ہمیں طاق بستان کی دیواروں پر ملتا ہے۔ تاریخی کتبوں کے علاوہ جو سنگتراشوں نے پتھروں پر تصویریں بنائی ہیں ان میں جابجا بادشاہوں کے ساتھ موسیقار نظر آتے ہیں۔ بادشاہ شکار کو جا رہے ہیں اور مغنی ان کے ہمراہ ہیں۔ طاق بستان کرمانشاہ کے نواح میں کوہ بیستون کی چٹانوں کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ اور اسکی دیواروں پر مصور واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔

اور اب سویرا ہو چکا تھا۔ کفر کی ظلمت چھٹ چکی تھی اسلام کا نور پھیل چکا تھا۔ عرب ایران میں اسلام کا پیغام لیکر آئے۔ ایرانی اپنے نئے حکمرانوں کو خوش کرنے کے لیے عربستان کی دختر شعر کو ایرانی موسیقی کے لباس سے سجاتے رہے اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ عباسیوں کے شاندار درباروں میں ایرانی موسیقاروں کی گونج تھی۔ شاہی محلات سے ابراہیم اور اسحٰق جیسے فنکاروں کے نغمات کے دریا بہتے تھے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ان کے نغمات کو سننے کے لئے شاید کچھ دیر کو تھم جاتا ہو۔

اسحٰق کا شاگرد زریاب ایرانی موسیقی کو اسپین لے گیا اور اس نے فن موسیقی کو وہاں کافی ترقی دی۔

فارابی پہلا شخص تھا جس نے ایرانی موسیقی پر فنی حیثیت سے بحث کی اور اسوقت کے ایرانی سازوں پر ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد ابن سینا نے موسیقی پر عربی اور فارسی میں ایک کتاب لکھی۔ ساتویں صدی میں صفی الدین ارماوی نے موسیقی پر دو کتابیں تحریر کیں جو اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ آٹھویں صدی میں قطب الدین شیرازی نے موسیقی پر کافی بحث کی اور اسکو قلم بند کیا۔ نویں صدی میں ایک اور کتاب عبدالقادر مراغہ ای نے لکھی۔ فن موسیقی اپنے عروج پر پہونچ چکا تھا کہ نویں صدی کے بعد مذہب نے اس فن کو کچل کر رکھدیا۔ صرف تھوڑا بہت مذہبی رسومات میں رہ گیا لیکن حقیقتاً اسکا جنازہ نکال دیا گیا اور آج اس کلاسیکل موسیقی کا جاننے والا کوئی بھی نہیں تھوڑا بہت وہی ہے جو سینہ بہ سینہ ہم تک پہونچا ہے۔ اور آج جو ایران میں مختلف مقامات پر عوامی گیت گائے جاتے ہیں وہ ان راگوں کا ہلکا سا چربہ ہیں۔ ڈھانچے رہ گئے ہیں روح نکل چکی ہے۔

موسیقی کا نیا دور ستر سال پہلے شروع ہوا شاہان وقت نے صرف فوجی ترانوں کی دھنیں بنانے کے لئے ایک فرانسیسی فنکار کی خدمات حاصل کی تھیں جس نے اپنا اسکول تہران میں قائم کیا۔ یہاں پر مغربی موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی اور اس طرح مغربی موسیقی آہستہ آہستہ ایرانی موسیقی سے شیر و شکر ہوتی رہی۔

علی نقی وزیری نے جو ایران کا بہترین مغنی مانا جاتا ہے تیس (۳۰) سال پہلے وہ یورپ گیا اور اس نے پیرس اور برلن میں مغربی موسیقی

کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ تہران واپس آکر اس نے ایرانی موسیقی کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک اسکول قائم کیا اور وہاں پر ایرانی موسیقی کے راگوں کو رائج کرنے کے لئے ریسرچ کی۔ اس نے بہت سے راگ خود ایجاد کئے ہیں اگرچہ یہ راگ اصلاً ایرانی ہیں لیکن وزیری کی کاوش سے اتنے دلفریب اور دلنشین ہو گئے ہیں کہ سننے والا جھوم جھوم اٹھتا ہے اور ان نغمات کے تنوع پر سر دھنتا ہے۔ علی نقی تار کا استاد ہے، وائلن اور موسیقی کی تھیوری پر اس نے کتابیں لکھی ہیں۔ وہ ایرانی موسیقی کو فنی حیثیت دینے میں کامیاب ثابت ہوا ہے علی نقی وزیری کے شاگرد بڑی تعداد میں ہیں۔ اور ان کا ہنر قابل ستائش و تحسین ہے علی نقی کے اسکول میں ایک نیا ادارہ اور کھولا گیا ہے جہاں فنی انداز پر سازوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔

نغمہ اور آہنگ دو لازم و ملزوم چیزیں ہیں جو مختلف MODES کے ذیل میں آتے ہیں جنہیں ایران میں "دستگاہ" کہا جاتا ہے اور جو مغربی موسیقی پر بلحاظ ندرت و کثرت، فوقیت رکھتے ہیں۔ چونکہ ایرانی موسیقی میں مدھم اور پنچم سروں کے علاوہ کچھ زائد سُر بھی ہیں جو "سہ گاہ" "چہار گاہ" اور "شور" کہلاتے ہیں اور مغربی موسیقی ان کا نظیر پیدا نہیں کر سکی۔ علاوہ بریں ایرانی موسیقی میں اور بھی باریکیاں اختراعات اور خوبیاں ہیں جو عربی، ترکی اور ہندوستانی موسیقی میں پائی جاتی ہیں۔

ایرانی موسیقی کے خزانے میں عوامی اور دیہاتی گیتوں نے بھی کافی اضافہ کیا ہے جو بہت ہی سادہ، سپاٹ، پرتاثیر اور دلکش ہوتے ہیں یہ پرانے عرصے سے دیہاتوں میں گائے جاتے ہیں اور اسی طرح سینکڑوں برس سے سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے ہیں۔

ایرانی موسیقی سات غیر آہنگی (Non - rythmic) حصوں پر مشتمل ہے۔ دستگاہ ۱۔ ماہور ۲۔ راست پنجگاہ ۳۔ چہارگاہ ۴۔ سہ گاہ ۵۔ شور ۶۔ ہمایوں ۷۔ نوا

ان میں سے ہر ایک مختلف Themes سے مل کر بنتا ہے۔ ان ساتوں کا مجموعہ اور ان کی Themes ایران کی کلاسیکل موسیقی کہلاتی ہے۔

Folk Tunes ، Rythmic Songs ، Rythmic Tunes اور Iranian Dances انہی سات غیر آہنگی حصوں سے اختراع کئے گئے ہیں اور یہی ان کی اصل ہیں۔

ایرانی موسیقی میں بعض نغمات خاص تاثیر رکھتے ہیں اور سننے والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ فلاں نغمہ ایک انفرادی حیثیت اور خاص تاثیر کا مالک ہے

ایرانی آرکسترا میں آجکل وائلن۔ کلارنٹ (قرہ نی)۔ پیانو۔ فلوٹ سیکسوفون۔ باجہ۔ سُلو (Cello)۔ بڑا وائلن — (Contrabass) اُوبو (Oboe) اور پرانے ساز استعمال کئے جاتے ہیں۔

ایرانی سازوں میں سنتور، چنگ و رباب اور سہ تار کافی مشہور ہیں۔ دف بھی گانے والوں کو مدد دیتا ہے۔

ایران کے مشہور موسیقار مردوں میں تہرانی۔ ابراہیمی۔ رشیدی۔ اور ہمایوں پور اور عورتوں میں دلکش۔ مرضیہ۔ الاہہ۔ یاسمین شاہ پہلوی اور شہین ہیں شہین ایک پاکستانی باپ سے ہے۔

ایران کے معروف فنکار . . .

ضرب میں حسین تہرانی اور اصغر بہر

وائلن میں مہدی خالدی۔ پرویز یاحقی۔ علی تجویدی۔ رحمت اللہ بدیعی۔ اور عباس شاہ پوری۔

تارو:۔ استاد علی نقی وزیری۔ زرین پنجہ۔ مجید تاکستانی۔ شاہپور رحاتی۔ فرہنگ شریف۔ حشمت نازی۔
ستار:۔ استاد عبادی۔ زرین پنجہ۔
پیانو:۔ مرتضیٰ محجوبی۔ جواد معروفی۔ قاسم نیک پور۔ رحمت اللہ جہندی۔

ان نادرہ روزگار موسیقاروں اور فنکاروں کا قافلہ جادۂ ترقی پر گامزن ہے۔ ڈرامے کار روں کے ساتھ ملی جلی کچھ آوازیں ایسی بھی ہیں جیسے ان کی منزل پر ان کا استقبال کرنے والے خوش آمدید کہہ رہے ہوں اور قافلہ کے ساتھ اڑتی ہوئی خاک اور بگولوں کے بننے میں انہیں اپنے مستقبل کے روشن مینار دکھائی دے رہے ہوں

یقیہ اداریہ

مولوی صاحب کی موت نے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ۔ کم سے کم عام آدمی کو تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے بے حیات مذہب خلا کا احساس تو ہو گیا ہے ایک ادیب کی موت پر آٹھ کروڑ انسانوں کی بستی ایک غم کدہ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس کا یقین کس کو ہے۔ مولوی صاحب کی موت نے ہمیں اس بات کا یقین دلا دیا۔

اے سرسید و حالی و شبلی کے ہم نشین! خدا حافظ۔ آج تو اپنی محفل میں پہنچ گیا۔ سفر ختم ہوا۔

شبِ قدر ــــــ آزادی

رمضان مبارک کی ایک رات ہے جو شب قدر کہلاتی ہے، اور جو "الفِ شہر" (ایک ہزار مہینوں) سے زیادہ قیمتی ہے، اسی میں وہ آخری ہدایت ربانی اتری تھی جس نے آدمی کو آدمی بننے کے اصول سکھائے۔

زیادہ رجحان یہی ہے کہ شب قدر رمضان کی ۲۷ ویں شب ہے، اسی لئے اہل دل خصوصیت کے ساتھ ۲۷ ویں شب کو زیادہ سے زیادہ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور اس کی برکتیں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پاکستان کی جدوجہد کو بھی اس شب قدر سے ایک نسبت ہے، مسلمانان برعظیم کی تحریک آزادی اپنی منزل مراد کو اسی رات پہونچی تھی، ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے نام سے جس تاریخ کی دنیا میں دھوم، اور دلوں میں گونج ہے، وہ رمضان مبارک کی شب ۲۷ تھی برطانوی پارلیمنٹ نے تو کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ بلکہ زیادہ قرین یہی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اگر اس کو یہ خیال آجاتا کہ رمضان کی شب ۲۷ آرہی ہے تو وہ پوری کوشش کر کے اسے کچھ اور کر دیتی، مسلمانوں کی تحریک پاکستان اسلام کے نام پر چل رہی تھی اور اسلام سے برطانیہ کو بالخصوص (کہ وہ یورپ کا مدتوں امام رہا ہے) اور مسیحیوں کو بالعموم ایسی ہی محبت خاص ہے مسلمانوں کے لئے تو اتفاقی کیف کا یہ پہلو کچھ معمولی نہ تھا، اس سے اسلامیت ابھرتی تھی، یہ شب قدر تو بے خبری میں آگئی ــــ برطانیہ نے تو آزادی اپنے کی تاریخ ۱۴ اگست رکھی تھی۔

اور ۱۴ اگست ہر سال آتی ہے، مگر کیا کبھی لیلۃ القدر بھی آتی ہے ۱۹۴۷ء کی ۱۴ اگست کو تو آئی تھی۔ اور یہی کا کیف و سرور تھا جس نے مسلمانوں کو اصل مہاجرین و انصار" بنا دیا تھا ــــ لیکن اب تو شاید کسی کو یاد بھی نہ ہو کہ جب پاکستان قائم ہوا تھا تو وہ شب قدر تھی! ــــ پھر کیا تھا سے شب العید!

نواب نصیر حسین خیال

علی سجاد عظیم آبادی

زمانہ مُردہ پرست ہے ایک عام اور مشہور مقولہ ہے۔ لیکن میر دہلوی ایسے زبان زد فقرے سے بھی شاید آشنا نہیں ا صحبہ بہار کی خاک نے جو پتلے گھڑے گئے وہ اپنے رنگ روپ میں کہیں کی زمین سے پست نہیں رہے، مگر اوروں نے اپنے کو سلا اور اونچا کر دکھایا۔ اور ہم نے اپنے جگر بندوں کو ہمیشہ زمین ہی میں سُلا دیا۔ اور خاک ہی میں ملا دیا۔ ان کی زندگیاں موت سے اور پھر موت زندگیوں سے کسی وقت بہتر نہیں نکلی! یہ سنت عرصے سے جاری ہے۔ اور آج بھی فرض و واجب کا حکم رکھتی ہے۔

سجاد بھی اسی تغافل شعار زمین سے اُٹھے تھے۔ اس لئے گمان کیا یقین کامل تھا کہ ان کے ساتھ بھی اگلوں کا سا سلوک کیا جائے گا اور اگر کبھی زمانہ نے اس زمانہ شناس کو یاد کیا تو پھر اُس وقت کوئی پورا نام و نشان بتانے والا باقی نہ رہے گا۔ اسی خیال نے یہ چند سطریں لکھوا دیں اور یہ بھی سمجھا کہ اپنوں کی یاد تازہ کر دینے کے لئے شاید یہی ایک بہانہ ہو جائے اور اس ایک شمع کے جلتے باقی شکستہ مزاروں پر بھی کنول روشن دکھائی دینے لگیں۔ یہ اگر ہوا تو سمجھوں گا کہ اپنی زندگی کی سب سے بہتر وہ گھڑیاں تھیں جو ان اوراق کی ترتیب میں گذریں کیونکہ اسی یاد نے خود فراموشیوں کو بھلا دیا اور اسی طرح پیروی کر کے باقی موقعوں کو بھی جلا دیا!

خاندان و پیدائش

سید علی سجاد کے دادا مولوی سید کریم بخش عظیم آباد میں دلّی سے آئے اور میر عبداللہ صاحب مرحوم (جو اس شہر کے ایک متمول بزرگوار تھے) کی کوٹھی میں ملازمت اختیار کر کے فراغت و نیک نامی سے زندگی گذار گئے۔ چار نرینہ اولادیں چھوڑیں۔ میاں میر جان، میر محبوب جان، حاجی میر غالب جان اور میر رشید جان۔ میر رشید جان جس طرح اپنے بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ اسی طرح قسمت میں بھی سب سے چھوٹے نکلے۔ جس فراغت و اطمینان کے ساتھ ان کے اور بھائیوں نے زندگیاں بسر کیں، یہ اس طرح اپنے دن کھیپ نہ سکے۔

تعلیم و تربیت

بہت کم عمری میں ان کا مکتب ہوا۔ تقریباً آٹھ نو برس کے اندر اندر فارسی کے درسیات ختم کر کے عربی شروع کر دی۔ اس زمانہ میں پرانی تعلیم کا دور آخر ہو چلا تھا۔ ہوشیار و حوصلہ مند لوگ انگریزی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ سجاد کے بزرگوں نے زمانہ کی آنکھ پہچان کر گھر کی تعلیم اب بند کی اور انہیں اسکول میں داخل کر دیا۔ جہاں انٹرنس تک تعلیم حاصل کی۔

اس زمانہ میں نواب لطف علی خاں مرحوم نے اپنے صاحب زادوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کلکتہ سے ایک نہایت لائق و ادیب انگریز ٹیوٹر طلب کیا۔ علی سجاد کو اس گھر سے دیرینہ توسل و تعلق تھا اس بنا پر مسٹر [illegible] سے بھی نیاز حاصل ہو گیا جیسا کہ اب بند ہے تا ان

کا قاعدہ ہوگیا ہے کہ عموماً دولت مند علم کی طرف جھکنا اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ اسی طرح نواب موصوف کے صاحب زادوں کو بھی مسٹر نائٹ، کی صحبت خوش نہیں آئی اور اس وجہ سے صاحب کا زیادہ تر وقت سجاد ہی کی نگرانی اور تعلیم میں صرف ہونے لگا۔ اور یہ بھی اسکول کو سلام کر کے اب ہمہ وقت اُن ہی کے ساتھ رہنے لگے۔

مسٹر نائٹ ایک بڑے انشا پرداز اور مانے ہوئے ادیب تھے۔ اپنے ہونہار اور عزیز شاگرد میں ادب و انشا کا فطری مادہ و مذاق پاکر بے حد محظوظ ہوئے اور کچھ اس طرح دل لگا کر تعلیم دی کہ سجاد کچھ ہی دنوں میں کلکتہ کے روزانہ انگریزی اخبارات میں مضامین بھیجنے اور وہاں سے صلہ و انعام بھی لینے لگے۔ مسٹر نائٹ وہاں بہت دنوں رہ نہ سکے۔ ان کے چلے جانے پر سجاد کی تعلیم بھی گویا بند ہوگئی جس کے بعد سبقاً پھر انہوں نے کچھ کسی سے حاصل نہیں کیا۔ گھر ہی میں بیٹھے مطالعہ کرتے اور مشقِ تحریر بڑھاتے رہے۔ اور یہ اسی کے نتائج تھے کہ ان کا قلم انگریزی کے کوچوں میں بھی اپنے اردو بازار کی طرح بے تکلف چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا۔

نظمِ اردو کا شوق

سجاد کا گھرانا ایک علمی گھرانا تھا۔ جہاں شعر و سخن کے چرچے بھی ہمیشہ رہتے تھے۔ ان کے بڑے چچا میر علی فرحتؔ تخلص کرتے اور فارسی میں زور دکھایا کرتے تھے۔ حاجی میر نواب جان صاحب ریختی کو بھی اس فہم سے اُنس خاص تھا اور پارہائے سخن فہمی میں بہ مشکل کسی سے دبتے تھے۔ خود ان کے والد میر سید جان حسرتیؔ بھی شعر کہتے اور صاحب مذاق تھے۔ سجاد نے آنکھیں کھولیں تو انہیں بزرگوں کی مبارک صورتوں کو دیکھا اور انہیں کے دامنِ فیض میں پلے اور بڑے ہوئے۔

علاوہ اس کے اُس وقت کا عظیم آباد آج کا عظیم آباد نہ تھا۔ گھر گھر علم کے چرچے اور شعر و سخن کی صحبتیں اور جلسے رہتے تھے۔ چھوٹے سے بڑے تک صاحبِ مذاق اور جہلا تک کی زبانوں پر شعر و اشعار۔ زمانے کا رنگ سب پر غالب ہوا کرتا ہے۔ علی سجاد بچے کیونکر اس رنگ میں رنگے گئے۔ اور وقت کا زیادہ حصہ گل و بلبل کی نذر ہونے لگا۔ جیسا کہ اکثر دیکھا اور سنا گیا ہے۔ ابتدا میں بزرگوں کی نظریں بچا بچا کر انہوں نے بھی غزلیں کہنا شروع کیں۔ رفتہ رفتہ جب ان کے مربیوں تک بات پہنچی تو ہونہار بچے کو بلا کر امتحان لیا۔ فطری مذاق معلوم ہوا۔ اور زبان و طرزِ ادا پر اسی عمر میں دلچسپی دیکھی۔ اور پھر اس خیال سے کہ وادیِ سخن کی دشوار گزار منزلیں بغیر رہنما کہیں کٹھن نہ ہو جائیں صوبہ بہار کے سب سے نامی اور موقر شاعر جناب خان بہادر شادؔ کی خدمت میں لاکر انہیں پیش کر دیا۔ دن پھرے اور اب شفیق استاد کی نگرانی میں رفتہ رفتہ جذباتِ دل موزوں ہونے لگے۔

نثاری

یہ اب وہ زمانہ ہے کہ نظم کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں نثر نگاری کا شوق بھی پھیل چکا ہے۔ اردو نے اپنا مندیل جامہ اتار کر نیا جوڑا زیبِ تن کیا ہے۔ فسانۂ عجائب پرانی ہو چکی اور بوستانِ خیال۔ پامال۔ داستانِ امیر حمزہ" فسانہ بن چکی ہے۔ "آبِ حیات" نے مردوں پر پانی چھڑکا اور "مرآۃ العروس" و "صورتِ خیال" نے زندوں کو آبِ طرب پلا دیا ہے۔ "گلدستہ" اور "پنچ" کا زمانہ ہے۔ ایک طرف شررؔ اپنی شعلہ فشانیوں سے دلوں کو گرمائے دیتے ہیں تو دوسری طرف ستم ظریف "فلکِ سیاہ" بھی دفترِ شعار اپنی زبان اور بولیوں سے کسی کو ہنسنے اور سر اٹھانے نہیں دیتے۔ اردو کی دلہن بانکا جوڑا پہنے، ہار سنگار اور بیسیوں زیوروں سے آراستہ عشاق کی آنکھوں کا تارا بنی پھرتی ہے۔ سجاد سا خوش مذاق و نظر باز کیونکر رکتا اور اسے آغوشِ محبت میں جگہ نہ دیتا۔

عظیم آباد کے شوقین اُن دنوں ساون کے میلے کیا کرتے تھے جن میں شہر کے اکثر نوجوان امیر زادے اپنے گھروں کی تقریب کی طرح شریک ہوا کرتے اور احباب کے ساتھ اربابِ نشاط کے جمگھٹ بھی رہتے تھے۔ ہرے بھرے باغوں میں فاصلہ فاصلے کم

گلے اور جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ معلق جھولوں سے زمین آسمان کا ایک رنگ ہو رہا ہے۔ ہر پینگ کے ساتھ ساون اور کجلی کی تانیں بیر فلک کے دل کو ہی برسات اور گرمائے دیتی ہیں۔ سجاد بھی اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ چہل قدمی کرتے اور شریک نشاط ہیں۔ تاہو نظر بند لطف کی ڈوریوں سے الجھ رہے ہیں اور سوا اس کے کچھ سجھائی اور دکھائی نہیں دیتا! یہ سماں کئی میلوں تک رہا۔ نشہ اترا تو انہیں اپنے حال پر نظر ہوئی اور فوراً ایک چبھتا ہوا مضمون "مشیر قیصر" (اخبار لکھنؤ) میں لکھ ڈالا۔ اس میں یہاں کے میلوں کی کیفیت، برسات اور ساون کے مزے، پھر شریف زادوں کی آوارہ گردی و تباہی کے آثار و نشان کچھ اس طرح سے قلم بند کر دئے کہ معمولی مضمون اخلاق کی ایک کتاب بن گیا۔ ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ ڈالا اور پڑھنے والوں نے وہ اثر لیا کہ پھر تو باغوں میں خاک اڑنے لگی اور یہ جیسے جلتے میلے جڑ سے اکھڑ گئے۔ یہی مبارک تاریخ سجاد کی نثر نگاری کی ہے جس کے بعد یہ مشغلہ ان کی عمر کے ساتھ بڑھتا گیا اور مشق نے آخر مؤلف و مصنف کے درجہ تک پہونچا چھوڑا۔

مسافرت اور ملازمت

سجاد کے چچا حاجی میر نواب جان صاحب ایک نہایت باوضع و موقر بزرگوار تھے اور شہر بلکہ ہندوستان کے اکثر امراء و روسا سے دوستانہ ربط و تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ ان امراء میں سے سر راجہ امیر حسن خاں رئیس محمود آباد جناب حاجی صاحب کے خاص عنایت فرما تھے۔ علی سجاد نے ہوش سنبھالتے ہی اپنا بار، باپ یا اور بزرگوں پر ڈالنا مناسب وقت نہ سمجھا۔ عظیم آباد میں فارغ البالی کی کوئی عمدہ صورت جب نہ نکل سکی تو دیرینہ تعلقات نے محمود آباد کی راہ سجھائی اور سامانِ سفر کر کے پہلے پہل یہ گھر سے نکلے۔ محمود آباد میں اُس وقت اچھے اچھے صاحب ہنر موجود تھے۔ بڑی بات یہ کہ راجہ صاحب کو خود بھی شعر و شاعری کا اچھا مذاق تھا۔ اکثر شاعروں کی صحبتیں ہوتیں اور علمی چرچوں سے محفلیں گونجا کرتیں۔ سجاد کو مشقِ سخن بڑھانے اور اپنے معلومات تازہ کرنے کا یہ بہت ہی اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔

اسی زمانہ میں ان کے استاد خان بہادر شاد کی ایک غزل جگا دینا۔ بتا دینا۔ مشیر قیصر اخبار لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ مطلع تھا سہ

اسی بہانے سے دل کو اٹھے دکھا دینا　　　یہ چیز کیسی ہے ذری اٹھا دینا

جہاں غزل کی تعریفیں ہوئیں وہاں مطلع کے دوسرے مصرعہ کے لفظ ذری پر اعتراض اور موشگافیاں شروع ہو گئیں۔ سجاد کو یہ انداز ناگوار ہوئے اور پھر تو اس ایک ذرا سے لفظ کے لئے مہینوں قلم ہاتھ سے نہیں چھوٹا، یہاں تک کہ معترض نے (اور شعراء کو بس پشت ڈالا تھا۔ اور) صرف فصیح الملک ہی کو نہ یہاں وہاں شاعروں کو انہیں مرحوم کے کلام سے سند طلب کی تھی۔ اس لئے اب ان کا شہباز طبیعت بچارے بلبل ہند کے پیچھے پڑا اور گلزار داغ کے کانٹوں سے الجھے بلکہ اسے صاف کرتے رہے۔

راجہ صاحب کی صرف صحبتیں نہیں بلکہ سجاد کی خود لیاقتیں بھی شریک تھیں کہ بہت جلد ریاست میں انہوں نے ایک عمدہ و اعلیٰ عہدہ پالیا۔ سر راجہ کے پرائیوٹ سکریٹری بنے اور ریاست کے اکثر کام اب ان کے ہاتھوں سے سرانجام پانے لگے۔ راجہ نے سفر ہندوستان کیا، یہ ہر رکاب رہے۔ پھر انہیں زیارات کا شوق ہوا۔ بڑے تزک و احتشام سے نکلے تھا۔ قافلہ کا قافلہ ساتھ تھا۔ علی سجاد اس کے سالار بنائے گئے۔ سارا انتظام ان کے سر۔ اور سفر کا پورا بار ان ہی کی گردن پر۔ اس مبارک سفر کا سجاد نے ایک نہایت ہی دلچسپ روزنامچہ تیار کیا تھا۔ محمود آباد سے لکھنؤ، لکھنؤ سے بمبئی۔ اور پھر وہاں سے سمندر کا حال، جہاز کی کیفیت، خلیج فارس اور مختلف جگہوں کے روزانہ چشم دید واقعات، پھر زمینی راستہ کا مرقع، خشکی کا سفر، عرب و عربوں کا حال چال اور وہاں کی تہذیب و معاشرت غرض کوئی بات اس سفر نامہ میں باقی نہیں رہی تھی۔

لہ اس روزنامچے کے اکثر مقامات ہندوستان کے بعض مشہور رسالوں میں چھپ چکے ہیں اور پڑھنے والوں نے اس کے طرز و رنگ کو پسند کیا ہوگی

یا پہلے کا کوئی عمدہ سامان جلد نکل آتا تو سجاد واقعی در و دیوار سے ٹکرانے لگتے۔ آخر انہیں کی طبیعت نے زور کیا اور چند عزیزوں دوستوں کو آمادہ کر کے ۱۸۹۶ء میں عظیم آباد سے ادیب کے نام ایک ماہوار پرچہ جاری کرایا اور اپنی تپش دل نکالنے کی یوں راہ نکالی۔ یہ رسالہ اس حسن و خوبی سے نکلا کہ دنیا کی آنکھیں چندھیانے لگیں اور دیگر مراتب کے ساتھ بہ حیثیت زبان بھی وہ معزز درجہ پا گیا۔ دلگداز میں شرر نے اس پرچہ پر ریویو کرتے وقت سچ کہا تھا کہ "اگر یہ رسالہ جاری رہا تو صوبہ بہار تقلید زبان لکھنؤ و دہلی سے ایک دن آزاد ہو جائے گا" ادیب میں وہ زیادہ تر خود لکھا کرتے تھے متعدد اور مختلف سبجکٹس پر مضامین نکالے۔ نثر تو نثر نظم کا حصہ بھی زیادہ تر انہیں کے زور قلم کا منت کش رہا۔ "آسمانی ستارہ"[1] ایک نظم ایسی پیاری اور دلکش لکھی کہ اس کے شعر زبانوں پر چڑھ گئے اور ہندوستان میں نیچرل شاعری کا جب ذکر آئے گا تو اولیت کا سہرا اسی کے سر رہے گا۔ اس نظم میں ابر کی زبانی اس کی ایسی مکمل کہانی سنا دی کہ اب ایک حرف اس پر زیادہ کرنا محال ہے زبان کی صفائی و چستی۔ محاوروں کی برجستگی و چاشنی۔ اور پھر جا بجا اس میں ہلکی ہلکی خوشبوؤں کا اٹھتا ہوا رنگ تو خیر ان کا روزمرہ ہی تھا۔ نئی نئی ترکیبوں، اچھوتے تشبیہات و استعارات۔ اور نادر کنایات و اشارات سے اس طرح کام لیا کہ اردو میں واقعی وہ ایک نئی چیز ہو گئی انگریزی و فارسی کے سرد و گرم چشمہ کا منہ ملا دیا بھیا اور اسے پھر دو آتشہ بنا دیا ہے" ادیب میں اس نظم کے نکلتے ہی ہر طرف کان کھڑے ہو گئے اور مختلف اخبارات نے اپنی اپنی زبانوں میں اسے دہرایا۔ سر سید مرحوم نے بھی گوش دل سے اسے سنا اور فوراً پرچہ خرید فرما کے ہمت کے ہاتھ بلند کرا دئے "پھولوں کی ڈالی" ایک اخلاقی ناول بھی اسی رسالہ کے ذریعہ سے پبلک کے آگے پیش کیا جس میں اپنا خاص رنگ قائم رکھا مگر افسوس کہ اوراق ادیب کے ساتھ یہ خوشنما ڈالی بھی مرجھا کر رہ گئی۔ مضامین ادیب کے علاوہ سجاد اس زمانہ میں اور مزید کام بھی کرتے رہے۔ بنگالہ کے انٹرنس کورس کا بیٹھے بیٹھے ترجمہ کر ڈالا اور وہ اتنا مقبول ہوا کہ گھر گھر پھیل گیا کبھی انگریزی ناول کو اردو کا لباس پہنا دیا جو لکھنؤ کے رسالہ ناول میں اعمال کے نام سے اشاعت پا گئے

اسی زمانہ میں ان کے عزیز دوست راجہ نوشاد علی خاں کا علاقہ (میلارائے گنج) کورٹ سے چھوٹا۔ انہیں بھی اس کی بڑی خوشی ہوئی مسعود تخیل نے بہت ہی عمدہ عنوان سے تہنیت پیش کرائی۔ سنہ عیسوی کا نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ خوب ہی موقع ملا۔ ایک مخمس ترتیب دے دیا۔ شروع میں سال نو کی مبارکباد، گذشتہ ایام کے دکھڑے، پھر زمانہ و ابنائے زمانہ کے شکوے۔ محمود آباد چھوٹنے کے رنج آمیز اشارے اور کنائے۔ اور آخیر میں میلارائے گنج کے کورٹ سے نکلنے پر اظہار خوشی و تہنیت۔ طبیعت کے زور و آمد میں کئی بند فارسی کے بھی لگا کر اس کی چاشنی اور بڑھا دی۔ غرض تیس چالیس بندوں میں سب کچھ کہہ ڈالا اور دل کا بخار اور جذبہ اس پیرایہ میں خوب خوب نکالا گیا۔ اس کے ساتھ چونکہ یہ نظم زندہ اور بے پیچ ہوتی دریائے ظرافت بھی رہ رہ کر امڈتا رہا۔ مخمس کا آخیر مصرعہ "ترنا تری یا توم تنندانی توم توم"

---

[1] یہ آسمانی ستارہ اول کے بعد بھی کئی دفعہ افق پر جلوہ گر ہوا اور آخر صفحات اردوئے معلیٰ (غالباً ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء) پر چمکا)

ہر چار مصرعہ کے بعد بار بار آتا اور کلام کے ستارہ پر مضراب کا کام کرتا اور روتوں کو ہنسا ہنسا دیتا تھا۔

پھر اودھ پنچ ہی میں برابر مختلف نظم و نثر کے دریا بہاتے رہے اور جب کوئی عمدہ اور اپنے مذاق کی بات خیال میں آئی فوراً حوالۂ قلم کردی گئی: "خواب مرزا" (ایڈیسن کا ترجمہ) اسی زمانہ کا خواب پریشان اور "ہر روزے نداردعید مبارک" انہیں ایام کا ایک مضحک عنوان ہے!۔

پھر ایک لکھنوی دوست کے اصرار و فرمائش سے سمند قلم کی عنان بی زہرہ طوائف کی جانب موڑی گئی۔ اور "کوئی دم میں ڈوبے گا زہرہ ستارہ" خمسہ کا اخیر مصرعہ تجویز کرکے قلم نے جو شوخیاں دکھائیں اُن سے بے پردہ معشوقوں کے ماتھوں پر بھی شرم کا پسینہ آگیا ہوگا۔ غرض عظیم آباد کے یہ تین سال خواب کی طرح انہیں حرف و حکایات میں کٹ گئے۔

علی سجاد نہایت فراخ دل، حوصلہ مند، خلیق، مہمان نواز اور حد کے سلیقہ شعار تھے۔ جہاں رہے ہمیشہ عمدہ کھایا، اچھا پہنا اور اپنی ظاہری حالت یوں بنائے رکھی کہ بڑے بڑوں نے رشک کھایا۔ لکھنؤ کی طرح یہاں بھی ان کا چھوٹا سا بنگلہ ہر وقت آراستہ اور دلہن بنا رہتا تھا جس میں شاید ہی کوئی کمبخت دن ایسا گذرتا ہو کہ کوئی نہ کوئی ان کا عزیز مہمان نہ آجاتا ہو۔ جو گھر پر آیا یا یہ پہنچ گئے معمولی ماحضر تواضع خود ان کے دل کو سیر نہیں کرتی تھی، بغیر کھانا کھلائے اور چائے پانی ہوئے چین نہیں آتا تھا۔ انہیں اندازنے ہمیشہ ہاتھ خالی رکھا اور زمانۂ تعلق و تجرد میں اتنا بھی پس انداز نہ کرسکے جو اندنوں کام آتا۔ خدا بخشے ان کے والد میر سید جان پاس اول تو تھا ہی کیا پرانی کفر خچی سے جو بچ رہا تھا وہ اسی کے الٹ پھیر سے کام نکالتے اور اتنے دنوں کو کسی طرح چلاتے اور اپنی شرافت نباہتے رہے صاحبزادے کی ان فیاضیوں سے بچارے ہمیشہ تنگ رہا کرتے تھے۔ اسی عرصہ میں سجاد کی شادی بھی ہوگئی۔ اب بار اور زیادہ پڑا گھر کا رنگ دیکھ کر قلب نے اثر لیا اور تلاش روزگار کی دھن بندھی کچھ دنوں کے لئے پٹنہ کے ایک پرائیوٹ ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری قبول کرلی۔ لیکن وہ بھی حوصلہ سے کم نکلی تو حیدرآباد کا خیال آیا، اور آخر یہ عزیز وطن گھر سے نکلا اور منزلیں کرتا ہوا اپنی امیدگاہ تک جا پہونچا۔

علی سجاد عظیم آبادی

قدیم لکھنؤ

اب سے چونسٹھ سال پہلے کی تحریر ہے پڑھئے اور مزا لیجئے۔ انداز بیان کی سادگی و پُرکاری، اور پھر زبان ——
—— علی سجاد عظیم آبادی کی شخصیت پر ایک مضمون اسی شمارے میں درج ہے۔ یہ ایک دوسرے ادیب کے قلم سے ہے۔ (ادارہ)

بیگمات گم گئی۔ رؤسا اور امراء کوچہ بکوچہ جن کے سینکڑوں ملازم فنس، گھوڑا، ہاتھی، نالکی ان کے پھاٹکوں پر آٹھ پہر موجود ڈیوڑھیاں بڑی بڑی، دروازہ پر کا کا تو ان پچر لٹکا ہوا۔ خدمتگار نوکر چاکر آ رہے ہیں جا رہے ہیں، ماما اصیلیں کہاریاں پیش خدمتیں تیر تلوار، محلداری دستور جو شریف آدمی کسی غرض سے پھاٹک پر کھڑا ہوا پہرے والوں نے پوچھا، آپ کس کی تلاش میں آئے ہیں۔ کھڑا رہنا آپ کے خلافِ شان ہے۔ کرسی پر تشریف رکھئے۔ سپاہی نے خدمتگار کو خبر کی۔ خدمتگار نے مہری سے کہا۔ اندر اطلاع ہوئی۔ اگر کسی کے سگے سوتیلے ہیں تو اندر بلائے گئے اور اگر کوئی ایسے غیر سے ہیں تو ان کے لئے کچھ گلوریاں آگئیں۔ وعدہ وعید ہوگیا۔ سمجھ لیا کون تھے۔ وہی محبوب جان جو بی مغلانیوں میں نوکر ہیں، انہیں کی تاک میں آئے تھے۔ اگر بیگم صاحبہ کی کوئی زیادہ منہ چڑھی ہیں۔ اور کوئی ان کے دیکھنے والوں میں سے آیا تو ڈیوڑھی تو ڈیوڑھی کوس پر سے جواب حضور کی خبر کیونکر ہو جائے۔ یہ اٹک کے سامنے کھڑے ہوئے۔ سپاہی کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس نے دیکھ کر کہا۔ آپ مجھ سے کہتے ہیں؟ کہنے لگے جی ہاں۔ پھر سپاہی نے کہا کیا ارشاد ہوتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ کوئی خدمتگار آئے تو ذرا گلشن کو اطلاع دیدینا کہ تمہیں ایک صاحب بلاتے ہیں۔ اتنے میں خدمتگار سودا لینے کے لئے باہر آیا۔ سپاہی نے اسے دیکھ کر ان سے کہا۔ ہم پہرے پر ہیں، جو کچھ آپ کو ارشاد فرمانا ہے آپ ان سے کہئے۔

خدمتگار۔ کیا حکم ہوتا ہے۔

یہ۔ جنو بی مغلانی کی ماما سے کچھ ضرورت ہے

خدمتگار۔ آپ تشریف رکھیں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

یہ ڈیوڑھی پر بیٹھ گئے۔ اس نے جا کر اطلاع کی۔ محلدار نے سہ دری کا پردہ اٹھا کر کہا۔ اے بی مغلانی صاحب کوئی مرد آدمی آپ کی ماما کو ڈیوڑھی پر بلا رہے ہیں۔ بیٹھی ہوئی بیگم صاحبہ کے پاس چھوٹے کپڑے تراش رہی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے جھک کر پوچھا۔

۔کون ہیں "

بی مغلانی۔ اوئی بیگم صاحبہ،

بیگم صاحبہ۔ کیا کوئی تمہارے ملاقاتی آئے ہیں۔
بی مغلانی۔ (مسکرا کر) کوئی ہوگا۔
بیگم صاحبہ کیا کوئی عزیز ہیں۔

پھر بیگم صاحبہ نے گلشن سے کہا کہ جا کر دیکھ تو آ کہ بی مغلانی کے پاس کون آیا ہے۔ وہ باہر آئی پیچھے پیچھے محلدار نے آکر پردہ کھسکا کر دیکھا، کوئی صاحب آئے ہیں انہیں ادھر بٹھادو۔ عبداللہ بیگ چپراسی نے پکار کے کہا۔ نادر مرزا صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ کی قطع یہ کہ ململ کا سفید انگرکھا، پلیٹوں دار پاجامہ پہنے ہیں۔ زردوزی جوتہ پاؤں میں ہے۔ چکن کا رومال کندھے پر پڑا ہے۔ سفید رومال ہاتھ میں اس میں پانوں کی ڈبیہ بندھی ہوئی۔ جوانی کا عالم ہے، آدمی رنگیلے ہیں۔ انہوں نے پردہ کے پاس آکر آہستہ آہستہ باتیں کیں۔ گلشن مسکراتی ہوئی اندر گئی۔

چپراسی۔ آپ تشریف رکھئے نہیں معلوم ملا کب تک آئے گی۔ بی مغلانی صاحبہ سرکار کے پاس بیٹھی ہیں۔

بی مغلانی صاحبہ فراغت پا چکیں تو جو چیزیں بیگم صاحبہ نے دی تھیں ان کو ترکیوں کی رنگین چھوٹی ٹوکری میں رکھ باہر دالان کی چلمن میں گئیں اور گلشن کو آواز دی۔ اس میں کچھ عرصہ بھی ہوا۔ اس وقت اس نے کہا کہ نادر مرزا صاحب آئے ہیں۔ اور مزاج پوچھتے ہیں۔ کیونکہ ہفتہ میں یہ ساتھ ہوتی ہیں، اور وہ ان کے بہنوئی ہوتے ہیں۔ ان کے شوہر نہیں، ان کے جلدو نہیں، اس لئے کبھی کبھی خیر صلاح کے لئے آجایا کرتے ہیں انہوں نے کچھ چپکے چپکے باتیں کیں، اس کے بعد یہ اندر گئیں اور وہ باہر آئے۔

ڈیوڑھیوں کی یہ کیفیت تھی کہ ہر قسم کے کاریگر موجود ہیں۔ زرگر، زردوز، جوہری، خیمہ دوز، علاوہ ان کے جو شے درکار ہو وہ حاضر ہے محلات سے ایک محل نے حکم دیا کہ زربفت کے تھانوں کی ضرورت ہے، باہر بزاز موجود ہیں، انواع اقسام کے کپڑوں کی گٹھریاں رکھی ہیں، دن کو آتی ہیں شام کو اٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ مہاجنوں اور جوہریوں کے گماشتے صبح سے شام تک ڈیوڑھی پر حاضر ہیں۔ دار وغہ نے باہر سے گٹھریاں اندر بھجوادیں، بیگم صاحبہ نے کھولا، دیکھا تھانوں کو الٹ پلٹا۔ اور ناک بھوں چڑھا کر کہا، پوچھو تو کون سے بزاز کے یہاں کے ہیں دار وغہ۔ حضور وہی کیو بزاز جو سرکار میں آتا ہے۔ اسی کے تھان ہیں۔
بیگم صاحبہ۔ اٹھا لیجاؤ میرے کام کے نہیں، لونڈی باندی کے پہننے کے بھیجے ہیں۔

حالانکہ ایک ایک تھان چار چار سو کا ہے۔ یہ شان و شوکتیں تھیں جو فروختیں چھوٹے محلات کی تھیں بھلا محلات معلیٰ کی پوشاک گفتار اور رفتار کیا ذکر۔ ایک ادنیٰ سی بات یہ تھی کہ ان کی جوتیوں میں سونے کے گھنگرو اور موتیوں کی جھالر لگی رہتی تھی۔ گھونگرو چھاگل کا کام دیتے تھے۔ صدا سے معلوم ہو جاتا تھا کہ بیگم صاحبہ تشریف لاتی ہیں اُن جوتیوں کی بھرائی میں تین تین اشرفیاں جاتی تھیں۔ اگر ایک موتی ٹوٹ کر گر گیا تو کسی ناکتخدا لڑکی کی نتھ کی زینت ہوگئی وہ جوتیاں بیش قیمت ہوتی تھیں، ہمارا بدلی جاتی تھیں اور خواص کو ملتی تھیں، پوشاک سے بادلے، سلمہ ستارے کے ذرّے فرش پر اس قدر گرتے تھے کہ ضیا بلد ہو جاتا تھا، ماری دائیں یا خواصیں انہیں جھاڑ کر لے جاتی تھیں اور اپنے گھروں میں بچوں کی ہسلیاں بنواتی تھیں۔ متوسط محلات کی مہریوں کی یہ سیر چشمی تھی کہ جس دو کان پہ جوتہ پہننے جاتی تھیں اپنے پاؤں کا جوڑا وہیں چھوڑ کر آتی تھیں، جمادار اٹھا کر آٹھ آٹھ دس دس آنے کو بیچ ڈالتے تھے۔ اور پھر وہ مہریاں تین چار روپئے سے کم کا جوڑا نہیں پہنتی تھیں۔

اختر محل، قدسیہ محل، ضیا محل، امیر محل، تاج محل، بادشاہ محل، ملکہ زمانی، ملکہ جہاں کی فیاضیاں اور سخاوتیں تو بیان ہو ہی نہیں سکتیں

صدہا روپئے ہر شب سرہانے رکھے جاتے تھے۔ اور صبح سادات و مومنین کو تقسیم ہوتے تھے۔ امیرا محل کے یہاں رجب کے کونڈے ہوتے تھے۔ نوبرطوہ سولونڈے بارہ دری میں چنے جاتے تھے۔ ایک ایک من دو دو من شیر برنج ہوتی تھی۔ ایک کونڈا سو آدمی نہ کھا سکتا تھا۔ لوگ کھاتے کھاتے گھبرا جاتے تھے۔ اور شیر برنج ختم نہ ہونے پاتی تھی۔ محرم میں تیرہ ۱۳ دن تک مجلسیں بھی ہوا کرتی تھیں ایک من کی دو قفلیاں ہوتی تھیں باہر صدہا مزدور اور کہار بیٹھے رہتے تھے۔ قفلیاں گھر بھر نچانے کے چار آنے ملتے تھے۔ جو سقہ نہ لیتا تھا اس کو چار روپئے دیئے جاتے تھے۔ بلاؤ کی مجلسیں بھی اسی طرح ہوا کرتی تھیں۔ ایک طباق میں بقول شخصے محلہ بھر کھاتا تھا۔ ملکہ زمانی رجب اور شعبان میں کونڈے کرتی تھیں۔ ستر کونڈے بارہ دری میں چنے جاتے تھے۔ ایک ایک کونڈے میں ایک من اور بیچ کے کونڈے میں گیارہ من شیر برنج ہوتی تھی۔ قدسیہ محل حلوے اور امرتیوں کے کونڈے کرتی تھیں ایک ایک امرتی تین پاؤ سے کم اور سیر بھر سے زیادہ نہ ہوتی تھی ایک دن اور ایک رات کونڈا ہوتا تھا۔ پھاٹک کھلے رہتے تھے خواجہ سرا کھلائے جاتے تھے۔ لوگ کھاتے کھاتے اکتا جاتے تھے۔ اور اپنے ساتھ بھی لے جاتے تھے۔ قدسیہ محل نے مرنے سے پیشتر اپنے تمام ملازموں کو طلب کیا اور ایک مدت حیات قرار دے کر اتنے زمانے کی تنخواہیں سب کو اپنے سامنے تقسیم کرا دیں ان کے یہاں کی شادیوں، مہمانیوں، اور جلسوں کے حالات کو لکھ ہی نہیں سکتے۔ اگر محلات میں رسم ہو جاتے تھے اور جو خوش طبیعتیں تھیں اور جن کا محل محل سے ملا ہوا ہے، تو پھر اپنی شان شوکتیں دکھانے کے لئے موقع ڈھونڈتی تھیں۔ آدگیاں بلی یا بکری کی چھٹی یا شادی کریں، اس میں وہ سامان اور طبیعت داریاں ہوتی تھیں کہ اللہ تیری پناہ۔ توڑے کے منہ کھل جاتے تھے۔ نقل مشہور ہے کہ عماد الدولہ دیوان غازی الدین حیدر بہادر نے بھی بکری کے بچے کی تین لاکھ لگا کر چھٹی کی۔ اہل ایران سن کر متعجب ہوئے اور اکثروں نے کہا: خیلے پول داشت کہ سہ لک روپیہ برائے بچہ بز، صرف کرد اگر بہ من میداد رسہ یا دہ راز جی کردم و خوابیدم۔" اہل فارس ایک ادنیٰ سے شعبدے پر اس قدر متحیر تھے۔ وہاں سینکڑوں کرشمے اسی طرح کے روزانہ ہو جایا کرتے تھے۔

رئیس بھی ایک سے ایک جس کو خدا نے مرجع خلائق بنایا تھا اور جو شریفوں اور غریبوں کی حاجت روائی کے لئے ہر وقت آمادہ تھے نواب حسین علی خاں چاول والے مشہور تھے۔ بٹیروں سے بہت شوق تھا۔ پالی میں ایک بٹیر باز کا بٹیر بڑھ گیا۔ طبیعت ہی تو ہے۔ اسکی لڑائی پسند آگئی۔ نواب نے اپنے رفیق سے کہا۔ ان سے بٹیر لے لو، رفیق نے کہا نواب صاحب بٹیر مانگتے ہیں۔ بٹیر باز نے سامنے آکر دست بستہ عرض کی، بٹیر بھی حاضر ہے اور میں بھی حاضر ہوں، نواب صاحب نے بٹیر کو ہاتھ میں لے کر دیکھا اور کہا بھئی یہ بٹیر مجھے دیدو، پھر پوچھا اس کی قیمت کیا ہے، بٹیر باز نے جواب دیا کہ میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ یہ بٹیر حضور کی نذر ہے، نواب صاحب کی شان کب اسکی مقتضی تھی کہ ایک غریب سے مفت بٹیر لے لیتے اور بٹیر بھی وہ جو دو سو کا بکوں کی جان ہے۔ رفیق نے بٹیر باز سے چپکے سے کہا جو قیمت کہئے وہ دلوا دی جائے۔ بٹیر باز نے جواب دیا کہ اگر آپ قیمت پوچھتے ہیں تو چاندی کا وہ ہودہ جس پر نواب صاحب سوار ہو کے آئے ہیں مع ہاتھی مجھے عنایت ہو رفیق یہ سن کر گڑبڑ گیا۔ نواب صاحب سن رہے تھے پوچھا کیا ہوا۔ رفیق نے کہا حضور، عرض نہیں کر سکتا نواب نے کہا آخر کہتے کیوں نہیں ہو۔ اچھا جو وہ مانگتے ہیں دے بھی دو اور بٹیر لے لو۔ پانچ ہزار کا ہودہ، پانچ ہزار کا ہاتھی اس پر دو ہزار کے جھول لٹکتے ہار سے

فقط بات پر، ایک مشت استخواں کی قیمت دیدی۔ غریب نہال ہوگیا۔ اور اس کے بال بچے پرورش پاگئے۔ مرزا حیدر صاحب خشیاپوری، سنہرے بہت سے چار گھڑی دن رہے سوار ہوکر اکبری دروازے تک جایا کرتے تھے۔ سواری کی شان یہ تھی کہ آگے کہار کندھے پر تامجان لئے آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں اور خدمتگار دائیں بائیں، ایک جھنڈا بردار پشت پر، پیچوان لئے ہوئے۔ اس کا پیچ نواب صاحب کے ہاتھ میں، آپ کنکھیوں سے کمرے کی طرف دیکھتے جاتے۔ اور پیچوان پیتے جاتے ہیں۔ تو تیغا نہ پاسوں میں انگیٹھوں پہ سازو سامان، غریب کے حوالہ کیا کہ تین من کوئلہ ہے۔ پانچ سات روز تک کھلانے کا حکم ہے۔ یہ روزانہ کی کیفیت تھی۔ نادر مرزا صاحب شہزادے نوار گنج کے رہنے والے تھے پانچ ہزار کے گھوڑے پر سوار جا رہے تھے کہ ایک شریف نے سلام کیا اور تعریف کی کہ نواب جی سبحان اللہ، فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اصرار کیا کہ یہ گھوڑا تم لے لو۔ ایک دن کا ذکر ہے اسی زمانے میں نواب عظمت اللہ پسر نواب نادر مرزا بہادر نے بلی کی شادی کی جس کی خوشی میں ہنڈیاں تقسیم کیں تو ایک ایک پانچ پانچ سیر کی تمام شہر میں حصہ تقسیم کیا۔ اور تمام امرا اور نواب زادوں کے یہاں پچیس پچیس ہنڈیاں بھیجیں۔ یہ ایک ادنیٰ نواب زادوں کے یہاں کے افسانے ہیں اگر اور بیان ہوں تو دفتر سیاہ ہو جائیں آہ وہ سیر چشمیاں اور حوصلے آج بھی ایسے حوصلہ مند موجود ہیں اور ان کی حوصلہ مندیاں جاری ہیں اسے عاقبت نا اندیشی یا فضول خرچی مگر مے قدیم کا اب تک خمار باقی ہے۔ رسی جل گئی ہے اینٹھن نہیں گئی ہے۔ حوصلے میں ڈوبے ہوئے نام کے طالب۔

رئیس امروہوی

قصیدہ بمدحِ فرنگ و فرنگیاں

بمناسبت ورودِ ملکہ الزبتھ ثانی خلد اللہ ملکہا و مد ظلہا

عشقِ افرنگ ہے یوں ہر عملِ خیر کی جڑ
نسخۂ ہضم میں جس طرح کہ اکسیر ہے "ہڑ"

خطرِ سیلِ حوادث ہو تو اے یارِ عزیز! — دامنِ دولتِ افرنگ کو مٹھی میں پکڑ

یہ خدایانِ فرنگی ہیں خدا کا سایہ — ان خدایانِ فرنگی سے خدارا نہ اکڑ

ہے نظر کردۂ الطافِ الٰہی، یہ قوم — اس کی چوکھٹ پہ جبینِ ادب و عجز رگڑ

ایشیا والوں کو یورپ کے مقابل پہ گھمنڈ — کوہ کے سامنے ذرے کی اکڑ اور تکڑ!

ان کو اللہ نے بخشے ہیں انوکھے اوصاف — کہیں سختی میں ہیں لوہا کہیں نرمی میں ربڑ

باغِ عالم میں کشش ان کی نہ سمجھا کوئی — یہ کبھی رت ہیں بسنتی تو کبھی ہیں پت جھڑ

جس طرف جائیے مغرب کی ہے چھائی ہوئی یا عالم — جس طرف دیکھئے یورپ نے جمائی ہے پھڑ

تین سو سال سے ہیں حاکمِ تقدیرِ اُمم — ان سے لڑتا ہے؟ جو تقدیر سے لڑنا ہو تو لڑ

یہ جہاں عرصۂ عالم میں قدم رکھتے ہیں — وہیں جم جاتی ہے اقبال سے انکی جڑ بڑ

مکر و تزویر پہ ہے انکی ترقی کی اساس — برق اور بھاپ فقط ان کی فتوحات کی جڑ

سارا عالم ہے مگر قاعدہ ان کی ہے گرفت — ساری دنیا ہے جکڑ بند وہ ان کی ہے پکڑ

گوری قوموں میں بھی وہ قوم ہے انگریز کی قوم
سربلند اور سرافراز سڈول اور سگھڑ

ریس کرتا ہے کسی کی تو کر اس ملک کی ریس پیچھے پڑنا ہے کسی کے تو اسی قوم کے پڑ
مجھ کو غزل کہاں تک یہ سخن میں کہنی مطلع تازہ کوئی نظم کے حلقے میں جڑ

مطلع تازہ

سر سلامت ہے تو ملتی ہے کہیں جسم کو غذا طمع بڑھا نہ مگر دولتِ اقوام سے جڑ
بخت اچھا ہے تجھے ملکۂ برٹش کے حضور دستِ سائل نہ لرز دامنِ حسرت نہ سکڑ
گو کہ انگلش کے خزانے ہیں بہا ب لیکن فیض اٹھاتا ہے وہی شخص کہ ہو جم کے پھیڑ
آستانہ اسی ملکہ کا ہے ملجائے شہاں اس زمانے میں کہ ہر سو ہے پکڑ اور دھکڑ
لندن و پیرس ہو واشنگٹن و برلن ہیں وہ باغ جن میں لگتے ہی نہیں بادِ خزاں کے جھکڑ
نسبت امریکہ و یورپ سے کہاں مشرق کو وہ ہیں مخصوص عزیز اور زمانہ گوڈڑ
ان کے خدام کی قسمت میں الوہی انعام ان کے بدخواہ کی تقدیر میں غیبی تھپڑ
دستِ شفقت مرے سر پہ ہے جو افرنگ کا کیا مجھے خوف جو دنیا میں مچی ہے گڑبڑ
ورقِ دہر الٹنے کی جو طاقت ہو الٹ بخت برگشتہ! بگڑنے کی جو ہمت ہو بگڑ
ہم کہاں اور یہ مغرب کے خداوند کہاں! فرق ہے مشرق و مغرب کا سمجھ او ہیکڑ
ہم جو بالشتیے انسان تو انگریز ہیں دیو ہم جو ناچیز سے تنکے تو فرنگی لکڑ
پیٹ رہے ہیں کیا ایٹم کو انہی لوگوں نے اور ہم ہو سکے ایک ہی [illegible]
وہ فلک پر تو زمیں پر ہم اللہ بیٹھے ہیں ان کا پیغام ہے اُڑ اور یہاں کا ہے اَڑ
حق یہی ہے کہ ہر اک اہلِ نظر کا مقصود حق یہی ہے کسی اہلِ نظر پہ نہ بگڑ
راہِ افرنگ پرستی ہے عجب راہِ نجات گو کہ اس راہ میں حائل ہے سیاسی کیچڑ
ختم کر اپنے قصیدے کو دعاؤں پہ نسیم اے قلم طولِ سخن پر تو خدارا نہ اکڑ
کاش ہو پیرس و لندن کی طرف اپنا کوچ باندھ کر سر سے کفن ہاتھ میں لے کر لک چڑ

ظہیر احسن

جانے کتنی راتیں کاٹیں
کتنے تلخ ایّام گذارے
عمر اسی امید پہ گذری
شاید دن پھر آئیں ہمارے

دور سے تم کو چپکے چپکے !
دیکھ رہے ہیں چاند ستارے !
رخ پہ ابھی پردہ رہنے دو
ڈوب نہ جائیں شرم کے مارے

اب تو کسی کی آس بھی ٹوٹی !
ڈوب گئے آکاش کے تارے !
پھر بھی یہ پتھرائی آنکھیں
جاگ رہی ہیں کس کے سہارے

جانے کتنے موتی ہم نے
آنکھوں سے پلکوں پہ اتارے
آہ! نہ ہم نے ہی سکھ پایا
اور نہ آئے کام تمہارے

نیم روز کراچی
2 SEP 1961
ستمبر ۱۹۶۱

مظہر جمیل (ایم اے)

"دستک"

اے میری جان سوچتا ہوں میں

ترے رخسار کی مہک دل سے
مثل شبنم کہیں نہ اڑ جائے
اور تمناؤں کا حسیں چہرہ
بزم میں ہر کسی سے شرمائے

زندگی کے قریب تر رہتے
مصلحت کے شکار ہو جائیں
اور ہم پُر ہجوم میلے میں
سوچتا ہوں کہیں نہ کھو جائیں

رسم دنیا کہیں نہ ٹھہرائے
شوق کی جستجو کو بے حاصل
یاس کی تیز و تند آندھی میں
سوچتا ہوں کہیں نہ ہو جائے
نذر طوفان میرا شہر دل

میرا احساس اور میرا شعور
سوچتا ہوں کہیں نہ ہو جائے
اک مسلسل خلیج بے پایاں
اپنے ہی شوق کی فسوں کاری

سوچتا ہوں کہیں نہ ہو جائے
زندگی کا عذاب بے درماں

صبح ہو شام ہو یونہی پھروں
فکر کے جال بنتا رہتا ہوں
دل کی دھڑکن پہ چونک اٹھتا ہوں
اپنی باتوں پہ آپ ہنستا ہوں

تیرے رخسار کی تپش اکثر
میرے ہونٹوں کو جلا دیتی ہے
اور کبھی ہجر کے دھندلکے سے
یادِ بے نام صدا دیتی ہے

قربتیں آ کے میری گردن میں
بارہا باہیں ڈال دیتی ہیں
اور یہی گاہ ہر رگ و پے میں
درد کا زہر اچھال دیتی ہیں

سوچتا ہوں کسی طرح دل کو
یورشِ یاس سے بچا لوں میں
اور اسی واسطے نہ کیوں تجھ کو
اے میری جان پھر صدا دوں میں

شاعر ندیم

تلاش

(سانیٹ)

میری خوابیدہ امنگوں کو جگا جاتی ہے
تیری آواز نسیم سحری کی مانند
ایک طوفان مرے دل میں اٹھا جاتی ہے
تیری ہر یاد تری بے خبری کی مانند

میرے احساس پہ آنچل ترا لہراتا ہے
اس طرح تو مجھے دیوانہ بنا دے نہ کہیں
مجھ کو مخمور نگاہوں کا خیال آتا ہے
تشنگی ان کو بھی پیمانہ بنا دے نہ کہیں

نکہت و رنگ کی وادی میں بہل جاتا ہوں
ایک معصوم تمنا کا سہارا لے کر
کتنی انجان سی راہوں میں نکل جاتا ہوں
تیری دزدیدہ نگاہی سے اشارا لے کر

کاش افسردہ امیدوں کا کنول کھل جائے
جس کو میں ڈھونڈ رہا ہوں وہ کہیں مل جائے

ایس ملتانی

الجھاؤ

قیوم کی آنکھیں یکایک کھل گئیں اور وہ جاگ گیا تکیہ سر کے نیچے سے سرک گیا تھا اور اس کی جگہ اس کے بائیں ہاتھ نے لے لی تھی۔ چادر جو وہ اوڑھ کر سویا تھا پہلو میں بے ترتیبی سے پڑی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی وہ غسل خانے کو چلا گیا اور وہاں سے واپسی کے بعد چادر تان کر پھر سونے کی کوشش کی۔ مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی اس کے دماغ میں جانے کیسے کیسے واقعات چکر لگا رہے تھے۔ اس کو جب نیند نہ آئی تو قریب کی میز پہ پڑی ہوئی ایک کتاب اٹھالی۔ وقت کاٹنے کے خیال سے اس نے ورق گردانی شروع کر دی۔ یکایک اس کی نظر ایک صفحہ کی اس سطر پر پڑی جہاں لکھا تھا۔ "مجھے تم جیسوں سے سخت نفرت ہے" وہ زیر لب مسکرایا اور پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "یہ لڑکیاں —— پروین نے بھی تو ایک دن یہی کہا تھا مجھ سے۔ مگر پھر ——" اس کی آنکھوں کے سامنے تمام واقعات ایسے آ گئے جیسے کل ہی کی بات ہو۔

سکنڈ ایر پاس کرنے کے بعد وہ سٹی کالج سے گورنمنٹ کالج میں چلا آیا تھا —— گورنمنٹ کالج میں آنے کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہاں کا اسٹاف اچھا اور دوسرے یہاں کو ایجوکیشن (CO-EDUCATION) تھا۔ اسٹاف کے اچھے یا نہ اچھے ہونے سے تو اسے کوئی خاص مطلب نہیں تھا البتہ کو ایجوکیشن نے اسے زبردست طریقے پر جھنجھوڑ دیا تھا۔

کالج کھلا۔ کلاسیں شروع ہوئیں۔ لڑکیاں پروفیسر کے ساتھ آتیں اور اگلی نشستوں پر بیٹھ جاتیں پیریڈ ختم ہوتا اور وہ پروفیسر کے ساتھ کلاس سے باہر چلی جاتیں —— اسے سخت غصہ آتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک ساتھ پڑھتے ہیں مگر کوئی تعارف نہیں کوئی گفت و شنید نہیں۔ کوئی خاص جان پہچان نہیں۔ پھر ایک ساتھ پڑھنے کا فائدہ کیا ہوا۔ اگر ان لڑکیوں کو لڑکوں سے ملنا جلنا اتنا ہی ناگوار ہے تو پھر یہ زنانہ کالج میں کیوں نہیں داخلہ لیتیں۔ پردہ کیوں نہیں کرتیں اور وہ جل جل جاتا ——

ایک دن آنرز کی کلاس ہو رہی تھی۔ قیوم کے علاوہ چار لڑکے اور تین لڑکیاں لکچر نوٹ کر رہی تھیں۔ اتفاقاً قیوم کے فونٹین پن کی سیاہی ختم ہو گئی۔ وہ ہاتھ روک کر بیٹھ رہا —— پروفیسر نے جب اسے خاموش بیٹھا دیکھا تو کہا کہ یہ بہت اہم لکچر ہے اسے وہ ضرور نوٹ کرلے۔ قیوم نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا سب ہی نوٹ کر رہے تھے۔ اس کی اینک ختم ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا اگر کسی کے پاس دو قلم ہوں تو ایک مانگ لے۔ معاً اسے پروین کے پاس دو قلم نظر آئے ایک سے وہ لکھ رہی تھی اور دوسرا اس کے بائیں ہاتھ میں بے کار پڑا تھا۔ اس نے ہمت کر کے دبی زبان سے قلم مانگا۔

"نو —— نو —— آئی کانٹ سپیر فار یو" پروین کی جبیں شکن آلود ہو گئی

وہ جھینپ سا ہو رہا اور سوچنے لگا کہ بڑی بد مزاج لڑکی ہے یہ تو۔ بھلا پانچ منٹ میں اسکا قلم خراب تو نہ ہو جاتا۔

"پرکین، ہیلو مائی پن پلیز" پروین کے قریب سے شاہدہ نے مسکرا کر قلم تھمایا

"نو۔ تھینکس" وہ اب کسی سے قلم نہیں لینا چاہتا تھا۔

وہ خاموشی سے بیٹھا رہا اور پروین لکھتی رہی۔ سب لکھتے رہے۔ پیریڈ ختم ہو گیا۔ لیکچر ختم ہو گیا۔ مگر قیوم کی نظر سے پروین کی شکن آلود پیشانی دور نہیں ہوئی۔ اس کا تند و تیز لہجہ اب تک اس کے کانوں میں بسا ہوا تھا۔ — قیوم کو آج پہلی دفعہ ایک لڑکی نے جھڑکا تھا زندگی میں پہلی بار اسے ایسی بد مزاجی سے واسطہ پڑا تھا۔ —— کلاس سے سب چلے گئے وہ سب سے آخر میں اٹھا اور اٹھ کر سیدھے ہوسٹل چلا گیا۔ — آج اس کا پڑھنے میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ پروین کا ضمیر اس کی بداخلاقی پر ضرور ملامت کریگا اور وہ ضرور اس سے معافی مانگ لے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دوسرے دن پروین نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں — قیوم نے عزم کر لیا کہ جب تک وہ پروین سے اس کا بدلا نہیں لے لیگا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا

وقت کٹتا گیا۔ پروین بدستور ایک تند و تیز لڑکی بنی رہی۔ کالج کے تمام طلبا اور طالبات میں وہ مغرور اور بد مزاج مشہور تھی۔ اسے اپنی خوبصورتی پر بھی گھمنڈ تھا۔ پڑھنے لکھنے میں تو کوئی خاص بات نہیں تھی البتہ بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس اچھا کھیل لیتی تھی۔ اسے اس بات پر بھی فخر تھا وہ اپنے برابر کا کسی کو کھلاڑی ہی نہیں سمجھتی تھی —— ادھر قیوم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو وہ اسے ان کھیلوں میں شکست دے کر ہی دم لے گا — قیوم نے ان دونوں کھیلوں میں جان توڑ محنت شروع کر دی۔ اس کا پختہ ارادہ تھا کہ ان چیمپئن شپ کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے میں بھی دریغ نہیں کرے گا —— اس کے خیال میں پروین کا سر اس وقت یقیناً جھک جائے گا جب وہ ہار جائے گی ——"

ادھر ایک پروفیسر صاحب پروین میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ انہیں بھی کھیل کا شوق ہوا اور وہ بھی بلاناغہ مشق کے لئے آنے لگے —

ایک دن شام کے وقت قیوم کھڑا تھا۔ ٹیبل ٹینس کا کھیل شروع ہونے والا تھا۔ شاہدہ اور پروین یونہی کھیل رہی تھیں۔ پارٹنر کا انتخاب عمل میں آنے لگا۔ پروفیسر نے اپنی پارٹنر شپ کے لئے پروین کا نام تجویز کیا — ابھی کوئی دوسرا بولنے بھی نہیں پایا تھا کہ پروین نے ریکٹ سے بال کو اچھالتے ہوئے کہا۔ "آئی ول نیور بی اے پارٹنر آف یو"

سب ہنس پڑے۔ پروفیسر نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ہوم ڈو یو لائک دن"

"اینی ون۔ اکسیپٹ یور سیلف" وہ اپنی ریکٹ سے بال اچھالتی رہی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر اور سن کر قیوم کا دل کچھ ہلکا ہو گیا —— جب وہ ایک پروفیسر کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ روا رکھ سکتی ہے تو وہ کس شمار میں ہے۔ اور پھر اسے کل والی بات یاد آگئی۔ کل جب وہ پروفیسر کی پارٹنر شپ میں کھیل رہی تھی تو پروفیسر کی اک ذرا سی غلطی سے وہ ان سے ٹکرا گئی تھی۔ اور اس معمولی سی ٹکر نے اس کو کتنا برہم کر دیا تھا۔

"بی۔ اے جنٹلمین پروفیسر"

اور جب پروفیسر نے معافی مانگی تو بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس نے پیشانی پر بل لا کر کہا تھا۔

"فرسٹ لرن مینرز۔ دن پلے ود لیڈیز"

پروفیسر جیسے کٹ کے رہ گئے ہوں مگر وہ شرمائے شرمائے کھیلتے رہے اور آج بھی پروین نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ قیوم کو پروفیسر پر غصہ آنے لگا جو ڈانٹ سن کر بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ انہوں نے اختر کی سفارش کی کہ پروین اس کے ساتھ کھیلے۔ اس نے پھر ڈانٹا۔ مائنڈ یور اون بزنس سر۔

پروفیسر مسکرا کر رہ گئے مگر قیوم کا جی چاہا کہ وہ ان کے مسکراتے ہوئے دونوں ہونٹ نوچ لے

"مسٹر قیوم۔ او ڈیولائک ٹو پلے ود می" پروین نے قیوم کو مخاطب کیا۔

"نو — آئی ام ناٹ سو فلش" قیوم نے جیسے بدلا لے لیا ہو۔

"دیٹس آل رائٹ" اور اس روز پروین بغیر کھیلے چلی گئی — پروفیسر بھی چلے گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے قیوم کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر سر جھکا کر چلے گئے۔

"یار قیوم تم نے تو واللہ انتہا کردی آج" اختر کو حیرت تھی۔

"کیوں" قیوم مسکرایا۔ جیسے اس کی فتح ہوئی ہو۔

"بڑے احمق ہو تم بھی۔ پروین کی پارٹنرشپ میں کھیلنے سے انکار کر دیا تم نے۔ ایک پروفیسر کو دیکھو کہ بچھا جا رہے تھے۔ مجھے تو لفٹ ہی نہیں دیتی"

"پروین کو تم اسٹاندرڈ بیوٹی لڑکی سمجھتے ہو۔ میں نہیں سمجھتا۔ کیا رکھا ہے اس میں"

شاہد کا چہرہ مسکرا اٹھا۔

پھر بھی تمہیں اس طرح نہیں کہنا چاہئے تھا" اختر نے سمجھایا

"اب تو کہہ دیا" قیوم کو جیسے اپنی بدنامی کا احساس ہوا ہو اور پھر وہ سوچنے لگا

واقعی مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہئے تھا۔ میں اگر اس کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہتا تھا تو نہ کھیلتا۔ نہ کھیلنے کے دو ہزار بہانے ہو سکتے تھے۔ اس قسم کی بداخلاقی کا جملہ تو ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا پھر اس میں اور مجھ میں فرق کیا رہا۔ اس روز اس نے بھی تو ایسی ہی بداخلاقی کا ثبوت دیا تھا مجھے اس سے معافی مانگ لینی چاہئے — اس میں اور مجھ میں کوئی امتیاز تو ہونا ہی چاہئے — اور پھر قیوم بھی بغیر کھیلے واپس چلا گیا —

دوسرے دن پروین نہ تو کھیلنے کے لئے گئی اور نہ کالج ہی پہونچی — قیوم کو بڑی فکر تھی کہ شائد اس کا ایک معمولی سا جملہ پروین کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا — ممکن ہے اسے پہلی بار اس قسم کی ٹھیس لگی ہو۔ مگر اب وہ کر بھی کیا سکتا تھا —

تیسرے دن جب وہ آئی تو قیوم اس کے پاس دھیرے دھیرے پہنچا —

"مس پروین"

"آئی ڈونٹ وانٹ ٹو ٹاک انی تھنگ"

"بٹ آئی ہیو کم ......"

"یو گو اوے فرام ہیر۔ آئی ہیٹ ناٹ آنلی یو بٹ آل آف یو" اور پھر وہ لیڈیز روم کی طرف چلی گئی۔

قیوم کے منہ پر جیسے کسی نے طمانچہ مار دیا ہو۔ اس سے کچھ اور نہ کہا گیا۔ وہ پروین کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ وہ وہیں چمن میں قریب کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا —— ہری ہری گھاس پر دوسرے لڑکے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے ہنس رہے تھے قہقہے لگا رہے تھے۔ پاس ہی مالی پودوں میں پانی دے رہا تھا۔ یکایک اس کے ہاتھ سے جھرنا (آبیاری کا برتن) گر کے ٹیڑھا ہو گیا ——— مالی بیٹھ کر اسے درست کرنے لگا ——

کالج کی دو منزلہ عمارت جو انگریزی حرف (T) کی شکل کی تھی دھوپ کے رخ پر ہونے کی وجہ سے کافی چمک رہی تھی۔ لڑکے عمارت کے سائبان میں جگہ جگہ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ صاف دکھائی دے رہے تھے اور کچھ مہندی اور کیلے کے درختوں سے چھپ گئے تھے۔ رات کی شہزادی (رات کی رانی) کی چھوٹی چھوٹی پتیاں بھی چند لڑکوں کو چھپائے ہوئے تھیں قیوم کالج کی عمارت کی طرف ٹکٹکی باندھے غیر ارادی طور پر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر روش روش سے ٹکراتی ہوئی پتلی اور خوبصورت سرخی والی سڑک پر پھسلتی ہوئی کنارے کنارے دلکش پودوں سے گذر کر کالج کی عمارت پر پہنچی تھی۔ اسے بیلے کے بڑے اجلے اور پھیلے ہوئے گول پھولوں پر گلاب کے سرخ اور سفید پھولوں کی پتیوں پر ننھے ننھے اور ہلکے لال پھول والے سنگھار ہار کے کھردرے پتوں پر گیندے کے بھرے بھرے پیلے پھولوں پر جنہیں وہ اپنے خیالوں پر دھیرے دھیرے رگڑ تا تھا الغرض تمام خوبصورت پھولوں پر، کل حسین پتوں پر اور ساری جاذب نظر چیزوں پر آئی ہٹ ہو، لکھا نظر آ رہا تھا ——— وہ اپنے سر کو ہلکی ہلکی جنبش دیکر اپنی آنکھیں میچتا رہا اور پھر آنکھیں کھول کر عمارت کی طرف دیکھتا رہا کرتا۔ اوپر والی منزل کے سائبان میں اسے پروین نظر آئی جو عجب شانِ استغنا کے ساتھ جا رہی تھی ——— دوپٹہ اس کے کندھے پر پڑا ہوا تھا۔ پروین دوپٹے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کاندھوں پر ڈال لیتی ہے۔ سامنے سے اس کا دوپٹہ انگریزی حرف وی (V) کی شکل کا معلوم ہوتا تھا جو اس کی وکٹری کا اعلان کیا کرتا تھا۔

قیوم نے ایک بار پھر عزم کیا کہ چاہے کچھ ہو وہ اسے رام کر کے ہی دم لے گا ——— وہ بڑا مشاق شکاری تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ وہ ایسا شکار کس طرح پھانس سکے گا۔ پروین کے متعلق اس کے دل میں یہ بات جم چکی تھی کہ وہ ایک باعصمت لڑکی ہے۔ غیر مردوں سے راہ و رسم رکھنی پسند نہیں کرتی اور قیوم کا معیار یہی تھا . . . .

دن کٹتے گئے۔

قیوم ظاہرا تو پروین سے کنارا کنارہ رہنے لگا اس سے کوئی دلچسپی نہ لیتا مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ وہ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہنے لگا کہ کس طرح پروین کے دل میں گھر کرے۔ اور جب جب موقع میسر آیا وہ اس سے فائدہ اٹھاتا ——— ڈبیٹ میں وہ ہمیشہ پروین کے خلاف بولتا۔ ایک ڈبیٹ ہی پر کیا منحصر تمام باتوں میں وہ اس کی مخالفت کرتا اس کے مدمقابل ہوتا اسے معلوم تھا کہ یہی ایک صورت ہے جس کے ذریعہ اس شترِ بے مہار کو قابو میں کیا جا سکے گا۔

اس بار بھی وہ سالانہ ڈبیٹ میں پروین کے خلاف بولا —— پروین نے جتنے نکتے بیان کر کے اپنی تقریر کو ٹھوس بنانے کی کوشش کی تھی اس نے ان سب کو بے معنی مہمل اور لغو قرار دیا۔ اس کے اندازِ خطابت سے تمام لوگوں کو یقین تھا کہ انعام اسی کو ملے گا ثالث کے رجحان سے اسکو خود بھی یقین تھا کہ وہی اول نمبر پر رہے گا۔ پروین کو بھی اس کا علم تھا کہ اس بار ٹرافی قیوم ہی لے جائے گا۔ —مگر اس نے اپنا نام مقابلے سے واپس لے لیا جس پر دیر تک گڑبڑ رہی ——— وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ انعام بجز پروین کے اور کوئی نہیں لے

سکتا اس نے اپنی تقریر میں اس کا اشارہ بھی کر دیا تھا، اور ہوا بھی یہی —— طلبا و طالبات کو سخت تعجب تھا کہ آخر یہ کیسے ہو گیا۔

سالانہ ٹورنامنٹ ہو رہے تھے۔ ٹیبل ٹینس کمپیٹیشن میں قیوم کے مقابلہ پر پروین آئی۔ چیمپئن شپ کے لئے ان ہی دونوں کو آنا تھا —— فیصلہ بسٹ آف فائیو پر تھا۔ کھیل شروع ہوا۔ قیوم پہلے دو گیم جیت گیا۔ تیسرا بھی جیتنے ہی کو تھا کہ اس نے ہاتھ روک لیا

"میں اب نہیں کھیلوں گا آج"، اس نے ثالث سے کہا۔

"مگر کیوں"

"یونہی"

"مس پروین۔ ڈو یو اگری"، ثالث نے پروین سے پوچھا۔

"ایز یو لائک پلیز"

پروین کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے یہ میچ ہار ہی جانا ہوگا۔ اس لئے اس نے ایک چانس لیا کہ شاید دوسرے دن اس کا کھیل بن جائے۔

کھیل ملتوی ہو گیا۔

دوسرے دن اور تیسرے دن قیوم نے ہاتھ کے درد کا بہانہ کیا۔ چوتھے دن اس نے ثالث کو لکھ کر دیا کہ وہ درد کی وجہ سے میچ نہیں کھیل سکے گا۔ اس کے مقابل کو "واک آوٹ" پر "چیمپئن شپ" دیدی جائے۔

پروین سال رواں کی چیمپئن تو ہو گئی مگر اسے یقین تھا کہ یہ چیمپئن شپ اس کی اپنی محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض اتفاق ہے اور یہ اتفاق بھی پانچویں دن ختم ہو گیا جب کہ اس نے قیوم کو دیکھا کہ وہ ریکٹ پکڑے بڑے روز رونک کے شارٹ لگا رہا تھا —— قیوم پروین کو دیکھ کر زیر لب مسکرایا اور پھر اس نے اپنی توجہ دوسری طرف کر لی —— پروین جیسے کٹ کے رہ گئی۔ اس میں قوت احساس کی کمی نہیں تھی —— —— قیوم اس کو نفسیاتی طور پر زیر کرنا چاہتا تھا جس میں اسے کسی حد تک کامیابی ہو چلی تھی۔

اور پھر ایک دن آنرز کی کلاس ہو رہی تھی۔ اچانک پروین کے قلم کی نب ٹوٹ گئی۔ اتفاق سے اس وقت اس کے پاس کوئی دوسرا قلم نہیں تھا۔ مجبوراً ہاتھ روکنا پڑا۔ قیوم نے دیکھا اور پھر اس نے اپنی جیب سے پنسل نکال لی اور خود پنسل سے لکھنے لگا —— —— وہ چپ چاپ لکھتا رہا —— پروین بیٹھی رہی —— اس دن آنرز کی کلاس کے اسٹوڈنٹس بہت کم تھے —— پروفیسر کی نظر جب پروین پر پڑی تو وہ خاموشی سے بیٹھی ہوئی تھی۔

"یو آر سیٹنگ آئیڈل"

"مائی پن از ناٹ ان آرڈر سر"

قیوم نے پروفیسر کی طرف اپنا قلم بڑھا دیا۔ پروفیسر نے لیکر پروین کو دیدیا،

"نوٹ ڈاؤن"

اور اس نوٹ ڈاؤن نے بہت ساری باتیں نوٹ کرا دیں۔ ماضی سے حال تک کی تمام باتیں۔ لیکچر ختم ہو گیا تو پروین نے شکریہ کہتے ہوئے قیوم کی طرف اس کا قلم بڑھا دیا —— اس نے خاموشی سے اپنا قلم لے لیا۔

"ول یو پلیز لٹ می ہیو یور کاپی یک تھانکس فیو سکنڈ"
"قیوم نے بغیر جواب دیئے اپنی نوٹ بک اس کی طرف بڑھا دی جس میں سے پروین نے وہ حصہ نوٹ کر لیا جو نب نوٹ جانے کی وجہ سے رہ گیا تھا۔

"مسٹر قیوم۔ مجھے حد درجہ افسوس ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ انتہائی بداخلاقی کی تھی۔ اور آپ نے اس کا جواب اس طرح دیا"
"میں نے اکسٹرا آرڈینری کوئی بات نہیں کی" قیوم نے آہستہ سے جواب دیا۔
"آپ بے حد شریف آدمی ہیں"
"اور شاید اسی لئے آپ کو مجھ سے نفرت ہے"
"میں سخت نادم ہوں"
"آپ کو تو مجھ سے باتیں بھی نہ کرنی چاہئیں"
"معاف کیجئے مجھے اور زیادہ شرمندہ نہ کیجئے"
"خدا کا شکر ہے آپ کو اس کا احساس تو ہوا" وہ مسکرایا۔

اور پھر دونوں میں رفتہ رفتہ دوستی ہوگئی —— دونوں ملتے رہے۔ باتیں ہوتی رہیں اور وقت گزرتا گیا ——
قیوم خوش تھا کہ اس نے پروین کو رام کر لیا —— وہ پروین کے یہاں آنے جانے بھی لگا۔ پردہ تو کوئی تھا نہیں تعلیم پائے ہوئے ترقی یافتہ لوگ بھلا پردہ جیسی دقیانوسی شئے کو کیا سراہتے —— پروین کی ماں قیوم سے مل کر بہت خوش ہوئی اور اس کا باپ بھی قیوم کی جولانئ طبع سے بہت محظوظ ہوا —— اور پروین تو خیر خوش تھی ہی ——
صبح سے شام اور شام سے صبح ہوتی رہی اور ہوٹلوں، تفریح گاہوں اور سینماؤں میں ان کی دوستی پروان چڑھتی رہی ......
...... لیکن .... لیکن یہ خیال بھی مستحکم ہوتا گیا کہ پاکدامنی کی شہزادی ہے —— یہ تو دن کٹتے گئے۔

ہر روز وہ سات بجے شام تک ایک ساتھ رہے اس کے بعد قیوم ہوسٹل چلا جاتا سات بجے کے بعد وہ ہوسٹل سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک دن بغیر خبر کئے ہوئے وہ آٹھ بجے ہوسٹل سے بھاگ آیا۔ اس دن اس کا جی نہیں لگ رہا تھا —— اس نے سوچا ایک دو گھنٹے پروین سے باتیں کرنے میں اس کا جی بہل جائے گا۔
پروین کے بنگلے پر پہنچنے کے بعد اس نے دیکھا کہ گیراج خالی ہے جس سے معلوم ہوا کہ خان بہادر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں وہ زنان خانے میں چلا گیا —— دروازہ کھلا ہوا تھا —— باورچی پائپ سے پانی لے رہا تھا۔ قیوم نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ میم صاحب صاحب کے ساتھ سینما گئی ہیں۔
قیوم پروین کے کمرے کی طرف چلا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ سمجھا کہ پروین پڑھ رہی ہے —— اس نے کواڑ پر اپنی انگلیوں کو اسی طرح بجایا جس طرح وہ اکثر دیا سلائی کی ڈبیا پر بجایا کرتا تھا۔ اور پھر پکارا "یو آر لو بیڑی" وہ سمجھا کہ پروین پڑھائی میں

اس قدر منہمک ہے کہ اس کی آواز اس نے سنی ہی نہیں۔
یکایک کمرے کی لائٹ آف ہو گئی۔
"کیا ہوا" وہ پھر بولا۔
"بلب فیوز ہو گیا شاید ——— کون۔ قیوم۔ اس وقت کیسے آئے ———" پروین اندر سے بولی۔
"بس یونہی چلا آیا۔"
"ذرا کسی کو آواز دینا ——— اِف یو ڈونٹ مائنڈ ——— کہ ایک کینڈل لے آئے۔"
جب قیوم آواز دینے کے لئے مڑا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے پروین کے کمرے سے کوئی آدمی نکل کر کوری ڈور سے ہوتا ہوا باہر چلا گیا ——— کوری ڈور میں بھی اندھیرا تھا اس لئے قیوم کچھ سمجھ نہیں سکا کہ اس سایہ کو وہ واہمہ سمجھے یا حقیقت۔
جب کینڈل آ گئی تو پروین نے میز کی دراز سے دوسرا بلب نکال کر لگا دیا اور پہلا وہیں رکھ دیا ——— قیوم قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اس کی نظر مسہری پر گئی جہاں پروین اپنے پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی ——— اس نے دیکھا کہ پروین ایک پنجے سے جوتے کو اپنی سینڈل سے مسہری کے نیچے پھینکنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے بعد فوراً ہی اس کی نظر تکئے پر پڑی جس کے ایک سرے پر وہ رومال پڑا ہوا تھا جس سے اس نے دیکھا کہ مجید اپنی ناک صاف کیا کرتا تھا ——— اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ چوبیس سالہ مجید کو چھوٹی بی بی کے ساتھ قیوم کا ہنسنا بولنا اور پڑھنا کیوں ناپسند تھا۔ وہ ایک معمولی نوکر ہوتے ہوئے بھی اس کا منہ بنا کر اور پیشانی پر بل لا کر کیوں استقبال کرتا تھا ——————— اور پھر وہ پروین کو کیچڑ سمجھ کر اپنے ہوسٹل لوٹ آیا۔
قیوم کا دماغ ماضی کے واقعات سے چکرا گیا ——— اس نے کتاب بند کر کے منہ پر رکھ دی۔ اب صبح کی اذان ہو رہی تھی اس کا باورچی اٹھ چکا تھا۔ اس نے آواز دی۔
"مشتاق"
"جی حضور"
"غسل خانے میں گرم پانی رکھ دو۔"

(ماہنامہ فکر و نظر میں چھپ گیا)

مائکل ویسٹ

مترجم:- سعد منیر

چیری

قرون وسطیٰ کے رومان نگاروں کے طرز پر لکھی ہوئی ایک انگریزی کہانی

ننھی چیری! ننھی چیری!!!
تو تو بہت سی کہانیاں جانتی ہے،
سنگدل ننھی چیری!
للہ مجھے ایک کہانی سنا دے،
"جب گرمیاں آئیں گی اور سورج چمکنے لگے گا،
اور رات کو پتیوں پر شبنم ناچنا شروع کرے گی۔
جب میرا پیٹ گرم وگداز اور پوشاک گہرے لال رنگ کی ہوگی
تب میں تجھے کہانی سناؤں گی"!
اور پھر گرمی کے موسم نے اسے گل بوٹوں والا لبادہ اڑھا دیا۔
اور پھل پکنے لگے، اور ڈالیاں جھک گئیں،
یہی وہ کہانی ہے جو ننھی چیری نے۔
چیری کے درختوں کی چھاؤں میں مجھے سنائی۔

کسی زمانے میں ایک نائٹ تھا، اسے لوگ بدبخت جنگ کہا کرتے تھے، اور وہ تھا بھی اسم بامسمیٰ، کیونکہ اس کے نصیب بڑے ہی کھوٹے تھے۔ کبھی ایسا نہ ہوا ہوگا کہ جب کبھی کسی چھت یا دیوار سے کوئی اینٹ یا پتھر گرا ہو اور وہاں اسکا سر اسے روکنے کے لئے موجود نہ ہوتا ہو، نائٹ کی ہم رکابی سے لیکر خود اپنے نائٹ بننے تک وہ کبھی بھی خوشی سے دوچار نہیں ہوا تھا، ہمیشہ ہی تو نامرادیاں اور بدنصیبیاں اس کے گرد منڈلاتی رہی تھیں۔ اسکی طبیعت بھی ایسی تھی کہ جتنی زیادہ بدبختیاں سے جھیلنا پڑتیں اتنا ہی وہ خوش وخرم اور شاداں وفرحاں دکھائی دیتا، اور کیسی ہی سخت مصیبت کیوں نہ ہوتی وہ اسکی ہنسی اڑائے بغیر ہرگز نہ رہا کرتا۔

ایک دفعہ البتہ خوش قسمتی اس کے سامنے مسکرائی تھی، اور یہ اسوقت کی بات ہے جب فرحت بانو سے اسکی شادی ہوئی تھی، اور فرحت بانو ایسی حسین تھی، ایسی حسین تھی کہ اس جیسی دوسری کا سان گمان بھی نہیں ہوسکتا لیکن بدنجتی تھی کہ اس کا پیچھا ہی نہ چھوڑتی تھی، اگرچہ ان دونوں نے ہزارہا دعائیں مانگیں، سیکڑوں منتیں مانیں، روم کے گرجا تک میں چراغ جا چڑھاوے چڑھائے مگر اللہ کا کرنا انکے یہاں بیٹا ہونا تھا نہ ہوا، اور یہی ان کے لئے بڑے دکھ کی بات تھی اور کیسے نہ ہوتی، بیٹا نہ ہونے سے اسکا اپنا کوئی وارث نہیں ہوتا اور اسکی ساری جائداد ہی تو اس کے چچازاد بھائی ترم باز کے قبضہ میں جانے والی تھی، اور ترم باز ایک ہی بدذات اور شیطان صفت آدمی تھا۔ بدبخت جنگ کو یہی سوچ دن رات کھائے جاتی تھی، سوچتے سوچتے آخر اس نے یہ قسم کھالی کہ جبتک اللہ میاں اسے گھر کا چراغ نہیں عطا کریں گے تو وہ جب تک بھی اس میں سکت ہے لڑائی کے میدان میں جاکر حق کے لئے لڑتا رہے گا۔

یہ قسم کھا کر اس نے اپنی بی بی کو گلے سے لگایا، ہتھیار سجے اور میدان جنگ کی راہ پکڑی، ابھی میدان جنگ میں پہونچے ہوئے اسے مہینہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ اسکے شانے کو ایک زہر میں بجھے ہوئے تیر نے چھید کر رکھدیا، اور وہ تلوار چلانے سے معذور ہوگیا، اور اسے گھر لوٹ آنا پڑا

اب جو وہ گھر واپس پہونچا تو اسکی بی بی زچہ خانہ میں تھی، اب کیا ہوا کہ ایک طرف تو اسے اپنے وارث کے پیدا ہونے کی لگن تڑپانے لگی اور دوسری طرف زہر اپنا کام کرتا رہا، اور اس کے کندھے میں اتنا شدید درد ہونا شروع ہوا کہ بیان نہیں ہوسکتا، اسے زور کا بخار چڑھ آیا اور ایسا چڑھا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید ہی نہ رہی، پھر جب موت کا فرشتہ دروازہ کھٹکھٹانے لگا تو اسے خبر ملی کہ وہ باپ بنگیا ہے، یہ سننا تھا کہ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا "لڑکا ہی ہوا ہے نا؟!" اور جب قاصد چپ سادھے رہا تو اس نے اندازہ لگالیا کہ لڑکی ہوئی ہے، پھر تو وہ بڑبڑانے لگا.. "اب میں مرنے کو تیار ہوں کیونکہ جب اللہ میاں کی یہی مرضی ہے تو انکی مرضی پوری ہونی چاہئے، مجھے خوش قسمتی سے کبھی سابقہ نہیں پڑا، شاید عاقبت میں یہی بات میرے خلاف نہ پڑے گی، کیونکہ اللہ میاں کی طرف سے اچھے اور برے دونوں ہی طرح کے موقع فراہم ہوتے ہیں، اور بدقسمت ہونا ہرگز گناہ نہیں ہے"

پھر اس نے اپنی بی بی کو اپنے پاس بلا بھیجا، پہلے اس سے قصور معاف کروایا اور پھر بولا، "جان من! اب میں ہمیشہ کے لئے رخصت ہورہا ہوں، میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو میں تجھے دے سکوں اور تو اسے میری یادگار سمجھ کر رکھ سکے، ہاں ایک چیری کی ٹہنی ضرور ہے، ذرا پائینتی رکھے ہوئے صندوق کو کھولو اور اسے نکال لو، جب میں جہاز پر سوار ہونے کے لئے گھوڑے پر آرہا تھا تو یہ ٹہنی میں نے فلسطین میں توڑی تھی، ایک دفعہ کی بات ہے کہ حضرت یسوع مسیح کو بڑے زور کی پیاس لگ رہی تھی، مارے پیاس کے حلق میں کانٹے پڑے جارہے تھے، راستہ میں جتنے بھی انجیر کے درخت تھے سب کے سب ننگے بچے اور اجاڑ ہورہے تھے، وہ چلتے رہے چلتے رہے یہاں تک کہ ایک جگہ پر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک چیری کا درخت سرخ سرخ چیریوں سے لدا ہوا جھوم رہا ہے، پھر کیا تھا، انہوں نے چیریوں سے اپنی پیاس خوب بجھائی، اور وہ چیریاں اتنی میٹھی تھیں، اتنی شیریں تھیں کہ یسوع مسیح کے دل سے اس درخت کے لئے بہت سی دعائیں نکل گئیں، اے جان! یہ وہی تو

تھا جو مقدس ماں کے باغ میں اگا ہوا تھا، اور جسکی شاخیں خود بخود ان کے پاس جھک جایا کرتی تھیں ۔

بدبخت جنگ نے اپنی جان جان آفریں کو سونپ دی، ہوتے ہوتے کئی سال بیت گئے اور فرحت بانو بھی اللہ کو پیاری ہونے لگیں، جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا وقت آن پہونچا ہے تو وہ ٹہنی اپنی ننھی منی سی لڑکی کو دیدی جسکا نام چیری تھا، اور یہ نام اس کیلئے بھی بہت تھا ۔

جس جھونپڑی میں چیری رہتی تھی اس سے ملا ہوا ایک باغ تھا، اس نے کیا کیا کہ وہ ٹہنی اسی باغ میں لگادی اور لگی دن رات پانی دینے، خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس ٹہنی میں کلّے پھوٹ آئے پتے نکلنے لگے، اور وہ بڑھتے بڑھتے ایک بڑا سا درخت ہوگیا، اور اسمیں بہت ساری چیریاں نکل آئیں، تھوڑے دنوں میں وہ اتنی بڑی اور اتنی لال لال ہوگئیں کہ ان کی سی نہ کہیں دیکھی گئیں اور نہ سنی گئیں ۔

ایک دن چیری کے دل میں نہ جانے کیا آیا کہ اس نے سیڑھی لگائی اوپر چڑھی اور چیریاں توڑ توڑ کے ایک ٹوکری میں جمع کرنے لگی، جب ٹوکری لبالب بھر گئی تو وہ نیچے اتر آئی اور ٹوکری زمین پر رکھ کر ذرا دیر سستانے کے لئے لیٹ گئی، ابھی وہ لیٹی ہی تھی کہ نیند آنکھوں میں سمانے لگی پھر تو وہ ایسی سوئی، ایسی سوئی کہ اسے سدھ بدھ کی خبر ہی نہ رہی،

اب کیا ہوا کہ ادھر تو وہ نیند میں مدہوش تھی اور ادھر اسکا چچا، وہی ترم باز لگا دیوار سے جھانکنے، اس نے جو اتنی بڑی بڑی اتنی پکی پکی اور اتنی رس بھری چیریاں دیکھیں تو اسکی نیت ڈانواں ڈول ہوگئی، پھر تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بس دیوار سے کود کر ساری چیریاں لے، یہ جا وہ جا،

اب جو چیری کی آنکھ کھلی تو وہ کیا دیکھتی ہے کہ ساری چیریاں غائب ہیں، اور کوئی ہوتا تو بہت کڑھتا بہت رنجیدہ ہوتا لیکن اسے ذرا بھی تو ملال نہ ہوا، نہ اس نے کسیکو کوسا پیٹا نہ برا بھلا کہا، اس نے خیال کیا تو یہی خیال کیا کہ شاید کوئی تھکا ہارا پیاس کا مارا راہگیر ادھر سے گزرا ہو اور اس نے پیاس بجھانے کے لئے چیریاں کھالی ہوں، اور تازہ دم ہوکر خراماں خراماں اپنی راہ لگ گیا ہو، چیریاں پاکر وہ کتنا نہ خوش ہوا ہوگا، اس خیال سے چیری کا چہرہ کنواری کلی کی طرح دمک ہی تو اٹھا ،

جب ترم باز چیریاں اٹھالایا تو اس نے سوچا کہ انہیں بادشاہ کی نذر کردے، کیونکہ ویسی چیریاں کسی نے سنی کاہے کو ہوں گی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوں گی، جب بادشاہ چیریاں دیکھے گا تو بہت خوش ہوگا، پھر کیا عجب کہ وہ اسے اپنا چہیتا مصاحب بنالے اور اس پر مہربانیوں کی بارش کرنے لگے، پھر تو اسے اپنی بیٹی کے لئے دھن دولت والا بہت ہی اچھا سا بر مل جائے گا اور کون جانے بادشاہ ہی اس سے بیاہ کرلے، تب تو اس کے گھر میں ہُن ہی ہُن برسنے لگے گا، اور زمین کا تو کوئی ٹھور ٹھکانا ہی نہ رہے گا ۔

اور ترم باز کی بیٹی کیا تھی، بس آفت کی پرکالہ، نام ہی اس کا نک چڑھی بیگم تھا ۔ اتنی غصیلی، اتنی کڑوی کسیلی کہ نام سنتے ہی لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے، جب بھی دیکھا لال پیلی، آنکھیں سرخ انگارہ اور منہ پھولا ہوا، جہاں ذرا بھی مرضی کے خلاف بات ہوئی اور اس نے دھائیں دھائیں دو تین تھپڑ جما کر خواصوں کی مرمت کردی، سٹراپ سٹراپ ہنٹر برسا کے لونڈیوں کی چمڑا ادھیڑ کر رکھدی، غرضکہ ہر وقت کا پیٹنا کوٹنا، ہر وقت کا رونا سسکنا، بس ایک کہرام سا مچا رہتا ،

اور جب ترم باز نے بادشاہ کے سامنے چیریاں رکھیں تو وہ دیکھتے ہی بیتاب ہوگیا۔ فوراً ہی تو اس نے کئی ایک اٹھا کر یکدم سے منہ میں رکھ لیں، چیریوں کا ذائقہ زبان کو ملنا تھا کہ بادشاہ لپک اٹھا، ایسی چیریاں تو اس نے سپنے میں بھی کبھی نہیں کھائی تھیں، خدا کی شان ان چیریوں کا خاصہ یہ تھا کہ جو ایک بار چکھ لیتا وہ کھاتا ہی چلا جاتا اور کبھی سیر نہ ہوتا، بادشاہ بھی بس کھاتا چلا گیا، اور جتنا وہ کھاتا جاتا اتنا ہی اسکا جی اور کھانے کو چاہتا، یہاں تک کہ وہ ختم ہی ہوگئیں، اور اسکی نیت بھرنی تھی نہ بھری "اور وہ اور کھانے کے لئے تڑپنے لگا، آخر اس سے نہ رہا گیا اور ترم باز سے اور چیریاں لانے کا تقاضہ کر دیا۔

ادھر کیا ہوا کہ جب ترم باز دوبارہ چیریاں چرانے جا رہا تھا تو مقدس ماں نے اسے دیکھ لیا، انہوں نے کیا کیا کہ فرشتوں کو انکی رکھوالی کے لئے تعینات کر دیا، اب جب ترم باز چیریوں کی تاک میں وہاں پہونچا تو وہ درخت کے پاس تک نہ پھٹک پایا ادھر بادشاہ کی چیری کی طلب اتنی بڑھی، اتنی بڑھی کہ وہ بے کل رہنے لگا، کسی صورت اسے چین ہی نہ آپاتا تھا، وہ ترم باز سے تقاضے پر تقاضہ کرتا رہتا۔ اور ترم باز کبھی ادھر کی اور کبھی ادھر کی باتیں بنا دیتا اور ٹال مٹول کرتا رہتا، آخر جب حیلے حوالوں سے کام نہ چلا تو وہ بادشاہ کے ڈر کے مارے وہاں سے رفو چکر ہوگیا،

اب کیا ہوا کہ بادشاہ کی چیری کی طلب بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی کہ اسکی آنکھوں کی نیند اور بھل اور دل کا چین حرام ہوگیا، جب اسے صبر کی تاب بالکل ہی نہ رہی تو اس نے ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو عورت بھی اس کے لئے ایسی چیریاں لائے گی جو اسکی سیری کر دیں گی تو وہ اسے اپنی ملکہ بنالے گا، ڈھنڈورے کا سننا تھا کہ ہزاروں ہزار دوشیزائیں اچھی سی اچھی، خوبصورت سے خوبصورت اور سلی چیریاں لے کر بادشاہ کے محل کی طرف چل پڑیں، ہر ایک کے ہی تو دل میں آس تھی کہ اسکی چیریاں بادشاہ کی سیری کر دیں گی اور وہی بادشاہ کی مملکت کی ملکہ بن جائے گی۔

چیری نے باغ میں بیٹھے بیٹھے جو یہ اژدہام، یہ سازو سامان، یہ چہل پہل اور یہ رنگ برنگی اشیاء دیکھیں تو اس سے نہ رہا گیا اور وہ راہ گیروں سے پوچھ بیٹھی، "ارے لوگو! بتاؤ تو یہ سب کیا ہے، کہاں جا رہا ہے اور کاہے کے لئے ہے؟" اور لوگوں نے اسے بتایا کہ یہ تو ہمارے بادشاہ کے بیاہ کا سامان ہے،

اور پھر چیری دل ہی دل میں کہنے لگی، اور سوچنے لگی کاش ایسا ہوتا کہ وہ بھی بارات کی دھوم دھام دیکھ سکتی۔ پھر تو اسکی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہے گا، وہاں کیسی کیسی خوبصورت بیگمیں آئیں گی کتنے اچھے اچھے باجے بجیں گے، اور کتنی سجاوٹ نہ ہوگی، سوچتے سوچتے آخر اس کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ اپنی کچھ چیریاں لے جا کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے پھر شاید بادشاہ اسے صحن میں کھڑے ہونے کی اجازت دیدے اور اسے یہ دھوم دھام دیکھنے کا موقع مل جائے، اسکی چیریاں بھی تو بہت ہی عمدہ ہیں، ویسی چیریاں تو اس نے دیکھی ہی نہیں، اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی چیریوں کے علاوہ کوئی دوسری چیریاں نہیں دیکھی تھیں اور وہ جو اس کے سامنے پادری کے باغ میں لگی ہوتی ہیں وہ بہت چھوٹی اور کچی رہتی ہیں، کیونکہ وہ ہمیشہ پانی دینا بھول جاتا ہے۔

پھر چیری نے یہ کیا کہ چیریوں سے اپنی ٹوکری بھری، اور خاک دھول سے بچانے کے لئے ان پر سرپوش ڈالا اور بادشاہ کے محل کی طرف چل پڑی، جب وہ بادشاہ کے محل کے پھاٹک پر پہونچی تو وہاں ایک موٹا تازہ دربان کھڑا ہوا تھا، اس دربان

نے کیا کیا کہ اس کا راستہ روک لیا، اور اسے اندر نہ جانے دیا۔ چیری نے بہت منت سماجت کی، بڑی خوشامد کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا، اور بت بنا رہا۔ اتنے میں ہوا جو چلی تو ٹوکری پر سے سرپوش سرک گیا، اور دربان نے چیریاں دیکھ لیں، اتنی بڑی بڑی اور اتنی رسیلی اور خوبصورت چیریاں دیکھنا تھیں - - - - - - - - کہ اس کے منہ میں پانی بھر آیا، اور وہ یکبارگی بول اٹھا "اچھا دیکھ۔ اگر تو مجھے تھوڑی سی چیریاں دے دے تو میں تجھے اندر چلا جانے دوں گا" چیری نے جواب دیا "دیکھ یہ میں بادشاہ کے لئے لائی ہوں۔ مگر خیر وہ جو کنارے پر کچھ گھٹیا قسم کی چیریاں دکھائی دے رہی ہیں تو وہی لے لے" اور دربان ٹوکری لے کر اندر چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد لوٹ آیا، اور پھر اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

اب کیا ہوا کہ جتنی چیریاں تمام دوشیزائیں اور کنواریاں لیکر آئی تھیں، اُن میں سے ایک ایک لے کے بادشاہ نے چکھیں، لیکن کسی نے بھی تو اس کے جی کو خوش نہیں کیا۔ وہ نراس ہو کر محل کے اندر لوٹنے ہی والا تھا کہ دربان حاضر ہو کر کورنش بجالایا اور عرض کی۔ "جہاں پناہ! ایک دوشیزہ آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہے"۔

اور بادشاہ الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ سامنے چیری کھڑی تھی۔ وہ بادشاہ کو دیکھتے ہی بولی "اے بادشاہ لوگوں نے مجھے بتلایا ہے کہ تیرا بیاہ ہو رہا ہے، میرا دل بھی تیری بارات دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ اگر تو اپنے صحن کے اندر مجھے کھڑے ہونے کی اجازت دیدے تو میں بھی بارات کی دھوم دھام، لوباندانیاں لئے ہوئے باندیوں کی قطاریں اور خوشجمال اور خوبصورت عورتوں کے جھرمٹ دیکھ کے اپنے دل کو خوش کر لوں، کیونکہ جہاں پر میرا چیری کا درخت لگا ہوا ہے وہاں والی سڑک سے بہت ہی کم لوگ گزرتے ہیں اور جو گزرتے ہیں وہ زیادہ تر مسافر ہوتے ہیں۔ وہاں سے مجھے کچھ دکھائی ہی نہیں دے گا، اور اسی خاطر میں تیرے لئے ایک ٹوکری چیریاں بھی لائی ہوں، اگر تجھے پسند آجائیں تو خیر میرے بھاگ جاگ جائیں گے"۔

اور بادشاہ نے جونہی چیری کو دیکھا تو ہزار جان سے اس پر عاشق ہو گیا، اور وہ تھی بھی بڑی موہنی اور کامنی جیسی، اسکا سندر مکھڑا چاند کو شرماتا، اس کے گالوں کی گلابی کو ملتا گلاب کے سینہ میں آگ لگاتی اور ہونٹوں کی لال لال لالی لعل کو پانی پانی کرتی، ایسی دوشیزہ بھلا بادشاہ نے کاہے کو دیکھی تھی، اور وہ بے تحاشہ ہی تو بول اٹھا۔ "اے ننھی کامنی! کہاں ہیں تیری چیریاں، لا دیکھوں تو ذرا۔ لیکن کوئی بھی چیری اتنی رس بھری اور اتنی مزیدار ہو ہی نہیں سکتی جتنے کہ تیرے شہد بھرے ہونٹ ہیں گے" چیری نے جو اپنی ٹوکری سے سرپوش اٹھایا تو اس کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا سانس باہر رہ گیا ٹوکری میں تو صرف کنکر ہی کنکر بھرے ہوئے تھے، اور ساری چیریاں دربان ہڑپ کر گیا تھا،

یہ دیکھنا تھا کہ بادشاہ کھلکھلا کے ہنس پڑا، اور کہنے لگا۔ "دیکھو میں نے تجھسے نہیں کہا تھا؟ آ، میرے قریب آ، اور مجھے اپنے ہونٹوں کا امرت رس پی لینے دے، بس اسکا بدلہ یہی ہو سکتا ہے"۔ اور جیسی میٹھی رسیلی چیریاں تھیں ان سے کہیں زیادہ میٹھے رسیلے اس کے ہونٹ نکلے، اب بادشاہ کو جو اس کے ہونٹوں کا مزا ملا تو اس کی پیاس کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی، اور اس کے تن من کو جلانے لگی۔

اور چیری کے کنول کل جیسے نین حیا سے جھک گئے، اُن کا جھکنا تھا کہ گیا دیکھتی ہے کہ ٹوکری پکی پکی، لال لال چیریوں سے
ہے جیسے کہ انکو کسی نے ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ اور وہ ایک دم پکار اٹھی، اے بادشاہ دیکھ تو، یہ کیسا معجزہ رونما ہوا ہے
ان دربان ہڑپ کر گیا تھا لیکن مقدس ماں نے پھر سے ٹوکری کو چیریوں سے بھر دیا ہے "

• پھر تو بادشاہ خوشی سے پھولا ہی نہ سمایا، اور وفورِ خوشی سے چیخ اٹھا، "او ہو اب تو دو دو خزانے میرے ہاتھ لگ گئے
اور دونوں ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، اے ننھی دوشیزہ اب تو تو ہی میری ملکہ بنے گی، اور میرے دل اور میرے ملک پر تیرا
راج ہو گا "

پس اللہ نے چیری کے دن پھیر دیئے اور بادشاہ نے اس سے بیاہ کر لیا اور وہ ہنسی خوشی دن بتانے لگی، اور اس کے
ت سے بچے ہوئے، پھر اسے زندگی بھر غم کا منہ دیکھنا نہیں پڑا۔ یہاں تک کہ وہ آسمان کو سدھار گئی، جہاں نہ رونا ہے، نہ
ہیں۔ بلکہ جہاں ہمیشہ روپہلی دھوپ کی چمکیلی کرنیں تھرکتی رہتی ہیں، رنگ برنگ کے خوبصورت سے خوبصورت پھول
لہراتے رہتے ہیں، اور تسنیم و کوثر کے کناروں پر پھلوں سے لدے ہوئے درخت مست ہو ہو کر جھوما کرتے ہیں۔ اور جہاں
فرشتے پھلوں کی ٹوکریاں عرش پر لیجاتے ہیں۔ اور جہاں ہم سب کے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اور یہی وہ کہانی ہے جو ننھی چیری نے
درختوں کے سایہ میں مجھسے کہی تھی،

مسرت حسین۔ بی۔ ایس۔ سی

"اندھیرے"

چلتے چلتے اس نے یکبارگی گھوم کر پیچھے دیکھا اور پھر تیز تیز ڈگ بھرنے لگا مٹیالے اور کھردرے پتھروں کی بلند دیوار اسکا منہ چڑاتی دور ہوتی جا رہی تھی اور لوہے کا وہ بڑا دروازہ جو زنگ لگتے لگتے کسی غار کے دہانے کی طرح دور سے سیاہ دھبے کی مانند دکھائی دیتا تھا اب ہمیشہ کے لئے اس پر بند ہو چکا تھا لیکن اب بھی نہ جانے کتنی زندگیاں اسکے پیچھے مقید تھیں، تاریک کوٹھریاں ویران اور خشک ماحول۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کے بیش قیمت بیس سال گذار دیئے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے چوکیدار اور سنگ دل جمعدار اسے گھورتے رہے۔ جھڑکیاں دیتے رہے اس سے بے دریغ کام لیتے رہے۔ وقت گذرتا گیا موسم بدلتے رہے لیکن اسکے گرد ایک ہی سا مستقل ماحول رہا وہی دن وہی راتیں اور انہی گردش کے ساتھ ساتھ اسکی زندگی کے موڑ بھی بدلتے رہے۔ اسکی مقید زندگی گھٹتی رہی اور آج جبکہ اسکی زندگی کی ساری گرمی جیل کی سرد دیواریں جذب کر چکیں تو وہ آزاد تھا اس کھلی ہوا میں اسکا بھی حصہ تھا۔ یہ سبزہ یہ درخت اب اسے بھی تراوٹ دے سکتے تھے۔ اس نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور ایک لمبا سانس کھینچا جیسے فضا کی ساری رنگینی سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ اسکے بوجھل قدم بڑھتے رہے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اسکا اگلا قدم کس منزل کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں اب اسکا کوئی بھی نہ تھا۔ نہ کوئی ساتھی نہ کوئی دوست۔ وہ ایک ایسا ضعیف رسیدہ درخت بن کر رہ گیا تھا جسکے گرد کوئی سبزہ نہیں ہوتا۔ بے برگ و بار شجر جس پر کوئی پرندہ نہیں چہچہاتا۔

دم بھر کے لئے وہ رک گیا اور ایک نظر اپنے اوپر ڈالی جیسے دیکھنا چاہتا ہو کہ کیا یہ وہی ندیم ہے۔ جو اب سے بیس سال پہلے اسی ویران راستے سے جیل کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ ندیم مر چکا۔ اسکا وجود ختم ہو چکا۔ اور اب اسکی جگہ ایک سایہ رہ گیا ہے۔ ایک ضعیف جسکا وجود نحیف اور خشک ہے جہاں سرخی سے زیادہ زردی عیاں ہے۔ پھٹے پھٹے کھردرے ہاتھ۔ ابھری ہوئی نیلگوں رگیں۔ ایک سرد آہ اسکے لبوں پر بکھر گئی۔ اور ایک دفعہ پھر اسے جیل میں گذرا ہوا بیکار وقت یاد آگیا۔ کتنی سخت محنت لی جاتی تھی اس سے دن رات کام۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ سردیوں کی ٹھنڈی برف راتیں، کوئی بھی اسکے کام میں کمی نہیں کرتی تھیں وہ ایک جانور کی طرح صبح سے شام تک کام کرتا رہتا۔ ہانپتا رہتا لیکن کوئی ہمدرد دور دور تک نظر نہ آتا جو اس کے لئے پیار اور خلوص کے دو بول ہی بول سکے یہی کچھ تو ہوتا ہے۔ ان اندھیری کوٹھریوں میں ان لوہے کے کٹہروں میں۔ یہی سوچتے سوچتے اسے ایک جھرجھری آگئی ——

انہیں خیالات میں محو وہ چلتا رہا۔ اور جب چونکا تو اسکے چاروں طرف بلند عمارتیں پھیلی ہوئی تھیں سرخ، سبز اور سفید

عمارتیں۔ بڑی بڑی کوٹھیاں اور چھوٹے چھوٹے بنگلے پام اور گلاب کے پودے۔ ہاں اور انگور کی بیلیں سبھی کچھ تو ہے ان چہار دیواریوں میں لیکن ان دیواروں کے پیچھے کیا کچھ نہیں ہوتا۔ نہ جانے کتنی آشاؤں کا خون ہو جاتا ہے کتنے ارمان کچل کر مرجاتے ہیں۔ ذاتی مفاد کے لئے نہ جانے کتنے فیصلے خود بہ خود ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں کلیاں شگفتہ ہونے سے پہلے ہی مسل دی جاتی ہیں۔ یہ سوچ کر اسے ان چمکیلی عمارتوں سے نفرت ہو گئی ان میں جلتی ہوئی تیز اور چمکیلی روشنیاں اسے سیاہ دھبے نظر آنے لگیں۔ اسنے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان فلک بوس عمارتوں یا انکے مکینوں کا غرور دیکھے۔ انکی سختی اور وسعت کا مشاہدہ کرے۔

اس کے اٹھتے ہوئے قدم آبادی کو پیچھے چھوڑتے تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ شہر کا شور بالکل کم ہو گیا۔ سورج کی الوداعی کرنیں چٹانوں پر دور دور تک سونا بکھیر رہی تھیں۔ یہ جگہ شہر سے کافی دور پہاڑیوں کے دامن میں تھال کی مانند دھری تھی شام کی سیاہی کے پردے آہستہ آہستہ گرنے لگے۔ خاموشی کا دیوتا اپنے پر پھیلائے جیسے ہر شئے کو ساکن و ساکت بنا رہا ہو۔ سکوت اور تاریکی کی یہ کیفیت جلد ہی ختم ہو گئی اور تاروں کی محفل جمنے لگی آسمان کی سطح پر بے شمار ننھے ننھے دیپ جگمگانے لگے آسمان کے آبنوسی دروازے ہولے ہولے کھلتے رہے اور ماہتاب کا شرماتا ہوا چہرہ ابھرنے لگا چاند کی دودھیا روشنی میں ہر شئے نہا گئی اسمیں ایک نیا بانکپن اور وقار آگیا۔

نم اور خنک ہوا اسے تھپکیاں دے رہی تھی فضا میں ہلکا ہلکا سا سرور تھکن اور خمار کے احساس کو تیز کر رہا تھا۔ گرتے ہوئے آبشار کا شور قریب تر ہو گیا۔ وہ کنارے پر کھڑا پانی کی صاف سطح کو دیکھتا رہا۔ دور دور تک پڑتے ہوئے بھنور دریا کی منہ زور لہریں اس وقت اسے بڑی عجیب لگ رہی تھیں جیسے ایک رنگین سپنا دیکھ رہا ہو۔ اچانک اسکی نظر سامنے پڑی ہوئی پتھر کی سل پر پڑی جو چاندنی میں سنگِ مرمر کی طرح چمک رہی تھی۔ اسکا آدھا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا جیسے چاندنی کا کوئی دیوتا اپنے پاؤں پانی میں لٹکائے خاموش بیٹھا ہو۔ ایک لمحہ کے لئے اسکی آنکھوں میں چمک سی آگئی اور وہ آہستہ آہستہ اسکے قریب پہنچ گیا اور کافی دیر تک حسرت و یاس سے اسے تکتا رہا۔ اسکی سطح پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ جیسے دیکھنا چاہتا ہو کہ زمانے کی تیز رفتاری اور حالات کے تغیر کے باوجود بھی یہ پتھر اس جگہ کس طرح قائم ہے۔ وقت کی گردش، موسم اور دنوں کی تبدیلی کوئی بھی اسکی جگہ کیوں نہ بدل سکی۔ اپنے پاؤں پانی میں ڈال کر وہ اس پر بیٹھ گیا۔ ٹھنڈا پانی اسکے پاؤں سہلاتا رہا۔ نکھری ہوئی چاندنی، خنکی اور فضا کا سکوت سب نے ملکر اسکے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر دیا۔ اسکے کمزور جسم میں اک نئی روح پھونک دی۔ اسکی آنکھیں ٹھنڈی ہونے لگیں۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اسکے منہ کو چومتا گذر گیا۔ وہ پانی کی موجوں کے سہارے خیالات کے دھارے میں بہنے لگا۔ وہ کمزور تھا اور بہاؤ تیز اسلئے اس نے بے بس ہو کر اپنے آپ کو منچلی موجوں کے حوالہ کر دیا وہ اس طرح بہتا سطح سے کھیلتا رہا کہ ایک تیز ریلا آیا اور اسے کھینچ کر دور لے گیا جہاں اسکے ماضی کے حسین اور مدھر سپنے تھے اسکی زندگی تھی

آج سے تیس برس پہلے وہ ایسا تو نہ تھا۔ اسکا دل امنگوں سے بھرا تھا مسرتوں سے ہمکنار تھا۔ اپنی چھوٹی سی ہمائی دنیا کے تصور سے وہ ہر وقت سرشار رہتا۔ اسکے گرد بے شمار حسین چہرے تھے جنمیں محبت بھی تھی اور خلوص بھی۔ قہقہوں سے لبریز زندگی تیزی سے گذرتی رہی اور راستے میں آنے والے موڑوں کو کامیابی سے کاٹتی رہی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ایک فرم میں منیجر ہو گیا۔ جہاں اسے ہر قسم کا آرام اور سکون تھا ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی۔ کار تھی۔

اور ایک دن جب وہ آفس سے واپس آ رہا تھا اسکی نظر روبی پر پڑی جو بے تابی سے بس کی منتظر تھی۔ دھوپ کی آخری کرنوں میں نہائی ہوئی روبی اسے سونے کی ایک مورتی معلوم ہوئی اسکے کھلے ہوئے سنہرے بال ریشم کے لچھوں کی طرح ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے بھی اسنے کئی بار روبی کو دیکھا تھا لیکن اچٹتی ہوئی نظر سے۔ وہ اسکی کوٹھی کے قریب ہی رہتی تھی لیکن کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس وقت ایک آرزو اسکے دل میں ابھرنے لگی۔ کاش وہ اس سنہری بالوں والی لڑکی کو اپنا ہمسفر بنا سکے۔ چنانچہ قریب پہنچ کر اسنے دھڑکتے ہوئے دل سے بریک لگائے۔ کار ایک چرچراہٹ کے ساتھ رک گئی۔ روبی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسکی آنکھوں سے نکلتی ہوئی تیز چمک نے ایک دفعہ پھر اسکی دھڑکنوں کو تیز کر دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"اگر آپ گلبرگ جا رہی ہوں تو ...."

"جی شکریہ بس اب آتی ہی ہوگی" اس نے جلدی سے کہا۔

"آپ تکلف سے کام نہ لیں۔ آخر اس میں ہرج بھی کیا ہے میں بھی تو وہیں جا رہا ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر تک کھڑی کچھ سوچتی رہی اور پھر ہچکچاتی ہوئی آگے بڑھی۔ ایک دفعہ پھر اسنے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ راستہ خاموشی سے طے ہونے لگا آخر روبی نے سکوت توڑا۔

"کیا آپ مجھے جانتے ہیں۔"

"صرف اس حد تک کہ آپ میری پڑوسن ہیں۔ سرکل سے تیسری کوٹھی میری ہے۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے شیشے میں اسکا عکس دیکھا۔ روبی نے کسمسا کر پہلو بدلا۔

کار چلتی رہی اور وہ خاموش ایک دوسرے کے متعلق سوچتے رہے۔ ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے رہے۔ کار آہستہ سے ایک خوبصورت کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوئی اور روبی نے اترتے ہوئے ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کیا۔ وہ دیر تک اسکے اٹھتے ہوئے ہلکے ہلکے قدم دیکھتا رہا برآمدے کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

یہ تھی اسکی پہلی ملاقات۔ دوسری بار روبی نے اسے اپنی سالگرہ پر مدعو کیا۔ اس بار پہلے جیسا حجاب نہ تھا۔ اور تیسری ملاقات تکلفات کے بھاری پردوں سے دور تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ روبی اسکے قریب ہوتی گئی۔ اس کی روح کی گہرائیوں میں اترتی رہی اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اس کائنات کی ہر شے ساکن ہو گئی ہے۔ خاموشی میں ڈوب گئی ہے۔ صرف وہ ہے اور اسکی ہمسفر سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی روبی۔ اسنے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ وہ کن حالات سے دوچار ہے کس طبیعت اور مزاج کی مالک ہے وہ تو صرف اسے چاہتا تھا اسکے قرب کا خواہش مند تھا۔ جو اسے میسر تھا۔ دن کے اجالے اور رات کی تنہائیوں میں وہ اکٹھے رہتے۔ دیر دیر تک چاند کی نورانی کرنیں جذب کرتے رہتے۔ اسکی دودھیا روشنی میں اپنے مستقبل کے گھروندے بناتے رہتے۔ اور جب رات کی تاریکی ہر شے کو اپنی آغوش میں لے لیتی۔ فضا میں مار ڈالنے والا سکوت چھا جاتا تو وہ شہر کے ہنگاموں سے دور۔ بند کے راستے چلتے اسی نہر پہ آ جاتے اور اسی پتھر کی سل پر بیٹھے گھنٹوں بھیگی رات کو دیکھا کرتے بہتے پانی کا ترنم اور ایک تاریک رات جب وہ اس جگہ بیٹھے ایک دوسرے کے دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکنیں سن رہے تھے۔ اس نے روبی سے پوچھا

"تمہیں ان خاموش سیاہ راتوں سے ڈر نہیں لگتا روبی"

"اونہوں"

"جانتی ہو ان تاریک راتوں میں کیا کچھ ہوتا ہے"

"نہیں" اس نے بھولپن سے جواب دیا۔

"ان میں بہت سے راہی اپنی منزل سے بچھڑ کر کسی تاریک کھڈ میں گر پڑتے ہیں وہاں وہ تاریکی کا سینہ چیرنے کے لئے چیختے ہیں شور مچاتے ہیں لیکن غار کی تنگ اور سنگین دیواریں انکی آوازوں کو واپس لوٹا دیتی ہیں منزل کے قریب نہیں ہونے دیتی"

"پھر" اس کے لہجے میں تھکاوٹ اور نیند کے آثار تھے۔

"پھر۔ وہ مظلوم مسافر گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیتا ہے۔ اسکی روح اپنی منزل کے گرد پھڑپھڑاتی رہتی ہے لیکن اسے اتنا موقع بھی نہیں ملتا کہ وہ اپنی وفا کا یقین دلا سکے۔ میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ کہیں کوئی تاریکی مجھے صفائی کا موقع دیئے بغیر ہی نہ دبوچ لے۔

"خدا کے لئے" اس نے بےچینی سے ہاتھ اٹھایا۔ "ندیم ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ تمہیں اپنی روبی پر اعتبار نہیں کیا؟ ندیم دل کی حیات بےکار جا سکتی ہے لیکن روح کی محبت اتنی پختہ ہوتی ہے کہ اسے موت کے بےرحم ہاتھ بھی جدا نہیں کر سکتے۔ میں تمہارا دامن اتنی مضبوطی سے پکڑے رکھوں گی کہ تاریکی بھی خضر راہ بن جائے"

انکی محبت کے پودے پہ روز بروز نئے شگوفوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ نئے پھول اور پتے نکلتے رہے۔ اور یہ ایک تناور درخت بن گیا جسکی چھاؤں ٹھنڈی بھی تھی اور پرسکون بھی۔

اور پھر اچانک اسے کراچی جانا پڑا۔ جہاں اسے چھ ماہ تک رہنا تھا کیونکہ یہاں کا برانچ مینیجر چھٹی پر تھا۔ چھ ماہ کا عرصہ اسکے لئے پہاڑ بن گیا۔ دن بھر وہ زیادہ سے زیادہ کام کرتا تاکہ مصروف رہے اور روبی کا خیال پریشان نہ کرے۔ اس کے باوجود اسکا موڈ ہر وقت خراب رہتا۔ کچھ عرصہ تک تو روبی کے خطوط آتے رہے۔ محبت اور شکایت سے پُر۔ لیکن پھر کم ہوتے ہوتے یہ سلسلہ بالکل ختم ہو گیا۔

وقت کا زخمی پرندہ آہستہ آہستہ اڑتا رہا۔ موسم کا رخ بدل گیا اور چھ ماہ گذر گئے اور جس دن وہ واپس لاہور آیا تو نہ جانے ہزاروں مسرتوں کے باوجود اسکا دل بار بار کیوں دھڑکنے لگتا۔ اسنے ارادہ کر لیا تھا کہ اب وہ ہر طرح کا فیصلہ کر دے گا اپنی منزل کے گرد ایک مضبوط چار دیواری بنائے گا۔ روبی کے ڈیڈی سے ملکر اپنی خواہش کا اظہار کرے گا۔ چنانچہ شام کو وہ ہزاروں خواہشات لئے روبی کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ ابھی وہ لان کراس کر رہا تھا کہ گلاب کے قطعے کے پاس اسے روبی نظر آئی۔ وہ کسی سے گفتگو میں منہمک تھی مسکراتے ہوئے بار بار اسکے گلابی لب کھل جاتے سنہرے بال ہوا کے دوش پر آہستہ آہستہ ہچکولے لے رہے تھے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا کیونکہ روبی سے محو گفتگو گلبرگ کا ایک نوجوان جاوید تھا وہ اسے صرف نام سے ہی جانتا تھا۔ بہرحال وہ کسی کالج میں لیکچرار تھا اور کافی اسمارٹ بھی تھا۔

وہ بوجھل قدم اٹھاتا ان کے سامنے جا پہنچا۔ روبی اسکی غیر متوقع آمد پہ بہت حیران ہوئی اور کافی دیر تک گھورتی رہی پھر ایک دم وہ مسکرا پڑی اور کھڑی ہو گئی۔

"آپ ...۔" اسکی سانس پھولی ہوئی تھی "اتنے عرصے بعد واپس لوٹے"

"ہاں بھئی کام کچھ توقعات سے زیادہ ہی نکلا — تم سناؤ کیا حال ہے"
"بس 50.50 — اوہ معاف کیجئے میں نے آپ کا تعارف نہیں کروایا"
"یہ ہیں مسٹر ندیم! میرے پڑوسی اور دوست"
"اور آپ ہیں" اس نے جاوید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مسٹر جاوید میرے نئے ٹیچر" رسمی سی گفتگو کے بعد نہ جانے وہ زیادہ دیر کیوں نہ رک سکا اور واپس آگیا۔ اک عجیب سا احساس اس کے دل میں گھر کرتا جا رہا تھا۔ روبی کا جاوید کے ساتھ بڑھتا ہوا بے تکلف رویہ اسے شکوک کی دلدل میں دھکیل رہا تھا۔ اسکے بعد بھی اک دو دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ جاوید کی موجودگی ہی میں روبی سے ملا اور ان دونوں کے رویہ سے اسے یقین ہو گیا کہ وہ اب اک باسی پھول بن چکا ہے اک خشک شاخ جس کی طرف چاہنے والوں کا ہاتھ کبھی نہیں بڑھتا۔ روبی کا رجحان زیادہ تر جاوید کی طرف تھا کیوں! یہ وہ بھی جانتا تھا بس اک خلش تھی ہیجان تھا جس نے اس کے دل و دماغ کو بری طرح مجروح کر دیا۔ اک عجیب سا احساس کمتری پیدا کر دیا۔ وہ اپنے دکھی دل کو لئے پھرتا رہا۔ ماضی کے حسین سپنوں میں کھو تا رہا۔ لیکن اس کے قدم کبھی روبی کی طرف نہ بڑھ سکے۔ اگر اسے کبھی یہ خیال آتا بھی تو اک دم جاوید کا چہرہ جیسے اس کے سامنے آجاتا اور وہ نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیتا کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ شام کو مال کی پُر رونق فضا میں روبی اور جاوید کے مسکراتے ہوئے چہرے اسے نظر آئے لیکن وہ کبھی ان سے ملنے کی کوشش نہ کر سکا۔ وہ روبی کو بھولنے کی ناکام کوشش کرتا رہا لیکن خلش اور رشک کی آگ بھڑکتی گئی۔ اور پھر وہ دن اسکی زندگی میں سب سے زیادہ منحوس تھا جب اس نے روبی کو جاوید کے ساتھ پلازا میں دیکھا۔ اس دن اسکی طبیعت بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ بار بار روبی کا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم جاتا۔ وہ سارا دن کرسی پر بیٹھا پہلو بدلا کیا اور جب شام کے دھندلکے گہرے پڑ گئے تو وہ آفس سے باہر نکلا۔ مال کراس کر کے وہ پلازا کی طرف مڑ گیا۔ پچر ہاؤس پر کافی رش تھا شاید کوئی نئی پکچر لگی تھی۔ اس نے کار پارک کی اور بکنگ آفس کی طرف بڑھا۔ اچانک اسکی نظر گیلری پر جا کر ٹک گئی۔ روبی جاوید کی بانہوں کے سہارے اوپر جا رہی تھی۔ وہ کافی خوش نظر آتی تھی۔ گلابی جمپر میں وہ بالکل پھول جیسی معلوم ہو رہی تھی۔ چہرے پر وہی معصومیت اور لالی جیسے کلی کھل گئی ہو۔ اور اسے ایک دھچکہ سا لگا اور وہ واپس لوٹ آیا۔

اس رات وہ بالکل نہ سو سکا۔ اس کی آنکھیں نیند کی شدت سے جلتی رہیں اور وہ سوچتا رہا کہ یہ دنیا اور اسکی خوشیاں کتنی عارضی ہیں بالکل کسی ادھورے خواب کی طرح۔ روبی۔ اس کی روبی وہ روبی جو ہمیشہ اس کی سانسوں میں رچی رہتی تھی۔ اسکی محبت میں ڈوبتی ہوئی دور نکل گئی تھی اب کسقدر دور ہے کس قدر خوش ہے۔ جاوید سے کسقدر قریب ہے۔ اور وہ — وہ اب اتنا ہی دور ہے۔ مسکراہٹوں اور مسرتوں سے دور۔ لیکن ایسا کیوں ہوا۔ اسے پرانا کھلونا سمجھ کر کیوں پھینک دیا گیا۔ روبی اپنے وعدوں سے کیوں پھر گئی۔ اسکا دماغ بہک گیا اور اس نے جواب دیا۔ "ذاتی مفاد" جاوید تم سے بہتر ہے۔ روبی عورت ہے کمزور اور خود پرست۔ وہ چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کرتی ہے۔ اب وہ تم سے کبھی قریب نہیں ہو سکتی۔ اسکے آنچل کا سایہ اب تمہاری تپتی ہوئی دنیا پر کبھی نہیں پڑ سکتا۔ نہیں پڑ سکتا نہیں پڑ سکتا"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا" وہ پوری طاقت سے چیخا "جس دل سے میں نے اتنا پیار کیا۔ اسی دل سے میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم بھی کر سکتا ہوں۔ اسکی محبت کے جذبے کو ختم کر سکتا ہوں اسکے وجود کو ختم کر سکتا ہوں"

اور ابھی سپیدۂ سحر اچھی طرح نمودار بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھا۔ اس نے میز کی آخری دراز سے پستول نکالا اور

روبی کے گھر کی طرف چل دیا۔

روبی کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور وہ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی بڑی محویت سے کچھ لکھ رہی تھی۔ پشت کے دروازہ کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ بیڈ شیٹ پر پڑی ہوئی بے شمار شکنیں اس امر کی گواہ تھیں کہ وہ رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی ہے۔

اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اک لمحہ کے لئے کانپنے لگا۔ لیکن دوسرے لمحے اس کی نالی سے اک شعلہ نکلا۔ فضا میں دھمک ایک شور سا پیدا ہو گیا اور اسے ایسا لگا جیسے اک ساتھ کئی عمارتیں گر پڑی ہوں۔ ہلکی سی اک چیخ کے بعد روبی کا بے جان جسم نیچے لڑھک گیا۔ وہ جلدی سے میز کے قریب پہنچ گیا۔ پیڈ کے پہلے ہی صفحے پر ایک نامکمل خط تھا۔ لکھا تھا۔

روٹھے ہوئے ندیم !

"جانتی ہوں تم مجھ سے ناراض ہو کیوں؛ یہ بھی جانتی ہوں لیکن تم صرف اپنی ایک غلط فہمی کا شکار ہو۔ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں اور اسی لئے میں نے تمہیں تھوڑا سا تنگ بھی کیا ہے۔ تاکہ تم محبت اور اعتماد کی قدر کر سکو۔ جاوید صرف میرا کزن ہے اور میرے لئے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

میں جانتی ہوں تم بہت زیادہ ناراض ہو لیکن جب چاندنی میں نہائی ہوئی نہر اور موجوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی تمہیں تنہائی کا احساس دلانے گی جب خاموش فضا تمہیں اداس کرنے گی تو تم فوراً "میرے پاس چلے آؤ گے مجھے لینے اپنی روبی کو لینے اور اس وقت میں مصنوعی غصّہ سے کہونگی ...."

اسکے بعد صرف اسے اتنا یاد ہے کہ اسکی آنکھوں کے سامنے ایک دھندسی چھا گئی تھی اور جب یہ صاف ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو موٹی موٹی سلاخوں کے اندر قید پایا۔ کالی اور بھدی سلاخیں۔ جو بیس سال تک اسکی ساتھی رہیں اسے گھیرے رہیں اور اسکے گرد مستقل طور پر اندھیرے منڈلاتے رہے۔

حضرت تمنا عمادی

ہم دیر سے ہو آئے تھے مسجد سے بھی ہو آئے ۔۔۔ نکلے تھے اُنہیں ڈھونڈھنے اپنے کو بھی کھو آئے

موت آئے، کہ جس کے لئے مرتا ہوں میں، وہ آئے ۔۔۔ اب اُس کا ہوں میں پہلے مرے سامنے جو آئے

ہو جاتی ہے مرنے پہ رقابت بھی محبت ۔۔۔ کل غیر بھی ساتھ ان کے مری قبر پہ رو آئے

ہر روز بھری بزم میں وہ دے مجھے دشنام ۔۔۔ راتوں کو جو جا جا کے مری قبر پہ رو آئے

وہ ایک ہے، اس ایک کا ہے ایک ہی جلوہ ۔۔۔ آنکھوں کی ہے تقصیر نظر تم کو جو دو آئے

دل لے تو چلا اشکوں میں حسرت کا سفینہ ۔۔۔ کشتی ہی کو یہ نوح نہ دریا میں ڈبو آئے

بسمل کا تڑپنا ہے کہ ہوتا ہی نہیں ختم ۔۔۔ تلوار بھی رکھ آئے وہ، اور ہاتھ بھی دھو آئے

خود اپنا اگا لیتا ہے دل تخم سُویدا ۔۔۔ وہ بیج نہیں یہ کہ گئے کھیت میں بو آئے

ہے مرد رہ عشق جو جا کر سر مقتل ۔۔۔ خون جگر آب دم خنجر میں سمو آئے

بھولے نہیں ہم اسکو تو کیا؟ یہ ہمیں بتلاؤ ۔۔۔ ہم یاد کبھی اپنے دل گمشدہ کو آئے؟

کرنے کو چلا ہے در جاناں پہ تیمم ۔۔۔ کہدے یہ کوئی شیخ سے منہ پہلے وہ دھو آئے

کس ناز سے فرماتے ہیں وہ لاش پر آکر ۔۔۔ کہتے تھے، کہ آتے ہی نہیں آپ، تو لو آئے

پہنچے تو تمنا کے یہاں لوگ ہزاروں
جو آئے، وہ کانٹا ہی کلیجے میں چبھو آئے

عطا اللہ عطا

دار کے نزدیک آپہنچے ہیں دیوانے بہت
ہو گئے رُسوا قدِ جاناں کے افسانے بہت

میکدے والوں کو اندازہ نہیں اس بات کا
تشنہ کامی پر مری چھلکے ہیں پیمانے بہت

کیا کریں ایسی محبت کا نہ ہو جس میں وفا
تم اگر اپنے نہیں بنتے تو بیگانے بہت

آرزو سے شوق سے ارماں سے دردِ عشق سے
اس دلِ ویراں میں ہیں آباد کاشانے بہت

دل تمنا آشنا اور ہر تمنا وجہِ غم
زندگی ہے تو ابھی باقی ہیں افسانے بہت

جس طرف انکی نظر اٹھی ادھر دیکھا گئے
اپنے مطلب کے رہے ہشیار، دیوانے بہت

اک دل ویراں ہی اپنا آج تک برباد ہے
ہو چکے ہونے کو یوں آباد ویرانے بہت

یاد ہیں وہ دن بھی مجھکو جن دنوں میرے لئے
شام ہی سے منتظر رہتے تھے میخانے بہت

تھا بہت گہرا تعلق جن سے کل تک اے عطا
وائے قسمت اب وہی اپنے ہیں۔ بیگانے بہت

بسمل سعیدی

پرتوِ حسن ایک ہے اور آئینہ خانے بہت
اک حقیقت نے بنا ڈالے ہیں افسانے بہت

رخصت اے چاک گریباں دشتِ وحشت الوداع
بڑھ چکے ہیں اب جنوں کی حد سے دیوانے بہت

ایک دروازہ اگر توبہ کا ہو جاتا ہے بند
بابِ رحمت بن کے کھل جاتے ہیں میخانے بہت

شمع تربت پر مری آتے ہوئے جلتے ہیں پر
شمعِ محفل پر، تو آجاتے تھے پروانے بہت

کھو نہ جائیں کثرتِ اوہام میں وحدت پرست
بندگی کے ذہن میں ہوتے ہیں بتخانے بہت

عقل نے برباد کر ڈالی ہیں کتنی بستیاں
کر دیئے ہیں عشق نے آباد ویرانے بہت

چھوڑیئے بھی حضرتِ واعظ یہ ذکرِ حشر و نشر
میکشوں نے سن رکھے ہیں ایسے افسانے بہت

دیکھ لے ساقی ذرا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
ہیں دو عالم کو مرے یہ دو ہی پیمانے بہت

بسمل اس دلی کے سنسان ویرانوں میں آہ
گونجتے ہیں آج بھی عبرت کے افسانے بہت

سلیم اللہ فہمی

دل کی تسکین بجز نالہ و فریاد نہیں
ورنہ مقصد گلۂ رنجشِ صیاد نہیں

پہلے شکوہ تھا کہ لطفِ ستم ایجاد نہیں
اب شکایت ہے کہ وہ مائل بیداد نہیں

مضطرب ہوتا ہے تیرے کرم و جوُد سے یہ
کسی صورت بھی سکونِ دلِ ناشاد نہیں

طالبِ دید نے کیا خوب تماشا دیکھا
یعنی کیا دیکھا تھا اتنا بھی اسے یاد نہیں

کیا کروں شیون خاموش سے دم گھٹتا ہے
ورنہ معلوم ہے کچھ حاصل فریاد نہیں

آبلہ پائی سے کانٹوں کی بدولت مجکو
وہ مزا آیا ہے صحرا میں کہ گھر یاد نہیں

شکر احباب کا کس منہ سے بجا لاؤں سلیم
لطف غربت میں وہ آیا کہ وطن یاد نہیں

رعنا اکبر آبادی

جلووں کا جہاں میں کوئی معیار نہیں ہے
جتنا جسے ہم چاہیں وہ اُتنا ہی حسیں ہے

محتاجِ نمائش مرا ایمان نہیں ہے
رخ تیری طرف ہے نہ ترے در پہ جبیں ہے

ہم بھی تمہیں دیکھینگے یہ امید نہیں ہے
تم دیکھ رہے ہو ہمیں اتنا تو یقیں ہے

مرنا ہے تو اک دن مجھے اے خانہ خرابی
ملجائیگی جتنی مرے حصے کی زمیں ہے

دین ہے ہمہ تسلیم تو دنیا ہمہ انکار
اے ذوق طلب کیا یہی دنیا یہی دیں ہے

جس سمت ابھی باغ میں شعلہ سا اٹھا تھا
اس سمت کہیں میرا نشیمن تو نہیں ہے

جینا تو بڑی چیز ہے دنیا میں خوشی سے
انسان کو مرنے کا بھی مقدور نہیں ہے

ہے عقل کا اصرار کہ ہے وہم محبت
کہتی ہے محبت کہ محبت ہی یقیں ہے

فردوس کے دروازہ پہ پہچان لے مجھکو
زاہد یہ وہی رند خرابات نشیں ہے

یہ کون سی منزل ہے محبت کی الٰہی
اب دل کو محبت کا بھی احساس نہیں ہے

سبزے کا بھلا کیا ہوا برسائے جو موتی
اے ابر گہر بار ابھی خشک زمیں ہے

رعنا درِ دل پر کبھی دستک نہیں دیتا
آواز نہ آجائے یہاں کوئی نہیں ہے

ڈاکٹر ابرار احمد خاں چاندپوری

جو تیرا ہو گیا اسکو خیال رنج و راحت کیا
جنوں کو احتیاجِ چارۂ دردِ محبت کیا

نہ ہوں بے چینیاں شامل تو پھر لطفِ محبت کیا
جو ایفا ہو تو وعدہ کیا نکل جائے تو حسرت کیا

یہ مانا اہمیت ہے کچھ شکستِ دل کی بھی لیکن
کسی کے التفاتِ بے نیازانہ کی قیمت کیا

حسینانِ جہاں یوں تو بہت پہلے بھی دیکھے تھے
مگر اس اک نظر نے ڈھائی ہے دل پر قیامت کیا

تمنائے حسین، روحِ بہاراں، جانِ رعنائی
نگاہوں کو ترے جلوے میسّر ہوں تو جنت کیا

بہت ممکن ہے بیتے دن تمہیں بھی یاد آجائیں
نگاہیں تو ملاؤ اسقدر بھی اجنبیت کیا

بجز خونِ تمنا، ضبط گریہ کچھ نہیں ملتا
ستمگاروں کی دنیا میں غریبوں کی محبت کیا

یہ محرومی، یہ محکومی، یہ قید و بند کا عالم
ذرا سی زندگی پر اسقدر جبرِ مشیت کیا

تری اک فکر نے سارے جہاں کے غم بھلا ڈالے
ملی ہیں راحتیں دل کو ترے غم کی بدولت کیا

وہ کیا جانیں، کہ کیونکر نیند اڑ جاتی ہے راتوں کو
ابھی ناواقفِ رسمِ محبت ہیں شکایت کیا

چلے آتے ہیں پرسش کو تو یہ احسان کیا کم ہے
کوئی قاتل بھی آتا ہے کہیں بہر عیادت کیا

ہمیں سمجھاتے سمجھانے چلے ہیں اُن کو سمجھانے
نہ جانے آگئی ہے حضرتِ ناصح کی شامت کیا

بپاسِ خاطرِ عاشق کیا ہے ذبح رک رک کر
نکالا ہے نیا ظالم نے اندازِ مروت کیا

دلِ برباد اس نے کچھ سمجھ کر تو جفا کی تھی
بروئے دوست شکوہ اور گلا ایسی بھی جراءت کیا

سہے ہیں زندگی بھر انتظارِ یار کے صدمے
ہمیں ابرارؔ خوفِ مرگ یا فکرِ قیامت کیا

وفا انتھموی

مکاں سے گذرے، حدِ لامکاں سے گذرے ہیں ـ ہم اوج و رفعتِ ہفت آسماں سے گذرے ہیں

ہر امتیازِ بہار و خزاں سے گذرے ہیں قیودِ رسم و رہِ گلستاں سے گذرے ہیں

کسے بتائیں ہم اپنی حقیقتِ ہستی کسے کہیں کہ کہاں ہیں، کہاں سے گذرے ہیں

ہوئے ہیں لذتِ دشنامِ حسن سے سرشار وہ ہم، کہ قربِ لبِ مہوشاں سے گذرے ہیں

فلک جناب و فضیلت مآب و عرش مقام کہو، کہ منزلِ کنتم نہاں سے گذرے ہیں

نہیں ہے اب مئے خوں رنگ سے ہمیں کچھ کام نیازِ ساقی و رطلِ گراں سے گذرے ہیں

شکستِ رنگ سے آیا شکستِ دل کا یقیں ہم اعتبارِ غمِ دوستاں سے گذرے ہیں

ہمیں بھلا کوئی ترغیبِ کج روی دے گا؟ کہ ہم تو جادۂ رفعت نشاں سے گذرے ہیں

عروجِ فکر و نظر ہے وفاؔ، متاعِ گراں
وہ شئے کہ جس کیلئے کتنے جاں سے گذرے ہیں

شفیق قادری

مری ذات اسکی دلیل ہے کہ جہاں میں عکسِ خدا بھی ہے
ذرا غور سے مجھے دیکھئے کوئی مجھ میں جلوہ نما بھی ہے

یہ خیال میرا غلط ہے کیا کسی ذات کا ہوں میں آئینہ
تو بتا یہ تنگ نظر مجھے کوئی نقش مجھ سا بنا بھی ہے

اسی شرم سے تو نہ اٹھ سکی ترے آستاں سے مری جبیں
کبھی سر کے ساتھ نہ دل جھکے کہیں ایسا سجدہ روا بھی ہے

یہ مرا خلوص تو دیکھنا تجھے آج تک نہ بھلا سکا
تجھے پاسِ اہلِ وفا نہیں مجھے پاسِ اہلِ جفا بھی ہے

مجھے ناز ہے کہ بہک گئے رہِ زندگی میں مرے قدم
تری رحمتوں کا یقیں بھی ہے، تری بندگی کا نشہ بھی ہے

جو شفیق کشتۂ ذوق ہوں مجھے شعر گوئی عزیز ہے
کوئی منصفی سے کہے مگر مری شاعرانہ ادا بھی ہے ؟

صلاح الدین نیّر

تیری الفت نے مرے قلب کو آباد کیا
میں نے ہر سانس میں سو بار تجھے یاد کیا

غالباً پہلی ملاقات میں شرمائے ہوئے
تم نے آنکھوں کی زباں سے بھی کچھ ارشاد کیا

رہ گیا میرا تصور بھی مجسم ہو کر
میں نے جس وقت سلیقے سے تجھے یاد کیا

آپ نے دادِ وفا دی نہ کبھی بھولے سے
پھر بھی کیا ہم نے کبھی شکوۂ بیداد کیا

اب مسرت کے تصور سے بھی جی ڈرتا ہے
ہائے! اک پنجۂ غم نے مجھے آزاد کیا

بھیگی کلیوں کی قسم! رات کی تنہائی میں
بھولنے والے! تجھے ہم نے بہت یاد کیا

ایک دیوانے کو دامن سے چھڑا کر اپنے
اک انوکھا ہی ستم آپ نے ایجاد کیا

ہم تو بربادِ محبت ہیں ہمارا کیا ہے
تم نے اچھا ہی کیا جو ہمیں برباد کیا

ہائے! خوشیوں نے بھی کس وقت صدا دی نیّر
دل کو جب ہم نے غمِ عشق سے آباد کیا

رسالوں میں

قلمکار ڈھاکہ :—

دو سو چوراسی صفحات کا یہ ششماہی رسالہ ادارہ مصنفین پاکستان کے مشرقی حصے کا ترجمان ہے، اس کے ادارے میں عطاء الرحمن جمیل صلاح الدین محمد، ام عمارہ، بانو اختر شہود، اور انور فرہاد جیسے لوگ ہیں، پروفیسر احسن احمد اشک نگراں اور سرور بارہ بنکوی چیف ایڈیٹر ہیں پہلا شمارہ سامنے ہے، اس کے مختصر ترین اداریے ہیں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ "مشرقی پاکستان میں اردو زبان ملک کے دونوں بازوؤں کا ادبی اور تہذیبی سنگم ہے"

ہندوستان اور پاکستان کے اردو رسالوں میں بنگال کے ادیبوں کی چیزیں برابر چھپتی رہی ہیں اور اردو کا ذوق رکھنے والے اس سے واقف ہیں کہ اردو کو بنگال سے یا بنگال کو اردو سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ لیکن زمانہ ایک سیلاب ہی تو ہے۔ اس کا تلاطم آدمی کو اکثر اپنی روایات اور تاریخ سے دور کر دیتا ہے سیلاب میں ہر شخص کے قدم کا جما رہنا (اگر وہ ضروری ساز و سامان سے آراستہ نہ ہو تو) مشکل ہی ہے، پھر تو وہ موجوں ہی کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، کہ جدھر لیجائیں اور جہاں پہونچادیں ۔————

———— یہ اکثر ہوتا ہے اور یہاں بھی ہوا، کچھ لوگوں کے لئے واقعی یہ بات اچنبھے کی ٹھہری کہ بنگال اردو صرف جانتا ہی نہیں اردو کا ادیب بھی ہے ... صورت حال کچھ ایسی ہی تھی کہ مہر نیمروز کو اپنا ایک اداریہ خاص اسی موضوع کے لئے وقف کرنا پڑا۔ اس اداریے کے بعد دوسری قسط اسی قسم کی آئی تھی جس قسم کی ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی اور سید اقبال عظیم کے قلم سے اس شمارے میں شامل ہے، اچھے اچھے مقالات، افسانوں، غزلوں اور نظموں کے علاوہ "مشرقی پاکستان میں اردو شاعری کے تیرہ سال" اور "مشرقی بنگال میں اردو نثر کے تیرہ سال" نہ صرف اچھے اور مفید مضامین ہیں، بلکہ علم و ادب اور تاریخ و تنقید کی ملی جلی کیفیت کی حامل وہ "روشنی" ہیں جن کے ذریعے "بے خبری" کا دھندلکا چھٹے گا، اور باخبری بڑھیگی۔

فہمی صاحب نے اپنے مضمون میں حضرت وحشت مرحوم، شیدا الحسینی، مرزا فقیر محمد، خواجہ محمد اسمٰعیل ذبیح، خواجہ محمد عادل اور ظہور المبارکی، مسعود الحق خضر، حبیب بولائی جیسے خالص بنگالی شعراء کے علاوہ حکیم ناطق لکھنوی، فضل احمد کریم فضلی، ڈاکٹر عندلیب، مولانا تمنا عمادی ماہر فریدی، رحمت اللہ شہاب، فطرت واسطی جیسے ممتاز ادبا و شعراء کا تعارف پیش کیا ہے، اور پھر اقبال عظیم احسن احمد اشک، امیر الاسلام شرقی افسر ماہپوری، جمشید مرزا، عارف بلگرامی، ایشور ڈی، قربان علی عصری، ———— قمر صدیقی مرحوم، اے ڈی اظہر، محمود اکبر آبادی، محمود طرزی، عابد دانا پوری، اسد رضا جعفری، عرش لکھنوی، عطاء الرحمن جمیل، صادق القادری مرحوم، سرور بارہ بنکوی، وفا براہی، عطا اصفی،

اختر پیامی، افضل چھپراوی، حنیف مونگیری، دلیل ناطق، ادیب سہیل، حسن عظیم آبادی، حفیظ فوق، مقبول نقش، یوسف علی لائق، محبوب خزاں، جبار لطیف، اصغر گورکھپوری، نیر کرشمہ، شہباز عندلا، اظہر قادری، ہلال صدیقی، تبسم بارہ بنکوی، قدوس صدیقی، منور فیضی، اختر لشاوری، وحید قیصر ندوی، نظر صدیقی، ارشد کاکوی، اختر لکھنوی، اے ٹی ایس محسن، کلیم سہسرامی، صلاح الدین محمد، شاعر صدیقی، ظفر عمر پیغام، رئیس باغی، شفیع اقبال، حبیب بارہ بنکوی، اعجاز الحق اعجاز، انور فرہاد، ممتاز ذکی، عبدالرحمن بیخود وغیرہ کا تذکرہ خاص طور پر کیا ہے اسی طرح اقبال عظیم نے مشرقی بنگال کی اردو نثر کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ یہاں اردو نثر کی عمر کم و بیش ڈھائی سو سال کی ہے اور پھر قدیم و جدید ان تمام مصنفوں کا تذکرہ کیا ہے جنکی تصنیفات سامنے آئی ہیں اور جنکی اہمیت کسی نہ کسی پہلو سے اردو زبان میں ہے اقبال عظیم کے اس مختصر مضمون کو پڑھ کر بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان نے اردو کی کیسی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔

اخبار الطب کراچی :۔

انجمن ترقی طب کا یہ رسالہ اس مرتبہ دو سو صفحات پر مشتمل، خاص اشاعت کی صورت میں نکلا ہے۔ اور اپنی معنوی سنجیدگی و متانت کے مطابق ظاہری صورت میں بھی سادگی و متانت کا حسن رکھتا ہے، یہ نمبر طبی جدو جہد کی ایک لمبی داستان ہے۔ انجمن ترقی طب کا قیام، صحت کانفرنس، طبی بل اور اسکی تنسیخ، جامعہ شرقیہ طبیہ کی بنا، اور مغربی و مشرقی طب کی کشاکش، ــــ یہ ساری باتیں قوم و ملک کی جسمانی اور فکری صحتمندی سے تعلق رکھتی ہیں، اس نمبر کو دیکھ کر ہمیں وہ زمانہ یاد آگیا جب علامہ اقبال پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے اور قومی زندگی کے مسائل پر ان کی عالمانہ اور محققانہ تقریریں فریب مغرب کے پردے چاک کیا کرتی تھیں، صحت ملکی ہی یہ نہیں انہوں نے یونانی اصول علاج پر بھی تقریر کی تھی اور بڑے انداز سے کہا تھا کہ حکومت برطانیہ یہاں مغربی نظام معالجہ کو رواج دینے پر اتنی مصر ہے تو کیا اس لئے کہ اس سے اہل ملک کو فائدہ پہونچیگا؟ جی نہیں، اہل ملک کا یہ خیال روز بروز پختہ ہوتا جاتا ہے کہ صحت کی بجائے مقصود تجارتی مفاد ہے۔ ورنہ اہل ملک کے حالات اور مزاج کے لئے طب مغرب سے کہیں زیادہ موزوں اور مفید مشرقی طب اور اس کا اصول علاج ہے، مغربی اصول علاج کے حامی یوں کہنے کو جو چاہیں کہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ مغرب کو ابھی مشرقی اصول علاج سے بہت کچھ سیکھنا باقی ہے، اس کے علاوہ ہمارا ملک غریب ہے اس لئے بھی ہمارے یہاں مہنگا علاج کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے، علامہ اقبال نے اور کیا کیا کچھ کیا تھا، وہ تو ان کی تقریروں میں ہے، لیکن اتنا تو آج بھی ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ اس دور میں جبکہ اچھی غذائیں کمیاب، اور صحتیں مضمحل ہی نہیں بلکہ تباہ ہیں، دوسرا بڑا عذاب مسئلۂ علاج ہے۔ اور اس عذاب میں قوم کا غالب ترین حصہ مبتلا ہے، حکیم محمد سعید نے اپنے طویل "حرف آغاز"، میں، جو معنوی طور پر "حرف انجام"، کا بھی حامل ہے، قریب قریب دو درجن صفحات پر اسی نکتے کی عالمانہ اور حقیقت پسندانہ تفصیل پیش کی ہے۔ یہ حرف آغاز شروع سے اخیر تک توجہ سے پڑھنے کی چیز ہے، اس سے بہت سی وہ بنیادی باتیں سامنے آئیں گی جنکو ہم اس طوفانی سطحی دور میں اکثر چھوڑ جاتے ہیں، اور ہمارے غور و فکر کی پرواز بیشتر خلا میں یا کسی پروپگنڈے کے زیر اثر ہوتی ہے اس لئے ہمیشہ ناقص رہتی ہے ــــ اور یہی تو بات ہے۔ ورنہ دنیا کا کوئی پروپگنڈا کبھی کامیاب نہ ہو، ــــ

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۰۳۷

ماہنامہ مہرِ نیمروز کراچی

نومبر ۱۹۶۱ء

ادارہ

رفعت القاسمی ثانی
انیس الرحمٰن

فی پرچہ	پچاس پیسے
سالانہ	چھ روپے
ششماہی	تین روپے

جلد نمبر ۶ —————— شمارہ نمبر ۴

مقامِ اشاعت

ہاؤسنگ یونین ایریا - کراچی ۵

دفتر

۷- کوی روڈ - صدر کراچی ۳

اس شمارے میں

حسن مثنیٰ ندوی ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر ۲۳ بہار یار جنگ سوسائٹی کراچی ۵ سے شائع کیا

آزادیٔ اظہار

آزادی انسان کی سب سے بڑی دولت ہے، اتنی بڑی کہ اس سے محروم ہوجانا خود انسانیت سے محروم ہوجانے کی برابر ہے لیکن آزادی کا مفہوم صرف لغت کی مدد سے یا اپنی سہل انگار طبیعت کے تقاضے سے متعین نہیں کیا جاسکتا۔ لغت کی مدد سے تو حریت و آزادی کا سیدھا سادا مفہوم یہی ہے کہ آدمی جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے، کوئی اس کو روکنے ٹوکنے والا نہ ہو، اور سہل انگار طبیعت بھی یہی چاہتی ہے کہ کسی قسم کی کوئی پابندی اور کوئی قید و بند اس کے سر عائد نہ ہو، لیکن کیا واقعی آزادی کا مفہوم یہی ہے! اک ذرا عملی زندگی میں جا کر اس مفہوم کو منطبق کرنے کی کوشش تو کیجیے۔ پھر دیکھیے کہ قدم قدم پر کتنی پیچیدگیاں کتنی خطرناکیاں اور کتنی ہلاکتیں سامنے آجاتی ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو علم المعاشرہ، علم السیاستہ اور علم دین نے آزادی و حریت کی شرح و تفصیل پہ اتنی جانفشانی سے توجہ صرف نہ کی ہوتی، اور اگر یہ شرح و تفصیل موجود نہ ہوتی تو ہم آزادی اور بے لگامی کے نازک فرق سے آشنا بھی نہ ہوتے

علم معاشرہ ہو یا علم سیاست یا علم دین، سب کے یہاں بنیادی فرق آپ کو یہی ملیگا کہ "انسان فطری طور پر آزاد ہے" ان میں سے کوئی بھی انسان کی فطری آزادی کا منکر نہیں ہے، لیکن یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ ان کے سامنے "انسان" ہے جس کی خصوصی صفت مدنی الطبعی قرار دی گئی ہے۔ اور مدنی الطبعی اور حریت مطلقہ کا ایک ساتھ اجتماع ناممکن، اس لئے آزادی کا مطلب کسی کے یہاں بھی حریت مطلقہ نہیں ہے، حریت مطلقہ کے معنی بے لگامی، اور انارکی کے ہیں، اور انارکی مدنی الطبعی کی قاتل ہے۔ یہاں ہر فرد کی آزادی دوسرے فرد کی آزادی سے بندھی ہوئی مقید اور محدود ہے، یہاں کوئی شخص بھی کسی پہلو سے بے لگام نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے کے پابند ہیں اور اسی صحت مند پابندی کا نام حریت و آزادی ہے، یہاں اس کے حدود و قیود کو توڑنا نہیں بلکہ حدود و قیود کی چار دیواری کی حفاظت کرنا اور ان کے اندر سلیقے سے رہنا حریت پسندی کہلاتا ہے۔ قرآن نے اسی مفہوم کو اپنی زبان میں "تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰه" کی اصطلاح سے واضح کیا ہے کہ جو چاہو کرو، لیکن حدود کے اندر رہ کر، حدود کی چار دیواری کو ڈھانا آزادی و حریت پسندی نہیں، تعدی اور بے لگامی ہے اور بے لگامی انسانیت کش۔

علم دین ہو یا اسکی دوسری شاخیں ——— علم المعاشرہ اور علم السیاستہ ——— آپ کسی کو بھی لے لیں، ان میں سے ہر ایک کا مقصود اچھائیوں کا فروغ اور برائیوں کا استیصال ہے۔ اچھائیوں اور برائیوں میں بڑا نازک فرق ہے، ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

اور اکثر اسی کے سمجھنے میں چوک ہوتی ہے کہ ایک ہی چیز کا استعمال برمحل ہو تو اچھائی اور بے محل ہو تو برائی۔ یہ کیسے ہو جاتا ہے
لیکن ایسی دیدہ وری جو محل و بے محل کی شناخت فوراً کرلے آسانی سے نہیں پیدا ہوتی اس کے لئے بڑی محنت و ریاضت اور مسلسل
تربیت ذہنی و فکری درکار ہوتی ہے۔

دنیا کے ہر بلند مرتبہ علم نے ضروری قرار دیا ہے کہ انسان کی بے لگام انرجی کو لگام دی جائے۔ اسکی لاتعداد و متضاد جبلتوں
کو ہم آہنگی و اعتدال کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ ہموار کیا جائے، حدود و قیود کی چاردیواری میں بند کیا جائے۔ تہذیب نفس اسی کو
کہتے ہیں۔ اور تہذیب نفس کی منزل سے گذرنے کے بعد ہی آدمی انسان بنتا ہے، مہذب کہلاتا ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ بقول غالب

"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

آدمی کے اندرون کا مرتب و منظم اور درست کیا جانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ جو اس کا اندرون ہے وہی اسکی فکر کا سرچشمہ ہے او
یہ فکر ہی ہے جس کے ظہور کی مختلف شکلوں کو ہم حرکات و سکنات اور اعمال و افعال کہتے ہیں، یہ اندرون اگر درست نہ ہو تو آپ صحت
فکر کی توقع آخر کیسے کر سکتے ہیں، اور صحت فکر مشکوک ہو تو پھر آزادیٔ اظہار کا مطالبہ عام اور نعرۂ عام قابل توجہ ہے، ——

ہمارے ملک میں آزادی اظہار سے پہلے "آزادیٔ فکر" کی منزل ہے، پہلے اس منزل کا نظم و انتظام ضروری ہے۔ یہ حقیقت دلوا
میں جاگزیں ہونی چاہئے کہ آزادیٔ فکر کا مفہوم کسی اعتبار سے بھی یہ نہیں ہے کہ آپ جو چاہیں سوچیں اور آپ کا رخش فکر قطعاً بے لگام ہو
کہ بقول غالب:-

ہے رَو میں رخش فکر کہاں دیکھئے تھمے　　　نَے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

آزادیٔ فکر کے بھی یقیناً کچھ حدود ہیں اور ان حدود کے اندر ہی رہ کر رخشِ فکر اور توسنِ ذہانت سے بایں انداز کام لیا
جا سکتا ہے کہ باگ بھی پوری طرح اپنے ہاتھ میں ہو اور پاؤں بھی رکاب میں جمے ہوئے ہوں، ماہر نفسیات ہنری سی لنک نے غلط
نہیں کہا تھا کہ جس طرح دانت کسی چیز کو چبانے کے لئے ملے ہیں، خود اپنے آپ کو چبا ڈالنے کے لئے نہیں، اسی طرح عقل و فکر (ذہن)
بھی سوچنے سمجھنے کے لئے ملے ہیں اس لئے نہیں کہ آدمی انہیں میں ڈوبا ہوا چکر کھاتا رہے، (ذہن برائے زندگی است، نہ زندگی برا
ذہن نیست) پھر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ذہن پیدا نہیں ہوتا بلکہ تربیت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اور شخصیت بھی پیدا نہیں ہوتی بلکہ
مشق و ریاضت سے بنتی اور ابھرتی ہے ——— اور ان دونوں مقاصد کے حصول میں سب سے پہلے اس بات کی تمیز لازمی ہے کہ
ہم جسے اکسپریشن یا سیلف اکسپریشن (SELF EXPRESSION) کہہ رہے ہیں وہ کہیں سیلف انڈلجنس - - -
(SELF INDULGENCE) قسم کی کوئی چیز تو نہیں، زندگی کی ساخت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہاں قدم قدم پر چھوٹی سی
بات بھی آدمی کو سیکھنی پڑتی ہے، آپ دیکھنا، سننا، بولنا اور چلنا تک تو سیکھتے ہیں تو پھر سوچنا اور اس کا اظہار کرنا بھی سیکھنا ہی پڑ
اگر کوئی بات سیکھی نہ گئی ہو تو اس کا اظہار لازماً غیر معقول ہوگا بلکہ غیر معقولیت پیدا کرنے کا موجب بھی، بالغ نظرانہ اور پختہ کارانہ اظہ
اور تخلیقی عمل کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسی کسی راگنی کی، جب تک اس کے سُر تال اور تیور سے آپ پوری طرح باخبر نہ ہوں آپ کی آواز
یقیناً کسی دوسری راگنی میں اتار دیگی، اور ہم فرض بھی کرلیں کہ نہیں آپ کسی کی نقل کرتے ہوئے واقعی اچھی طرح ادا کر سکتے ہیں جب بھی
مستند نہیں ٹھہرے گی۔ "عطائیت" ہی رہے گی، ناقابل اعتماد اور ناقابل استناد، آزادیٔ اظہار درحقیقت اس کے اساسی تکنیک پر ا

قدرت حاصل کرنے سے وابستہ ہے، ورنہ یوں گانے کو تو سبھی گا رہے ہیں، اور بے سرے سے بے سرا آدمی بھی اپنی آواز کو کچھ ایسا ہی یاد کرتا ہے گویا مومن خاں مومن نے اسی کی آواز سن کر یہ شعر کہا تھا ؎

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اور جو لوگ مستند انداز سے گا رہے ہیں وہ بھی بس مستند انداز ہی سے گا رہے ہیں، ان کا ذہنی پس منظر بھی شاذ و نادر ہی مستحکم نظر آتا ہے، شعر و شاعری ہو، افسانہ نگاری ہو، ڈراما نویسی ہو، یا انشا پردازی یہی اظہار کے وسیلے ہیں، اور ان وسیلوں کے ساتھ جو عام طور پر سلوک ہے اور ان فنون کو باقاعدہ حاصل کرنے کا دستور کس قدر ناپید سا ہے، جس سے آپ بے خبر نہیں پھر کیا اظہار ہوگا کس طرح اظہار ہوگا کس بات کا اظہار ہوگا اور اس اظہار سے قوم و ملک کو کیا فائدہ پہونچیگا ہم اسکے سمجھنے سے واقعی قاصر ہیں۔

آزادیٔ اظہار سے مراد اگر لبرازم ہے اور مقصد یہ ہے کہ لبرل مائنڈڈ زیادہ پیدا کئے جائیں تو یہ لبرازم بھی اگر معاشرے اور صحبت مرد معاشرے کے حدود میں رہ کر ظہور نہیں کرتی تو علم النفس کی رائے میں ذہنی انار کی انتشار اور بدنظمی کا سبب ہوگی کسی پہلو سے بھی اسکی حیثیت بے لگامی سے مختلف نہیں ہے۔

کچھ اور دن یہی عالم رہا تو کیا ہوگا

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوچ کرنے والوں نے اپنے قدم تیز کر دیئے ہیں، پروفیسر سید نواب علی، ڈاکٹر سید عبداللہ سید حسن امام وارثی، تمکین کاظمی، مولانا ابوالحسنات قادری، خواجہ دل محمد، ڈاکٹر عبدالحمید قاضی، مفتی محمد حسن جامعہ اشرفیہ، بابا مولوی عبدالحق، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رخصت ہوئے اور۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

کہ ان کے بعد ہی ہادی مچھلی شہری، حاجی لقلق، انتظام اللہ شہابی، اور پروفیسر تاج محمد خیال نے الوداع کہی، یہ تمام لوگ پیچھے کچھ اس انداز سے اٹھے ہیں کہ بچھڑنے کا غم تو تھا ہی، ویرانی مستقبل کے اندیشے سے دل کانپ اٹھا۔

کچھ اور دن یہی عالم رہا تو کیا ہوگا

سائنس سب کچھ کرتی ہے، زمین کے تہ خانے ٹٹولتی ہے۔ آسمان پر کمندیں پھینکتی ہے، چاند اسکی زد میں ہے، وہ مریخ سے آنکھیں لڑاتی ہے، سب کچھ کرتی ہے۔ مگر نہیں کرتی تو یہ ہی نہیں کرتی کہ فرشتۂ مرگ کی راہ بند کر دیتی موت آتی ہے اور اچانک آجاتی ہے، چاہیں کہ چند ہی لمحوں کے لئے سہی اسے ٹال سکتے مگر آئی نہیں ٹلتی۔ دولت و حشمت کی فراوانی اگر کچھ کام آسکتی تو پیر محمد مرحوم جیسے اہل دل کروڑ پتی کو تو روک ہی لیتی جس کے آگے دنیا کی ہر نعمت ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی اور جوانی پر اگر بھروسا ہوتا تو انور زبیری جیسا کرنیل جوان عین جوانی میں داغ مفارقت نہ دے جاتا جسکی یاد آتی ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی انور　　　کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

لیکن آدمی کی یہ تمنائے زلیست کہاں پوری ہوتی ہے، تاہم دکھے ہوئے دلوں کی تڑپ اپنی جگہ، اور قدرت کا قانون رفتار اپنی جگہ۔ اس لئے فکر کی بات یہ نہیں ہے کہ اس بھری محفل سے کون اٹھ گیا۔ فکر کی بات یہ ہے کہ محفل سے اٹھ جانے والوں کی جگہ خالی تو نہیں رہ گئی! ——— پرچم علم و ہنر جو کہیں سرنگوں ہوا تو کوئی دوسرا ہاتھ اس کو سہارا دینے کے لئے آگے بڑھا، بڑھا۔ نہ بڑھا تو مستقبل کو خطرہ ہے اور سخت خطرہ ہے۔

سیّد زاہد علی شاد

ادب اور تخریبی رجحانات

یوں تو کوئی ادب اپنے رجحانات کے لحاظ سے سو فی صدی تعمیری نہیں ہوا کرتا اور نہ اسکے برعکس یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی مخصوص ادب میں محض تخریبی پہلو ہی ہوتے ہیں۔ ایک زندہ متحرک اور ارتقا پذیر ادب میں جہاں اور دوسرے پہلو ہوتے ہیں وہاں تخریبی اور تعمیری پہلو بھی ہوتے ہیں۔ تخریبی اس معنی میں کہ متحرک ادب دوسرے مکاتب فکر کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اسکے خلاف ایک ہنگامی محاذ قائم کر لیتا ہے۔ اور تعمیری اس اعتبار سے کہ متحرک ادب ایک خاص اجتماعی لائحہ عمل (پروگرام) پر اپنی فکری اساس قائم کرتا ہے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ محض تنقید کو تخریب کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ تنقید کے اس نہج کو ہم بلاشبہ تخریبی کہہ سکتے ہیں جب کسی ادب کے محاسن کو اجاگر کرنے کی بجائے اسکے معائب کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے ورنہ یوں معیاری تنقید تخریب نہیں ہوا کرتی۔ دراصل تخریبی رجحانات سے میری مراد وہ "خارجیت" ہے جو جدلی عینیت (DIALECTIC IDEALISM)، جدلی مادیت (DIALECTIC MATERIALISM)، تاریخی مادیت (HISTORICAL MATERIALISM)، تنازع للبقا (STRUGGLE FOR EXISTENCE) اور تحلیل نفسی —— (PSYCHO-ANALYSIS) کے فلسفہ و لغویات اور انکی غیر انتقادی تعبیرات (NON-CRITICAL INTERPRETATION) سے ہمارے ادب میں داخل ہو گئی ہے۔ دراصل ہمارا ادب ایک مخصوص تہذیبی وراثت رکھنے کی وجہ سے غیر مانوس یورپی افکار و تصورات کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا اب میں جو کچھ ہوا وہ دراصل ادب میں خارجیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ آگے سطور میں یورپ کے جن افکار و تصورات کا تذکرہ مقصود ہے انکے دور رس نتائج نہ صرف ہمارے ادب میں ہی رونما ہوئے ہیں بلکہ دنیا کے تقریباً تمام ادبیات نے انکے اثر و رسوخ کو شدت سے محسوس کیا ہے اور انکے منطقی بلکہ عملی نتائج جب جب ظاہر ہوتے رہیں ہمیشہ انہیں خارجیت سے ہی تعبیر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "جدید ادب" کا وہ پہلو جس سے قدیم ادب یا "روایاتی ادب" کا وہ پہلو جس سے قدیم ادب کی شدید داخلیت (OVER SUBJECTIVISM)، نامناسب انفرادیت (IMPROPER INDIVIDUALISM)، غیر معمولی قنوطیت (OVER PESSIMISM) اور "غلط تصوف" پر کاری ضرب لگتی ہے سراہے جانے کے قابل ہے لیکن جب اس کے سلبی اور منفی پہلو کے مقابلہ میں اسکے ایجابی اور مثبتی پہلو پر نظر پڑتی ہے تو داخلیت کی جگہ ایسی خارجیت (OBJECTIVISM) سے سابقہ پڑتا ہے جس سے محض بدیسی مال نئے ہی مراد لئے جا سکتے ہیں انفرادیت کی جگہ ایسی اجتماعیت (COLLECTIVISM) سامنے آتی ہے جو بین الاقوامیت (INTERNATIONALISM) کا دوسرا نام ہے اور جس سے انفرادی تشخص (INDIVIDUAL IDENTITY) اور اسکے احترام کا خاتمہ یقینی ہے۔ قنوطیت کی جگہ ایسی رجائیت (OPTIMISM) جلوہ گر ہوتی ہے جسکا تقاضا قانون، اخلاق اور مذہب سے کامل متناقض ہے۔

سب سے پہلے میں جدلی عینیت کو لیتا ہوں جو دراصل ہیگل کے نظام فکر اور اسکے ارتقا سے بحث کرتی ہے۔ ہیگل کے نزدیک انسانی

تاریخ کا ارتقا محض افکار و تصورات کی جنگ و پیکار سے وابستہ ہے مختلف ادوار میں جتنے بھی انقلابات آئے ہیں وہ نتیجہ ہیں افکار و تصورات کی جدلیت کا۔ جدلی عینیت کا عمل اس طرح شروع ہوتا ہے کہ جب کوئی نظام فکر اپنے نقائص کی وجہ سے انحطاط کی طرف مائل ہوتا ہے تو خود اس نظام فکر سے اسکی ضد پیدا ہو جاتی ہے اور سابقہ نظام فکر کی نفی کرتی ہے پھر اس جنگ اضداد (STRUGGLE OF OPPOSITES) سے ایک نیا نظام فکر پیدا ہوتا ہے جس میں سابق دور تہذیب کے باقیات صالحات (REMAINING VIRTUE) بھی ہوتے ہیں اور موجودہ دور کی اقدار (NEW VALUES) بھی جو آپس کی مصالحت (COMPROMISE) کا نتیجہ ہیں پھر یہ نظام فکر ایک معین مدت تک روح عصر (SPIRIT OF AGE) کے نام سے اس دور انسانی کی مدنیت و تہذیب سیاست و معیشت اور اخلاق و معاشرت سب پر حکمرانی کرتا ہے اور اس طرح جدلی عمل برابر نئے نئے افکار و تصورات کو جنم دیتا ہے۔

جدلی عینیت کے بعد ڈارون کی نئی جبلیت آتی ہے جسکو وہ اپنی اصطلاح میں تنازع للبقا کہتا ہے ہیگل افکار و تصورات کے تاریخی ارتقا کے لئے جدلی عینیت کو محرک قرار دیتا ہے اور ڈارون حیاتیاتی ارتقا (BIOLOGICAL EVOLUTION) کے لئے تنازع للبقا (STRUGGLE FOR EXISTANCE) اور انتخاب طبعی (NATURAL SELECTION) کے اصول کو محرک گردانتا ہے۔ ڈارون کے نزدیک وہی نوع باقی رہتی ہے جو اپنی بقا کے مختلف خارجی احوال (UNFAVOURABLE CONDITION) سے تنازع اور جد و جہد کرتی ہے جسمانی ساخت کے لحاظ سے جن انواع (SPECIES) میں اپنے ماحول سے مطابقت (ADOPTATION TO ENVIRONMENT) پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی فطرت انہیں فنا کر دیتی ہے اور ان کے مقابلہ میں محض ان انواع کا انتخاب کرتی ہے جو اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے عناصر اور ماحول کے موافق ہوں ڈارون کے اس فلسفہ کو تنازع للبقا، انتخاب طبعی اور بقاء اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پھر اسکے بعد جدلی مادیت اور تاریخی مادیت کا فلسفہ سامنے آتا ہے جو اشتراکیت کے بانی کارل مارکس کی ایجاد کردہ ہے۔ کارل مارکس نے ہیگل کے فلسفۂ اضداد (PHILOSOPHY OF OPPOSITES) یا جدلی عینیت کے محض جدلی طریقہ (DIALECTICAL PROCESS) مستعار لیکر اس میں مادیت (MATERIALISM) کا اپنی طرف سے اضافہ کیا تھا اس لئے جدلی مادیت کو مارکسیت (MARXISM) بھی کہتے ہیں۔ مادیت کے اصول کے مطابق معاشرتی زندگی اور تاریخ کا خالص معاشی جائزہ لیا جاتا ہے تو اس طریقہ کو "تاریخی مادیت" کہتے ہیں مارکس کی مادی تاریخ (MATERIALISTIC INTERPRETATION OF HISTORY) یا تاریخی مادیت کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب و عمرانی کا ارتقا اور اسکے تغیرات کا واحد سبب اسباب معیشت کی فراہمی اور اسکی تقسیم ہے۔ جب کسی معاشی نظام میں معاشی پیداوار کی تقسیم میں ناانصافی اور ملکیتی تعلقات (PROPERTY RELATION) میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے تو اس معاشی نظام میں سے نئے مخالف عناصر پیدا ہوتے ہیں جو نئے معاشی نظام کا مطالبہ کرتے ہیں اور بعد میں اسے بدل ڈالتے ہیں یا یوں کہئے کہ نا آسودہ معاشی نظام کا پس ماندہ طبقہ پیداواری قوتوں (FORCES OF PRODUCTION) پر قابض طبقے سے تنازع شروع کر دیتا ہے جسے طبقہ واری تنازع کہا جاتا ہے۔ مارکس کے نزدیک گزشتہ تمام اقدار (SECONDARY VALUES) ہیں۔ اسکی راہ میں حائل ہوتے ہیں تو انہیں بھی مٹا کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ مارکس کے نزدیک گزشتہ نظاموں کی تہ میں دراصل یہی معاشی عوامل (ECONOMIC FACTORS) ہوتے ہیں جو نئے نئے انقلابات کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ مذہب و اخلاق بنیادی چیزیں نہیں ہیں جو بڑے بڑے انقلابات کو جنم دے سکتے ہیں۔

آخر میں سگمنڈ فرائڈ کے نظریۂ جنس سے بحث کرنی ہے جو تحلیل نفسی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تحلیل نفسی دبی ہوئی خواہشات سے جو ذہنی الجھن پیدا ہو جاتی ہے اسکے معلوم کرنے کے طریقے کو کہتے ہیں شعور (CONSCIOUSNESS) تحت الشعور (SUB-CONSCIOUSNESS) لاشعور (UNCONSCIOUSNESS) منطقی شعور (SUPER EGO) شعوری دربان (SENSOR) اور عمل ارتفاع (
دراصل تحلیل نفسی کے طریقے کی مختلف اصطلاحات ہیں۔ فرائڈ اپنے نظریہ کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ انسان کی بہت سی آرزوئیں اور خواہشیں ایسی بھی ہیں جو موجودہ تہذیب و معاشرہ میں پوری نہیں ہوتیں اس لئے دب جاتی ہیں یا دبا دی جاتی ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواہشات ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں مگر درحقیقت یہ ختم نہیں ہوتیں بلکہ لاشعور یا تحت الشعور میں کچھ مدت کے لئے روپوش ہو جاتی ہیں اور بعض محرکات سے پے در پے شعور میں آنے کی کوشش کرتی ہیں مگر منطقی شعور جو ہماری تہذیب و حضارت کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے، انہیں ہمیشہ لاشعور یا تحت الشعور میں ڈھکیل دیتا ہے اس لئے منطقی شعور کو دربان بھی کہتے ہیں۔ یہ تحت الشعوری حیوانی خواہش (جسے جبلی حرکتِ ارادی بھی کہتے ہیں) جب آسانی سے شعور میں داخل نہیں ہو پاتی تو اپنی نکاس کی مختلف صورتیں پیدا کر لیتی ہے اور بھیس بدل کر خواب کی صورت میں آتی ہے جب شعوری دربان سویا ہوتا ہے یا پھر جمالیاتی ذوق ( ) بنکر ہمارے شعور میں ادبیات اور فنون لطیفہ (FINE ARTS) کی صورت میں چھا جاتی ہے۔ ادبیات اور فنون لطیفہ میں جس نہج سے یہ آتی ہے اسے عمل ارتفاع کہتے ہیں۔ عمل ارتفاع کے تحت لاشعوری خواہش کی ایسی صورتیں بھی معلوم کی گئی ہیں جو اپنی جگہ بلند اور پاکیزہ مقصد کے لئے ہوتی ہیں مثلاً حب الوطنی اور سیاسی سرگرمیوں کے پس منظر میں کبھی کبھی جنسی محرکات (SEXUAL MOTIVES) بھی پائے جاتے ہیں۔ ان مندرجہ بالا یورپی افکار و نظریات پر خالص علمی حیثیت سے کسی طرح کی انتقادی نظر ڈالنے کی بجائے محض انکے تخریبی رجحانات کے منطقی نتیجے کی طرف مختصر اشارے پر ہی اکتفا کرونگا جو نہ صرف بین الاقوامی ادبیات کو اپنی زد میں لئے ہوئے ہیں بلکہ ادبیات اور افکار و تصورات کی سرحد سے نکل کر انسانی اعمال و افعال پر بھی مسلط ہیں۔

ہیگل کی جدلی عینیت کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر موجودہ دورِ تہذیب اپنے سابقہ دورِ تہذیب سے بہر نوع افضل ہے۔ سابقہ دورِ تہذیب چونکہ اپنی خامیوں کی وجہ سے ختم ہوا تھا اسلئے موجودہ دورِ تہذیب اپنے اندر نئی مفید اقدار کے ساتھ ان اجزائے صالحہ (GOOD ELEMENTS) پر بھی مشتمل ہے جو کبھی سابقہ دورِ تہذیب میں رہ چکے ہیں۔ گویا رُشد و ہدایت، فوز و فلاح اور خیر و عافیت کے لئے پچھلی تہذیب اور اسکے حصول و مبادی اب ہمارے موجودہ تہذیب کے لئے بیکار محض ہیں اس لئے سابقہ دورِ تہذیب سے اب استفادے کا کوئی موقع نہیں۔ ادب میں جدت و قدامت کی بحث بھی جدلی عینیت سے ہی پیدا ہوئی ہے۔ نیا ادب ہر جدید رجحان کو برسرِ حق تسلیم کرتا رہا ہے۔ ابن الوقتی اور زمانہ سازی کی تحریک کے لئے بھی یہ مہمیز کا کام دیتی ہے۔ اسکے بعد نظریہ ارتقا اور تنازع للبقا کی رو سے انسان کا رشتہ حیوان سے جڑ جاتا ہے اور حیوانیت کو انسان کا وظیفۂ فطری قرار دیا جاتا ہے۔ ڈارون کے نزدیک کائنات کی اس رزم گاہِ حیات میں نزاع، جنگ اور کشمکش ارتقائے حیات کے وسائل ہیں، اس کشمکش میں جو کامیاب ہوتا ہے وہ صالح اور برحق ہے اور جو اپنی کمزوری کی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے وہ غیر صالح ہے اس لئے فطرت کو اسے فنا کر دینا چاہیئے۔ جدید ادب میں فرد، قوم اور ملک کی بالادستی اور برتری کو حق بجانب تسلیم کرنے کا رجحان دراصل تنازع للبقا ہی کی پیداوار ہے۔ پھر مارکس کی تاریخی مادیت کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہماری پوری تاریخ کو محض خود غرضانہ طبقاتی کشمکش کا نتیجہ قرار دے لیا جائے جس میں قانونی ضوابط، اخلاقی حدود اور مذہبی اصول و مبادی کے طبقاتی نزاع کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں۔ مارکس کے نزدیک مذہب و اخلاق کی اگر کوئی حیثیت ہے تو محض اس قدر کہ کسی

بر سرِ اقتدار طبقے کے اپنے مادی مفاد اور اپنی معاشی اغراض کے لئے اسکے اصول و مبادی گھڑ لئے جاتے ہیں ورنہ خیر و شر، حق و ناحق اور ازل و ابد کے لحاظ سے انکا کوئی مستقل وجود نہیں۔ جدید ادب نے سائنس آرٹ اور مذہب و اخلاق کو افیون اور سرمایہ دار طبقے کی پیداوار کہنے کا فیشن بھی اشتراکیت سے ہی سیکھا ہے۔ پھر فرائڈ نے حیوانی خواہش کو شعور و لاشعور کے اصطلاحی فریب سے ایسی اہمیت دے ڈالی کہ گہوارہ کا طفلِ شیر خوار سے لیکر طعیف العمر انسان تک کے لئے اسکی سیادت سے نجات حاصل کرنا مشکل ہوگیا۔ گہوارہ میں اگر بچہ انگوٹھا چوستا ہے تو یہ جنسی فعل ہے، فنون لطیفہ میں اگر جمالیاتی مسرت حاصل کی جاتی ہے تو یہ جنسی فعل ہی کی ایک اعلیٰ قسم ہے، خواب جو دیکھا جاتا ہے وہ جنسی ناآسودگی کی نشاندہی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات حب الوطنی اور سیاسی سرگرمیاں بھی اس نظریہ کی رو سے جنسی فعل کے محرکات قرار دے دی جاتی ہیں۔ دراصل فرائڈ کے جنسی رجحانات ہی تھے جس نے ہمارے ادب میں جنسی بے راہ روی کو شعور کی فلسفیانہ اصطلاح کا نام دے کر اس کو شہرتِ دوام بخشا۔ جنسی بے راہ روی کے فلسفہ نے ہمارے یہاں منٹو، عصمت چغتائی، طاہرہ دیوی شیرازی اور میراجی جیسے ادیب پیدا کئے۔

ہنری سی لنک

مفاسدِ تعلیم

یہ عنوان چونکا دینے والا ہے گویا تعلیم آتنی منزل بہ شئے بھی ہو سکتی ہے لیکن حالی کا مشہور مصرعہ پڑھیئے۔ "وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر"۔ اگر تعلیم کا یہی اثر ہو تو پھر کیا شبہہ کہ وہ بڑی خراب چیز ہے۔ ویسے دنیا میں کوئی چیز بذات خود بری نہیں ہے، ہر چیز خیر ہے اور اس خیر کی نفی ـــــ (NEGATION) کا نام شر ہے یعنی ہر وہ عمل جو اپنے صحیح مقام پر، صحیح وقت میں، صحیح طریقے پر اور صحیح مقدار میں نہ ہو وہ شر ہو جائیگا ـــ اسی لحاظ سے تعلیم بھی شر بن جا سکتی ہے ـــ ہنری سی لنک نے اسی پر روشنی ڈالی ہے، اور وہ چونکہ مشہور و معروف، ور تجربہ کار ماہر نفسیات ہیں اس لئے ان کا یہ مضمون غور سے پڑھنے کا ہے ہم اس مضمون کے آئینے میں اپنی بہت سی اجتماعی بیماریوں کی تصویر دیکھ سکتے ہیں ـ　　(ادارہ)

میرے مشاغل کا تعلق نارمل قسم کے لوگوں سے ہے یا پھر ان لوگوں سے جو نارمل کیفیات سے ابھی اتنے دور نہیں ہوئے کہ پیتھالوجی یا مڈیکل کے حدود میں پہونچ گئے ہوں، جن میں خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی شامل ہے جو خراب جنسی عادات یا دوسرے مسئلہ گنا ہوں میں مبتلا ہیں پھر بھی میں نے اپنے یہاں آنے والوں میں سب سے زیادہ جس "روگ" کو عام پایا، وہ ایک ایسا روگ ہے جس کی طرف بھول کر بھی کسی کا خیال نہیں جاتا ـــــــ یعنی ضرورت سے زیادہ تعلیم اور کلچر کا روگ ـــــــ

رسمی تعلیم کی پرستش، امریکی تاریخ کے نمایاں عجائبات میں سے ایک ہے ۔ ۱۸۸۹ء میں طلبہ کی تعداد جو سارے ملک کے کالجوں میں داخل ہوئے تھے، پچپن ہزار چھ سو ستاسی تھی ۔ ۱۹۳۸ء میں یہ تعداد تیرہ لاکھ چھیالیس ہزار آٹھ سو چھپن تک پہونچ گئی، بلفظ دیگر چوبیس گنا اضافہ ہوا ۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ممالک متحدہ کے تمام بچوں کی ایک تہائی تعداد نے ہائی اسکول کی جزوی یا مکمل تعلیم پائی تھی جو ۱۹۳۶ء میں یہ تناسب دو تہائی تک پہونچ گیا ۔ اور جنگ کے زمانے تک اضافے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی ۔ ہائی اسکول کی تعداد میں بھی اور کالجوں کی تعداد میں بھی ـــــ اضافے کی یہ رفتار ایک تو فطری تھی، دوسرے سماجی اور معاشی اصلاحات کی بعض تحریکوں نے بھی اس کو بہت بڑھایا ۔ اور اب تو گویا عام طور پر یہ ایک طے شدہ نصب العین ہے کہ ہر بچے کو کالج کی یا اس مرتبے کی کوئی تعلیم ضرور ملنی چاہیئے ۔

اس ہمہ گیر تعلیم کا مقصد تو یہ ہے کہ فرد کی صلاحیتیں نشوونما پائیں اور وہ زندگی کے لئے تیار ہو جائے ۔ لیکن ماہرین نفسیات نے گذشتہ پانچ برس کے دوران جو چھان بین کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گریڈ اسکول سے اوپر کی رسمی تعلیم شخصیت یا کیرکٹر کی اصلاح

و ترقی میں کچھ مفید نہیں، یا اگر ہے بھی تو بہت کم، چنانچہ اس سلسلے میں خاص خاص باتیں جو ظاہر ہوئیں وہ یہ ہیں۔

(۱) "جو لوگ عملاً کسی تعلیم کے حامل نہ تھے ان کے اندر بھی شخصی امتیازات (PERSONALITY TRAITS) ویسے ہی تھے جیسے کالج کے گریجویٹ اپنے اندر رکھتے تھے"۔

(۲) "ہائی اسکول یا کالج کے غریب طلبہ کے اندر بھی شخصی امتیازات اتنے ہی بلند تھے جتنے خوشحال طلبہ کے اندر ہوتے ہیں"۔

(۳) "جن لوگوں کی علمی ذہانت، استعداد عالمانہ کی میزان (SCHOLASTIC CAPACITY TESTS) پر انتہائی معیاری قرار پائی وہ بس ایسے ہی تھے کہ ان کے شخصی امتیازات تھرسٹن پرسنلٹی شیڈول، روٹس ایکسٹروورشن اینڈ انٹروورشن، آل پورٹس اے ایس ری ایکشن اسٹڈی، بیمن ریوٹرس پرسنلٹی انونٹری، اور خود میرے طریقے "پرسنلٹی کوشنٹ ٹسٹس" (پی کیو) پر جانچے گئے تو "کمترین" نہ نکلے۔ اسی طرح جو لوگ ذہانت کی جانچ میں سب سے کم آئے، وہ بھی بس ایسے تھے کہ شخصیت کی امتیازی خصوصیات میں "بلند ترین" درجہ نہیں پاتے"۔

(۴) "اگرچہ بعض کی شخصیت نے ہائی اسکول یا کالج کے زمانے میں ترقی کی لیکن بعض طلبہ کی شخصیت گر بھی گئی اور اس قدر کہ صفر تک پہونچ گئی، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ شخصیت کی اوسطاً کوئی ترقی تعلیم کی وجہ سے نہیں ہوئی"۔

اس سلسلے میں ایک اور بہت گہرا اور ہمہ گیر مطالعہ وہ بھی ہے جس میں دس ہزار افراد کا معائنہ ایک ساتھ کیا گیا تھا۔ یہ معائنہ ادارۂ تطبیق (ADJUSTMENT SERVICE) کی طرف سے ہوا تھا۔ یہ افراد جب اپنی اپنی تعلیم کے علاوہ شخصیت کی بعض ان خصوصیات و آثار کے مطابق جو امتحان کے وقت ان سے ظاہر ہوئے تھے، الگ الگ حلقوں میں تقسیم کئے گئے، تو معلوم ہوا کہ کالج کے طلبہ کسی اہم پہلو سے بھی، ہائی اسکول کے طلبہ سے برتر نہ نکلے۔ نہ ہائی اسکول کے طلبہ گریڈ اسکول کے طلبہ سے برتر نظر آئے۔ شخصیت کی امتیازی خصوصیات و آثار کی جانچ کا نتیجہ تو یہی نکلا۔

نفسیات کے پورے دائرے میں کہیں بھی ایسے شواہد موجود نہیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ موجودہ اعلیٰ تعلیم کی موجودہ صورت شکل کسی اعتبار سے بھی شخصیت و کردار کی نشو و نما میں کوئی قطعی حصہ رکھتی ہے۔ اس کے برخلاف شواہد کا زور دار افزوں ذخیرہ، یہ البتہ موجود ہے کہ اس تعلیم سے شخصیت نے کوئی قابل توجہ ترقی نہیں پائی۔ بلکہ اچھے خاصے شواہد اس کے ملیں گے کہ اکثر نتائج الٹے رونما ہو رہے ہیں اور رسمی تعلیم کی یہ طوالت شخصیت کو بگاڑ رہی ہے۔

یہ انکشافات آپ کو بڑے انقلاب انگیز سے معلوم ہوں گے لیکن ان سے تصدیق بہرحال ان تمام باتوں کی ہوتی ہے جن کا علم اکثر کارخانہ داروں کو، والدین کو، اور بعض ارباب تعلیم کو بھی ذاتی تجربے سے ہو چکا ہے۔ شروع شروع میں کارخانہ داروں کا یہ حال تھا کہ وہ کالج کے گریجویٹوں کو ملازم رکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے اور ٹوٹ ٹوٹ کے گرتے تھے۔ مگر اب وہ بات بالکل نہیں رہی۔ اب تو وہ ان کے انتخاب کے موقع پر تعلیم سے زیادہ ان کی دوسری سرگرمیوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے تعلقات دوسرے طلبہ کے ساتھ کیسے رہے، یہ نہیں دیکھتے کہ پروفیسروں سے روابط قائم کرنے میں انہوں نے کتنی کامیابی حاصل کی۔

اسپیکر کینن سے جب ایک مرتبہ کسی انڈر گریجویٹ نے یہ پوچھا کہ اعلیٰ تعلیم کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے۔ تو انہوں نے

جواب میں کہا تھا کہ میرا خیال تو یہ ہے کہ کالج کی تعلیم اوسط درجے کا ذہن و فکر رکھنے والے نوجوانوں کو زیادہ نقصان نہیں پہونچا سکتی ہے۔ اس جواب کا بڑا شہرہ ہوا تھا لہٰذا کالج کی تعلیم کے بارے میں یہ خیال صرف اسپیکر کینن ہی کا نہیں بلکہ ارباب فکر و نظر کی ایک خاصی تعداد اسی قسم کے خیالات رکھتی ہے۔ تاہم ان خیالات کی اہمیت محدود رہی، مگر جب سائنٹفک ٹسٹس یا وہ جانچ پڑتال جو سائنٹفک تیقنات کا درجہ رکھتی ہے، وہ بھی انہیں ارباب فکر و نظر کی تصدیق کرتی ہو تو پھر انتہائی سنجیدگی اور فکر مندی کا مقام آجاتا ہے۔ ان باتوں کا علم جتنا عام ہوگا اور حقیقت حال جتنی زیادہ محسوس کی جائے گی اتنی ہی جلد ہماری تعلیم کی ان روایات میں جو نسبتہً ماڈرن ہیں، وہ انقلاب برپا ہو کر رہے گا جس کی طرف آنکھیں ایک مدت سے لگی ہوئی ہیں ہمارے روایتی ارباب تعلیم اس حقیقت کو محسوس کریں یا نہ کریں ہسی سی کیمپ " C.C.C. CAMPS کا وجود امریکی تعلیم میں انقلاب کے اولین اہم مرحلے کا نقیب ہے۔

مفاسد تعلیم کا جو تجربہ مجھ کو ہوا ہے اس کی حیثیت کسی انوکھے واقعے کی ہرگز نہیں ہے، بلکہ وہ درس صورت حال کے واضح آثار و علامات ہیں۔ تعلیم جس میکانیکی ترکیب سے شخصیت کو کچلتی یا تباہ کر دیتی ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے کیجئے۔ ایک واقعہ تو اپنی نوعیت کے لحاظ سے انتہا کو پہونچا ہوا ہے۔ البتہ دوسرا واقعہ معمولی ہے۔

یہ واقعہ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے انتہا کو پہونچا ہوا ہے۔ ایک ۴۹ سالہ مرد کا ہے۔ یہ شخص ایک کیمیکل انجینئر تھا، اور اپنے پیشے سے بددل و بے حوصلہ ہو کر اس توقع کے ساتھ میرے پاس آیا تھا کہ میں کچھ اس کی مدد کرونگا اور وہ میری مدد کے سہارے کسی نئے مشغلے میں لگنے کا فیصلہ کرسکے گا۔ یہ شخص ملک کے ایک اعلیٰ انجینئرنگ اسکول کا سند یافتہ تھا۔ ذہانت کی شاندار اسکالرشپ حاصل کرنے کے بعد دو سال ایم اے کی تعلیم بھی پائی تھی، اس کے بعد جرمنی کی ایک اعلیٰ یونیورسٹی میں بھی تین سال رہ کر کیمسٹری کے ایک نہایت ہی دقیق موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، واپس آیا تو فولاد سازی کے ایک بڑے کارخانے کی ریسرچ لیبوریٹری میں اس کا تقرر ہوا۔ مگر سال ختم ہوتے ہوتے اس سے کہا گیا کہ اپنے عہدے سے استعفا دیکر رخصت ہو جاؤ۔ اور سبب یہ بتایا گیا کہ تکنکل آلات و ادوات کی تیاری و ترتیب میں جیسی ذہانت و مہارت درکار ہے وہ تم میں نہیں پائی جاتی۔ اس شخص نے خود بھی اس کا اعتراف کیا کہ یہ اعتراض درست تھا، وہ کہتا تھا کہ میری راہ میں یہ ایک بڑا پہاڑ ہے، اور آئندہ میں اپنے فنی حلقے میں جہاں بھی کوشش کرونگا خواہ وہ تعلیمی ہی خدمت کیوں نہ ہو، یہ پہاڑ ہمیشہ حائل رہے گا اور میں کبھی عبور نہ کرسکونگا لہٰذا آپ توجہ کرکے میری کسی دوسری استعداد طبعی کی نشاندہی فرما دیجیے جو شائد کسی اور مشغلے میں کارآمد ثابت ہو اور میں کچھ کرسکوں، اس کا اپنا خیال یہ تھا کہ نفسیات کا میدان اس کے لئے موزوں رہے گا۔

یہ شکست خوردگی اور یاس و قنوطی کی ایک دردناک داستان تھی، اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ زندگی کے حقائق سے اس کا تعلق ایک عرصہ دراز تک منقطع رہا۔ ورنہ آزمائشوں (TESTS) سے تو یہی ظاہر ہوا کہ میکنیکل کاموں کی صلاحیت کم از کم اوسط درجے کی تو ضرور اس کے اندر موجود تھی، اور وہ اگر توجہ کرتا تو کسی محنت کی طرف میلان نہ رکھنے کے باوجود وہ کسی نہ کسی کام میں لگ کے اپنی اس صلاحیت کو بہت پہلے بڑھا چکا ہوتا۔ لیکن اس نے تن آسانی کو راہ دی۔ وہ زیادہ سے زیادہ نظریات کے حصول میں ڈوبا رہا کیونکہ وہ نظریہ پسند تھا اور ان نظریات کو عملی جامہ پہنانے سے حتی الامکان دامن بچاتا رہا کیونکہ وہ عمل پسند نہ تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تعلیم کے بارآور ہونے کا وقت آیا تو وہ بےبس ہو کر رہ گیا۔ آدمی وہ خاصہ وجیہہ تھا اور ظاہری طور پر اسکی

شخصیت بھی خوشگوار تھی، لیکن خود اعتمادی نہ تھی۔ قوت عمل مفقود اور قوت فیصلہ غائب تھی اخفی عادتیں (COVERT HABITS) بھی اس میں پیدا ہو گئی تھیں، اسکی شخصیت اور اسکی صلاحیتوں کو برسوں کی لمبی تعلیم نے اور حصول علم کی جبری مشقت نے بری طرح پامال اور خستہ و تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

دوسرا واقعہ جس شخص کا ہے وہ نسبتہً زیادہ خوش نصیب تھا، مگر اس کا بھی حشر ایک دن ایسا ہی ہونے والا تھا، تازہ تازہ کالج سے نکلا ہوا نوجوان تھا، اور اگرچہ موقع تو یہ تھا کہ اپنے لئے کسی طرز معیشت اور کام کاج کا انتخاب کرتا اور لگ رہتا، لیکن وہ مشرقی علاقے میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ ایک یونیورسٹی میں جرنلزم کے، اور دوسری یونیورسٹی میں ڈرامیٹک تعلیم کے اور تیسری یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی کے امکانات کیا کیا ہیں، اس کا گھرانا اتنا خوشحال تو یقیناً تھا کہ وہ دو تین سال تک اور اسے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کی اجازت بخوشی دے سکتا تھا۔

معلوم ہوا کہ اس کا باپ ایک ٹھیٹ کاروباری آدمی تھا۔ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا فوراً کسی کام پر لگ جائے مگر ماں علمی قسم کی عورت تھی، وہ چاہتی تھی کہ اس کا لڑکا کوئی علمی مشغلہ اختیار کرے اور یوں ایک طرف ماں کا اور دوسری طرف خود اپنی تعلیم کا اتنا شدید اثر اس لڑکے پر تھا کہ صبح و شام کی اس مادی دنیا کی طرف سے ایک بیزاری اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ اس نے خود مجھ سے یہ کہا کہ "مجھے تو فکر اس کی ہے کہ زندگی کے بلند تر تہذیبی و ثقافتی اقدار کو حاصل کروں اور ان سے بہرہ اندوز ہو سکوں، پیسے کی خاطر میں کسی ادھیڑ بن میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مالی اعتبار سے بڑا آدمی بننے کی فکر مجھے نہیں ہے، میرا محبوب سبجکٹ انگلش ہے۔ میں نے کچھ چیزیں لکھی بھی ہیں، لیکن چھپنے کے لئے نہیں، میں ڈرامیٹکس پسند کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے معلمی کا پیشہ اختیار کرنا چاہئے یا جرنلزم سیکھنی چاہئے یا پھر ڈراما نویسی میں لگ جاؤں ورنہ گلا گھونٹنے والی اس کاروباری زندگی کی جان لیوا چکی پر ثقافتی مفاد کو قربان کرنے کا تو تصور تک میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔"

نفسیاتی جانچ سے معلوم ہوا کہ اس شخص کی علمی صلاحیت بس اوسط ہی درجے کی تھی، گو انگلش کا فطری ذوق بھی اسے کچھ تھا اور جرنلزم میں بھی کچھ توقعات روشن نظر آتی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ نمایاں چیز اسکی مذبذب اور ڈھیلی ڈھالی شخصیت تھی، وہ بڑا قبول صورت لڑکا تھا اور اس کے انداز و اطوار بھی بہت عمدہ تھے، لیکن کوئی چمک، کوئی سرجوشی، کوئی قوت عمل اس کے اندر نہیں تھی۔ اس کے تخیلات بھی غبار آلود اور مبہم تھے، حتیٰ کہ اس کی گفتگو بھی شکستہ تھی،

تہذیب و ثقافت کی جو طلب اور تمنا اس کے دل میں تھی، اسکی حوصلہ شکنی تو میں نے نہیں کی، بلکہ جرنلزم کے امکانات پر جو اسے یقین سا تھا اس کو اور میں نے سہارا دیا حوصلہ افزائی کی مگر اپنی پوری قوت کے ساتھ یہ تاکید بھی ضرور کی کہ سب سے پہلے کوئی ملازمت کر لو ـــــ ممکن ہو تو کسی رسالے میں کر لو، یا کسی اخبار میں یا کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں، کسی قسم کی بھی ملازمت ہو، مگر ہو ضرور، میں نے یہ بات اس کے ذہن نشین کرائی تھی ـــــ جو خود اسے بھی نظر آتی تھی ـــــ کہ تمہاری شخصیت اسفنجی ہو گئی ہے، اگر تم نے اپنی تعلیم جاری رکھی تو سراپا اسفنج ہو کر رہ جاؤ گے۔ لہٰذا اس وقت ضرورت تمہیں اسکی ہے کہ کشمکش میں چپٹنے کی قوت اپنے اندر پیدا کرو، یا ساتھی زندگی کے دباؤ کے تحت، اپنی توانائیوں کو ٹھوس اور مشہود کی صورتوں میں ڈھالنے کی عادت ڈالو، اس قسم کی کچھ عادتیں جب تمہارے اندر پیدا ہو جائیں تو پھر جرنلزم کی تعلیم بھی مفید ہو

ر ایسے عنوان بھی تم کو ملیں گے کہ ان پر کچھ لکھ سکو،

تقریباً چھ ماہ بعد وہ پھر میرے پاس آیا اور اس اطلاع کے ساتھ آیا کہ میں نے ایک رسالے میں نوکری کر لی ہے
رجب سے برابر وہاں کام کر رہا ہوں" اور اس خبر کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ میں اپنی زندگی میں کبھی اتنا مسرور نہیں رہا تھا
نا اب ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کوئی بڑی ملازمت یا بڑا کام نہیں ہے۔ لیکن یہاں رہ کر میں لوگوں کے اور کاموں کے
لق وہ کچھ سیکھ رہا ہوں جس کی مجھے خبر تک پہلے نہ تھی۔ زیادہ تر میرا وقت کاغذات میں کلپ لگانے اور مضامین کو چپکانے
ں گذرتا ہے۔ اور اس کام کی یکسانی سے طبیعت الجھنے بھی لگتی ہے، مگر جب کبھی الجھتی ہے فوراً آپ کی باتیں یاد آجاتی ہیں کہ
بس کام کام، کوئی سا بھی کام ہو اگارے کی ٹوکری ہی ڈھونے کا کام کیوں نہ ہو، ہرکارے اور چپراسی ہی کی خدمت کیوں نہ
، پارسل ہی بھیجنے کی ڈیوٹی کیوں نہ ہو، مگر کچھ ہو ضرور ... اس سے تم کو وہ فوائد پہونچیں گے جن کی تمہیں ضرورت ہے " میرا موجودہ کام تو ان
اوں سے بہتر ہی ہے، اور یقیناً اس کی بدولت میرے نقطۂ نظر میں زیادہ صفائی ستھرائی اور خوشگواری پیدا ہو گئی ہے، اور میں اب
ے جاڑوں میں جرنلزم کی شعبۂ تعلیم بھی شروع کرنے والا ہوں "

اس لڑکے کے چہرے بشرے میں اور انداز و اطوار میں جو تبدیلی پیدا ہوئی وہ حیرت انگیز تھی، اب وہ بڑا پر جوش و گرمجوش ہو گیا تھا۔
کی گفتگو میں بھی روانی آگئی تھی اور روانی کے ساتھ اعتماد و یقین کے تیور بھی خود اعتمادی و مقصدیت کی چمک سے اس کا چہرہ منور تھا
کی توانائیوں نے بیرون کی طرف مڑ کر اپنا فطری ظہور شروع کر دیا تھا،

نفسیاتی جانچ پڑتال سے جس میلان و رجحان اور صلاحیت و استعداد کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس کی بنا پر ایک تعلیمی نقشہ مرتب کر کے
ی میں نے بہتیرے نوجوانوں کی دستگیری کی ہے، اور دوسری طرف سینکڑوں ایسے بھی تھے جو نہ جانے کتنے منصوبے اپنے دماغوں میں
لے پھرتے تھے۔ مگر میں نے ان کو روک دیا اور ان کی سخت حوصلہ شکنی ... تو قریب قریب ہمیشہ ہی کی کیونکہ ان کی شخصیتیں اخذ و جذب
اور لپیٹ سمیٹ کے اس تسلسل کو سنبھال نہ سکتی تھیں، ان کو ضرورت کتابوں کے اوراق میں بسنے والے لوگوں سے نہیں بلکہ چلتے پھرتے
اور گوشت پوست والے زندہ لوگوں سے ربط ضبط پیدا کرنے کی تھی، ضرورت اس کی تھی کہ جو نظریات وہ اپنے دماغوں میں لئے پھرتے تھے
ان کو جانچیں پرکھیں، آزمائیں بھی، نہ یہ کہ اور نئے نئے نظریات اپنے دماغوں میں بھرتے رہیں، تلاش علم کی دھن میں ڈوبے رہنے کی بجائے
ان کو ضرورت اس کی تھی کہ جو علم وہ حاصل کر چکے تھے اس کو اچھی زندگی بسر کرنے کی عملی جد و جہد میں صرف کریں۔ ضرورت اس کی تھی کہ اپنی اس
"اسفنجیت" (انجذابیت) (SPONGING) کو ختم کریں جو مستقل عذاب بنتی جا رہی تھی، وہ کچھ تخلیقی کام میں بھی لگیں ان کی صفت زرخیزی
بار آوری ظہور میں بھی آئے مگر اس کو تو انہوں نے بری طرح نذر عذر و خوف کی نذر کر رکھا تھا۔

تعلیم کے مضرت رساں اثرات کے سلسلے میں ماہرین نفسیات نے جو انکشافات کئے ہیں ان کی وضاحت کے شواہد بے شمار
ہیں۔ خود میری فائلوں میں سو سے اوپر مجموعے ان مشہور و ممتاز ارباب تعلیم اور گروپ کے بیانات پر مشتمل موجود ہیں جو تعلیم کی ضروری
چھان بین کے لئے متعین کئے گئے تھے یہ بیانات ہمارے موجودہ نظام تعلیم کے نقائص کی دستاویزیں ہیں۔ مگر میں یہاں اپنی گفتگو کو
صرف انہیں اسباب و علل کے تذکرے تک محدود رکھوں گا جو میرے اپنے تجربات میں سامنے آئے ہیں اور ساتھ ہی دوسرے
ماہرین نفسیات کی چھان بین کے نتائج بھی درج کروں گا۔

ایک مؤثر شخصیت کی نشو و نما کا زینہ دراصل آفاقی عادات اختیار کرنے کی ترتیب کا دوسرا نام ہے۔ اس میں وہ تمام مہارتیں اور ذہانتیں حاصل کرنی پڑتی ہیں جو آدمی کی توانائیوں کا رخ ایک تدریج کے ساتھ سودمند اور سکون بخش راستوں پر لگاتی جاتی ہیں۔ بچہ انتہائی خرّاچ (CONSUMER) ہوتا ہے، یہ جتنا پیدا کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ صرف، یا ہضم کرتا ہے، اور مؤثر شخصیت کے لئے لازمی ہے کہ بنیادی طور پر تخلیقی ہو یعنی جتنا صرف کرے اس سے زیادہ پیدا کرے۔ بلفظ دیگر مؤثر شخص میں ایسی مہارتوں اور ذہانتوں کا حصہ غالب تر ہونا چاہئے جو دوسروں کے لئے مسرت بخش و مفید پہلے ہوں اور اپنے لئے موجب تسکین بعد میں، یعنی اپنی تسکین کا امر ثانوی ہو۔ دنیا اپنے آپ کو بچے کے سپرد کر دیتی ہے لیکن شخصیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے تئیں دنیا کے سپرد کر دے۔

اگرچہ تعلیم بھی بہت سی پسندیدہ اور آفاقی عادات و خصائل کی پرورش میں مدد دیتی ہے لیکن اصلاً اسکی حیثیت عرصۂ جذب و اخذ (PERIOD OF ABSORPTION) ہی کی ہے۔ زمانۂ تعلیم میں جن عادات کی پرورش سب سے زیادہ ہوتی ہے وہ سننے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی عادات ہیں، لہٰذا یہ صورت جتنے زیادہ عرصے تک جاری رہے گی اتنی ہی زیادہ اخذ و جذب کی عادتیں مستحکم اور وسیع ہوتی جائیں گی۔ اخذ و جذب کی یہ عادتیں ہائی اسکول، کالج، پوسٹ گریجویٹ، اور توسیعی نصابوں (EXTENSION COURSES) کے ذریعے جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہیں ویسے ویسے تخلیقی صلاحیتیں اکثر گھٹتی یا مرجھاتی چلی جاتی ہیں۔ ایک آدمی زیادہ سیکھنے زیادہ پڑھنے، زیادہ سننے پر جس رفتار سے آمادہ ہوتا جائے گا اسی رفتار سے عمل بھی بنتا جائیگا۔ اخذ و جذب کی یہ نفسی عادتیں اتنی زیادہ غالب ہو جاتی ہیں کہ گریجویشن کے بعد اکثر طالب علم کے ذہن میں کوئی تصور تک باقی نہیں رہتا کہ اب دوسرا قدم اسے کون سا اٹھانا ہے۔ میرے مریضوں میں سے ایک اور مریض نے، جو ہمارے ایک عظیم الشان شرقی کالج کا انڈر گریجویٹ تھا، مجھ سے یہاں تک کہا کہ کسی بڑے (سینئر) طالب علم سے یہ پوچھنا برا سمجھا جاتا ہے کہ تم سند حاصل کرنے کے بعد کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ طلبہ اگر کوئی مشغلہ اپنے ذہن میں رکھتے بھی ہیں تو ان کو اپنے کام کی بالکل ابتدائی عادتیں اختیار کرتے کرتے بھی اکثر برسوں کی مدت بیت جاتی ہے۔

میرے تجربے میں جتنے واقعات آئے ہیں ان میں سے اکثر میں اخذ و جذب اور انہماک کی عادتیں گویا فساد کی حد تک پہونچ گئی تھیں۔ مسلسل تعلیم کا فساد، کلچر کا فساد، انٹلکچوئل لائف کا فساد ——— جو مؤثر، مفید اور تخلیقی شخصیتوں کے نشو و نما میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ (بلکہ تعلیم زدہ) اور بے اثر شخصیت کی عام علامتوں میں ایک علامت یہ بھی ہے کہ لوگ نفسیات سے دلچسپی لینے لگتے ہیں یا ایسی کتابوں کے شوقین ہو جاتے ہیں جنکو وہ اپنے خیال میں نفسیات کی ترجمان سمجھتے ہیں چونکہ ایسے شخص کی توانائیوں کا پہیہ اپنے ہی گرد چکر کھاتا رہتا ہے۔ لہٰذا اس کو دلچسپی صرف انہیں چیزوں کے سیکھنے سے پیدا ہو جاتی ہے جو پہیے کو چکر دیتی رہتی ہیں، یہ خاص الفسی ذہنیت ہے، ورنہ ایک آفاقی شخص جو اپنے آپ میں گم نہیں رہتا، یا وہ شخص جو مطلوبہ ذہانتوں کا مالک ہے، نفسیات کا مطالعہ نہیں کرتا، ان کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے جو عادتیں اچھی اور مستحکم سمجھی جاتی ہیں وہ نفسیات کی کتابیں پڑھ کر اتنی ہی پیدا ہو سکتی ہیں جتنی گالف کی مشق گالف کی کوئی کتاب پڑھ کر حاصل ہو سکتی ہے یا تیراکی کی کوئی کتاب پڑھ کر آدمی تیرنے کا کمال حاصل کر سکتا ہے۔ میں نے شاید ایک ہزار سے بھی زیادہ آدمیوں کو نفسیات کی کتابوں کی طرف اس قدر لپکنے سے بڑی سختی سے روکا ہے۔ بہت سے لوگ اس کثرت سے جو نفسیات کی کتابیں پڑھتے ہیں تو اس کا سبب اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جس کی وجہ سے وہ تشریح الابدان (ANATOMY) اور طبی کتابیں (MEDICINE) پڑھا کرتے ہیں، یہ دونوں عادتیں مالیخولیا (HYPOCHONDRIACS) پیدا کر دیتے۔

کی موجب بھی ہوتی ہیں بلکہ تعلیم کی زیادتی (تعلیمی استسقا) اور جذب و انہماک کی مبالغہ آمیز عادات کی علامت بھی ہیں۔

زمانۂ تعلیم گویا ایک طرح کی نرسنگ اور پرورش و پرداخت کا زمانہ ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ مفید اور کارآمد زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں لیکن نرسنگ کی یہ مدت روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، اور اس مدت میں بچوں کو اصلی اور عملی زندگی کے بہاؤ سے دور رکھا جاتا ہے عملی زندگی کے حقائق سے آدمی جتنی زیادہ مدت تک بچا بچا کے رکھا جائے گا وقت آنے پر اتنی ہی کم قابلیت ان حقائق سے نمٹنے کی اس کے اندر ہوگی، وہ گھنٹے، وہ ڈسپلن اور پڑھائی لکھائی کے کاموں کا وہ ہجوم جو اسکولوں میں ہوتا ہے یہ سب عملی زندگی میں آنے کی تیاریوں سے زیادہ زندگی سے بے نیازی جذب پنی کے ترجمان ہیں، بہکتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اسکولوں کے ڈھیلے ڈھالے اور پست معیار نے (جو لازمی نتیجہ ہے اس قدر بچوں کو بھرنے اور پھر کھیپ کی کھیپ نکالنے کا) ان صاحب صلاحیت بچوں کے لئے بھی جو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے تھے تعلیم کو ایک طرح کی پکنک بنا رکھا ہے۔

تعلیم کے معیار کا اس بنا پر پست ہو جانا کہ کسی اسکول یا کالج کے مقررہ زمانۂ تعلیم میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں لڑکے پاس کئے جائیں ایک بدنام و رسوا حقیقت ہے، مضامین (SUBJECTS) کے لینے ہی میں نہیں بلکہ ان مضامین کو برتنے میں بھی ادنیٰ ترین طبقہ تک برابر قدم سے قدم ملائے چلے جا رہے ہیں، ریاضیات اور ریاضیاتی علوم میں خصوصیت کے ساتھ سب سے زیادہ سہل انگاری کو راہ ملی ہے۔ حالانکہ یہی وہ مضامین و موضوعات ہیں جو ماہرین نفسیات کے نزدیک شخصیت کی تشکیل و تعمیر پر خاطر خواہ اثر ڈالتے ہیں، سب سے زیادہ واضح، پائدار اور مستحکم و مربوط عادات کی نشو و نما ریاضیات ہی سے وابستہ ہے، انگلش، سوشیل سائنس فارین لنگویج، ہسٹری وغیرہ کے مقابلے میں ریاضیات کے پیمانے کہیں زیادہ جچے تلے باقاعدہ اور قطعی ہیں جس سبجکٹ میں جتنی زیادہ ڈھلمل یقینی اور لغزشیں روا ہونگی وہ سبجکٹ شخصیت کے مطلوبہ آثار و خصوصیات کی تعمیر میں اتنا ہی ضرر رساں بھی ثابت ہوگا

یہ بات عمومی ہے اور عام رجحانات پر صادق آتی ہے، البتہ وہ طلبہ اس سے مستثنیٰ ہیں جنہوں نے اپنے تعلیمی ماحول کی غفلتوں اور سہل انگاریوں سے اپنے آپ کو بلند و برتر رکھا ہے ایسے طلبہ جو مضامین اور جو نصاب بھی لے لیں کوئی مضائقہ نہیں

اخبار نیویارک ٹائمز نے کالج کے طلبہ کا جائزہ لیا تھا کہ وہ امریکن ہسٹری کا علم کہاں تک رکھتے ہیں ۱۹۴۳ء کے اپریل میں اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی وہ اس قسم کی غفلت اور سہل انگاری کے نتائج کی بڑی واضح تصویر ہے۔ نیویارک سٹی کے ہائی اسکول میں ریاضیات کو، بیرونی زبانوں کو، اور تاریخ کو اختیاری مضامین قرار دیا گیا، ایک ذمہ دار کمیٹی نے جو بارہ اہم ارباب تعلیم پر مشتمل تھی، ایک سال کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد جو رپورٹ پیش کی اس میں یہ سفارش بھی تھی کہ "پاسنگ گریڈ"، یا "مارکس" ترک کر دیئے جائیں، تمام بچے اپنی حیثیت کے کسی لحاظ کے بغیر ہی خود بخود ایک گریڈ سے دوسرے گریڈ میں چلے جایا کریں، اس قسم کی پلاننگ کے اثرات، بچوں کی عادات اور احساس ذمہ داری کے حق میں سخت تباہ کن ہیں۔

عددی گریڈ اور "مارکس" کے خلاف کچھ مدت سے بغاوت جاری ہے اور کامیاب بھی ہوتی جا رہی ہے حالانکہ مارکنگ سسٹم ان چند قطعی نکات اور واضح مقامات میں سے ایک ہے جہاں تعلیم ہماری اصلی دنیا کے نظام محرکات و ترغیبات، نظام انعامات، نظام عدل و انصاف اور نظام و تقصیر و خطا سے مشابہت رکھتی ہے، چنانچہ میں نے خود اپنے بچوں کو بارہا سمجھایا ہے کہ

ہماری تعلیم کے اس پہلو کو مستقبل کے تجربۂ عمل سے بڑی مماثلت ہے۔ اچھے نمبر دو ہی طریقوں سے حاصل کئے جاتے ہیں، ایک تو اس طرح کہ آدمی کام اچھا کرے، دوسرے اس طرح کہ اپنے اساتذہ کو خوش رکھنے کا سلیقہ سیکھے، یہ دوسرا طریقہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا اہم پہلا طریقہ ہے۔ پیشے اور مشاغل کی ترقیاں اور اچھی تنخواہیں صرف اچھے کام ہی کرکے حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ اچھے کام کو اس طور پر انجام دینے سے بھی حاصل ہوتی ہیں کہ افسر کو ایک خوشی محسوس ہو، ایک طریقہ اگر ذہانت کا ترجمان ہے تو دوسرا شخصی ربط ضبط کی سلیقہ مندی کا ترجمان ہے ظاہر ہے کہ دوسروں کی مرضی اور مفاد کا خیال رکھنا بڑی اچھی عادت ہے اور "اخلاقیت" ہے بلکہ اس پہلو سے دیکھئے تو یہ شاید پہلے طریقے سے بھی زیادہ اہم ہے۔

تعلیمی نظم و ضبط (ڈسپلن) میں سہل انگاریوں کو راہ دینے اور اس کے معیار کو پست کرنے کا ہر قدم یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہماری تعلیم۔ اور "کرائے کی انا" (WET NURSE) میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ وہ بچوں کو ذہنی اور اخلاقی طور پر انگوٹھا چوسنے کی عادت میں لگائے رہتی ہے۔

قسم قسم کی رنگارنگ تعلیم کا ایک طویل زمانہ صرف کرنے کے باوجود یہ بڑا المیہ ہے کہ اتنے سارے فارغ التحصیل لوگوں میں نہ تو کوئی خاص لیاقت پیدا ہوتی ہے، نہ کسی کام کاج کا کوئی تصور قائم ہوتا ہے میرے پاس نہ جانے کتنے لوگ صرف اس غرض سے آتے ہیں کہ میں ان کا معائنہ کروں، کوئی مشغلۂ زندگی منتخب کرنے میں مدد دوں، یا ان کے وجود کو کرید کرید کر اس بات کا پتہ لگا دوں کہ ان کے اندر فلاں جوہر اور فلاں وصف چھپا ہوا موجود ہے یہ بیچارے اتنا نہیں جانتے کہ صلاحیت اور فہم و ذکا کی تلاش نہیں کی جاتی اس کو پیدا کیا جاتا ہے، بنایا جاتا ہے، اور اپنے میلان و مذاق کی طرف توجہ کرنے کا وقت بھی جبھی تک ہے کہ اس کی پرورش و پرداخت کا زمانہ باقی ہو، صلاحیتوں اور فہم و ذکا کی امکانی استعداد کے جانچنے پرکھنے کے دو مواقع بہت ہی نازک ہیں، ایک موقع تو وہ ہے جب ہائی اسکول کا کوئی کورس لیا جا رہا ہو، چاہے وہ کورس سائنس کا ہو چاہے لبرل آرٹس کا۔ انڈسٹریل ٹریڈ کا ہو یا موسیقی اور آرٹ کا، یا کوئی کمرشیل کورس ہو، اور دوسرا نازک موقع وہ ہے جب کسی کالج کے کورس کا فیصلہ کیا جا رہا ہو۔

ماہرین نفسیات نے میلان و مذاق کی تشخیص اور جانچ پڑتال کے معاملے میں غیر معمولی ترقی کی ہے، اور یہ بتا دیا ہے کہ ان کی نشو و نما کے لئے کونسی تعلیم بہترین ہو سکتی ہے۔ اس قسم کے امتحانات اور معائنے کے لئے بالعموم آٹھ دس گھنٹے درکار ہوتے ہیں، مگر موجودہ نظام غلط قسم کی تعلیم پر آٹھ سال صرف کر ڈالنے کے لئے تو اچھی طرح کمر باندھے ہوئے ہے لیکن موزوں تشخیص کے لئے آٹھ گھنٹے نہیں دے سکتی۔

ایک موثر شخصیت کے لئے ہنرمندیوں کی رنگارنگی اور بوقلمونی ہی درکار نہیں ہوتی، بلکہ چند شعبوں میں اضافی اور کسی ایک میں امتیازی فوقیت بھی ضروری ہے کوئی خاص فوقیت تو مشغلۂ عمل کے شعبے میں ہونی چاہئے، باقی اسپورٹس، ہابیز اور سوشیل آرٹس میں ہونی چاہئے، آج جو ہم احساس کمتری کی اتنی کثرت لوگوں میں پاتے ہیں، تو وہ قریب قریب کلیتہً ہی اس کا نتیجہ ہے کہ کامیابی کے خصوصی عادات کی پرورش نہیں کی جاتی۔

نظام تعلیم، اپنی نوعیت کی بنا پر، یہ میلان رکھتا ہے کہ برتری کی مخصوص شکل و صورت نشو و نما نہ پائے۔ وہ لوگوں کے

جوہر و استعداد کی پرورش کہاں کرنا چاہتا ہے، وہ تو سب کو سپاٹ کر دینے کا میلان اپنے اندر رکھتا ہے۔ عمومی زندگی کے لئے طلبہ کی ریجنٹ تیار کرنے کی اس کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے مخصوص پہلوؤں پر قدرت پانے کی عادت پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ لبرل ایجوکیشن اور اسپشلائزڈ ایجوکیشن کے حسن و قبح کے بارے میں جو مدت دراز سے اختلافی بحث چلی آ رہی ہے اس سے مجھے یہاں کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک لبرل آرٹس کالج اپنے طلبہ پر زور دے سکتا تھا کہ وہ کسی ایک کورس میں خاص غور و تعمق کے ساتھ کوئی اعلیٰ کام کر دکھائیں۔ اسکی بجائے بے شمار طلبہ انجینئری کے اسکول سے برآمد ہوتے رہتے ہیں مگر انجینئرنگ کے کسی خاص پہلو پر کوئی بہتر چیز پیش کرنے کی ضرورت تک کسی کو محسوس نہیں ہوتی، یہ مسئلہ دراصل معیار اور ڈسپلن کا ہے صرف نصاب کے موضوعات و مشتملات کا نہیں ہے۔

ہائی اسکولوں اور گریڈ اسکولوں تک میں امتیازات کے حصول یا زیادہ جد و جہد کو کسی نہ کسی اعتبار سے مشروط کر دیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ کوئی بچہ خوشنویسی کی اعلیٰ صلاحیت بہم پہونچا لیتا، کوئی بچہ جغرافیے میں امتیاز پیدا کر لیتا، اور کوئی خطوط نویسی یا فن مراسلت ہی میں غیر معمولی اہلیت حاصل کر لیتا۔ خصوصی توجہ کے موضوعات کو حتی الامکان اس کے رجحانات کے مطابق ہونا چاہئے۔ کسی خاص شعبے میں فاضل محنت، غیر معمولی تحقیق و تدقیق اور انتہائی مرتب و منظم کام انجام دینے کے لئے بچے پر دباؤ ڈالنا بڑی مخدوش بات ہے، پروگریسیو ایجوکیشن کا جو مطلب عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ یہ بالکل نہیں ہے بلکہ فوقیت و برتری اور امتیاز پیدا کرنے کی صرف عادت لگائی جانی چاہئے اور یہی بعد کی زندگی میں کامیاب ہونے کی تیاری ہے۔

لیکن عملاً ہو کیا رہا ہے۔ اسکی وضاحت اس حالیہ رپورٹ میں ملاحظہ کیجیے جو نیویارک کے پبلک اسکولوں میں ڈھائی ہزار طلبہ و طالبات کا دس سال تک مطالعہ کرتے رہنے کے بعد مشہور ماہر نفسیات E. L. THORNDIKE نے پیش کی ہے۔ ان بچوں کی نفسیات کی جانچ مختلف طریقوں سے کی گئی اور چودہ برس کی عمر میں کی گئی اس کے بعد آئندہ دس سال تک ان کے اسکول کا اور ملازمت کا ریکارڈ پوری توجہ کے ساتھ دیکھا جاتا رہا۔ معلوم ہوا کہ موجودہ نظام نے جتنی تعلیم ذہین ترین بچوں کو دی اس سے فقط چار ماہ کم تعلیم غبی ترین بچوں کو دی اور جو تعلیم دی اسکی نوعیت یا مقدار کو کسی قسم کی کوئی مناسبت بچوں کی صلاحیت و استعداد سے مطلق نہ تھی یہ طرز عمل ظاہر ہے کہ برتری کے خصائل کی جگہ کمتری پیدا کرنے کا موجب ہے اور نتیجۃً شخصیت کو جراحت پہونچانے والا۔

تمام اداروں کی، اور ان میں بھی خاص طور پر نفع اندوز کاروبار کی کامیابی اس بات پر موقوف ہے کہ مقابلہ و مسابقت کے بازار میں ان کی خدمات اپنے گاہکوں کو تسکین خاطر کتنی بہم پہونچا سکتی ہیں، ان کی پیش کردہ چیزیں اور ان کی خدمات، دونوں کی برابر جانچ پڑتال ہوتی رہتی ہے، اور تقابل ہمیشہ سامنے رہتا ہے، اس پر نگاہ صرف خریداروں ہی کی نہیں بلکہ ان کا رباریوں کی بھی رہتی ہے جو اصلاح و ترقی کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں، مگر شعبۂ تعلیم ایسے اغراض و مصالح کا ترجمان نظر آتا ہے جس کی فطرت جامد ہو کر ایک ہی ڈھرے پر جاری ہے۔ اسکی پیداوار یا شاگردوں کی بھی ایسی سخت جانچ پڑتال نہیں کی جاتی۔ اس کا پیمانہ و معیار بڑی حد تک اس کا اپنا اور خود ساختہ ہے۔ انٹلکچول ڈیولپمنٹ پر جو اصرار اس کو ہے، اسکی روشنی میں اساتذہ کے انتخاب میں پہلا پیمانہ "اکیڈیمک" ہے یعنی وہ نارمل کو [illegible]

اس طرزِ عمل کا جو نتیجہ ہے اس کو ٹیچنگ اسٹاف کی نسل تیار کرنے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تعلیمی نظام اپنے آپ کو اور ایک مسلّط شدہ اسٹائلیکرٹل آئیڈیلز کو قائم و دائم رکھنے کا میلان رکھتا ہے اس لئے ایسے ہی لوگوں کو معلّمین کے طور پر منتخب کرتا ہے، جو ان آئیڈیلز سے قریب تر ہوں، یہ طرزِ عمل اس اکاؤنٹنٹ کے طرزِ عمل سے ملتا جلتا ہے جو خود ہی اپنے رجسٹروں کی تنقیح کرتا ہو اور خود ہی اپنی غلطیوں کو ٹھیک ٹھاک کرتا ہو۔ اساتذہ کو اپنا اپنا سبجکٹ پڑھانے کی تربیت تو دی جاتی ہے لیکن شاگردوں کی شخصیتوں کی پرورش و پرداخت کا طریقہ نہیں سکھایا جاتا

اس حقیقت کا ایک ڈرامائی انکشاف اس نفسیاتی جانچ میں بھی موجود ہے جو ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے "اٹھارہ گریڈ اسکولوں کے طلبہ کی شخصیت کو پرکھنے اور اس کے علامات و آثار کا پتہ لگانے کے لئے لیا گیا تھا۔ اس جانچ میں جابجا اساتذہ سے بھی کہا گیا تھا کہ وہ طلبہ کی شخصیت کے آثار و علامات کا تناسب متعین کریں، اور جب نتائج پر نظر ڈالی گئی تو معلوم ہوا کہ فورتھ گریڈ کے اساتذہ نے اپنے طلبہ کا جو تناسب اور اندازہ پیش کیا تھا وہ اس سے بلند تھا جو ففتھ گریڈ کے اساتذہ نے اپنے طلبہ کا پیش کیا تھا، اور ففتھ گریڈ کے طلبہ کا تناسب سکستھ گریڈ والوں سے بلند تھا، اس طرح ہر اگلا درجہ پچھلے درجے سے کمتر اور پست تھا، الغرض اساتذہ کے نظریۂ شخصیت کے مطابق، فورتھ گریڈ کے طلبہ کی شخصیتیں نائنتھ گریڈ والوں سے اوسطاً دوگنی بلند تھیں

یہ ایک عجیب بات ہے اور یہ سب کو معلوم ہے، کہ شخصیت اور آفاقیت، دس سے چودہ سال کی عمر کے درمیان زیادہ تیزی سے نشو و نما پاتی ہے، ورنہ اور کسی زمانے میں بجز ایک سے دس سال کی عمر کے، اتنی تیزی سے نشو و نما نہیں پاتی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک استاد کے نقطۂ نظر سے وہی بچہ مثالی ہے جو سب سے زیادہ صبر و سکون اور سلامت روی و حلم و حجاب کے ساتھ اپنے کلاس کے ضابطے کی محدود فضا میں اپنے کو ڈھال لیتا ہے۔ وہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے اپنے ماحول کے ایجابی اثرات کے تحت اپنے اندر زیادہ انفرادیت پیدا کرتا جاتا ہے اور اتنا ہی زیادہ اپنے اساتذہ کی باریک بین ناقدانہ نگاہ اور اندازہ و تخمین کو دعوت دیتا ہے لہٰذا موجودہ اسکیم میں اساتذہ کے نزدیک ایک اچھی شخصیت کا مثالی نمونہ وہی ہے۔ جو نہایت خاموشی کے ساتھ اسفنج کی طرح ہر بنی کو جذب کرنے والا ہو، ایجابی صلاحیت اور تخلیقی مزاج کا فرد ہونا ان کا آئیڈیل نہیں ہے۔

یہ اپنی نوعیت کی کوئی واحد تحقیق اور واحد مطالعہ نہیں ہے، بلکہ حال حال میں جو تازہ ترین مطالعے سامنے آئے ہیں ان میں سے ایک ہے اور اس سے پہلے اور جتنی تحقیقات اس قسم کی ہو چکی ہے اس کے نتائج کی مزید تصدیق و توثیق ہے۔ بلکہ اس دریافت کی ترجمان جو اس واقعہ عجیب کے ماہرین کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔ یہ تجربہ لازمی نتیجہ ہے ایک ایسے نظامِ تعلیم کا جس میں نشو و نما کے فکری پہلوؤں پر اصرار دوسرے تمام پہلوؤں کو قربان کر کے کیا جاتا ہے۔ اور جہاں معلّمین کے انتخاب و تقرر کی بنیاد بڑی حد تک رسمی اکاڈیمک سطح پر رکھی جاتی ہے۔

عام تعلیمی اداروں کے اس طرزِ عمل کے بالکل برعکس ایک محتشمانہ نمانہ وہ بھی ہے جو طبی تعلیم میں نظر آتا ہے۔ اور جس کے کرتا دھرتا مذہبی پروفیشن والے ہیں۔ میڈیکل کے حلقے میں دیکھئے تو پریکٹس کرنے والے اطباء کے نزدیک درس و تدریس کا مشغلہ ایک قابلِ فخر چیز ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ میڈیکل اسکولوں اور طبی درسگاہوں میں نصاب کی بیشتر کتابیں، پریکٹس کرنے والے ڈاکٹر اور طبیب پڑھاتے ہیں بلکہ عملی تربیت ۔۔(INTENSHIP) اور ...... HOSPITAL ROUTINE کے پورے نظام کی بنیاد ...

ربط و ارتباط پر قائم ہے جو طلبا اور پڑھانے والے تجربہ کار طبیبوں کے درمیان ہوتا ہے۔ طبی دنیا کا یہ انداز مثالی ہے اور اس عمدہ نمونے پر عام تعلیمی اداروں کی بھی تنظیم ہو سکتی ہے۔

آج تعلیم کو اپنے جس واحد پہلو پر سب سے زیادہ فخر ہے وہی سب سے زیادہ جراحت رساں اور تباہ کن ہے۔ یعنی آزاد خیالی کی پرورش۔ آزاد خیالی اور اسکی پیداوار یعنی۔ لبرلزم۔ آج تعلیم کے بت ہیں۔ عقلی ہی حلقوں میں نہیں بلکہ اخلاقی معاشرتی مذہبی اور سیاسی دائروں میں بھی لبرلزم قابل تحسین شے سمجھی جا رہی ہے اور اندوختۂ ماضی کے تحفظ (کنزرویٹیزم) کو رجعت پسندی کا نام دے کر اسکی مذمت کی جا رہی ہے۔

تعلیم کا طور طریقہ ذہنی آزاد منشی کا طرز عمل ہے۔ علم طبقات الارض بتاتا ہے کہ یہ دنیا سات دنوں میں پیدا نہیں کی جا سکتی اور نہ آدمی ایک دن میں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ مختلف مذاہب کی دیومالائیں سناتی ہے۔ علم الانسان (بشریات) کی تشریحیں یہ ہیں کہ احکام عشرہ (TEN COMMANDMENTS) ایک خاص نسل کے خصوصی رسوم وغیرہ ہیں، اس لئے کسی دوسری نسل پر جو مختلف حالات میں بسر کر رہی ہو، ان کی پابندی لازمی نہیں، فلسفہ تجسیم کے نظریئے اور دنیا کے مذہبی تصورات سے ذہن کو نجات دلوانے کا علمبردار ہے۔ علم الاخلاق موثرات سے بے نیازی بے تعلقی (STOICISM) اور لطف و لذت کے اصل نیکی ہونے کے نظریئے (لذتیت HEDONISM) اور مختلف دوسرے مکاتب خیال کی کہانیاں سناتا ہے۔ اور یہ طالب علم پر چھوڑتا ہے کہ وہ ان میں سے جس کو چاہے پسند کر لے، بے شمار نکتوں اور مقامات میں سے یہ چند ہیں جن کے بارے میں تعلیم ایک فرد کو "تعصبات و اوہام" سے اور ماضی کی روایات سے آزادی عطا کرتی ہے۔

آزاد خیالی اور آزاد منشی تعلیم کا ایک عقیدہ بن چکی ہے۔ اور یہ عقیدہ بھی اتنا ہی پراسرار اور غیر معقول ہے جتنا کہ چرچ کا کوئی عقیدہ کبھی ہو سکتا تھا۔ لیکن اس آزاد خیالی یا ذہن آزاد کا واقعی مرتبہ کیا ہے؟ اور تعلیم کے اثرات جس بیدردانہ بیت شکنی کے ترجمان بنے ہوئے ہیں۔ اس کی سود مندیاں اور فوائد آخر کیا ہیں؟ بچپن سے جن عقائد اور انداز فکر کو آدمی نے اختیار کر رکھا تھا، ان سے چھڑانے کے بعد زندگی کے مسائل نمٹنے کے لئے ہماری تعلیم اسے کس بہتر اور افضل تر ساز و سامان سے آراستہ کرتی ہے؟ آخر وہ بلند تر، ولولہ خیز و فکر انگیز اور قوی الاثر تصورات کون سے ہیں جنکی خاطر ذہن آزاد کو حریت بخشی گئی ہے؟ ان سوالات کا خاص جواب گذشتہ عرصے میں، اس تعلیمی مسلک کی صورت میں سامنے لایا گیا ہے کہ کلچر تو خود ہی مقصود ہے کلچر کا، یا علم خود ہی منزل و مراد ہے علم کی۔ مگر یہ مسلک، معہ اور اسکی اہمیت کے مذہبی عقیدے کے مقابلے میں حد درجہ لغو اور بے معنی ہے۔

لبرلزم در اصل نام ہے۔ ماضی کے اثرات اور ان کی گرفت اور روایات سے بے امتیازانہ طور پر دامن چھڑا لینے اور بے لگام ہو جانے کا جن کی جگہ آئندہ کسی قسم کے تصورات یا معقول بندشیں اپنے اوپر سرے سے عائد نہ ہوں اور اس لبرلزم کا ظہور تو جوانوں کے اندر مرض کی صورت میں ہو رہا ہے مثلاً:۔

ایک ذہنیت یہ پیدا ہو رہی ہے کہ ماں باپ کو "اولڈ فیشنڈ" اور بزرگوں کو پس ماندہ کہا جائے۔

ایک ذہنیت یہ پیدا ہو رہی ہے کہ ماں باپ کی دولت، کار یا دوسری جائداد کے معاملے میں کسی قسم کی متعلقہ ذمہ داری تو قبول نہ کی جائے نہ فرائض کا کوئی احساس ہی دل میں ہو بلکہ اپنے آپ کو یکسر آزاد و مختار تصور کیا جائے۔

ایک ذہنیت یہ بھی پیدا ہو گئی ہے کہ اپنے والدین کے اور خود اپنے مذہبی سیاسی اور اخلاقی تصورات کی تحقیر کی جائے، ہم
طلبہ اکثر کرتے ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کے پیشوں یا دستی محنت کے مشاغل کو معیوب اور قابل نفرت سمجھنے لگتے ہیں، خصوصاً
غریب گھرانوں کے لڑکوں میں یہ ذہنیت پیدا ہو رہی ہے۔

اور انہیں میں ایک یہ بھی ہے کہ عام طور پر تجارت کو ذلیل و خفیف اور علمی یا ثقافتی مشاغل کو (اپنی اہلیت و صلاحیت
لحاظ کئے بغیر) مثالی طرز حیات تصور کرنے لگے ہیں، یہ نوجوان ذرا نہیں سوچتے کہ یہ پیدا دار اور دولت کی بچت ہی ہے جو تعلیم اور علمی
مشاغل کا امکان پیدا کرتی ہے۔

سیانے لوگوں میں اس لبرلزم کے ظہور کی صورت یہ ہے کہ درست و نادرست اور حق و باطل کے اساسی معاملات میں
کوئی ایمان باقی نہیں رہتا اور اسی کو وہ رواداری کا لقب دیتے ہیں، ماں باپ کی یہ بے یقینی اس افسری اور اتھارٹی کو غارت کر دیتی
ہے جو والدین کو اپنے بچوں پر فطرۃً حاصل ہے، اور پھر یہ لوگ اس اتھارٹی کی جگہ ایک "ڈھیلا ڈھالا" اور لبرل رویہ بچوں کے معاملے میں اختیار
کر لیتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ بچے ایک دن اپنے والدین سے بھی زیادہ آزاد منش ہو جائیں گے۔ گھر کے اندر رواداری اختیار کرنے کی یہ
ایک فطری نتیجہ اور علامت ہے بالعموم تمام سیاسی اور سماجی مسائل اور حق و باطل کے معاملات میں رواداری قبول کر لینے کی،
جس کا مطلب ہوا کہ حضرت عیسیٰ نے سود خواروں کو عبادت خانے سے نکلوا کر جو ادب سوز تحقیر اور اخلاق پرور [illegible] کا اظہار کیا
تھا اس کی ساری اہمیت کا خاتمہ ہوا۔ اس قسم کی اخلاقی نامحکمی اور ذہنی لیقینی اگر بہت بڑی بڑی شخصی نادانیوں کا سبب نہ بھی ہو
بھی اس دنیا میں جو اخلاقی تزکیہ و تنقیہ کی اس قدر محتاج ہے۔ یہ کیفیت کسی ایجابی اور یقینی عمل کی طرف راہ نمائی تو ہرگز نہیں کرتی۔

وہ تمام ایجابی قسم کے پرجوش لبرل حضرات، جو لبرل موومنٹ کے نمائندے بنتے ہیں، وہ لبرل ایجوکیشن کی غالباً سب سے نمایاں
بنی نوع انسان کیلئے ملکی ہمہ گیر منصوبے کا ایک پرجوش عقیدہ اپنے اندر پیدا کر کے اور اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں پر لامحدود اعتماد قائم کر کے یہ لوگ
اکثر اپنے منصوبے کو بے تکلف نافذ کر دینے کی دھن میں مبتلا نظر آتے ہیں اور روایات کے تہ نشیں اثرات کا ذرا لحاظ نہیں کرتے۔ ان کا نعرہ تو یہی
ہے کہ "جو قدیم ہے وہ لازماً غلط ہے۔ اور جو جدید ہے وہ لازماً درست ہے" حق ملکیت، قدیم معاہدات، امریکی آئین، موجودہ ادارات،
(احکام عشرہ اور مذہب کے بارے میں تو کچھ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ یہ سب) گھوڑے اور بگھی کے زمانے کی چیزیں ہیں، ان کو متروک تصور کرنا چاہئے
یقین کیجئے موٹے موٹے الفاظ میں اس کا مرقع تو یہی ہے بلکہ امریکی زندگی کی موجودہ حالت سے اس کی مناسبت و مطابقت بھی صاف ظاہر ہے۔

وہ بچے جو اپنے والدین کی جائداد کے معاملے میں آزاد منش نظر آتے ہیں اور وہ لبرل حضرات جو سوسائٹی کی جان و مال کے حق میں بے لگام ہو
دیتے ہیں، دونوں کا منبع ایک ہے۔ وہ روایاتی قیود سے آزاد ہو جانے کا نمونہ تو بنتے ہیں۔ لیکن جدید تصورات کے مقابلے میں ان قیود کی جو اہمیت
اور قدر و قیمت ہے اس کو نہیں محسوس کرتے۔ یہ لوگ ان اذہان کے نمائندے ہیں جو اپنے لنگر سے چھوٹ کر الگ جھول رہے ہیں اور مہلک
سمتوں میں غوطہ کھانے کے لئے بڑھے جا رہے ہوں۔ اس قسم کے اذہان جتنے زیادہ قوی ہوں گے اتنی ہی زیادہ ان کی مضرتیاں اور تباہیاں بھی ہوں
شدید ضرورت ہے کہ نظام تعلیم فطرت انسانی سے تعلق رکھنے والی اقدار اور بنیادی صداقتوں کی تدوین و تبویب کرے تاکہ ان شریفانہ روایات کا
تحفظ ہو جو قوم نے پائی ہیں اور ان کی عزت و عظمت دلوں میں قائم ہو۔ اور ذہنی و فکری سرکشی اور طغیان کو بے غرض اور بے روشن زندگی کی [illegible]
[illegible]

رخشاں ابدالی

عروج بہار، اور چند گلدستے

اردو صحافت میں گلدستوں کا بھی ایک بڑا کامیاب دور رہا ہے۔ لکھنو کا "پیام یار" اور حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم کا "فتنہ" اور
ر فتنہ" گلدستوں میں خاص امتیاز اور شہرت کے مالک رہے ہیں۔ عظیم آباد پٹنہ کا "بہار" اور "تازہ عشاق" اور گلدستہ بہار (بہار شریف)
ہیں طرحی غزلوں کا بھی التزام ہوتا تھا۔ ایک گلدستہ کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ دورِ آخر میں میرٹھ کا "جلوۂ یار" بھی خاصہ مقبول ہوا۔ اور طویل
ت تک نکلتا رہا۔

گلدستے ہر مہینے کے لئے طرحوں کا اعلان کرتے تھے اور ان ہی طرحوں کی مطروحہ غزلیں ان میں شائع ہوا کرتی تھیں کچھ غیر طرحی کلام
ی شایع ہوا کرتا، ایک حصہ جز و نثر کے لئے بھی مخصوص ہوا کرتا جو عموماً شعر و شاعری سے متعلق ہوتی۔ یا بعض گلدستے حصۂ نثر میں مسلسل
ل یا افسانے شایع کرتے۔ دورِ حاضر میں گلدستے ختم ہو چکے ہیں۔

اس وقت راقم کے پیش نظر دو گلدستے ہیں اور انہیں کے متعلق یہ سطور پیش کی جارہی ہیں ان میں پہلا گلدستہ "عروج بہار" ہے
وج بہار" کا صرف ایک شمارہ میرے پیش نظر ہے۔ یہ صرف ۱۴ صفحات کا ہے اور یقینی ہے کہ یہ ناتمام اور ناقص الآخر ہے۔ دوسرا گلدستہ
ردوس خیال" ہے۔

ہر چند عروج بہار۔ (پیش نظر) ایک ہی پرچہ اور وہ بھی ناتمام ہے مگر وہ اپنی جگہ قابل ذکر ہے اور اس کی اہمیت کے لئے یہی کافی
ہے کہ اس شمارہ میں حضرات داغ اور امیر کی غزلیں شریک اشاعت ہیں یہ بمبئی سے شایع ہوتا تھا۔ وہ گلدستوں کی مروجہ تقطیع ——— یعنی مولانا
رر لکھنوی کے مشہور رسالے "دلگداز" کے سائز پر شایع ہوتا تھا۔ یہ چوتھی جلد کا پہلا شمارہ بابت ماہ جنوری ۱۸۹۵ء ہے۔ سرورق پر گلدستہ
ا نام عروجِ بہار کے اوپر قوسی شکل میں انگریزی میں بھی نام "UROOJ—I—BAHAR" لکھا ہوتا تھا۔ نام کے نیچے سرورق ہی پر شمارہ
شمارہ جلد نمبر ا۔ جلد ۴ فصل سے درج ہے۔ سرورق ہی پر یہ شعر بھی ہے ؎

نغمہ یہ ہے چمن میں زبانِ ہزار پر　　　قرباں ہے بہار عروج بہار پر

اس کے نیچے درج ہے:۔
شیخ اسحاق حسن شمسی مارہروی مالک گلدستہ عروج بہار نے شہر بمبئی محلہ کیمت باڑی ڈاکخانہ گرگاؤں سے شائع کیا۔
سرورق کے پشت کا صفحہ سادہ ہے اسلئے متعلقہ تفصیلات کا علم نہیں ہوتا۔
پہلے صفحہ کے دونوں محاذی کناروں پر جس کے نیچے سے غزلیں شروع ہوتی ہیں "اطلاع ضروری" کے عنوان سے لکھا ہے:۔

مہتمم بوجہ خرابیٔ آب و ہوا بمبئی سے اپنے وطن میں چلا آیا ہے۔ اور چندے ارادہ قیام کا رکھتا ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی خط و کتابت قدرداں پتہ ذیل سے کریں۔ مارہرہ ضلع ایٹہ۔ مہتمم

اس اشاعت میں مصرعۂ طرح ع "ہماری دُعا کو دعا مل رہی ہے" کی مطرحہ غزلیں ہیں۔ اور تخلص کی ہجائی ترتیب کے مطابق غزلیں دی گئی ہیں۔

سب سے پہلی غزل حضرت امیرؔ مینائی کی ہے۔ عنوان ہے:۔

"جناب منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی استاد والیٔ رام پور خلد آشیاں"

غزل ۹ شعر کی ہے اور وہ یہ ہے ؎

یہ گالی جو لے دلربا مل رہی ہے	دعا دی تھی، اُس کی سزا مل رہی ہے
لگا چاہتی ہے کوئی آگ تازہ	شرارت سے انکی حیا مل رہی ہے
بھری ترس سے ہیں عیادت کی باتیں	مریضوں کو اچھی دعا مل رہی ہے
گلے پر جو رُک رُک کے چلتا ہے خنجر	یہ گویا قضا سے ادا مل رہی ہے
الٰہی انہیں راس آئے یہ زینت	لہو میں ہمارے حنا مل رہی ہے
مرے قتل کا دن ہے کیا عید کا دن	گلے تیغ کے کیوں قضا مل رہی ہے
بہار آئی ہے چہچہاتے ہیں بلبل	قیامت صدا سے صدا مل رہی ہے
مرا دل وہ تلووں سے ملتے نہیں ہیں	یہ مٹی میں میری وفا مل رہی ہے
امیرؔ! اب کہاں شعر میں کوئی کامل	رہی ہے تو اک بحر کامل رہی ہے

"صنم خانۂ عشق" دیوان امیرؔ میں (کہ قطعات تاریخ منسلکہ سے اس کی اشاعت ۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ میں ہونی ظاہر ہے) بلا ادنیٰ تغیر یہ اشعار اسی طرح ہیں۔ ہاں صنم خانہ میں مقطعے دو ہیں یعنی گلدستہ کے مطبوعہ مقطع کے علاوہ، اس سے پہلے یہ مقطع بھی ملتا ہے ؎

امیرؔ! التجا کیوں کرے چارہ گر سے	اذیت میں لذت سوا مل رہی ہے

اس کے بعد کی غزل "جناب منشی محمد علی خاں صاحب۔ ایماںؔ شاگرد حکیم مومن خاں صاحب" دہلوی" کی ہے یہ سات شعر کی ہے مطلع ہے:

رُخ یار سے زلف کیا مل رہی ہے	کہ شام و سحر ایک جا مل رہی ہے

ایک شعر یہ ہے ؎

ہے کیوں نہ گردش میں تو چرخ گرداں	تجھے بیکسوں کی دعا مل رہی ہے

اور مقطع میں مومنؔ کا خصوصی رنگ نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

سنا ہے یہ ایماںؔ! کہ تیری طبیعت	کسی بت سے مردِ خدا مل رہی ہے

اس کے بعد سیدی محمد عبدالصمد انجمؔ از جزیرہ حبشان۔ محمد ادریس صاحب باغؔ شاگرد جناب اکرؔاز قلعہ چہرہ۔ حاجی سید تجمل حسین تجملؔ جلالپوری معاون گلدستہ کے کلام ہیں۔ دو شعر انکے بھی سن لیجئے۔

جگر میں مرے مدتوں داغ بن کر	تری آرزو ماہ کامل رہی ہے

ہمیں پر ہوا ہے عتاب ستمگر ہمیں کو تحمل با سزا مل رہی ہے

اس کے بعد سید محفوظ حسین تسلیم شاگرد منشی محمد علی خاں ایمآؔی کی ۸ شعروں کی غزل ہے۔ دو شعر یہ ہیں

وہ گیسوئے مشکیں جو چھلتے ہیں رخ پر تو بجلی سے گویا گھٹا مل رہی ہے
لب باغ جنت ہے باغ شہیداں گلے سے ترے کربلا مل رہی ہے

پھر مولوی محمد مبین جلیسؔ مچھلی شہری کی غزل ہے۔ ان کے بھی دو شعر سن لیجئے ؎

الٰہی! رہے چشم قاتل کو گردش مرے قتل میں یہ بھی شامل رہی ہے
کہاں جا بسے جانے والے عدم کے فقط اک صدائے درا مل رہی ہے

اس کے بعد منشی محمد عبدالکریم صاحب۔ خادم مہتمم انجمن محمدی مالیگاؤں شاگرد تجمل کی (۸ شعروں کی) غزل ہے دو شعر ؎

نہیں روئے جاناں پہ بکھرے ہیں گیسو مگر صبح سے شام کیا مل رہی ہے
مہ و مہر کو کیوں نہ حیرت سے دیکھوں ضیائے رخ پُر ضیا مل رہی ہے

اب صفحہ ۵ پر حضرت داغؔ کی غزل (۱۳ شعروں کی) بعنوان ذیل دی ہے۔ گیارہ شعر پیشکش ہیں۔ جناب نواب مرزا خاں صاحب داغؔ دہلوی استاد حضور والی حیدرآباد دکن :

وہاں عاشقوں کو سزا مل رہی ہے محبت کی، لو، داد کیا مل رہی ہے
وفا پر مجھے بد دعا مل رہی ہے خطا کیا تھی، جس کی سزا مل رہی ہے
بدلتا نہیں حال بیمار غم کا بدل کر دوا پر دوا مل رہی ہے
یہ ڈر ہے انہیں پیچ میں آ نہ جاؤں کمر سے جو زلف رسا مل رہی ہے
یہ کس کو غش آیا۔ وہ دامن سے اپنے ہوا دے رہے ہیں، ہوا مل رہی ہے
علاج اور بیمار الفت کا کیا ہو دوا مل رہی ہے دُعا مل رہی ہے
مری داد دیتے ہیں بیداد کر کے سزا مل چکی تھی۔ جزا مل رہی ہے
رخ صاف سے آئنہ مل رہا ہے پھر اس پر ادا سے ادا مل رہی ہے
عدو کا ہے نام اس لب جانفزا پر مسیحا سے گویا قضا مل رہی ہے
ہمارے لئے ہے مزا دل لگی کا خطا کر رہے ہیں، سزا مل رہی ہے
ملو داغؔ سے تم بھی ہے عید کا دن گلے آج خلق خدا مل رہی ہے

اس کے بعد داغؔ کے شاگرد دلگیر مارہروی (سید امیر حسن) کی غزل ہے۔ یہ ۱۳ شعر ہیں۔ اس غزل کے چار شعر یہ ہیں ؎

مجھے نعمت وصل کیا مل رہی ہے مقدر سے یہ شئے سوا مل رہی ہے
ملو تم بھی مجھ سے کہ ہے عید کا دن گلے آج خلق خدا مل رہی ہے
وہ چشم فسونگر زمانے میں مجھ کو فقط غیر کی آشنا مل رہی ہے

ترے گیسوؤں کی، ترے کاکلوں کی — الجھنے میں یکسر ادا مل رہی ہے

ایک اور قابل ذکر شاعر حضرت داغ کے برادر خورد آغا مرزا شاغل کی ۱۲ شعر کی غزل بھی ہے چند شعر اس غزل کے بھی سن لیجئے۔

گلے دل کے تیغ ادا مل رہی ہے — عجب لذت جانفزا مل رہی ہے
سزا عشق کی گو بجا مل رہی ہے — مگر یار! بے انتہا مل رہی ہے
اٹھائنگے ناز فلک بھی، کہ اس میں — کسی فتنہ خو کی ادا مل رہی ہے
یہ کیا قہر ہے بزم میں ہر کسی سے — وہ چشم سراپا حیا مل رہی ہے
وہی مشت خاک اپنی برباد ہے اب — کبھی قافلوں کے جو شامل رہی ہے
امید اس اطاعت پہ لے دل جزا کی! — عنایت سمجھ جو سزا مل رہی ہے
تماشا نیا ہے یہ آج آسماں پر — اثر ہٹ رہا ہے۔ دعا مل رہی ہے
خوشا مدعبث اہل دنیا کی شاغل! — کہ روزی بغیر التجا مل رہی ہے

مالک گلدستہ جناب اسحاق حسن صاحب قمر کے شاگرد "منشی علی محمد صاحب شائق رئیس بمبئی" کی غزل بھی ہے (۸ شعر) دو شعر یہ ہیں،

ہمارے ہی حصہ میں ہے ہجر کی شب — ہمیں کو یہ کالی بلا مل رہی ہے
دعا کو اثر سے۔ اثر کو دعا سے — مدد ان دنوں برملا مل رہی ہے

"جناب مولوی علاؤالدین شاکر رئیس ملتانی و تلمیذ جناب شہیر استاد والیہ بھوپال" کی غزل بھی ہے۔ اس کا مطلع ہے ؎

جفا پر تمہیں تو دعا مل رہی ہے — جزائے وفا ہم کو کیا مل رہی ہے

اسی طرح "جناب منشی یوسف حسن صاحب عزیز مارہروی شاگرد جناب داغ دہلوی" کا یہ ایک شعر شریک اشاعت ہے ؎

مری اس مصیبت کو اللہ رکھے — کہ ہر حال میں میرے شامل رہی ہے

جناب احسانی شاہجہاں پوری کے شاگرد جناب محمد عبدالمجید خاں صاحب مجید کی غزل بھی ہے ۱۱ شعر۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ترے گیسوے یار رخ پر ہیں بکھرے — یہ آپس میں صبح و مسا مل رہی ہے

اس گلدستہ میں ہندو شعرائے اردو نواز کا کلام بھی ہے۔ مگر اردو کی دلنوازی کا کرشمہ دیکھئے کہ اس گلدستہ کے لئے مسٹر ڈبی سلیو آف لو۔ فدا لے "بھی اپنے رشحات فکر کے پھول نذر کئے ہیں۔ دو شعر آپ بھی سن لیجئے ؎

یہ کاکل سے زلف دوتا مل رہی ہے — غضب ہے بلا سے بلا مل رہی ہے
گل قد سے سانپ لپٹا ہوا ہے — کہ عارض سے زلف دوتا مل رہی ہے

آخر میں جناب افضل الدولہ مظفر الملک سید محمد افضل علی خاں بہادر شوکت جناب افضل" کی غزل کا تیسرا شعر (جس پر بہاما پیش نظر نسخہ ناتمام رہ گیا ہے مثلاً) پیش کیا جاتا ہے ؎

وہی تیرے رخ کو چھوئیں، ہوں جو طاہر — کہ شان کتاب خدا مل رہی ہے

◆ ◆ ◆

حضرت اثر مارہروی

انجام عیش

بیزار زندگی سے ہوں سرتا بہ دوش ہے کچھ دیں کا خیال نہ دنیا کا ہوش ہے
اے صورت ہالہ تو ہی فقط پردہ پوش ہے ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

کشتِ امید یاس کے حملوں سے پائمال ملتا ہے کچھ جواب نہ پاتا ہوں کچھ سوال
یارب اس انقباض سے مجھکو کہیں نکال اے مژدۂ وصال، نہ نظّارۂ جمال۔
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

دل میں امنگ، جوش پہ آیا ہوا شباب بندِ قبا کھُلے ہوئے، الٹی ہوئی نقاب
خوفِ کشیدگی ہے، نہ کچھ خطرۂ عتاب مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

اِک بے نوا کو خدمتِ سلطاں میں دیکھنا ذرّہ کو آفتابِ درخشاں میں دیکھنا
چیونٹی کو بارگاہِ سلیماں میں دیکھنا گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

جو اہلِ دل ہیں انکے نرالے ہیں بندوبست وہ بے پیئے ہی رہتے ہیں مستِ مئے الست
تجھکو خبر نہیں ہے تو سن لے ہوا پرست دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزمِ خیال مے کدۂ بے خروش ہے

اے سالکانِ مسلکِ عشق آشنائے دل اے رہروانِ کوچۂ حسن از ولائے دل

اے نو رسیدگانِ دیارِ فضائے دل — اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

اپنی تباہیوں کے اگر دادخواہ ہو — بے صبر ہو، ملول ہو، گم کردہ راہ ہو
آؤ ادھر کہ کچھ تو تمہیں انتباہ ہو — دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

دلچسپ ہے اگرچہ فضا حسن و عشق کی — کھانا نہ تم فریبِ ہوا و ہوس کبھی
اس راہ میں ہیں پیکِ قضا ایک کیا سبھی — ساقی بجلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

اے غافلو بہت ہے خطرناک یہ صراط — مہمان چند لحظہ ہیں یہ عیش یہ نشاط
کچھ تو کرو خدا کے لئے اب بھی احتیاط — یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

وہ سبزہ زار، وہ لبِ جو اور وہ راگ رنگ — خوبانِ ماہ پیکر و طناز و شوخ و شنگ
زاہد بھی ہو تو کر نہ سکے کوئی عذرِ لنگ — لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

افسوس اس بہار کا انجام کیا لکھیں — نیرنگیٔ زمانہ کو کیونکر بیاں کریں
یا رات کو وثوق تھا اس عیش پر ہمیں — یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

تاراج باغِ عیش کی اک اک کلی ہوئی — ہر شے پڑی ہوئی ہے کلی اور دلی ہوئی
پروانوں کے تکلوں پہ پھری ہے جلی ہوئی — داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

گذرا ہے اک زمانہ اثر قیل و قال میں — برسوں پھرا کئے ہیں تلاشِ محال میں
عقدہ کھلا بہ صحبتِ اہلِ کمال میں — آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

رعنا اکبرآبادی

شاعر کی محبوبہ

جذبات کے طوفان میں تسکین کی آبادی
اور نگِ تفکر پہ تخیّل کی شہزادی

لفظوں کے تلاطم میں کھویا ہوا افسانہ
ہر شعر کے دامن میں سویا ہوا افسانہ

تخئیلِ نزاکت میں خوش رنگ کنول جیسے
تشریحِ لطافت میں مفہومِ غزل جیسے

حجلہ میں تصور کے اک حجلہ نشیں صورت
ہو چاند کی کرنوں سے پیدا وہ حسیں صورت

غنچے کے تبسم میں تصویر نہاں جس کی
آئینۂ شبنم سے تصویر عیاں جس کی

ہے جس کی تجلی سے فطرت کی خود آرائی
اک عمرِ ابد جس کی شادابی و رعنائی

تاروں کی بلندی میں آوازۂ حسن اس کا
وینس کو بھی ناممکن اندازۂ حسن اس کا

وہ جس کو مصور کی قدرت بھی نہیں پاتی
وہ حسن کی دیوی جو خوابوں میں نہیں آتی

محبوبۂ شاعر ہے شاعر کی نگاہوں میں
احساس میں جذبہ میں انفاس میں آہوں میں

خالد (علیگ)

آمد ہے سحر کی

شہزادیٔ ظلمات کی افشاں ہوئی بے آب
ٹپکی دہنِ غنچہ میں شبنم کی مئے ناب
گلشن میں مدھر گیت صبا گانے لگی ہے
مشرق سے ابھرنے کو ہے خورشیدِ جہاں تاب

کرتے ہیں رسولانِ چمن اپنی قبا چاک
افشا نظر آتا ہے ہر اک پردۂ اسرار
اک وجد کے عالم میں ہے تقدیرِ الٰہی
گلشن ہمہ رعنائی و عالم ہمہ انوار

غنچے ہیں کہ تیار تکلم کے لئے ہیں
کلیاں ہیں کہ آمادہ تبسم کے لئے ہیں
سبزہ ہے کہ آنکھیں سی ملے جاتا ہے پیہم
طائر ہیں کہ بیتاب ترنم کے لئے ہیں

وسعت کدۂ دہر میں یہ کیف کا ہنگام
شاعر کو ابھی وقت ہوا کرتا ہے الہام
مخصوص ہے خود مادرِ فطرت کی طرف سے
یہ وقت ہے جائزۂ گردشِ ایام

جذباتِ خود آرا ہیں کہ بیباک ہوئے ہیں
انفاس طرب خیز و طرب ناک ہوئے ہیں
دوشیزۂ شب روز بہاتی ہے جو آنسو
اُن سے یہ حسیں دل کے ابھی پاک ہوئے ہیں

صحرائے سماعت میں نوا گونج رہی ہے
یا کوہ کے دامن میں ندا گونج رہی ہے
محسوس یہ ہوتا ہے درِ دل پہ ابھی تک
جبرئیل کی دستک کی صدا گونج رہی ہے

سرچشمۂ عرفان و رضا بول رہا ہے
یا نشۂ صہبائے وفا بول رہا ہے

سید انصار ناصری

منکہ ایک وکیل

پہلا سین

وکیل صاحب کا گھر نما دفتر۔ گھنٹہ دس بجاتا ہے۔

یل :۔ (جمائی لیتے ہوئے) آخاخاخا آآآ۔ دس ۔ بج ۔ گئے ۔ ہوں۔ ں ں۔ اوفو۔! (اونگھتے ہوئے) آج تو کچھ نیند سی آ رہی ہے۔ منشی جی ۔ ؟ کچہری جاکر کیا کرنا ہے کچھ کام دام تو ہے نہیں ۔ کیوں ؟

(منشی جی سو رہے ہیں اور خراٹے لے رہے ہیں)

خ خ خ خوب۔ تو گویا منشی جی بھی ہمارے اس وقت چنیا بیگم کے زیر حراست ہیں۔ یعنی بالکل ہی انٹا غفیل ہو ۔ سو رہے ہیں۔ ج ج ج ج ۔ بیچارے کو طریقے سے سونا بھی تو نہیں آتا۔ کیا کرے۔ . . . . .

(خراٹے زور زور سے بجتے ہیں)

اُفوہ ، ان خراٹوں کا اتار چڑھاؤ تو دیکھو ۔

(خراٹے اور بھی بلند ہوتے ہیں)

توبہ ، توبہ یہ شخص تو اپنے زہریلے سانسوں سے کمرے کی ہوا میں ضرب شدید لگا رہا ہے۔ مجبوراً مجھے عدالتی چارہ جوئی کرنا پڑے گی۔ جس کے ہرجہ خرچہ کے ذمہ دار ۔ اجی۔ منشی جی ! منشی جی ی ی !

(خراٹے ذرا تیز ہو جاتے ہیں)

(چیخ کر) منشی جی صاحب ؟

ی جی :۔ (گھبرا کر) حاضر۔ حاضر ۔ !!

یل :۔ (قہقہہ کے ساتھ) اجی قبلہ منشی جی صاحب ، خدا کے لئے ان کالی جان سے اپنا پیچھا چھڑائیے۔ ورنہ یہ بدبخت اغوا کرکے آپ کو حبس دوام بعبور دریائے شور کا مزہ چکھا دیں گی۔ اس کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔

شی :۔ (ناک میں بولتے ہوئے جمائی لے کر) واہ واہ حضرت واہ ، آپ بھی ناحق پریشان کرتے ہیں ۔ جی ہاں۔

یل :۔ اماں تو بندۂ خدا کے اس طرح گھوڑے بیچ کر سونے کا بھی کوئی طریقہ ہے۔ آخر کچھ کام بھی کرنا ہے یا نہیں۔

شی :۔ کام (خوش ہو کر) اس میں کیا شک ہے۔ اس میں کیا۔ بتلائیے کیا کوئی کام آ گیا کیا ؟ سچ بتائیے ۔ جی ہاں۔

وکیل :۔ یعنی یہ خوب ہوئی۔ ارے بھئی۔ مجھ سے پوچھتے ہو کام کو۔ کیا خوب طریقہ ہے تمہارا بھی۔ کام لانا تمہارا کام ہے یا میرا۔ ورنہ یہ میرا کام تو پھر تمہارا کام کونسا ہے۔

منشی :۔ کام، کام، کام۔ نہ معلوم کام کو کیا ہو گا ہے۔ جی ہاں ان کام کرنے والوں کے حوصلے دیکھ دیکھ کر تو ہمارا کام ہی تمام ہو گیا جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے؟

وکیل :۔ چلیئے انجام بخیر ہو۔ دعویٰ معہ خرچہ خارج۔ لیکن خدا را یہ بتلایئے کہ دنیا کے سارے رہنے والے سب مر گئے۔ کیا آخر یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ اماں زندہ آدمی رہتے ہیں۔ تو رہنے کے طریقے سے رہتے ہیں۔ دو چار کا لڑائی دنگا ہوتا ہے۔ لٹھ بازی ہوتی ہے چاقو چلتے ہیں۔ سر پھوٹتے ہیں۔ تھوڑا بہت خون بھی طریقے سے نکلتا ہے۔ کوئی کسی کی رقم ہضم کر جاتا ہے۔ کسی کا مال نقب زنی سے اٹھایا جاتا ہے۔ کسی کی جورو کسی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ وہ جواب میں دوسرے کا خون نہیں کرتا تو کم از کم طریقے سے سر تو پھاڑ ہی دیتا ہے۔ ارے بھئی یہی طریقے ہوتے ہیں شریفوں کے رہنے سہنے کے۔ اب بھلا تم ہی بتاؤ۔ یہ بھی کوئی طریقوں میں طریقہ ہے کہ ایک سرے سے سب کو سانپ سونگھ گیا۔

منشی :۔ اس میں کیا۔ اس میں کیا شک ہے۔ جناب۔ یہی تو میں کہہ رہا تھا۔ لیکن۔

وکیل :۔ واقعی حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب کے سب نے بالاتفاق رائے سچ بولنا کیسے شروع کر دیا۔ کیا خوب طریقہ نکالا ہے۔

منشی :۔ اس میں کیا شک ہے۔ جناب یہی تو میں سوچ رہا تھا۔ کہ آخر ان لوگوں پر کیا خدا کی مار ہوئی کہ جسے دیکھیئے بھلا آدمی بنا پھرتا ہے۔ جی ہاں! یعنی واللہ جدھر دیکھیئے۔ شریف ہی شریف نظر آتے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے میں چوک میں سے گذر رہا تھا اچھی خاصی بنی بنائی لڑائی بند ہو گئی۔ فریقین میں باہمی راضی نامہ ہو گیا۔ ورنہ وہ زوردار ۳۲۳/۵۰۴ لڑاتا کہ نام ہو جاتا۔ جی۔ اس میں کیا شک ہے۔ جناب وارنٹ نکلوا دیتا وارنٹ۔ وہ بھی بلا ضمانت۔ جی ہاں۔ اور پھر گواہان استغاثہ کو وہ پٹی پڑھاتا کہ چھ مہینے کی ٹھک جاتی۔ جی، اس میں کیا شک ہے جناب۔ یہ بھی نہ ہوتا تو جناب ازالہ حیثیت عرفی تو کہیں گئی ہی نہ تھی۔ ایسی چٹ پٹی شہادتیں گذرتیں کہ مزہ آ جاتا جناب۔ جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔ پر کیا بتاؤں۔ میری پھوٹی قسمت؟

وکیل :۔ خیر چلیئے، جانے دیجئے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔

منشی :۔ کوئی مضائقہ ہی نہیں۔ ارے یہی تو رونا ہے بابو صاحب، آپ کی ان ہی باتوں نے تو آج کو یہ دن دکھایا ہے کہ کمرے میں ایک بھی مکھی نہ رہی۔ جی ہاں۔

وکیل :۔ مکھی؟ کیا مطلب! یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟

منشی :۔ جس پر اقدام قتل کیا جاتا۔ جی۔ اس میں کیا شک ہے جناب۔ خالی بیٹھے بیٹھے مکھیاں ہی ماری جاتی ہیں۔ اور کیا ہو سکتا ہے۔ جی ہاں۔

وکیل :۔ بھئی یہ خوب کہا۔ ہا ہا ہا۔

منشی :۔ اجی کیا خوب کہا۔ بندہ پرور سچی بات تو یہ ہے کہ نہ آپ سے وکالت ہو سکتی ہے اور نہ مجھ سے آپ کی نوکری۔ جی ہاں۔ غضب خدا کا پورا ایک سال ہو گیا اور ایک بھی ٹھکانے کا مقدمہ نہیں آیا۔ نہ دیوانی نہ فوجداری نہ اجرار نہ نمبری! اور سب کو ڈالیئے بھاڑ میں۔ معمولی عرضی پرزے سے بھی گیا گذرے ہو گئے۔ قسم مالک کی انھیں ہاتھوں سے سینکڑوں کو جیل خانے بھجوا اور ہزاروں بالکل سچے دعوے خارج کروا کے پھینک دیئے۔ (سانس) آج یہ نوبت ہے کہ بیٹھے ہیں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے

جی ہاں۔

وکیل:۔ اجی تو قبلہ منشی جی صاحب! اس میں میرا کیا قصور۔ کام نہ آئے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔؟ طریقہ ہی کیا ہے؟

منشی:۔ (جوش سے) کیسے نہ آئے کام۔ ہم وہ ہیں قسم مالک کی کہ مٹی میں سے کام پیدا کر دیں۔ دو بھلے آدمیوں کو لڑوا دینا کونسی بڑی بات ہے۔ آن کی آن میں سترہ مقدمے کھڑے ہو تے ہیں۔ جناب۔ سچ جانیے۔ خاک چاٹ کر کہتا ہوں میں وہ ہوں کہ بڑے بڑے چالباز، اچھے اچھے چار سو بیس میرے آگے کان پکڑتے ہیں۔ جی! ایک اشارے پر مقدمات کا ڈھیر لگا دوں بابو صاحب (سانس لے کر) پر کیا کروں آپ کی عادت سے مجبور ہوں۔

وکیل:۔ ارے بھئی۔ میں نے کب منع کیا۔ جو جی چاہے کرو۔ لیکن دیکھنا۔ ذرا طریقہ سے۔ ذرا اپنے ہاتھ پاؤں بچاتے رہنا۔

منشی:۔ اجی توبہ کیجئے بابو صاحب۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ یہ آپ کی تعزیرات بھا زیرات اوروں کے لئے ہیں۔ ہمارے لئے نہیں۔ قسم مالک کی۔ سات خون معاف ہیں جی۔؟

وکیل:۔ (ہنستے ہوئے) افوہ۔ اتنا خونریز طریقہ۔

منشی:۔ نہیں جناب شرط تو یہی ہے کہ خون کی ایک بوند بھی نہ گرنے پائے چاہے گھر کے گھر تباہ ہو جائیں۔ بڑی بڑی آسامیوں کے دیوالے نکل جائیں۔ شریفوں کی عزت دآبرو خاک میں مل جائے اور ہم پھر الگ کے الگ۔ جی! ہاتھ کی صفائی اس کو کہتے ہیں جناب۔

وکیل:۔ خیر چلئے زبانی جمع خرچ۔ اب یہ بتائیے کہ اپنی وکالت کے چھکڑے کو کس طرح دھکیلا جائے۔

منشی:۔ اجی رہنے بھی دیجئے۔ ہونہہ۔ آپ نے مجھ سے پوچھا کب؟ جو چاہا کرتے رہے اسی لئے آج یہ حالت ہے کہ چھ مہینے کا مکان کا کرایہ چڑھا ہوا ہے اور آدھی سے زیادہ کتابیں کباڑیے کی نذر ہو چکی ہیں۔ (سانس لے کر) اگر آپ ایک مرتبہ بھی میرے کہے پہ چلتے تو جناب یہ نوبت نہ آتی۔

وکیل:۔ خیر خیر۔ گذشتہ را صلوٰہ۔ یہ عذرات بوجہ زائد المیعاد ہونے کے خارج۔ اب یہ بتائیے کہ آئندہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ میں ہر طرح آپ کے مشورہ پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔

منشی:۔ تو لکھ دیجئے ایک عدد اقرار نامہ۔ جو میں کہوں گا وہ کرنا ہوگا۔ قسم مالک کی اگر چاندی نہ برسنے لگے تو میرا ذمہ۔

وکیل:۔ منظور منظور۔ یہ لیجئے لکھئے۔ بابا نکہ فلاں ابن فلاں ساکن فلاں کے ہیں۔ جو کہ بہ تمام ہوش و حواس اقرار خود برضا و رغبت اپنی کے کرتے ہیں کہ . . .

منشی:۔ (جل کر) توبہ توبہ۔ پھر وہی مذاق۔ بھلا اس خیالی پلاؤ میں آپ کے قانون بگھارنے کی کیا ضرورت ہے۔

وکیل:۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ اقرار نامہ لکھ دوں۔ اور کونسا طریقہ ہے۔ اچھا جانے دیجئے۔

منشی:۔ سنیئے۔ ذرا غور سے۔ جی ہاں۔

وکیل:۔ فرمائیے۔

منشی:۔ اس پیشے میں سب سے پہلے چیز۔ گویا کہ سب میں پہلی موکلوں کو پھانسنا ہے۔ سمجھے جناب۔

وکیل:۔ موکلوں کو پھانسنا۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے منشی جی۔ گویا وکالت نہ ہوئی چڑی ماری ہو گئی۔

منشی:۔ اجی اس سے بھی زیادہ۔ آج کل کے موکل بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ دانے پانی کی لاگ پر نہیں آتے کمبختوں کو رسی سے باندھ کر رکھ پڑتا ہے۔ رکھا ہے۔ اور وہ پھر بھی تڑا تڑا کر بھاگ نکلتے ہیں۔ جی ہاں۔

نومبر ۱۹۶۱ء

وکیل:۔ پھر اس کا علاج کس طریقے سے کیا جائے۔

منشی:۔ بس گر کی بات ایک ہی ہے کہ موکلوں کو ڈرا دھمکا کر جھوٹی سچی اونچ نیچ سمجھا کر، بہلا پھسلا کر، سبز باغ دکھائے جائیں۔ جی ہاں۔ اور پھر

ایسا شیشے میں اتارا جائے، ایسا شیشے میں اتارا جائے کہ وہ آپ ہی کا دم بھرنے لگے۔ سمجھے جناب۔

وکیل:۔ خوب۔

منشی:۔ جی، اس میں کیا شک ہے۔ اور چاہے آپ ان کا ذرا سا بھی کام نہ کر کے دیں۔ انہیں سزائیں کروا دیں۔ ان کی قرقیاں کروا دیں پھر بھی

وہ آپ ہی کے نام کی مالا جپتے رہیں۔ اور اپنے گھر کا سارا زیور بیچ بیچ کر آپ کا محنتانہ ادا کرتے رہیں۔ اور آپ ہی کے گن گاتے رہیں۔

وکیل:۔ بس۔ جی۔ اس میں کیا شک ہے۔ اگر آپ نے اتنا کر لیا تو بیڑا پار ہے۔ جی ہاں۔

منشی:۔ جی ہاں بس آپ کا کام صرف اتنا ہی ہے۔ باقی عدالت جائے اور وہ۔ وکیل کا کام صرف یہی ہے کہ وہ اپنے موکلوں کو پوری طاقت

سے پکڑے رہے۔ جی ہاں۔

وکیل:۔ آپ نے تو کمال کر دیا۔ منشی جی۔ کس صفائی کے ساتھ کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے۔ گویا وکیل کا کام موکلوں کو تابع کرنا، محنتانہ

نذرانہ وغیرہ شکریے کے ہضم کرنا۔ بس۔

منشی:۔ (جلدی سے) اور منشیانہ نہ بھولیے گا۔ جناب دس فیصدی نقد، اس میں کیا شک ہے۔ اس میں کیا شک ہے۔

وکیل:۔ تو بھئی ان موکلوں کو تابع کرنے کا وہ کونسا عمل ہے۔ ذرا وہ بھی تو بتائیے۔ کیا طریقہ ہے۔ وہ کونسا ایسا منتر ہے کہ چھو کیا اور

موکل رام ہوا۔

منشی:۔ منتر وغیرہ کچھ نہیں بابو جی صاحب یہ چیز ہی اور ہے۔ مگر بہت مشق کی ضرورت ہے۔

وکیل:۔ پھر بھی طریقہ تو کچھ معلوم ہو۔

منشی:۔ دیکھئے پہلا منتر تو یہ ہے کہ جیسے ہی موکل کے قدموں کی آواز آئے آپ فوراً ایک موٹی سی کتاب کھول کر اس میں غرق ہو جائیں۔ تیوری چڑھا

کر، بھویں سکوڑ کر۔ آنکھیں جھکا کر اس قدر غور و خوض سے ماتھے پر بل ڈال کر مطالعہ کریں کہ آپ کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہے۔

وکیل:۔ تن بدن کا ہوش نہ رہے۔؟

منشی:۔ جی ہاں تن بدن کا ہوش نہ رہے۔ مگر موکل کی موجودگی کا ضرور ہوش رہے۔ جی ہاں۔ ذرا کنکھیوں سے موکل کو تاکتے رہنا چاہیئے۔ کہیں

کھسک نہ جائے۔ اس میں کیا شک ہے۔

وکیل:۔ ٹھیک، ٹھیک، ٹھیک۔ یہ خوب طریقہ ہے۔

منشی:۔ جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔ دوسری بات یہ کہ کبھی موکل سے سیدھے منہ بات نہ کیجئے۔ ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتے رہیئے۔ کاغذات

کو جھٹک پٹک کر نفرت کی نگاہ سے ذرا دیکھ کر دوسری طرف دھڑاک سے پھینک۔ اور اپنی بے پناہ معروفیت کا راگ، تیری

میٹنگ پر شروع کیجئے۔ پورے جوش کے ساتھ برابر الاپتے رہیئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ تیز کیجئے۔ اور پھر جھوٹی فیسوں کے حوالے کے

ساتھ اپنی شاندار فتوحات کا سکہ بٹھا کر موکل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح گھور کر دیکھئے کہ اس کی گھگھی بندھ جائے بس۔

اس میں کیا شک ہے۔

وکیل:۔ اجی منشی جی اس سے فائدہ؟

منشی :- فائدہ یہ کہ موکل پر ایسا رعب جمتا ہے۔ ایسا رنگ چڑھتا ہے کہ وہ سہم کر رہ جاتا ہے۔ اور سیدھا شیشے میں اترا چلا آتا ہے۔ جی۔
اس میں کیا شک ہے۔

وکیل :- خوب طریقہ ہے پھر؟؟

منشی :- ہونہہ تیسرا منتر یہ کہ۔ موکل کی بات کبھی غور سے سنئے۔ اس کی عاجزی اور غریبی پر کبھی ترس نہ کھایئے۔ صاف کہہ دیجئے کہ میں ایسے فضول مقدمات نہیں کرتا۔ شروع سے معاملات بگاڑ دیئے گئے ہیں۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ بہت محنت کرنی پڑے گی۔
وغیرہ وغیرہ۔

وکیل :- ہونہہ اور جو وہ مایوس ہو کر چلا گیا۔

منشی :- کیسے چلا جائے۔ ان باتوں سے تو ایسا گرویدہ ہوگا۔ کہ خوشامد نہ کرنے لگے تو میرا ذمہ۔

وکیل :- اور اگر وہ اتنا نہ دے سکے اور چل دے۔

منشی :- کیسے چل دے۔ وہ دے اور اس کا باپ دے۔ جب بالکل ہی جاتا دکھائی دے گا تو میں جو بیٹھا ہوں۔ ایسا آڑے ہاتھوں لوں کہ بچہ منہ کے بل گرے۔ قسم مالک کی میرے کاٹے کا علاج نہیں۔ جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے آدھے پونے پر فیصلہ کر کے چھوڑ دوں گا
جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔

وکیل :- طریقہ تو خاصا ہے۔

منشی :- جی اس میں کیا شک ہے۔ ایسی ترکیب ہے کمبخت پانی نہیں مانگ سکتا۔ جی ہاں۔ لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھیئے کہ اپنی فرضی مصروفیت کا ڈھنڈورا برابر ہوتے جائیں برابر۔ آپ کا سانس رکا اور موکل اکھڑا مسلسل کچھ نہ کچھ کہے جانا۔ بس یہ کامیابی کا راز ہے۔ اور ہاں یہ بھی یاد رکھیئے کہ موکل کو حق الیقین ہو جائے کہ۔

وکیل :- یہ گویا ذحل مل یقین کا بھائی ہے۔ بھائی کیا طریقہ ہے۔

منشی :- اجی ایسا یقین کہ جیسے پتھر کی لکیر۔ جی ہاں۔ یہ بات اس کے ذہن میں بٹھا دیجئے کہ معاملہ ہر چند معمولی ہی لیکن اگر اس نے آپ کو وکیل نہ کیا تو بس جان کا خطرہ ہے۔ جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔ یہ بھی ظاہر کرنا ضروری ہے کہ آپ کو موکل سے خدا معلوم کیوں ناحق ناحق کی ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ نسخہ بھی بڑا کارآمد اور مجرب ہے۔ جی ہاں۔

وکیل :- واہ واہ منشی جی۔ کیا کیا طریقے بتائے ہیں آپ نے۔ شاباش ہے آپ کو۔ آئندہ سے ہمارا یہی طریقہ رہے گا۔ اور آج سے اسی طریقہ پر عمل شروع ہوگا۔ اچھا۔ میں ابھی اندر جا کر کھانا کھاتا ہوں۔ کوئی ایسا ویسا آئے تو سنبھال لیجئے گا۔

منشی :- اس میں کیا شک ہے۔ اور ہاں سنئے تو چار روز ہوئے دفتر کا آدمی پیسے کہہ رہا ہے۔ کیا آپ نے کچھ ادھار لیا تھا۔

وکیل :- (ذرا شرمندہ ہو کر) ہاں بھئی، منشی جی، اب آپ سے چھپانے کا کونسا طریقہ ہے۔ گھر کی ضرورت کے لئے لئے تھے۔ واپس کہاں سے دیئے جائیں۔ کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر دیکھو۔ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔

منشی :- اس میں کیا شک ہے وہ کہتا تھا۔ لالہ جی سخت ناراض ہیں۔ اور دعویٰ کرنے کو کہتے ہیں۔ جی ہاں۔

وکیل :- آپ سلٹ لیجئے گا۔

منشی :- آپ نے بھی فکر کیا۔ آنے دو بدمعاش کو۔ بائیں ہاتھ سے ایسا پکڑ دوں کہ سب نام مالک کا۔ جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے

وکیل :- (قہقہہ) واقعی۔ اس میں شک کرنے کا کونسا طریقہ ہے۔ ہاہا (ہنستا ہوا اندر جاتا ہے) (اندر جا کر) اللہ دیئے او اللہ دیئے۔

اللہ دیا۔ آ گیا ہوں حضور۔

وکیل:۔ کہاں گیا بھئی اللہ دیا۔ کھانا وانا تیار ہے یا بازار سے منگایا جائے۔ ارے اللہ دیئے۔ او اللہ دیئے۔

اللہ دیا:۔ جی۔ یہ کھڑا تو ہوں۔ آپ کے پاس۔

وکیل:۔ جا بھئی دہی تولے کر آ۔ ارے۔ رے رے رے یہ کیا یعنی پورا گھر دھوبی گھاٹ بنا ہوا ہے۔ بھلا یہ کونسا طریقہ ہے۔

بیوی:۔ (دور سے) تشریف لے آئے آپ۔ طریقہ طریقہ جھاڑتے ہوئے۔

وکیل:۔ تے تے تے۔ میں کہتا ہوں کہ آخر اس ٹھنڈ میں اس طرح کپڑے دھونے کا کونسا طریقہ ہے۔ چلو۔ چلو چھوڑو اس گڑبڑ کو۔ کھانا دانا کھلواؤ۔ جلدی سے (وقفہ) بھئی کمال ہے ہر کام طریقے سے ہوا کرتا ہے۔ یعنی یہ کپڑے وپڑے دھونے کا کیا طریقہ نکالا ہے۔ بس اب ہو چکا۔ یا اب گھر کی دیواروں پر بھی استری ہوگی۔ چلو چلو آؤ۔ بس چھوڑو بھی۔ طریقے سے کھانا نکالو۔

بیوی:۔ (جل کر) بھاڑ میں جائے آپ کا طریقہ۔ کپڑے نہ دھوؤں۔ تو کیا موری کی چوہیا بنی رہوں۔ آپ کو تو خدا نے پیٹ بھر کے بے فکری بخش دی ہے۔ اتنا میرے لئے درد رکھتے ہیں تو بنوا دیجئے نا۔ دس بیس جوڑے۔ بکمبخت دھوبن تک کو تو پیسے جڑتے نہیں۔ ایک ہی جوڑا تن پر رہ گیا ہے۔ آپ کی سی حالت تو مجھ سے بنائی نہیں جا سکتی۔ کرکٹ کی حالت کے کپڑے بڑے سگھڑاپے سے پہنے پھروں۔ اور طریقہ طریقہ الاپتی رہوں۔

وکیل:۔ اُفوہ، اُفوہ خدایا رحم، مجھے کیا معلوم تھا کہ بھری بیٹھی ہو۔ ورنہ طریقہ سے گفتگو کرتا۔ بیگم، گھبراؤ نہیں۔ بہت جلد ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔ خدا نے چاہا تو میں اپنی بیگم کو زربفت وکم خواب کے کپڑے پہنوا دوں گا۔ جلد بہت ہی جلد بس دو ایک دن کی بات ہے۔ ہم نے ایک نیا طریقہ نکالا ہے۔

بیوی:۔ اجی بس رہنے دیجئے۔ ہر روز یہی سنتی ہوں کہ بس دو ایک دن کی بات ہے۔ میں تو عنقریب منشی جی سے تھوڑی سی افیم مانگنے والی ہوں۔

وکیل:۔ ارے رے رے۔ خدا کے لئے ایسا غضب نہ کرنا۔ لو چلو بس اب مان جاؤ۔ زیادہ باتیں بے طریقہ ہوتی ہیں۔ کھانا کھلواؤ لپک کر۔

بیوی:۔ آپ نے بھی تو گھر میں گھس کر ایسا شور مچانا شروع کر دیا۔ جیسے کوئی بڑے کماؤ تھکے ہارے آئے ہیں۔ اور آتے ہی تھیلیوں کے منہ کھول دیئے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔ لیکن کیا ریل پر جانا ہے۔ جو ایسی مارا ماری ہے۔

وکیل:۔ دیکھو بیگم۔ اب زیادہ طعنے ہم کسی طریقے سے نہیں سن سکتے۔ ریل پر نہیں جانا ہے تو کیا دنیا کا اور کوئی کام ہی نہیں۔ تم نہیں سمجھ سکتیں ایک وکیل کو کس قدر مصروفیتیں ہوتی ہیں۔

بیوی:۔ جی بڑی بھاری مصروفیتیں۔ واقعی دن دن بھر اونگھتے رہنا اور پھر نہایت خوبصورت اور نفیس ہوائی قلعے بنانا۔ بڑی بھاری مصروفیتیں ہیں۔ کیوں نہ ہوں۔ ہوں۔

وکیل:۔ ہا ہا ہا۔ کر گئیں نہ چوٹ طریقے سے۔ کیوں نہ ہو آخر وکیل کی بیوی ہو۔ ارے بھئی۔ اللہ دیئے۔ تو ابھی تک یہیں کھڑا ہے؟ لایا نہیں دہی۔

اللہ دیا:۔ پیسے تو دیجئے۔

وکیل:۔ ارے بھئی۔ تجھ سے لاکھ دفعہ کہا کہ ایسے معمولی سودوں کے لئے پیسوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ جا نکڑ والے پنساری سے ہمارا نام لے کر لیک نہیں کا بکس لے آ۔ اور اسی سے دو پیسے لے کر دہی لے آ۔

دیا:۔ اجی اسی کے پاس تو گیا تھا۔ وہ تو مارنے کو دوڑ رہا ہے کہ اب کے پہلے کے گیارہ روپے تین آنے تو لاؤ۔

پچھلا حساب تو صاف نہیں ہوا ہے۔ ہم لوگوں کو ادھار کس طرح دیں۔ اس طرح کا سودا ہمارے یہاں نہیں ہوتا۔

بل:۔ بڑا نامعقول ہے وہ۔ میں حرامزادے کے اوپر دعویٰ کر دوں گا۔

ری:۔ آخر یہ گیارہ روپے تین آنے ہو کس طرح گئے۔ آپ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ ایسے ایسے ٹٹ پونجیوں کے بھی دس دس اور بیس بیس کے قرضدار ہونے لگے۔

کیل:۔ دس دس اور بیس بیس کہاں سے ہو گئے۔ طریقے سے سنتی بھی ہو۔

یوی:۔ کہہ تو رہا ہے اللہ دیا۔ گیارہ روپے تین آنے چاہئیں۔

کیل:۔ بکتا ہے نامعقول۔ گیارہ روپے تین آنے نہیں۔ طریقے سے تین روپے گیارہ آنے ہوتے ہیں۔

اللہ دیا:۔ نہیں جی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ گیارہ روپے تین آنے چاہئیں۔ وہ کئی دن سے تقاضا کر رہا ہے۔

وکیل:۔ چپ رہ نامعقول بکے جاتا ہے۔ بکے جاتا ہے۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ جا جلدی سے دہی لے کر آ۔

اللہ دیا:۔ تو پیسے تو دیجئے بابو جی۔

وکیل:۔ پھر وہی پیسے پیسے کی رٹ لگائے جاتا ہے۔ جا باہر منشی جی بیٹھے ہوں گے۔ میرے نام سے دو پیسے لے لے۔ مگر دیکھ طریقے سے مانگیو (اللہ دیا گنگناتا ہوا جاتا ہے۔) خواہ مخواہ بات کا جھگڑا بنا دیتے ہیں یہ لوگ۔ دہی منگوانا نہ ہوا گویا کبھی قرقی نکلوانی ہو گئی۔ توبہ۔

بیوی:۔ میں کہتی ہوں۔ آخر یہ حالت کب تک جاری رہے گی۔ گھر کا سارا سامان میز کرسی، فرش فروش کے علاوہ میرا تار تار بک گیا۔ اور آپ کی وکالت کا چھکڑا ایسی دلدل میں پھنسا ہے۔ کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ میں پھر کہتی ہوں کہ چھوڑیئے اس وکالت پھکالت کو یہ مصیبت آپ کے بس کی نہیں۔

وکیل:۔ مگر اس مصیبت سے نجات پانے کا بھی تو کوئی طریقہ بتاؤ۔ اگر وکالت چھوڑ دی جائے تو پھر کیا کیا جائے۔ (وقفہ)

بیوی:۔ جوتوں کی دوکان۔

وکیل:۔ جوتوں کی دوکان۔ توبہ۔ توبہ۔ شے شے شے۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ کیا تم نے ہم کو بالکل ہی چمار سمجھا ہے۔

بیوی:۔ بالکل تو نہیں۔ ہاں خیر۔ خیر جانے دیجئے۔ اور یہ فرمایئے۔ آج کچہری کیوں نہیں گئے۔ مفت کی چھٹیاں خوب اڑاتے ہیں آپ۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کو جی نہیں چاہتا۔ پھر بھلا۔

وکیل:۔ دیکھو بیگم۔ یہ طعنوں کا طریقہ اچھا نہیں۔ کچہری کیا ہماری سسرال ہے کہ نہیں گئے تو تم گلہ کرنے بیٹھی ہو۔

(اللہ دیا گنگناتا ہوا آتا ہے)

اللہ دیا:۔ جی وہ کہہ رہے ہیں کہ میرے پاس زہر کھانے کو بھی پیسے نہیں۔ چار دن سے بیڑی تک سے ترس رہا ہوں۔

وکیل:۔ (ہار کر) بات تیرے کی ایسی کی تیسی۔ پھونکو دہی کو۔ کیا یہی طریقہ رہ گیا ہے۔ لاؤ جی۔ تم کھانا لاؤ۔ (وقفہ)

بیوی:۔ شرم تو نہیں آتی ہو گی (صندوقچہ کھولنے کی آواز) بے غیرتی عجیب نعمت ہے۔ جس کو خدا دے۔ لے رے اللہ دیئے پیسے لے جا دوڑ کے دہی لے آ۔

وکیل:۔ (خفیف ہنسی ہنستے ہوئے) تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم بہت اچھی ہو۔ نیک بیویوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ اچھا بیگم

اب ضد دوچھ کھولا ہے تو لاؤ ایک سگریٹ بھی پلا دو۔

بیوی:۔ جی نہیں معاف کیجئے گا۔ صبح سے دو سگریٹ آپ پی چکے ہیں۔ صرف تین باقی ہیں۔ ایک کھانے کے بعد ایک شام کو، ایک رات کے لئے۔ ٹھیک، ٹھیک حساب ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔

وکیل:۔ یہ حساب کتاب کا کیا طریقہ ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم۔

بیوی:۔ جی بڑی مہربانی۔ بڑی عنایت، آپ کا سر ابھی تک سگریٹ سے زیادہ قیمتی ثابت نہیں ہوا۔ زیادہ شوق پینی کرنی ہے تو اپنی جیب سے سگریٹ نوش فرمائیے۔ میں کہاں تک آپ کو دو پیکٹ روزانہ پلاؤں۔

وکیل:۔ دو پیکٹ روزانہ پلاتی ہو۔ اچھا خیر لاؤ۔ اس وقت تو دو۔ میں شام کو نہیں پیوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔

بیوی:۔ بہت دیکھ چکی ہوں۔ ایسے وعدے۔ اب کھانے کے بعد پیجئے گا۔

وکیل:۔ کھانے میں تو ابھی گھنٹوں پڑے ہیں۔

بیوی:۔ نہیں نہیں۔ کھانا تو تیار ہے۔ (اللہ دیا آتا ہے) لو وہ آگیا اللہ دیا۔ لا بھئی کھانا لا جلدی سے۔

وکیل:۔ (آہ سرد کے ساتھ) ہو بڑی ظالم، خیر دیکھا جائے گا۔

کوئی دم گر زندگانی اور ہے

ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

(برتنوں کی آواز)

اگر روزانہ سو سو سگریٹ نہ پی جایا کروں۔ تو بات ہی کیا۔ پھر تم جل جل کر کوئلہ کباب بن جاؤ گی۔ کیوں (ہنستا ہے)

بیوی:۔ (ذرا فاصلے سے) میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ جلیا بھنے۔ اور ابھی تو یہ دیکھنا ہے کہ آپ کی یہ دھواں دھاری آتی کس دن ہے

وکیل:۔ بہت جلد تم دیکھ لینا۔ بہت جلد۔

خدا ترا بت ناداں دراز سن تو کرے

بیوی:۔ جی ہاں۔ ؎

جفا کے تو کبھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

وکیل:۔ بھئی واہ واہ۔ بیگم مان گئے۔

اللہ دیا:۔ (گھبرایا ہوا) بابو صاحب، بابو صاحب۔ کوئی آیا ہے موکل۔

وکیل:۔ موکل۔ آگیا آگیا۔ ہو ہو ہو۔ ہی ہی ہی۔ کیا ک ک ک واقعی آگیا۔

کون ہے۔ کون ہے؟

اللہ دیا:۔ موکل۔

وکیل:۔ او ہو ہو۔ موکل موکل۔ آگیا۔ آگیا۔ کیا سچ۔

بیوی:۔ توبہ توبہ۔ اتنا شور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آگیا ہے تو آجائے۔

وکیل:۔ ارے اللہ دیئے۔ او اللہ دیئے۔ جا جا۔ دیکھ کرا۔ منشی جی سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ (ذرا فاصلے سے) جلدی آئیو!

(اللہ دیا جاتا ہے)

(منشی جی کی باتوں کی آواز آتی ہے)

(دھیمی آواز میں) ہاہاہا۔ ہاں۔ ہاں۔ کوئی ہے۔ واقعی کوئی موکل ہے۔ آگیا۔ آگیا۔ ہو ہو ہو۔

بیوی:۔ (بلند آواز سے) اتنی گھبراہٹ کاہے کی ہے۔ آگیا ہے تو بیٹھا رہے گا۔ کہیں بھاگا تو نہیں جاتا۔ آپ کھانا تو کھائیے۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ ناحق دیوانے بنے جا رہے ہیں۔

وکیل:۔ (دھیمی آواز میں) ش ش ش۔ چپ چپ چپ۔ تم نہیں جانتیں۔ یہ موکل لوگ۔ چھلاوے کی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کا یہی طریقہ ہے۔ کھانا فکر نہ کرو۔ آج ضرور اسے پھانسا جائے گا۔ منشی جی والے طریقے آج ہی آزمائے جائیں گے۔

(اللہ دیا آتا ہے) کیوں رے اللہ دیئے۔ کیا بات ہے۔؟

اللہ دیا:۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) منشی جی کہہ رہے ہیں کہ کوئی موٹی سی آسامی ہے۔ آپ ذرا اچھے سے کپڑے پہن کر ذرا جلدی آئیں۔

وکیل:۔ ہاں ہاں اچھے کپڑے۔ جلدی کرو۔ دیکھنا بھئی وہ میرا سلک کا کوٹ نکال دو۔ ذرا جلدی۔ ارے بھئی جلدی کرو۔ (دور سے) یہ کوٹ کیسا ہے؟ ارے یہ تو یہاں سے ادھڑ گیا۔ وہی ٹھیک رہے گا۔ نکال دیا۔؟ ارے بھئی جلدی کرو۔ یہ کیا طریقہ ہے؟ (دور سے) اس پر بھی سیاہی کے دھبے پڑے ہیں۔ (کپڑوں کی الٹ پلٹ کی آوازیں) (قریب سے) نکال دیا۔؟ نکال بھی چکو۔

بیوی:۔ توبہ ہے۔ نکال تو رہی ہوں۔ ہاتھ پاؤں پھلائے دیتے ہو۔ زمانہ بھر کا تو کھڑاگ بھر رہا ہے اس میں۔

وکیل:۔ ایسا بھی کیا پاتال میں رکھا ہے۔ ایک ہی تو کوٹ ہے۔ ارے جلدی کرو۔ موکل بھاگ جائے گا۔ (دور سے) یہ شیروانی کیسی رہے گی۔ (قریب سے) ارے اس پر تو چڑیا کی بیٹیں ہی بیٹیں پڑی ہیں۔ توبہ ہے یہ کیا طریقہ ہے۔ یہ دیکھوں۔ دکھانا یہ کیا ہے اچھا کپڑا ہے ہاں ہاں بس یہ ٹھیک رہے گا۔ نہایت نفیس۔ ارے یہ تو تمہارا جمپر ہے۔ لاحول ولا قوۃ بھلا یہ کیا طریقہ ہے۔ اتنی چیزیں بھی ٹھکانے سے نہیں رکھ سکتیں۔ میرے ٹرنک میں یہ کس طریقے سے گھس گیا۔

اللہ دیا:۔ جی وہ منشی جی کہہ رہے ہیں۔ ذرا جلدی سے کیجئے۔ مال ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔

وکیل:۔ ہاں، ہاں جلدی کرو۔ جلدی کرو۔ نکال بھی چکو۔ دیکھو بھئی۔ منشی جی سے کہو۔ طریقے سے بات کریں۔ بابو صاحب ابھی آتے ہیں۔ بحث تیار کر رہے ہیں۔ جا۔ لپک کر جا۔ ہاں ہاں یہی ہے لاؤ۔ جلدی۔ واسکٹ کی ضرورت نہیں لاؤ۔ اب وہ ٹائی ۔۔ دھودی کم تم نے۔ افوہ۔ یہ تو جگہ جگہ سے گل گیا۔ نہایت واہیات کپڑا نکلا۔ ہماری سسرال والے بھی بڑے کائیاں ہیں۔ جوڑا بھی دینے بیٹھے تو ایسا۔ کہ ایک دفعہ سے زیادہ پہننا نصیب نہ ہوا۔ بڑا دھوکا ہوا ہمارے ساتھ ۔۔ نئے نئے

بیوی:۔ (جل کر) کیا کہا۔ ہوش کی دوا کیجئے بندہ پرور۔ دعا دیجئے سسرال والوں کو جنھوں نے آدمی بنا دیا۔

وکیل:۔ خیر۔ خیر خیر۔ چھوڑو۔ اس بحث کو۔ جانے دو۔ ذرا اس کوٹ کے کالر کو دیکھو۔ بالکل دوہرا ہو گیا ہے۔

بیوی:۔ اب اس وقت استری تو نہیں ہو سکتی۔ لائیے ذرا پانی کا ہاتھ لگا کر درست کر دوں۔ (وقفہ)

وکیل:۔ اور ذرا پتلون کی کریز ملاحظہ ہو۔ کیا صراط مستقیم ہے۔ سبحان اللہ۔ بس بس زیادہ نہیں۔ اب ٹھیک ہو گیا۔

بیوی:۔ اور موکل سمجھے گا نہیں کہ ٹھیٹ جاڑوں میں وکیل صاحب ٹھنڈا سوٹ ڈانٹے ہوئے ہیں۔

وکیل:۔ ارے موکلوں کو اتنی تمیز نہیں ہوتی۔ ان کو تو بس یہ دکھائی دینا چاہئے کہ سوٹ ہے۔ (قدرے خاموشی) لیجئے ٹائی ٹھیک

کرنے میں ذرا ہاتھ لگا کر۔ کالر پھر مڑا جا رہا ہے۔

بیوی:۔ لائیے۔ میں پن لگا دوں۔ مگر پن کہاں سے ملے اس وقت۔؟ جلدی بھی دیجیئے۔ آپ یہاں ہاتھ رکھ لیجئے۔ گویا سر درد ہے۔

وکیل:۔ ہاں طریقہ تو اچھا ہے۔ لاؤ۔ اب تو سگریٹ دے دو۔ جلدی کرو۔ (صندوقچہ کھولنے کی آواز)

بیوی:۔ یہ لیجئے۔

وکیل:۔ ارے یہ سگریٹ کیا پورا پیکٹ دو جی۔ آخر موکل کو بھی پلانا ہوگا۔ یہ کون سا طریقہ ہے جی۔

بیوی:۔ لو بابا لو۔ پیچھا چھوڑو۔ (جلدی جلدی آتے ہیں)

وکیل:۔ اینہم۔

منشی:۔ لیجئے بابو صاحب تشریف لے آئے۔ جی ہاں۔

نووارد:۔ آداب عرض کرتا ہوں جناب۔

وکیل:۔ (بے رخی سے) منشی جی وہ رعنا دلاور سنگھ کو تار دید یجئے اگر محنتانہ کے بقایا پانچ سو وصول نہ ہوں تو ہم اپیل میں بحث نہیں کریں گے۔ (رونے کی آواز بتدریج بڑھتی ہے) اور وہ دیکھئے تو خان بہادر صاحب ہائی کورٹ لے جانا چاہتے ہیں۔ ان کو بھی لکھ دیجئے کہ ہزار سے کم نہیں لیں گے۔ مقدمہ شروع سے آخر تک غلط طریقے پر چلایا گیا ہے۔ بہت محنت کرنی پڑے گی۔ یہ لوگ اتنا دق کرتے ہیں کہ توبہ۔ اب انہیں کس طرح سمجھایا جائے۔ کہ میری یہاں سے ایک دن کی بھی غیر حاضری لاکھوں روپے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ صاف صاف لکھ دیجئے کہ آپ نے ایک ہزار روپے بذریعہ تار بھیجے ہیں وہ امانتاً محفوظ ہیں۔ ایسے پیچیدہ معاملات کی پیروی اتنے کم محنتانہ میں کیسے کی جا سکتی ہے۔ ابھی گذشتہ ہفتے لالہ رگھومل نے اپنی اپیل پر چار ہزار دیئے تھے۔ مگر کام بھی تو ہم نے ایک لاکھ کا کیا تھا۔

نووارد:۔ جی میں اس لئے حاضر ہوا تھا۔ کہ۔

وکیل:۔ ہاں اور دیکھئے۔ مہارانی صاحبہ رام نگر نے اپنی مثلیں منگوائی ہیں۔ وہ آج ہی بذریعہ رجسٹری بھیج دیجئے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیجئے کہ آپ کے ذمہ محنتانہ کے سات سو بقایا ہیں۔ امید ہے کہ جلد از جلد مرحمت فرمائے جائیں گے۔ بلکہ میری رائے میں تفہیم نامے کا مسودہ روک لیجئے۔ محنتانہ وصول ہونے پر بھیج دیجئے گا۔ اور

نووارد:۔ میں نے کہا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس لئے۔

وکیل:۔ (پورے جوش میں) اور ہاں منشی جی۔ خوب یاد آیا۔ کل سیشن کورٹ میں بدر الدین شمس الدین والے مقدمہ کی تاریخ معلوم کر کے میری ڈائری میں لکھ دیجئے۔ محنتانہ وصول ہو چکا ہے۔ پانچسو دیئے ہیں۔ پرانے موکل ہیں ان کے ساتھ رعایت کرنا ہی پڑتی ہے۔ اور سنیئے ورکنز فیڈریشن والوں کو تار دید یجئے کہ میں جلسہ کی صدارت کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ کونسا طریقہ نکالا ہے۔ بیکار کی علت۔ اور دیکھئے تو یہ کاغذات نواب حیدر حسن خاں دے گئے ہیں۔ گورنر جنرل کے نام پٹیشن لکھنی ہے۔ ان کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ پرانے تعلقات اب تو وبال جان ثابت ہونے لگے۔ دو ہزار کا چیک دے گئے ہیں۔ کیا کہا جائے خیر، دراز میں سے چیک نکال کر آج ہی بینک میں جمع کرا دیجئے گا۔

نووارد:۔ (بے چین ہو کر) اجی وکیل صاحب۔ میں نے کہا۔ ذرا میری تو سنیئے۔

وکیل۔ (قدرے جھنجھلا کر) ٹھہریئے، ٹھہریئے۔ دیکھتے نہیں ہیں آپ کہ مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ آخر کار کام ہی کر رہا ہوں خالی تو بیٹھا نہیں۔ یہ کون سا طریقہ ہے۔ اگر صبر نہیں ہو سکتا تو تشریف لے جایئے۔

(منشی جی اشارے سے منع کرتے ہیں اور کھکھارتے ہیں)

منشی۔ اس میں کیا شک ہے۔ اس میں کیا۔

نووارد۔ مگر میں تو . . . . . مجھے تو۔

وکیل۔ جمشید جی بنام مرتضیٰ خاں میں فہرست گواہان اور طلبانہ داخل ہو گیا یا نہیں۔ اور سنیئے تو وہ قلندر خان اپنے ریاستی معاملات میں مجھ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ آنے جانے کا کرایہ اور محنتانہ سو روپے یومیہ کے حساب سے ان سے پہلے لیجئے گا۔ ہیجہ آپ۔ (نووارد سے) ہاں جناب فرمایئے۔ آپ کا کیا معاملہ ہے۔

نووارد۔ میں نے عرض کیا کہ . . . .

وکیل۔ ہاں بھئی منشی جی۔ خوب یاد آیا۔ ظہور الدین بنام کرم الٰہی میں جواب دعویٰ تیار کرنا ہے۔ جی۔ جی۔ فرمایئے۔

نووارد۔ میں نے عرض کیا کہ دو ہفتہ سے آپ کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔ کئی دفعہ کچہری گیا۔ وہاں آپ کو کوئی جانتا بھی نہیں جو جانتے ہیں۔۔ انھوں نے کہا کہ آپ کچہری کبھی تشریف نہیں لے جاتے۔ خیر چند ضروری باتیں دریافت کرنا تھیں۔

وکیل۔ فرمایئے۔ دیکھنا منشی جی لالہ کانشی ناتھ کا جو فائل ہے میز پر رکھ دینا۔ یہ مقدمہ بہت سنگین ہے۔ ممکن ہے پریوی کونسل تک جانا پڑے۔ جی۔

نووارد۔ بے ادبی معاف فرمایئے گا۔ اندازاً آپ کی سالانہ آمدنی کتنی ہوگی۔؟

وکیل۔ یہ کیا طریقہ ہے۔ عجیب بیہودہ سوال؟

نووارد۔ جی ہاں۔ کیا عرض کیا جائے۔ لیکن گستاخی معاف فرمایئے گا۔ گذشتہ سال کی نسبت اس سال جناب کی مصروفیات میں کوئی نمایاں تبدیلی تو نہیں ہوئی۔

وکیل۔ نہیں کوئی طریقے کا فرق نہیں ہوا۔ جو حال پہلے تھا اب بھی وہی حال ہے۔

منشی۔ جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔ عرصہ سے ایک ہی حالت ہے۔ جی ہاں۔

نووارد۔ پھر جناب کوئی تخمینہ قائم کر کے مجھے بتا سکیں گے۔ (قدرے خاموشی)

وکیل۔ میں حساب و کتاب تو طریقے رکھتا نہیں۔ لیکن یوں سمجھئے۔ کہ اوسطاً ریاستوں کا کام چار پانچ ہزار روپے ماہوار رہتا ہے۔ اور، اور دیگر مقدمات بھی کوئی ایسے سمجھئے کہ چھ سات ہزار ماہوار کے پڑتے ہیں۔

نووارد۔ جی درست ہے۔ کیوں نہ ہو، کیوں نہ ہو۔

وکیل۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ سمجھئے۔ مگر ان بے طریقے سوالوں سے آپ کا مطلب۔

نووارد۔ جی کچھ نہیں۔ میرے پاس آپ کی آمدنی کا تخمینہ آیا تھا۔ جس میں آپ کی اوسط آمدنی ۳۰۰ روپے سال درج تھی۔

منشی۔ اوہ . . . . قہ قہ قہ۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ حضرت وہ کوئی اور ہوگا۔ قہ قہ قہ

نووارد۔ جی ہاں میں خود حیران تھا کہ آپ جیسے چوٹی کے وکیلوں کی اتنی قلیل آمدنی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے حاضر ہوا تھا۔ شکر ہے میرا گمان صحیح نکلا۔ آپ کی آمدنی بیس ہزار روپے سالانہ سے کسی طرح کم نہیں۔ نہایت خوب۔

وکیل:۔ لیکن آپ کو میری آمدنی سے کس طریقے سے دلچسپی ہے۔

نووارد:۔ جی مجھے تو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ البتہ سرکار دولت مدار کو انتہائی دلچسپی ہے۔

وکیل:۔ سرکار دولت مدار!! یعنی یہ کیا طریقہ ہے۔

نووارد:۔ یعنی انکم ٹیکس۔ لے یہ لیجئے۔ اس فارم کی خانہ پری میں نے کر رکھی ہے۔ آپ دستخط فرما دیں۔ شکریہ۔ آداب عرض۔

وکیل:۔ ان۔ کم۔ ٹیکس ۔۔۔ (دیوانہ وار) ان کم ٹیکس۔ بیس ہزار روپے سال۔ منشی جی۔ کچھ سنا آپ نے۔

منشی:۔ اس میں کیا . . . .

وکیل:۔ اس میں شک کا بچہ ۔۔۔ (لوگوں کا شور)

آواز ۱:۔ مکان کا کرایہ لاؤ۔ ابھی چھ مہینے سے کرایہ نہیں دیا۔

آواز ۲:۔ گیارہ روپے تین آنہ پان سگریٹ کے رکھ دو اسی وقت۔

آواز ۳:۔ کپڑوں کی دھلائی کے بیس روپے چودہ آنے ابھی رکھ دو۔

آواز ۱:۔ میرے چار سو اڑتالیس

آواز ۲:۔ میرے گیارہ روپے تین آنے

آواز ۳:۔ میرے بیس روپے چودہ آنے

وکیل:۔ ارے بھئی یہ کیا طریقہ ہے وہاں کیوں شور مچا رکھا ہے۔ ادھر آؤ۔ آ بھی جاؤ۔ اب کاہے کا تکلف ان کم ٹیکس۔

آوازیں:۔ لاؤ، لاؤ۔ ہمارا قرضہ۔ ہمارے روپے۔ مکان کا کرایہ۔ سامان کی قیمت۔

وکیل:۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم سب کے جو جو ہاتھ لگے۔ فوراً لے جاؤ۔ ورنہ انکم ٹیکس (ہنستا ہے) ہا ہا۔ یہ الماریاں یہ کتابیں یہ میز۔ یہ کرسی۔ سب لے جاؤ۔ ہا ہا۔

منشی:۔ اب کیا ہوگا۔ بابو صاحب۔

وکیل:۔ اب کیا ہوگا۔ تر تر تر۔ جوتوں کی دوکان (تیزی سے) منشی جی۔ آپ فوراً یہاں سے نکل جائیے۔ فوراً۔ جلدی۔ ورنہ آپ کی کھوپڑی میں نال جڑ دیئے جائیں گے۔

منشی:۔ اس میں کیا . . .

وکیل:۔ اس میں کیا شک کا بچہ۔ نکل جاؤ فوراً۔

(چیخ کر) فوراً طریقے کے ساتھ

(فیڈ آؤٹ)

سید علی اکبر قاصد
(انگریزی سے)

تلافی

فرانڈ کہنے لگا: "اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ اس زندگی میں ہر چیز کی تلافی موجود ہے تو مجھے بتاؤ کہ اس کا وجود کہاں ہے؟" "میں دو سال قبل آسٹنڈ کے ایک ہوٹل میں ترجمان تھا اور بندرگاہ پر جہازوں کے انتظار میں گھنٹوں گذار دیا کرتا تھا۔ یہ جہاز میری قربان گاہ کے لئے بھیڑیں لایا کرتے تھے۔ اسی زمانہ کی بات ہے کہ ایک نوجوان سستے قسم کے جواہرات کی دوکان کیا کرتا تھا اس کا نام مجھے معلوم نہیں اس لئے کہ ہم لوگ اسے "چک چک" کے نام سے پکارتے تھے لیکن میں اسے جانتا تھا اور وہ اس لئے کہ ہم ترجمان لوگوں کو سبھوں کو جاننا پڑتا ہے۔ وہ جنوبی اٹلی سے آیا تھا۔ اور اپنے کو اطالوی کہتا تھا لیکن نسلاً شاید وہ الجیرین یہودی تھا اور ذہین بھی، جو یہ جانتا تھا کہ انگلستان کے علاوہ آج کل یہودی ہونا کہیں بھی فائدہ مند نہیں۔ اس کی ناک اور اس کے خوبصورت گھونگھریالے بالوں والے سر کو دیکھنے کے بعد اس موضوع پر صرف چند ہی باتیں اور کہی جا سکتی ہیں۔ لباس جو وہ پہنے ہوئے تھا اسے ایک انگریز سیاح نے دیا تھا۔ فلالین کا ایک پائجامہ، ایک پرانا لمبا کوٹ اور ایک گول ٹوپی بس یہی اس کا لباس تھا اور کتنا لمبا چوڑا! جی ہاں! لیکن خیال تو فرمائیے کتنا سستا! اس کے بعد اس میں صرف ٹائی ہی ایک ایسی چیز تھی جو اس کی اپنی معلوم ہوتی تھی۔ دونوں کنارے ادھڑے ہوئے تھے اور اسے وہ لمبے کالر کے لگائے تھا۔ وہ کچھ زیادہ دبلا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ دن بھر میں اس کی ساری غذا آدھ پاؤنڈ روٹی تھی یا اتنی ہی سوئیاں جن میں پنیر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی ہوتا تھا۔ مخصوص تہواروں کے دنوں میں سموسے کے کچھ ٹکڑے بھی ہوا کرتے تھے۔ ان کپڑوں میں جو در حقیقت ایک موٹے تازے آدمی کے لئے بنائے گئے تھے وہ اپنے نمایاں بڑے سر کے ساتھ "کوا ہانک" معلوم ہوتا تھا۔ یہ اطالوی بھی مغرب کے چینی ہوتے ہیں۔ وہ مکڑی کی طرح یا پھر وسط ایشیا کے باشندوں کی طرح نکال باہر کئے جاتے ہیں اور یہ اس لئے کہ زندگی وہاں ناممکن سی ہو جاتی ہے۔ انہیں ہر ملک میں ایسی سوسائٹی ملتی ہے۔ جو زندگی شروع کرنے میں ان کی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جب ایک مرتبہ زیور، جواہرات یا جو بھی ان کے پیشے کی چیزیں ہوں مہیا ہو جاتی ہیں تو وہ بلا کسی چیز کے زندہ رہتے ہیں۔ نہ کچھ پیتے ہیں اور نہ کسی چیز پر پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ اور تمباکو نوشی؟ جی ہاں! وہ تمباکو پیتے ہیں اگر آپ انہیں دیدیں۔ کبھی ان کی عورتیں ساتھ ہوتی ہیں لیکن زیادہ تر وہ تنہا ہی ہوتے ہیں اور اس طرح وہ زیادہ روپیہ کما سکتے ہیں۔ ان کا مطمع نظر یہ ہوتا ہے۔ کہ کوئی سو پاؤنڈ اکٹھا کر لیں اور امیر بن کر اٹلی واپس جائیں۔ آپ کسی اطالوی کو گھر پر دیکھنے کے عادی ہوں تو یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ وہ اپنے ملک کے باہر کتنی جانفشانی سے کام کرتا ہے اور کتنا کفایت شعار ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے چین والے رہتے ہیں: چک چک تنہا تھا اور ایک غلام کی طرح محنت کا عادی ہو۔ دن رات وہ اپنی دوکان پہ رہتا۔ اسے نہ تو جھلس دینے والی گرمی کی پرواہ تھی اور نہ تیز و تند آندھی کی۔ اکثر وہ اپنی دوکان پر کھڑے کھڑے بھیگ بھی جاتا تھا لیکن ادھر سے گزرنے والے ہر راہگیر کی نظریں اس کے خنداں چہرے اور پھیلے ہوئے ہاتھ پر جن میں زیور ہوتے تھے

مزدور بنی تھیں۔ وہ عورتوں سے بہت اخلاق سے پیش آتا تھا اور انہیں متاثر کرنے کی کوشش کرتا تھا اس لیے کہ اس کے کاروبار کا تعلق
زیادہ تر اسی صنف سے تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے وہ عورتوں کو کس طرح گھورتا تھا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فطرتاً وہ کافی بدطینت تھا
لیکن آپ جانتے ہیں کہ بیکار رہنے میں بھی روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اور وہ ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا تھا۔ کھانے پینے کا روزانہ خرچ صرف دو پنس
تھا۔ چار پنس فی شب کا اس کا کرایہ تھا جہاں اسی کی طرح بہت سے لوگ رہا کرتے تھے۔ گویا اس کے روزانہ اخراجات صرف چھ پنس تھے۔ ایک
ہفتہ میں تین شلنگ چھ پنس۔ کوئی دوسرا انسان تو شاید ہی زیادہ دنوں تک اس طرح رہ سکتا۔ خود میرا کم سے کم روزانہ خرچ دس پنس ہے۔ جو
قطعاً پھولوں کی سیج نہیں مگر ہاں تمباکو کے بغیر جینا محال ہے۔ کیونکہ انتہائی غربت میں بھی تمباکو نوشی ہی ایک ایسی چیز ہے جو چھوڑی نہیں جا سکتی
لیکن اطالوی تو بغیر اس کے بھی رہ جاتے ہیں۔ چک چک تجارت کرتا تھا آپ کہیں گے یہ کوئی بہت مشکل کام نہیں۔ ایک آدھ گھنٹہ کوشش
کر کے دیکھئے۔ کہیں آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد تو کوئی سودا ہوتا ہے اور چک چک کی چیزیں تو ہلکی تھیں۔ بروچ اور بالوں کے پن تھے جن
پر اطالوی مینا کاری تھی اور کپڑے تک کے زیور تھے۔ اکثر شام کو میں نے دیکھا کہ وہ سارے دکان کے اونگھ رہا ہے۔ لیکن بلی کی طرح اس
کی آنکھیں ہمیشہ نیم وا رہتی تھیں۔ اس کی روح دوکان میں اٹکی تھی وہ ہر چیز کی بغور نگرانی کرتا تھا اور یہ سب اس لئے کہ اپنا قیمتی سامان بیچ سکے
اسے کسی دوسری چیز سے دلچسپی ہی نہ تھی وہ ساری دنیا سے الگ تھا۔ خلوص، سمندر اور تماشے یہ سب اس کی نظروں میں واہیات اور حماقتیں تھے
اسکے پاس دوکان تھی اور اس کی زندگی کا مقصد صرف سودا بیچنا تھا۔ وہ اس آدمی کی مانند تھا جو مسرت و ہمدردی کے نقطۂ نظر سے علیحدہ کر کے ایک
بکس میں بند کر دیا گیا ہو۔ اور جس کی عجیب دنیا میں کوئی دوسرا جذبہ پہونچ ہی نہ سکتا ہو۔ ایک مرتبہ اس نے کہا "میں جنوب کا رہنے والا ہوں"
اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سر سے سمندر کی سمت اشارہ کیا۔ "وہاں مصائب بہت ہیں۔ وہاں مجھے ایک لڑکی ملی تھی جیسے مجھے اب دیکھ
کر وہ مغموم نہ ہوگی بخدا وہاں تو آدمی بھوکا مرتا ہے۔ حقیقتاً وہاں بہت مصائب ہیں۔"

میں چک چک کے متعلق یہ گفتگو جذبات کی رو میں بہہ کر نہیں کر رہا ہوں وہ بہت مغرور تھا۔ لیکن اس کا غرور جنوب میں نہ ہونے
کے مصائب کو کم نہیں کرتا تھا اپنے گھر کی چمکتی ہوئی دھوپ اور اس لڑکی کی کمی کو بھی پورا نہ کرتا تھا۔ غرور کی زیادتی کے ساتھ اس کی مصیبتیں
بھی زیادہ تھیں کسی گونگے جانور کی طرح وہ ان چیزوں کا طلبگار تھا لیکن اس کا یہ بیان کہ وہاں تو آدمی بھوکا مرتا ہے میرے سامنے تھا ظاہر ہے کہ
اس نے بھوکوں مرنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ اس کی امیدیں اس کے ساتھ تھیں "خدا ٹھہرنا" وہ برابر کہا کرتا تھا۔ کہنے لگا "اگلے سال میں
برسلز میں تھا۔ دوکانداری بالکل خراب تھی ________ آخر انہوں نے میرا سارا روپیہ
سوسائٹی کے لئے لے لیا اور اس کے بدلے مجھے یہ دوکان دیدی۔ یہ ٹھیک ہے۔ اس موسم میں نفع ہوتا ہے۔"

آرائشی اخلاق والی عورتوں میں بہت سی اس کی خریدار تھیں جن کی نظریں اس کے حسین بالوں والے سر پر جمی رہتی تھیں۔ وہ جانتی
تھیں کہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں اور یہ کہ چک چک کے استقلال میں کچھ المیہ عناصر بھی تھے۔ اس کا لباس بالکل جھول تھا۔ اس کی بڑی بڑی
سیاہ آنکھیں اور اس کے نازک گرد آلود ہاتھ! — وہ بدصورت نہ تھا۔

ایک دن بوندا باندی ہو رہی تھی میں ٹہلتے ہوئے آیا۔ کوئی آدمی اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ چک چک نے اپنی دوکان کو ایک
پرانے ترپال سے ڈھانک رکھا تھا۔ وہ ایک لمبا سگار پی رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ارے چک چک تم سگار پی رہے ہو۔"
"ہاں یہ بہت خوب" اس نے کہا۔

میں نے کہا۔ "تو پھر تم ہر روز سگار کیوں نہیں پیتے جبکہ کہیں کے ہاتھ تمہاری بھوک میں یہ سکون بخش ثابت ہوگا۔"

اس نے اپنا سر ہلایا اور کہنے لگا۔ "سگار پینے میں پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ لیکن یہ سگار مجھے مفت ملا ہے۔ ایک مہربان شخص نے مجھے دیا ہے ایک سرخ چہرے والے انگریز نے۔ وہ اسے پی ہی نہ سکا۔ وہ بیوقوف کچھ نہ جانتا تھا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ بہت اچھا ہے۔"

لیکن چک چک خود ہی کچھ نہ جانتا تھا۔ وہ بہت دنوں سے علم کی دنیا سے الگ تھا۔ اس کا کھانا، پینا سانس لینا اور سگار پینا ان سبھوں کا نظارہ بہت دلچسپ تھا۔ لذات حواسی کا ایک مجسمہ۔

اختتام موسم آگیا تھا اور ہمارے جیسے تمام پرندے جو باہر سے آنے والوں کا شکار کرتے ہیں اڑنے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ لیکن میں ٹھہرا رہا۔ مجھے یہ جگہ پسند تھی۔ خوش رنگ مکانات، بندرگاہ میں مچھلیوں کی خوشبو، اچھی ہوا، دور تک پھیلا ہوا سبز سمندر، ساحل، ان تمام چیزوں کی یاد میرے دل میں موجود ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں اس جگہ کو چھوڑتے ہوئے ہمیشہ مغموم ہو جاتا ہوں لیکن چک چک کہا کرتا تھا "موسم ختم ہونے کے بعد یہاں انسان یہاں بھوکوں مرنے لگتا ہے۔"

آخری دن تھے، شام کو میں حسب معمول ایک کیفے میں گیا جو دو حصوں میں منقسم تھا۔ شاید ہی وہاں بیس آدمی ہوں۔ یہ کیفے ایسا تھا جہاں صرف وہی لوگ آتے تھے جن کی زندگی غیر مستقل تھی۔ عیار، مسخرے، گئی گذری ایکٹرسیں، نمائشی پاکدامن عورتیں، ترکی، اطالوی، یونانی اور ہر وہ شخص جو چوری کا عادی ہو وہاں آتا تھا۔ یہ دکان دھوکہ بازوں اور محنتی آدمیوں کی ایک اچھی خاصی نمائش گاہ تھی۔ یہ بہت دلچسپ لوگ تھے اور میں ان کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ تقریباً تمام لوگ جا چکے تھے اس لئے اس شام ہوٹل میں بہت کم لوگ تھے۔ اور اندرونی کمرے میں صرف تین اطالوی تھے۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا۔ اتنے میں چک چک بھی وہاں آگیا۔ میں نے پہلی دفعہ اسے ایسی جگہ دیکھا جہاں کچھ خرچ کیا جا سکتا ہو۔ وہ کتنا سنجیدہ تھا۔ چھوٹا جسم اور بڑا سر دیکھنے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اس نے ایک ہفتہ سے کچھ کھایا نہیں ہے اور ایک ہفتے سے کیا! وہ تو ایک سال کا بھوکا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بیٹھ گیا۔ ایک بوتل شراب منگوائی ساتھ ہی ساتھ گپ شروع کی اور انگلیوں سے میز بجانے لگا۔ "اوہ ہو!" ایک اطالوی نے کہا: "ذرا چک چک کو دیکھو وہ ایک بیک بلبل کی طرح کیسے چہکنے لگا۔" "چلو بھئی چک چک ہمیں بھی کچھ پلاؤ۔ آج تو تمہارا ستارہ بہت عروج پر معلوم ہو رہا ہے۔" چک چک نے ہمیں شراب پلائی اور دوسری بوتل لانے کا حکم دیا: "اوہ ہو!" دوسرے اطالوی نے کہا: "وہ اپنے گھر والوں تک کو بھول چکا ہے۔" ہم لوگ پیتے رہے اور چک چک سبھوں سے زیادہ تیزی سے پینے میں مشغول رہا۔ کیا آپ اس قسم کی پیاس کو جانتے ہیں جب شراب اس لئے پی جاتی ہے کہ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو محسوس کیا جا سکے عموماً لوگ ایسی حالت میں ہاتھ نہیں روک سکتے۔ اور جب تک کہ مدہوش نہ ہو جائیں پیتے چلے جاتے ہیں چک چک ان میں سے نہ تھا۔ وہ بہت ہوشیار تھا اور دوربین بھی۔ وہ اپنے کو قابو میں رکھنا جانتا تھا لیکن ایسی حالتوں میں تھوڑی سی بات بھی بہت ہو جاتی ہے۔ وہ خوش نظر آرہا تھا۔ ایک ایسے اطالوی کے خوش ہونے میں کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوتا جو مہینوں سے سوکھی روٹی اور ابلی سویاں اور سادے پانی پر اپنی زندگی گذار رہا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کی خوشی بے وجہ نہ تھی۔ وہ ہنستا اور گاتا رہا اور دوسرے اطالوی بھی اس کا ساتھ دیتے رہے۔ ایک نے کہا، "معلوم ہوتا ہے کہ چک چک کی تجارت اچھی چل رہی ہے۔ چک چک! ہمیں بھی بتاؤ کہ تم نے اس موسم میں کتنا کمایا؟" جواب میں چک چک صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ "ارے" اطالوی نے کہا "ڈر لگتے ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ایمانداری سے کہتا ہوں کہ میں نے پانچ سو فرانک بنائے۔ اور بس۔ ایک پائی فاضل نہیں اور اس میں بھی آدھا میرے حصہ دار کا ہے۔"

ان میں سے ہر شخص اپنے نفع کا ذکر کرتا رہا۔ مگر چک چک خاموش مسکرا یا کیا۔

"ارے بھئی چک چک! یہ رہزن کی طرح خاموشی کیوں؟ اک ذرا صاف گوئی سے کام لو۔"

"وہ مجھ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میں نے سولہ سو بنائے ہیں۔" دوسرے اطالوی کی آواز گونجی۔

"اچھا بھئی!" چک چک نے کہا: "چار ہزار کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" ہم لوگ ہنسنے لگے: "اوہ ہو۔"

ایک نے کہا: "ہمارا مذاق اڑایا جا رہا ہے!"

چک چک نے اپنے بوسیدہ کوٹ کے آگے کا بٹن کھولا: "دیکھو!" وہ چلایا اور اس نے ہزار ہزار کے چار نوٹ نکالے۔ ہم لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ہم لوگ اسے عجیب نظروں سے گھورنے لگے۔

"دیکھو!" وہ کہنے لگا، "کفایت شعاری سے کیا کیا ہوتا ہے۔ میں نے کچھ خرچ نہیں کیا۔ ایک ایک پائی یہاں موجود ہے۔ اب میں گھر جا رہا ہوں۔ وہاں مجھے میری محبوبہ ملے گی۔ میری سلامتی کی دعا کرو۔" وہ پھر انگلیوں سے میز بجانے لگا۔ ہم لوگ کچھ دیر اور ٹھہر گئے ایک بوتل اور چڑھائی۔ چک چک نے قیمت ادا کی۔

دوسری صبح میں اسی ہوٹل میں بیٹھا "ماک" پی رہا تھا کیونکہ میرے پاس کوئی دوسرا شغل نہ تھا کہ یکایک چک چک دوڑتا ہوا آیا۔ وہ میز پر گر پڑا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لیکر سسکیاں بھرنے لگا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے: "ان لوگوں نے مجھے لوٹ لیا۔" وہ چلایا، "میں تباہ ہوگیا، مجھے ایک ایک پائی سے محروم کر دیا۔ میں سویا ہوا تھا اور انہوں نے مجھے لوٹ لیا۔ وہ یہاں رکھا ہوا تھا۔ میرے تکیہ کے نیچے میں سر رکھے اس پر سویا ہوا تھا اور اب سب غائب ہے۔ ایک کوڑی بھی نہیں بچی۔" وہ سینہ کوبی کرنے لگا۔ "ایں! تمہارے تکیہ کے نیچے سے! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم؟" وہ چیخا: "میں کہتا ہوں میرا کل روپیہ غائب ہے کل روپیہ۔ میں نشہ میں چور تھا۔" ―― وہ بار بار چلا رہا تھا: "میرا کل روپیہ میرا کل روپیہ۔" ―― میں نے پوچھا: "کیا تم نے پولیس میں خبر کی؟" "اس نے پولیس میں خبر کر دی تھی۔ میں نے اسے تسلی دینی چاہی مگر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوا ہوگا۔ وہ آپے سے باہر تھا۔ پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ وہ کیوں کرتے؟ اگر وہ روسچائلڈ ہوتا تو بات ہی دوسری تھی لیکن وہ تو ایک غریب اطالوی تھا جو اپنا سب کچھ کھو چکا تھا۔ چک چک نے اپنی دوکان، سامان اور اپنی تمام چیزیں ایک دن قبل فروخت کر دی تھیں اس لئے اس کے پاس برسلس تک کے ٹکٹ کا بھی پیسہ نہ تھا۔ اسے پیدل جانا پڑا۔ وہ روانہ ہوگیا ―― اور میں آج تک اسے روانہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اس کی چھوٹی سخت ہیٹ اس کے خوبصورت سیاہ بالوں پر جمی ہوئی تھی اور اس کی ٹائی کے کنارے اُدھڑے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ شیطان کی مانند تھا جو باغ عدن سے نکال باہر کیا گیا ہو۔

اس کا کیا حشر ہوا؟ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ہاں اتنا ضرور ہے کہ جس تلافی کا آپ اس نودولیہ پر ذکر کر رہے تھے کہیں اس کا وجود معلوم نہیں ہوتا۔

فرانڈ خاموش ہو چکا تھا۔

ایس منّانی

اضطراب

دودھیا چاندنی پھیلانے کے لئے جب کثیف اور میلے بادلوں کے غول سے سولہویں رات کے چاند کا گولا نکلا تو واحد دادا کو ایسا لگا جیسے اس کی سولہ سالہ مُنّا اپنے میلے کچیلے اس کمرے کے دروازے پہ آکھڑی ہوئی جس کی دیواریں چونے سے پوتی نہیں گئی ہوں اور جو ایک مدت تک چولہے اور ڈھبری کے دھوئیں کی وجہ سے اپنا رنگ بدل چکی ہو ———— اس کی مُنّا بھی تو چاند کا ایک گولا ہی تھی جو اپنی روپہلی چاندنی سے اس کی آنکھوں کو روشن کئے ہوئے تھی اور جس سے اس کے دل کو ایک انجانی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ اس کی مُنّا ایک کھلتا ہوا پھول ہی تو تھی جس کی خوشبو سے اس کی دنیا معطر تھی۔ فیکٹری میں کام کرتے ہوئے واحد دادا کو تمام دن مُنّا کا خیال رہتا اور وہ اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں سوچتا رہتا۔ اس کی زندگی میں بجز مُنّا کے اور کیا رکھا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنی مُنّا کے لئے ہی جی رہا تھا ـــ وہ چاہتا تھا کہ مُنّا کے سہرے کے پھول کھل جائیں اس کے ہاتھوں میں مہندی رچ جائے۔ اور پھر چاہے آنکھیں مُند جائیں ـ وہ اس کے بیاہ سے پہلے مرنا نہیں چاہتا تھا اس کی بس یہی ایک آخری خواہش تھی۔ واحد دادا کی آنکھوں میں اکثر سوچتے سوچتے آنسو آجاتے۔ جانے اللہ میاں کو یہ بھی منظور ہے یا نہیں "اور پھر وہ آنکھوں کو اپنی پھٹی ہوئی قمیص سے پونچھ کر اپنی قسمت کا شکوہ کرنے لگتا" ہائے بڑھاپے کا ایک ہی سہارا تھا۔ سو وہ بھی چھین لیا مالک نے "۔ اور اس کی آنکھیں پھر ڈبڈبا جاتیں پندرہ سال سے اس کو بیٹے کا غم کھا رہا تھا۔ اس وقت جب اس کی مُنّا صرف ایک سال کی تھی جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی ———— اور اس سے پہلے وہ اپنی بیوی کے لئے کڑھتا رہا تھا ـــ اس کا بیٹا بھی خوب مقدر لے کر آیا تھا۔ جب ایک سال کا تھا تو ماں مر گئی اور جب اس کی بچی ایک سال کی ہوئی تو خود مر گیا ماں جوانی میں گئی اور اس کی بھی جوانی نہیں رہ سکی ـــ" واہ اللہ میاں واہ" واحد دادا کی زندگی کیا تھی غموں اور حسرتوں کا ایک مجموعہ تھی۔ محبوب بیوی کا صدمہ اور جوان بیٹے کا غم لئے وہ زندگی کے دن کاٹتا رہا ———— وہ ایک ہی وقت میں ماں بھی تھا اور باپ بھی۔ کتنی مشکلوں سے وہ اپنے بیٹے کو جوان کر سکا تھا اور پھر جب "مُنّا" پیدا ہوئی تو اس کو بھی پالنا پڑا۔ باپ کو جوانی کی بھینٹ دیکر پالتا رہا اور بیٹی کو بڑھاپے کی نذر پیش کرتا رہا ———— اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے مُنّا کی ماں آجاتی جو اپنے مرد کے مرنے کے بعد ہی اس کے گھر سے چلی گئی تھی اور جس نے اپنی ننھی مُنّی بچی کو روتا بلکتا چھوڑ کر ایک چوڑی والے سے بیاہ کر لیا تھا "لوگ کہتے ہیں کہ ماں کو باپ سے زیادہ محبت ہوتی ہے ـ بکتے ہیں لوگ" اور اس کا خیال ٹھیک ہی تھا ـــ اس نے تو اپنے بیٹے ہی کی خاطر اپنی ساری جوانی تباہ کر لی تھی ـ اس کا بیٹا ہوا شباب کیسا ضائع ہوا تھا کوئی اس کی بہو سے پوچھتا جس نے اپنی

سلو کو لانے دینے کے لئے جتن کئے تھے ـــــ اس کی امنگیں اس کے ارمان اور اس کی بہترین خواہشات دم توڑ گئیں مگر وہ اپنی بیوی کی یادوں کو سہارا بنائے اور اپنے ننھے بیٹے کو گود میں لئے زندگی کی ڈور کاٹتا ہوا آگے بڑھ گیا ـ ننھے منّے بیٹے کی تکلیف کا خیال کسی پل بھی اسے چین نہ لینے دیتا ـــــ ماں کی ممتا چھن جانے کے بعد بچے کے لئے کیا رہ جاتا ہے ـــــ سوتیلی ماں سے ممتا نہیں کوئی اور چیز ملتی ہے۔ جو ممتا کی طرح امرت نہیں ہوتی بس سے کہیں زیادہ ناگوار ہوتی ہے ـــــ اور اسے یہ کسی طرح منظور نہیں تھا کہ اس کے بیٹے کو امرت کی جگہ بس ملے اور پھر اس کو اپنی بہو پر انتہائی غصہ آجاتا ـــــ " اسے بھول سی مُنّا کا ذرا خیال نہیں آیا"
اور اسکو ساری باتیں یاد آنے لگیں کس کس طرح اپنی مُنّا ، اپنے جوان بیٹے کی یادگار کو سینے سے لگائے اپنی کمزور ٹانگوں مگر جوان حوصلوں پر زندگی کے مصائب سے لڑتا رہا ـــــ حیات کی پریشان کن سختیوں اور دشوار گذار پُر پیچ راہوں سے گذرتا رہا اڑوس پڑوس کی عورتوں کی خوشامدیں کر کر کے دن میں مُنّا کی دیکھ بھال کرواتا رہا ـــــ اس دیکھ بھال کے بدلے اکثر اسے ان عورتوں کو اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کے جمع کئے ہوئے پیسے بھی دینے پڑتے ـــــ اور پھر جب مُنّا اس قابل ہوگئی کہ اس کی روٹی تیار کرسکے تو وہ کتنا خوش ہوا تھا ـــــ اس کی محنت جیسے رائیگاں نہیں گئی ہو ـــــ " اللہ تیرا شکر ہے اور پھر اس کو اپنی لاڈلی کے بیاہ کی فکر ہونے لگی ـ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیاہ تو وہ کسی طرح دیکھ ہی لے ـــــ وہ اپنی کمزور ٹانگوں اور ناتواں ہاتھوں سے اتنا کچھ کام کرنا چاہتا تھا کہ مُنّا کے لئے اچھا بر ڈھونڈا جا سکے۔ اس مایا کی لوبھی دنیا میں آدمی کو کون پسند کرتا ہے ، سب ہیرا چاہتے ہیں ـ اور واحد دادا اس سے بخوبی واقف تھا ـ وہ جانتا تھا کہ اس کے ہیرے کی کنی اس وقت تک بیکار ہے جب تک اسے سنوارنے کے لئے چاندی اور سونا نہ ہو ـــــ وہ معمولی انسان ضرور تھا مگر اس کے دل و دماغ اس جیسے نہیں تھے ـــــ وہ اپنی مُنّا کو کھاتے پیتے گھرانے میں دیکھنا چاہتا تھا ـــــ ایسا گھرانا جیسا اس کے خاندان بھر میں کوئی نہ ہو اور اس کے لئے وہ انتھک محنت کر رہا تھا ـ وہ دو جگہوں پر کام کرنے کے علاوہ بابو لوگوں کو سگریٹ پان بھی سپلائی کیا کرتا ـ مُنّا سے سلائی کرواتا ـ رات کو اس کے پاس بیٹھ کر لفافے بناتا اور جانے پیسہ پیدا کرنے کی کتنی صورتیں اختیار کئے ہوئے تھا ـ واحد دادا کو بس پیسے جمع کرنے کی دھن تھی سو وہ اس میں مشغول تھا ادھر وہ پیسے جمع کرنے میں مشغول ادھر مُنّا فراق ' عمر بننے میں کوشاں

آج واحد دادا چاند کو دیکھ کر بہت خوش تھا ـ سولہویں کا یہ چاند اسے یاد دلا رہا تھا کہ اس کی مُنّا بھی آج سولہ سال کی ہوگئی ـــــ

وہ بھی میلے کچیلے گھر میں اس طرح چمک رہی ہے جس طرح میلے بادلوں میں ـــــــــــــ

آسمان پر چاند کا گولا چمک کر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہا ہے ـــــ اور پھر اس کے پاؤں ایک انجانی مسرت کے ساتھ تیز تیز اٹھنے لگے ـــــ وہ آج گھر جلد پہنچنا چاہتا تھا ـــــ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی مُنّا کو جلد سے جلد دیکھ لے ـــــ اس کی رفتار اور تیز ہوگئی ـــــ مگر جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو ایک ایسی آواز کانوں میں آئی جس نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ـ جیسے وہ زمین میں گڑا ہوا ہو ـ دھندلا گیا

" واحد دادا کی پوتی ممودہ پیٹ سے ہے "

" بیچارے کی ناک کٹوادی کم بخت نے " دوسری آواز آئی ـ

" جھوٹ ہے ـ ایسا نہیں ہوسکتا میری مُنّا ایسی نہیں ہوسکتی " وہ چیخ پڑا ـ قریب کے گھر سے کلّن دیا نکل آئی " کیا ہے واحد بھیا ! "

" اسحٰق میاں کے گھر میں کوئی کہہ رہا ہے مُنّا بدچلن ہے " واحد دادا جیسے اب رونے ہی والا ہو ـ

"دل مجی رکھو باحد چچا۔ اللہ کے حکم میں کا چارہ ہے۔ بہ اس کو یہ لاج نہ سہے" منگلن بوا بھی اپنے گھر کے کواڑ کھول کر باہر آگئی۔
منگلی۔ تیں چپ رہ۔ نہیں تو ہم تیرا کھون پی جائنگے"
"اب تم جو کرو۔ یہی بات سب کو بری لگے ہے" منگلن بوا نے منہہ بنا کر کہا اور اپنے کواڑ بند کر لئے۔
"باحد بیٹا۔ گھر جاؤ۔ کھدا کرے یہ بات جھوٹ ہی ہوے" الٰہی دیا نے واحد دادا کے زخم پر پھایا رکھا —— اور پھر وہ دھیرے دھیرے اپنے گھر کی طرف چلنے لگا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔
"کا یہ سچ ہے۔ کا یہ سچ ہو سکے ہے —— کھدا کرے او جھوٹ ہو۔ اللہ کرے را سچ نہ ہووے" —— اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو گر کر اس کی داڑھی میں جذب ہو گئے —— اس کے گھر کا دروازہ آگیا —— اس نے خلافِ معمول زنجیر ہلائی —— پہلے وہ "بیٹا منّا" پکارا کرتا تھا مگر آج اس نے آہستہ آہستہ زنجیر ہلائی —— اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ پکار سکے وہ چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہی رہا۔ کواڑ پر اس نے دھیرے دھیرے ہاتھ مار کر دھب دھب کیا۔
"کون ہے" منّا کی آواز آئی۔
واحد دادا نے چاہا کہ وہ اٹھ کر کہیں اور چلا جائے مگر وہ اٹھ نہیں سکا اس کو ایسا لگا کہ منّا کی آواز بھی پہلی سی نہیں رہی ہے۔
"ہائے اِبی کا ہو گیا"
کواڑ کھل گئے۔
"کا ہے دادا" منّا گھبرا گئی۔
وہ اپنے دادا کو سہارا دینے کے لئے آگے بڑھی۔
"بیٹا" واحد دادا اس سے لپٹ کر رونے لگا —— منّا بھی رو پڑی۔
"اِبی کا کیا۔ بیٹا؟" اس کی ہچکی بندھ گئی۔
"دادا کچھ کہو بھی۔ کا ہوا" منّا کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اور پھر وہ دونوں اندر کمرے میں چلے گئے۔
"بیٹا سچ سچ بتا دے۔ کس سے ملتی رہی ہے؟" واحد دادا نے سر جھکائے ہوئے کہا۔
"دادا۔ یہ آج تم کیسی بات کر رہے ہو"
"میرا کلیجہ پھٹک رہا ہے —— اِبی کا کیا بیٹا"
"دادا تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو" وہ کانپ گئی۔
"بیٹا۔ سچ سچ بتا دے۔ ہم تیرا کچھ نہیں کریں گے"
"میں کیا بتاؤں" وہ کچھ جھنجلائی۔
"وہ کون ہے جو تیرے ساتھ —— " وہ رک گیا
"دادا —— " وہ چیخ پڑی۔
"سب کہہ رہے ہیں" اس کا سر جھک گیا۔

"یہ سب جھوٹ ہے دادا یہ سب جھوٹ ہے"
اور پھر وہ رونے لگی۔
"ہاں بیٹا۔ ہم بھی اس کو جھوٹ سمجھتے ہیں"

اور پھر بہت دیر تک منّا اس کی گود میں سر رکھے روتی رہی دوسرے دن جب وہ دفتر گیا تو وہاں ایک بابو کا سر پان میں تمباکو زیادہ کھانے کی وجہ سے چکرا گیا تو اُسے یاد آیا کہ ابھی کچھ دن پہلے اس کی منّا کو بھی تو ہلکا سا چکر آ گیا تھا۔ وہ پان بھی تو نہیں کھاتی پھر کھڑی کھڑی ایک کیوں گر گئی تھی ——— فوراً ہی اس کے کانوں میں اشرف میاں کے گھر سے آتی ہوئی آواز گونجنے لگی۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھ گیا اور ایک خالی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھنے لگا ——— "تو کیا یہ ٹھیک ہے" ——— (معاً اسے یاد آیا کہ شبراتی کا لونڈا جب پیٹ میں تھا تو شبراتی کا بھی اسی طرح تو سر گھوما کرتا تھا۔ اس سر کے چکر کی وجہ سے وہ اکثر لیٹی رہتی تھی۔ ایک دفعہ تو وہ اس کے سامنے بھی سر کے چکر کی وجہ سے اکثر لیٹی رہتی تھی ——— ایک دفعہ تو وہ اس کے سامنے بھی لیٹی ہی رہ گئی تھی حالانکہ وہ اس کا بہت لحاظ کرتی تھی۔ اور پھر اس کو اس کی الٹی بھی یاد آ گئی ٹھیک ویسی ہی الٹی تو اس روز رات کو منّا کو بھی ہوئی تھی۔ رات کو وہ اسی وجہ سے کھانا بھی نہیں کھا سکی تھی ——) تو کیا اشرف میاں کے گھر کی آواز غلط نہیں ہے ——— پھر اب کیا کیا جائے" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں ———

اس دن اس کا جی کام پر نہیں لگا اور وہ چھٹی لیکر گھر آ گیا مگر آ کر اس نے منّا کو غور سے دیکھا ———

"ایسے کاہے دیکھ رہے ہو دادا" منّا کچھ جھینپی۔
"کچھ بھی نہیں بیٹا" ——— اس کا سر جھک گیا اور پھر اس نے سوچا۔

"آخر بات کیا ہے جو اس کا رنگ پیلا پڑ رہا ہے۔ سر بھی چکر کھاتا ہے پرسوں الٹی بھی ہوئی" ——— "اللہ رحم" ——— اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور جب کچھ دنوں کے بعد اس کی لاڈلی کے جسم میں فرق محسوس ہونے لگا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے واقعی اڑ گئے ———

اڑوس پڑوس میں چہ میگوئیاں بڑھ گئیں۔ منّا بھی منہ لپیٹے دن رات پڑی رہی ——— جب وہ اس سے پوچھتا تو وہ صرف روتی اور بات کہتی تو صرف اتنا کہتی "یہ جھوٹ ہے۔ دادا یہ سب جھوٹ ہے" واحد دادا کی محبت اس کی بات کا یقین کر لیتی اور پھر وہ سوچنے لگتا پھر ایسا کیسے ہوا۔ اس کے ذہن پر مٹے مٹائے نقوش ابھرنے لگے۔ گذرے ہوئے دنوں کی تمام باتیں یاد آنے لگیں ——— اور پھر یکایک وہ چونکا۔ "تو کیا۔ تو کیا منو حرامی نے ...."

وہ اپنی بہن کے نواسے کو گالیاں دینے لگا ———

آج سے چند مہینے قبل وہ ایک رات اس کے یہاں ٹھہرا تھا ——— رات اندھیری تھی منّا سو رہی تھی اور وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی دوست کو چلا گیا تھا ———

"تو کیا۔ تو کیا"

اور وہ منّا سے پوچھ ہی بیٹھا۔
"بیٹا — منو کب آیا تھا ہمارے یہاں"
"منو بھیّا کو آئے پانچ مہینہ ہوا"

"منّو کیسا آدمی ہے، بیٹا؟"
"اچھے ہیں دادا"
"تو پھر وہ بُرا آدمی کون ہے سالا" — وہ پھر چیخ پڑا
ممّدا پھر رونے لگی ——
"دادا اگر بھروسہ نہیں تو زہر دیدو ہم کو"
"نہیں بیٹا۔ بھروسہ ہے۔ مگر کلیجہ جانے کاہے جل رہا ہے" اور اس کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
"ہم یہاں نہیں رہیں گے اب بیٹا۔" کچھ دیر کے بعد وہ کچھ سوچ کر بولا۔
"ہاں دادا۔ کہیں اور چلو۔ یہاں کے لوگ پاگل ہوگئے ہیں"
ممّدا نے بھی اپنی آنکھوں کے آنسو اپنے آنچل سے پونچھ لئے۔ اور پھر دوسرے دن واحد دادا ممّدا کو لیکر دور ایک چھوٹے سے شہر چلا گیا جہاں اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ جہاں اس پر انگلیاں اٹھانے کے لئے کوئی غیر نہ تھا۔ جہاں اس کی مدد کے لئے۔ اس کے لئے سب پرائے تھے جو انجان تھے۔ پاگل نہ تھے۔
وقت کٹتا رہا اور واحد دادا کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ جب ممّدا کو دیکھتا تو اس کا شبہ یقین سے بدل جاتا اور جب وہ اس کی باتوں کو سنتا تو اس پر بھروسہ کرنے کو جی چاہتا ——
"پھر اسرف میاں کے گھر والوں کو یہ کیسے معلوم ہوا بیٹا"
"منگلو بوا کے سامنے ایک بار الٹی ہوگئی تھی — تو الٹی ہونا کوئی گناہ تو نہیں دادا۔"
"نہیں۔ بیٹا۔"
اور پھر وہ کسی سوچ میں غرق ہوگیا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا اور جب سوچتے سوچتے اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ ممّدا گردن نیہوڑا سے بیٹھی ہے ——
"بیٹیا۔ کچھ فکر نہ کر۔ جو ہوا سو ہوا۔ یہاں ہمارا جاننے والا کون ہے کھوس کھوس رہ۔ تیرا بوڑھا دادا تیرے لئے سب کچھ برداشت کرلے گا ——"
ممّدا کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ آگے کچھ نہ بول سکی۔ واحد دادا نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا ——
"چپ رہ بیٹیا۔ ہم کو تیری مجبوری کا خیال ہے۔ ہم تیرے ساتھ ہیں۔ تیں اپنے دل میں کوئی ایسی ویسی بات نہ لا" اور اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔
"بیٹیا تیں تو ہانپ رہی ہے۔ بخار ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کو بلادیں"
"نہیں دادا چھوڑو۔ اپنے آپ اتر جائے گا"
"نہیں رے ——" اور وہ ڈاکٹر کو لانے کے لئے چلا گیا — قریب کا ڈاکٹر آیا۔ معائنہ کرکے نسخہ لکھنے لگا۔
"کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب" واحد دادا کو تشویش تھی۔

"کچھ بھی نہیں ـــــ کمزوری ہے۔ بخار تو جلدی اتر جائیگا ـــــ بخار کی دوا چل کر لے لو اور کمزوری کی دوا بزار سے لے آنا" ڈاکٹر بولا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ لکھا یہاں نہ لکھیے۔ دواخانے میں لکھیے گا۔"

"کیوں کیا بات ہے؟" ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

"چلئے، بتاؤں گے۔"

اور جب ڈاکٹر اپنی چھوٹی سی ڈسپنسری واحد داوا کے ساتھ پہنچا تو واحد داوا نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ڈاکٹر صاحب اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ اس کا خیال رکھئے گا۔"

"اچھا ـــــ تمہاری لڑکی کا شوہر کہاں ہے؟"

"مر گیا ـــــ" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــــ

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں" ڈاکٹر نے اظہارِ افسوس کیا۔

واحد داوا دوا لیکر واپس آگیا۔ اسے اب یقین آگیا تھا کہ اس کی مُنّا حاملہ ہے ـــــ اس نے بہت غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ وہ مُنّا کے اس ناجائز بچے کی دیکھ بھال بھی اسی طرح کرے گا جس طرح اس نے اپنے بیٹے اور مُنّا کی دیکھ بھال کی تھی (بچہ اس کا بہر طور عزیز ہوگا) ـــــ وہ مُنّا کی باتوں، اس کے طور طریقے اور شرم حیا سے سمجھ چکا تھا کہ مُنّا بے قصور ہے معصوم ہے اس گناہ میں اس کا قطعی کوئی ہاتھ نہیں۔ اسے دھوکا دیا گیا ہوگا۔ اس سے فریب کیا گیا ہوگا یا اس کو اس کا کچھ بھی علم نہ ہوگا ـــــ اس نے ایسے کتنے واقعات سنے تھے کہ ...... اور مُنّا کی تیندی بھی تو بہت خراب ہے ـــــ پر اب جو ہو گیا سو ہو گیا ـــــ مُنّا کا بچہ جیسا بھی ہو یہ ظاہر نہ ہونے دے گا۔ کہ وہ ناجائز ہے ـــــ البتہ اسے اس کا ضرور غم تھا کہ مُنّا کا بیاہ اب ویسا نہیں ہو سکے گا جیسا کہ وہ چاہتا تھا تو اس میں اس کا کیا دخل تھا۔ اللہ ہی کو یہ کرنا تھا ـــــ (مولوی صاحب کہتے ہیں کہ اللہ سب کی سنتا ہے ـــــ ......

اور پھر وہ اس دن کا انتظار کرنے لگا جب اس کے گھر میں ایک بچہ جنم لے گا۔ اور وہ اس کے جنم دن کے لئے تیاریاں کرنے لگا جب وہ مُنّا کی کمزوری کی دوا خرید کر لوٹ رہا تھا تو راستے میں اسے ایک کھلونے کی دکان نظر آگئی۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے اور وہ غیر ارادی طور پر اس دکان کی طرف بڑھ گیا ـــــ اس نے شوکیس میں تمام سجے ہوئے کھلونے دیکھے۔ ادھر ادھر رکھے ہوئے کھلونے۔ شیشے کی الماریوں میں بند کھلونے۔ دیواروں اور چھتوں سے لٹکائے ہوئے کھلونے ـــــ طرح طرح کے کھلونے ـــــ ربڑ کے، پلاسٹک، کاغذ اور روئی کے بنے ہوئے کھلونے ٹین اور دھات کی مختلف قسم کے بنے ہوئے کھلونے ـــــ چابی دیکر چلنے والے، ہوا سے چلنے والے اور آگ سے جنبش کرنے والے کھلونے ـــــ وہ دیکھتا رہا دیکھتا رہا ـــــ اس کا جی چاہا کہ اپنے آنے والے مُنّے کے لئے سب کے سب لے لے۔ پوری دکان اٹھا کر اپنی مُنّا کو دیدے اور کہے "لے بیٹا۔ یہ سب تیرے مُنّے کے لئے ہیں۔ ان سے اپنے مُنّے کا دل بہلانا اور آپ بھی کھیلنا۔ بچپن تو تم دونوں کا ہے نا ـــــ"

مگر وہ کرتا کیا اس کی جیب میں پیسے اتنے کہاں تھے۔ اور پھر اس نے سوچا چند دن کے بعد کچھ نہ کچھ تو لینا ہے ہی ـــــ اور وہ

...ہو گیا ——

اور ایک دن جب وہ اپنی ڈیوٹی سے لوٹ رہا تھا تو اس کی نظر سڑک کے کنارے کھیلتے ہوئے ایک بچہ پر پڑ گئی تھی۔ ننھا منا حسین بچہ — "میری منّا بھی اس سے کم خوبصورت بچہ نہیں ہوگا" اسے اپنی منّا کی خوبصورتی کا بہت شدت سے احساس تھا۔ "خوبصورت باپ کا خوبصورت بچہ ہوتا ہی ہے۔ یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں" —— اور پھر اس کی آنکھوں میں اس کا لباس ناچ گیا۔ چھوٹی سی نیٹ، سفید قمیص لال ٹائی ننھے ننھے پاؤں میں چھوٹے چھوٹے چمکدار جوتے — ریشمی موزے

"چاہے کچھ ہو۔ ہم بھی اپنے منّے کو ایسا ہی کپڑا پہنائیں گے" اسی طرح اس کو سنواریں گے —— یہ سب دیکھ کر میری منّا کتنی خوش ہوگی —— اور اس کے لئے منّا کی خوشی سے بڑھ کر اور کیا چیز تھی ——

وقت گذرتا رہا یہاں تک کہ اس کے حساب سے نو مہینے سے اوپر ہو گئے اور پھر دس ماہ ہو گئے — اب اس کی پریشانی بڑھی — اس نے اپنے دفتر میں بابو لوگوں سے اس کا تذکرہ کیا۔ لوگوں سے مشورے کئے —— بات یہ طے ہوئی کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے —— واحد دادا اپنی منّا کے لئے بک جانے کو بھی تیار تھا۔ اچھا اور بڑا ڈاکٹر بلایا گیا۔

"بڑے میاں اس کو بچہ نہیں ہے" ڈاکٹر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تو — تو ڈاکٹر صاحب" اس کو حیرت ہوئی۔

"بیماری ہے — اس بیماری میں ایسا ہی ہوتا ہے بڑے میاں" اور پھر ڈاکٹر نے۔ واحد دادا کو سب کچھ سمجھا دیا۔

"مگر ڈاکٹر صاحب۔ آپ اس کو کسی طرح بچا لو میرے سب روپئے لے لو ہم اسے اپنے ہی جیسے کو بیاہ دیں گے۔ اچھا بُرا نہیں کہیں گے اچھے ڈاکٹر صاحب میرے اچھے ڈاکٹر صاحب"

"بڑے میاں۔ تم نے دیر تو بہت کر دی مگر" ڈاکٹر مایوس تھا۔

"دادا۔ دیکھا تم نے۔" منّا کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔

"ہاں بیٹیا" وہ اس سے زیادہ نہیں کہہ سکا۔

اور وہ منّا سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگا۔

ہادی مچھلی شہری

قفس میں اپنا جو حال دگر ہے کیا کہیے
ہنوز حوصلۂ بال و پر ہے کیا کہیے

شعاعِ مہر نہیں بلکہ تیر و پیکاں ہے
یہی سحر جو ہماری سحر ہے کیا کہیے

جو ذوق دید کو مجبور بیخودی کر دے
وہ جلوہ آج شریک نظر ہے کیا کہیے

دل شکستہ اگر خون ہو رہا ہے تو ہو
تری نگاہ کا رنگین اثر ہے کیا کہیے

سنا ہے ہم نے کہ ہے بیخودی ہی اصل حیات
جو بے خبر ہو وہی باخبر ہے کیا کہیے

زباں ہے بند مری بیخودی کے عالم میں
کسی کا جلوہ شریک نظر ہے کیا کہیے

میں کب سمجھتا تھا بیکار ہوگی ہر تدبیر
دعا جو خود ہی حریف اثر ہے کیا کہیے

ہمیں تو کام ہے دونوں سے موت ہو کہ حیات
وہی ہے زہر وہی چارہ گر ہے کیا کہیے

دلِ خراب کا انجام خود ہی ظاہر ہے
شریک حال تمہاری نظر ہے کیا کہیے

اسی مقام پہ مرنا اسی جگہ جینا
مرا نصیب ترا سنگِ در ہے کیا کہیے

وہ التفات سراپا ہیں آج اے ہادی
دلِ خراب مگر بے خبر ہے کیا کہیے

سید انتظام الدین شاہ جمالی

ہوتی ہے ان کے رخ کی زیارت کبھی کبھی
آتی ہے اوج پر مری قسمت کبھی کبھی

ہر روز رنج و غم ہیں مسرت کبھی کبھی
وہ بھی مزاج دل کی بدولت کبھی کبھی

محسوس کی ہے ان کی محبت کبھی کبھی
سوتے سے جاگ اٹھی ہے قیامت کبھی کبھی

ہوتا ہے لطفِ ساقیٔ فطرت کبھی کبھی
ملتی ہے مے کشی کی اجازت کبھی کبھی

وہ مہرباں نہیں نہ سہی، ملتفت تو ہیں
ہوتی ہے ان کی مجھ پہ عنایت کبھی کبھی

ظاہر میں دور ہو کوئی باطن میں ہو قریب
ہوتی ہے اس طرح بھی محبت کبھی کبھی

جب اضطرابِ شوق نے بہکا دیئے ہیں پاؤں
گم ہو گئی ہے راہِ محبت کبھی کبھی

اوروں کو کم مجھی کو تعجب بہت ہوا
کی ہے جو میں نے ان کی شکایت کبھی کبھی

کہنے کو یوں تو رنج و مصیبت ہے زندگی
مل جاتی ہے متاعِ مسرت کبھی کبھی

اپنوں کی دوستی نے جمالی دیا یہ درس
غیروں کی دشمنی ہے عنایت کبھی کبھی

پروفیسر پرویز شاہدی

راہ گذر ہی راہ گذر ہے راہ گذر سے آگے بھی
ہم نے جاکر دیکھ لیا ہے حدِ نظر سے آگے بھی

سوچ سمجھ کر اہل نظر نے شعلوں کی دنیا کو چُنا ہے
ورنہ نشیمن بن سکتا تھا برق و شرر سے آگے بھی

ہم سفری و راہبری ہیں حدِ فاصل کوئی نہیں
شام و سحر کیسا نظر بھی ہیں ہم شام و سحر سے آگے بھی

بربط و دف کی دنیا میں بھی شام و سحر رن پڑتا ہے
دیکھو جاکر اپنے جہانِ تیغ و تبر سے آگے بھی

دل کا تعاقب کیسے کرتے، ہانپ رہی ہے سعیِ ستم
دار و رسن کیا جاسکتے ہیں گردن و سر سے آگے بھی

وہم مسافت کے صحرا میں سائے سائے چلتے ہیں
چاند ستارے چل کے دکھا دیں فکرِ بشر سے آگے بھی

بھول ہوئی، کیوں آنسو بنکر رہ گیا بھیگی پلکوں تک
خونِ جگر تو جا سکتا تھا دیدۂ تر سے آگے بھی

رفیق عزیزی

جو تم تھے پاس تو کچھ دل کو اضطراب نہ تھا
وہ ایک لمحہ مگر عافیت مآب نہ تھا

نہ جانے کیوں تری نظریں بدل گئیں مجھ سے
اگرچہ پیشِ نظر کوئی انقلاب نہ تھا

مری نظر میں حدودِ غرور و ناز بھی تھیں
مگر بمصلحتِ عشق، اضطراب نہ تھا

حریفِ تمکنتِ بندگی بھی ہو نہ سکا
شکوہِ ناز، بہ پندارِ لاجواب نہ تھا

عجیب کشمکشِ جبر و اختیار رہی
وہ اجتناب تھا گویا کہ اجتناب نہ تھا

تری نگاہ سے پی کر اٹھا جو مستانہ
اسیرِ عظمتِ جام و خمِ شراب نہ تھا

نہ جانے کیوں نہ ہوئیں مجھ سے بھی تمنائیں
نہ جانے کیوں ترا غمزہ بھی کامیاب نہ تھا

خرد شکار، تری بادہ بار نظریں تھیں
سرورِ دل کو باندازۂ شراب نہ تھا

رفیق لے کے چلے دوستوں کی محفل سے
وہ غم جو تیری عنایت سے دستیاب نہ تھا

سعادت نظیر

ہنسنے کی شکل کوئی دیدۂ تر! ہے کہ نہیں؟ ظلمتِ شام کے پردے میں سحر ہے کہ نہیں؟

رہروِ منزلِ پُر خار! نہ کہتے تھے ہم راہِ دشوار میں بھی لطفِ سفر ہے کہ نہیں؟

رہنما سیکڑوں گم ہو گئے منزل کے قریب قافلے والو! تمہیں یہ بھی خبر ہے کہ نہیں؟

نام پستی کا نہ ہو جس میں بلندی کے سوا ایسی منزل کوئی یا ایسی ڈگر ہے کہ نہیں؟

نالے مرغانِ چمن کے ہیں جہاں برق اثر وہ چمن درخورِ اربابِ نظر ہے کہ نہیں؟

خونِ اربابِ وفا سے یہ صدا آتی ہے زیست کو موت کے پنجے سے مفر ہے کہ نہیں؟

عشق "فرہاد" ہے "خسرو" کے ہوس پر غالب حسنِ "شیریں"! تجھے اس کی بھی خبر ہے کہ نہیں؟

آسماں سے تو گزر جاتے ہیں نالے دل کے ان کی محفل میں، خدا جانے! گزر ہے کہ نہیں؟

کس سے پوچھوں کہ سعادت کے نشیمن کے سوا
کوئی آرام گہہ برق و شرر ہے کہ نہیں؟

شاعر ندیم

تمام عمر سر طوق و دار گزری ہے
ہماری زیست بھی کیا استوار گزری ہے

وہی تو حاصل فصل بہار گزری ہے
جو ایک صبح سر شاخسار گزری ہے

وہ رات ہجر کی تھی پھر بھی تھا سکون ہمیں
یہ ہو کے وصل کی شب ناگوار گزری ہے

دلوں کے زخم تلک بھی ہرے نہ ہو پائے
بہار اب کے بڑی بے قرار گزری ہے

وہ آ رہے ہیں کہ روشن ہیں آسماں کے کنول
تمام رات بایں اعتبار گزری ہے

سسک رہے تھے ستارے لرز رہی تھی فضا
ٹھہر ٹھہر کے شب انتظار گزری ہے

نہ سوز غم کا مداوا نہ چارہ کار جنوں
تیوں میں عمر بڑی سوگوار گزری ہے

وہیں سے بات گئی حلقۂ سلاسل تک
جہاں کہیں سخن زلف یار گزری ہے

ندیم آج نہ جانے ہوا ہے کیا دل کو
نسیم صبح چمن خوشگوار گزری ہے

علقمہ شبلی

زمیں ہے خاکِ پا، نقشِ قدم ہے آسماں میرا
ہے مہر و ماہ و انجم سے بھی آگے کارواں میرا

میں روحِ عالمِ امکاں، میں شرحِ عظمتِ یزداں
ازل ہے میری بیداری، ابد خوابِ گراں میرا

نگاہِ ناز کی ہے شرح میری اشک افشانی
تمہاری ہی کہانی ہے مگر طرزِ بیاں میرا

وہ فصلِ گل ہے جس میں دشت و صحرا لہلہاتے ہوں
یہ فصلِ گل نہیں جلتا ہے جس میں گلستاں میرا

بناتی آشیاں اپنا کہاں برقِ تپاں جا کر
اگر کرتا نہ اس کی دستگیری آشیاں میرا

فرازِ دار پر بھی میں نے تیرے گیت گائے ہیں
بتا اے زندگی! تو لے گی کب تک امتحاں میرا

چلو صحرا کے ذروں کو شریکِ گفتگو کر لیں
چمن میں تو نہیں شبلی! کوئی بھی ہم زباں میرا

رسالوں میں

(اکتوبر)

ثقافت لاہور ـــــــــ پہلا مضمون ہے " شریعت میں فنون کا دخل "۔ یہ مضمون مولانا شاہ جعفر صاحب کے قلم سے ہے اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ اگر وراثت جیسے خالص شرعی مسئلہ میں " فن قیافہ " سے کام لیا جا سکتا ہے درانحالیکہ وجدانی سا علم ہے تو علم فلکیات سے کیوں کام نہیں لیا جا سکتا۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے " غزالی اور آداب معاشرت " کے عنوان سے کھانے پینے۔ اٹھنے بیٹھنے۔ ملنے جلنے کے آداب بتائے ہیں۔ عبدالصمد صارم الازہری نے بنک اور سود کے مسئلہ پر مضمون لکھا ہے اور سود کو حرام قرار دینے والوں کے خلاف مناظرانہ انداز اختیار کیا ہے۔ ماحصل خلاصہ یہ ہے کہ " صدیوں کا پرانا نظام اس دنیا پر کیسے ختم کیا جا سکتا ہے (کسی علمی بحث میں اس قسم کے جملے مضمون اور مضمون نگار دونوں کو ہلکا ثابت کرتے ہیں) شفیق عبدی پوری نے مزدک اور مزدکیت کی تاریخ بیان کی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ زار آخر بن کے بعد روس میں مزدکیت کے فروغ کا موقع آیا اور وہ کمونزم کا لبادہ اوڑھ کر برسرعام آ گئی۔ ایک مختصر مضمون لطیف احمد قریشی نے " معصومیت " پر لکھا ہے اور نفسیاتی پہلو سے روشنی ڈالی ہے۔ نزہت آمانے ڈاکٹر شمیل کے مضمون فکر اقبال پر مغربی اثرات کا ترجمہ پیش کیا ہے، لکھا ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ آیا اقبال نے مشہور کارتھولکی مصنف فریدرش فان ہیوگل کی کسی تصنیف کا مطالعہ کیا تھا یا اس سے مماثلت محض ایک اتفاقی امر ہے تاہم اس کے خیالات کے علاوہ یوکن اور لوسے کے افکار بھی اسرار خودی اور اسلامی الہیات کی جدید تشکیل میں پائے جاتے ہیں۔ مضمون نگار نے نطشے، گوئٹے اور ملٹن وغیرہ کے نام بھی لئے ہیں اور بتایا ہے کہ اقبال کو مشرق اور مغرب میں جو جو حیات آفریں قوتیں نظر آئیں ان سب سے انہوں نے اپنی قوم کی قسمت بدلنے کا کام لیا ہے۔ مولانا شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی نے " صوفیاء اور تطہیر رقص " کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ موسیقی کے بعد دوسرا نقش ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے فنون کی ایک اور شاخ یعنی رقص پر اظہار خیال کیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ نظام شمسی کا ہر رکن رقصاں ہے اور کائنات کا کوئی ذرہ رقص سے خالی نہیں اور اس ضمن میں حیوانات کے رقص، پھر انسانوں کی مختلف قوموں کے رقص کا تذکرہ کیا ہے اس کے بعد بتایا ہے کہ مذہب فطری جذبات کو دباتا نہیں بلکہ اس کا صحیح مصرف لینا چاہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی مذہب نے بھی رقص کے فطری جذبات کو دبایا نہیں ہے اس کے تعمیری پہلوؤں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ انہوں نے زبور شریف، اور حدیث سے کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں، پھر فقہاء اور صوفیاء کی روش کا تذکرہ کیا ہے شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی کی عبارت " جواز وجد و رقص " کے سلسلے میں پیش کی۔ اور صوفیاء کے رقص خانقاہی پر بھی روشنی ڈالی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ صوفیاء نے رقص میں یہ بڑی اصلاح کی ہے کہ عورتوں کو اپنے وجد و رقص سے الگ رکھا۔

فاران کراچی ——— اس ماہ نقش اول میں میلاد و قیام کی بحث کرتے ہوئے مولانا ماہر القادری
ان واعظوں اور میلاد خوانوں پر تنقید کی ہے جو اپنی خطابت کے زور میں قرآن مجید کی آیات کی نہایت غیر معقول تفسیر
جاتے ہیں، اور افراط تفریط سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھتے، دوسرا مضمون ملا واحدی صاحب کے قلم سے بہ عنوان تاثرات
کے تجربات کا عالمانہ حاصل ہے، سید رشید احمد ایم اے نے اسلام کا نظام زکوٰۃ لکھ کر اس کی اجتماعی اہمیت اور تنظیم
روشنی ڈالی ہے۔ اور تنظیم زکوٰۃ کی مختصر تاریخ، عہد رسالت کا نظام زکوٰۃ زکوٰۃ نہ دینے والوں سے جنگ اور پھر موجودہ
زکوٰۃ پر تبصرہ کیا ہے، ظفر اسحاق انصاری کے قلم سے کنٹویل اسمتھ کی کتاب اسلام اِن دی ماڈرن ہسٹری پر ایک تنقیدی نظر۔ مار
مارکس (نیویارک امریکہ) کے مضمون کا ترجمہ ہے مضمون نگار نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر اسمتھ کے نزدیک پاکستان کا اسلامی ریاست بنانا
غلطی ہے وہ پاکستانیوں سے اس لئے برافروختہ ہیں کہ وہ ماضی پر اپنی نظریں جمائے ہوئے ہیں ڈاکٹر اسمتھ کے نزدیک کسی ایک دور کی
حکومت کو دوسرے دور میں تعمیر کرنے کی کوشش ناممکن اور بے معنے ہے وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل
ہے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مذہب کو لادینیت برداشت کرنی چاہئے اب اگر مسلمانوں نے قیصر اور خدا کی تقسیم کو قبول نہیں کیا تو وہ
ہو جائیں گے بالفاظ دیگر مسلمانوں کو اگر اپنا دین محفوظ رکھنا ہے تو انہیں چاہئیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں برباد کر دیں، امیر الدین
جے پوری نے فطرت اور حقیقت کی سرخی سے کائنات کی بہت دلچسپ داستان آغاز و انجام پیش کی ہے فضل احمد عارف
عرب کی عظیم مرثیہ گو شاعرہ الخنساء پر ایک مختصر مضمون لکھا ہے، یہ وہ جاہلی شاعرہ ہے۔ جو اسلام بھی لائی ہے۔ اور عرب کے
ممتاز شعراء میں سے ہے کہ جب بازار عکاظ میں ان کے خیمے لگتے تھے تو ایک طرف خنساء کا پرچم بھی لہراتا تھا۔ اس کی شاعرانہ عظمت
کے قائل، نابغہ ذبیانی جریر اور بشار بن برد جیسے شعراء رہے ہیں، آخر میں یادرفتگاں کے صفحات میں مولانا ماہر نے مولوی عبد
بی اے پر ایک تفصیلی معلومات انگیز مضمون سپرد قلم کیا ہے، اور مولوی صاحب کی خوبیوں اور خامیوں پر اپنے تاثرات وضاحت
سے بیان کئے ہیں۔

العلم کراچی ——— ایجوکیشنل کانفرنس کا سہ ماہی رسالہ العلم بہت باقاعدگی سے نکلتا ہے
تازہ شمارے میں، محمود اکبر آبادی کے قلم سے ل احمد اکبر آبادی کی افسانہ نگاری اور ادبی خدمات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی
ہے۔ اور انگریزی زبان کے افسانے کے عہد بہ عہد تنوعات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ لطیف احمد اکبر آبادی بیسویں صدی
کی ابتدا کے ان گنے چنے ادیبوں میں ہیں جن میں سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، نیاز فتحپوری کے نام آتے ہیں، جناب محمود نے
ل احمد کی نگارش کے تین دور ہیں پہلا اخذ و ترجمے کا، دوسرا رومانی، تیسرا واقعاتی، لطیف اکبر آبادی کو ٹکسالی زبان اور
محاورے پر پورا عبور ہے، اور یہ قدرت ان کو نظیر سے ملی ہے محمود صاحب کا مضمون مفید معلومات کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر حامد اللہ
خاں علیگ نے اپنے مضمون "تعلیم بالغان کی قومی اہمیت" میں بتایا ہے کہ انگلستان جو اس حد و جہد میں بہت سے ملکوں
آگے ہے وہاں کس طریقہ پر اس تعلیم کی ابتدا ہوئی اور کیا کیا ذرائع اختیار کئے گئے اور اس کے کیا کیا فوائد ہیں، سیدہ
فاطمہ بریلوی کے تاثرات بھی پڑھنے کی چیز ہیں وہ ماضی و حال کے واقعات کی ٹوٹی ہوئی بکھری ہوئی اور الجھی ہوئی ڈوروں کے
سروں کو ادھر ادھر سے کھینچ کر جوڑتی ہیں اور پھر انہیں بکھیر کر اثرات کا ایک عالم چھوڑ جاتی ہیں، ڈاکٹر حامد حسین بلگرامی نے

سرا پنج سالہ منصوبہ) میں پرائمری، ثانوی، اردو کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم پر تبصرہ کیا ہے۔ بشیر احمد علوی صاحب ناظر کاکوروی کے
خطوط کا سلسلہ کہکشاں کے قریب، ایک مدت سے چل رہا ہے، یہ اس کی ساتویں قسط ہے، خطوط یوں بھی دلچسپ ہوا کرتے ہیں،
صاحب کے خطوط معلومات افزا بھی ہیں۔ سخاوت مرزا نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ایک گمنام تصنیف (معتقدات
۔۔۔) کے عنوان سے شیخ دہلوی کی اس کتاب کا تعارف کرایا ہے، یہ کتاب قدریہ اور جبریہ فرقوں کے رد میں ہے، مضمون نگار
شیخ عبدالحق کا شجرہ، حالات، آل اولاد اور تصانیف سب کا تذکرہ کیا ہے۔ نو صفحات کا یہ عربی نادر مخطوطہ عربی زبان میں ہے
مولوی محمد عمر یافعی صاحب حیدر آباد کے کتب خانے میں ہے۔ کیپٹن ڈاکٹر محمد ایوب کے "مطالعہ آزاد" کا سلسلہ بھی جاری ہے اور اس کی
قسط اس شمارے میں شریک ہے۔ کیپٹن صاحب نے اس مضمون میں مولانا آزاد کی شخصیت اور افتادِ طبیعت کا تجزیہ کرنے کی کوشش
ہے اور یہ تجزیہ واقعات کی مثالوں سے کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مولانا کانگریس کی حمایت میں حق و ناحق کو بھی فراموش کر جاتے
ان کی تحریر میں دلکشی، جذبات پروری، ولولہ انگیزی اور قوتِ بیانی کے ساتھ تکبر، رعونت، اشتعال انگیزی، دل آزاری بلکہ
دشنام طرازی کا جذبہ بھی شامل ہوتا تھا۔ "در ذاں قافلۂ انسانیت را مجمع وحوش و کلاب" ـــ اور ان کا معرکۃ الآرا خطبہ جو
۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جامع مسجد دہلی میں انہوں نے دیا۔ اس خطبے میں حجاج بن یوسف کے علم و عرفان، طلاقتِ لسانی اور دل آزاری
سے کس قدر مشابہت ہے، زندہ تو زندہ انہوں نے مردوں کو بھی نہ چھوڑا، مرزا غالب، اورنگ زیب عالمگیر، سرسید کی عزت افزائی
تفصیلات دیکھئے۔ محمد عظمت حسین صابری نے خواجہ فریدالدین گنج شکر، شیخ رکن الدین سہروردی ملتانی، نصیر الدین محمود چراغ
دہلی، خواجہ گیسو دراز کے حالات و اقوال کا ایک مجموعہ بھی مرتب کر کے اس شمارے کے سپرد کیا ہے۔ اخیر میں مہر تقوی صاحب
پوری کے قلم سے چند تاریخ گو شعرا کے تذکرے اور فنِ تاریخ گوئی پر مفید تبصرہ درج ہے۔ اور مہابت جنگ نواب علی وردی
خاں حاکم بنگالہ کے حالات پر سید مصطفےٰ علی بریلوی نے روشنی ڈالی ہے۔

اشارہ پٹنہ ـــــــــ تازہ شمارے میں حسن مثنیٰ ندوی کے قلم سے ایک طویل مضمون بہار میں اردو
شائع کیا ہے، اس مضمون میں مضمون نگار نے شاہجہاں کے شیراز یعنی پورب (دامن دہلی سے سرحد بنگال تک) کے خطے کی
کی جد و جہد، اور پھر سارے برعظیم میں اردو کی رفتار، اہل تصوف کی جذبات، اور بہار کے ادیبوں، شاعروں کا تذکرہ بڑی
تفصیل سے کیا ہے، دہلی کے اجڑنے، دربار لکھنؤ، بزم عظیم آباد اور دربار مرشد آباد میں شعرا کے پہونچنے کی داستان بھی سنائی
ہے۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اردو کے ساتھ کسی حکومت نے کبھی اچھا سلوک نہیں کیا، شمالی ہند میں ایک مدت دراز تک
اردو زبان میں کچھ لکھنا قابلِ محاسبہ سمجھا جاتا ہے، ـــــ فارسی زبان کے حامی اسے دشمن سمجھتے تھے۔

دی سٹی کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس:۔ حیدرآباد۔ (پاک)

سرمایہ کا خاکہ

منظور شدہ سرمایہ	۱۰,۰۰,۰۰۰/۰۰
اداشدہ سرمایہ وزرِ محفوظ	۷,۰۰,۰۰۰/۰۰
جمع شدہ رقوم	۱,۳۴,۰۰,۰۰۰/۰۰
سرمایۂ کارکردگی	۱,۸۵,۰۰,۰۰۰/۰۰

شاخیں

۱۔ حیدرآباد
۲۔ کراچی
۳۔ نواب شاہ
۴۔ جھڈو
۵۔ سکھر
۶۔ ہالہ
۷۔ میرپورخاص
۸۔ ٹنڈوالٰہیار

مجوزہ شاخیں

۹۔ خیرپور
۱۰۔ لاڑکانہ
۱۱۔ نوشیروفیروز
۱۲۔ جیکب آباد
۱۳۔ کندکوٹ

قسم کی بنکاری اور زرِ مبادلہ کے کام اطمینان بخش طریقے سے انجام دیئے جاتے ہیں

سید بدرالدّجےٰ راجہ (جنرل منیجر)

hone No.

Regd. No. S. 2037

M[illegible]THLY MEHR-E-NEEMROZ KARACHI-5